سہ ماہی

تسطیر

لاہور

مدیر نصیر احمد ناصر

دیکھ سکتے ہو تو دیکھو!

دیکھ سکتے ہو تو دیکھو غور سے
ویرانیاں تاریخ کی ......!
مقدونیہ کی سمت جاتے راستوں پر دھول اُڑتی ہے
مقدر کے سکندر جا چکے ہیں
قونیہ کی میخ کے چاروں طرف کُنڈل بنائے
گھومتے قدموں کی چاپیں
اب کسی بے وقت لمحے کی صدائے جاں گزا ہیں
اب کسی درویش کی ایڑی میں دم باقی نہیں
روشن لکیریں بجھ چکی ہیں
محو ہوتے جا رہے ہیں رقص کے سب سلسلے
بغداد پر چیلیں جھپٹتی ہیں
دمشقی دھات کے پھل دار ہتھیاروں کی دھاریں کند ہیں

دیکھ سکتے ہو تو دیکھو!
اب تمھارے خواب کی گہرائیوں میں
دل دھڑکنے کی بجائے
بس بھری آنکھوں کے جنگل پھیلتے جاتے ہیں
کورِ تختی ستونوں سے بنی کُہنہ عمارت میں
نئی دنیا کے دھاری دار سانپوں کا بسیرا ہے
طلسمی غار میں
خفیہ خزانے کے پرانے آہنی صندوقچوں میں
سرخ سکّوں کی جگہ ڈالر بھرے ہیں
دیکھ سکتے ہو تو دیکھو غور سے......

(نصیر احمد ناصر، ۱۹۹۱ء، مطبوعہ "فنون" جولائی ۱۹۹۸ء)

شمارہ - ۱۹، ۲۰ اور ۲۱، ۲۲

اکتوبر ۲۰۰۱ء تا مارچ ۲۰۰۳ء

مدیر: نصیر احمد ناصر

قیمت موجودہ شمارہ	۱۵۰ روپے
زرِ سالانہ، پاکستان	۳۰۰ روپے
امریکہ اور کینیڈا کے لئے	۲۵۰۰ روپے
دیگر ممالک کے لئے	۱۵۰۰ روپے

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:

A-۲۵۱، سٹریٹ-۶، گلریز، فیز-II، راولپنڈی

HaSnain Sialvi

ترتیب

■ مکالمہ

■ میں اور میرے کردار

■ افسانہ

■ نظم

■ تنقید و تحقیق

■ نظم

■ بُک شیلف

■ نثری نظم

ترجمہ

سندھی ادب

■ غزل

■ میل باکس

■ متفرق

شمارہ۔۱۹،۲۰ اور ۲۱،۲۲ ...... اکتوبر ۲۰۰۱ء تا مارچ ۲۰۰۳ء

ناشر: نصیر احمد، مطبع: پرنٹو گراف، ۲۸۔نسبت روڈ، لاہور

مقام اشاعت: ۲۵۔اے، شادمان کالونی۔۱، جیل روڈ، لاہور

کمپوزنگ: ہارون، ذیشان، عابد سیالی

جیلانی کامران

اے خوش نما

اے خوش نما
تو نے اہلِ دل کو عجیب لطفِ خرام بخشا
نقابِ ہستی میں صورتوں کی تلاش کا اذنِ عام بخشا
نظر میں بس کر، زمیں کی وحشت کو اپنی آنکھوں کی روشنی دی
جو بے خبر تھا، جو نا سمجھ تھا، اُسے سمجھنے کی آگہی دی
جہاں کے ہر دیدہ وری آنکھوں میں
بے کلی کا گماں عیاں تھا
وہ پوچھتے تھے کہ عہدِ امروز میں جو کل تھا
وہ اب کہاں تھا
اے خوش نما
ہم نے زندگی کو ترے نشانِ قدم میں پایا
ہزار چہروں میں جس کو دیکھا، اُسے حجابِ صنم میں پایا
میں عمر کے جس مقام پر ہوں
تری محبت کا منتظر ہوں
جو آشناؤں کو اہلِ دل کا قرار دیتی ہے
ایسی حیرت کا منتظر ہوں!

ریاض مجید/نعت

ملیں جو چند سعادت کے پل مدینے میں
تو لکھیں نعت نبی برمحل مدینے میں

خوشا جو پلکیں ہوں جاروب کش دریچہ پر
رہیں موجب یہ آنکھوں کے بل مدینے میں

صد احتیاط، ہزار احترام، لاکھ آداب
ہوائے کعبہ کی مانند چل مدینے میں

حیات دامن مریم ہے جس کی خوشبو سے
کھلا ہے ایسا حیا کا کنول مدینے میں

ہر اک مرض کی شفا گاہ ہے وہ قریہ خیر
ہر ایک مشکل ہستی کا حل مدینے میں

وطن ہو، مال ہو یا والدین کی شفقت
ہر ایک شے کا ہے نعم البدل مدینے میں

خوشا نصیب یہ ہجرت، ہنر کے یثرب سے
بنی ہے نعت، جب آئی غزل مدینے میں

درود پڑھتا ہے جالی کے سامنے جا کر
خیال رہتا ہے ہر ایک پل مدینے میں

یہ مشت گل، ابدیت شناس ہو جائے
قسم خدا کی، جو آئے اجل مدینے میں

چل انتظار میں ہے جنت البقیع ریاضؔ
کوئی پکارتا ہے "جلد چل مدینے میں"

اداریہ

ادبی جمالیات، مواد، اثرات اور دائرہ کار

ادب کو جمالیاتی بنیادوں پر پرکھنا مناسب ہے یا فلسفیانہ اور اخلاقی بنیاد پر۔ اس بات کا تعلق فلسفۂ فن سے ہے جس کی بحث ادب میں بہت قدیم ہے۔ اور صرف فلسفیانہ اور اخلاقی بنیاد ہی نہیں اس کے افادی، عملی، ادراکی، فکری، معاشرتی، عمرانیاتی، سائنسی اور فنی دیگر پہلو بھی ہیں۔ جمالیاتی معروض کا تعلق صرف جسمانی یا مرئی مظاہر سے نہیں بلکہ غیر مرئی حسی اور داخلی اظہارات سے بھی ہوتا ہے۔ جمالیاتی تصور آفاقی ہے اور اسے علمی طور پر (Epistemically) بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ فلسفے اور اخلاق کی اعلیٰ اقدار جمالیاتی سیاق و سباق ہی میں ادب پارے کا روپ دھار سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے ادب کو جمالیاتی بنیادوں پر پرکھنا زیادہ مناسب ہے۔ فلسفہ اور اخلاق تو اس کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ارسطو نے اپنی بوطیقا میں شاعر اور فلسفی کو ایک جیسا اہم منصب عطا کیا ہے تاہم ارمسن (Urmson) اور چند دیگر مفکرین نے جمالیاتی نقطۂ نظر کی انفرادیت سے انکار کیا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب میں اصل اہمیت پیش کردہ مواد اور اسلوب کی ہوتی ہے۔ ادبی مواد میں جس نوع کے اجزا یا Contents ہوں گے اس کے اثرات بھی کم و بیش اسی نوع کے ہوں گے۔ مواد میں اگر Potential ہے تو ادب بھی طاقتور ہوگا۔ اسلوب اور پیش کش کے اعتبار سے ادب کی مثال ایک Finished Product کی طرح ہے، جس کے خام مواد کو شاعر یا ادیب اپنے اظہار کی ریفائنری میں نہایت پیچیدہ عمل سے گزارتا ہے اسے آپ Sublimation بھی کہہ سکتے ہیں۔ اثرات مابعد تخلیق یا مابعد ادب آتے ہیں اور مرتب ہونے میں عرصہ کھینچتے ہیں۔ حقیقی ادب کے اثرات فوری نوعیت کے نہیں دوررس ہوتے ہیں۔ ادب عام طور پر زیر زمین رہتا ہے اور سطح پر محض اس کے اثرات کی لہریں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ ان لہروں کی رینج (Range) اور Intensity کا انحصار کسی خطے یا معاشرے کے افراد کی ذہنی، علمی اور ادبی سطح اور رسائی پر ہوتا ہے۔

اثرات کے دائرہ کار میں سیاسی و سماجی جبر، ثقافتی و تہذیبی رویے یا قدریں، شرح خواندگی اور ترسیل و ابلاغ کے ذرائع براہ راست ملوث ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس معاشرے میں علمی و ادبی پسماندگی اور اقدار کی پامالی عروج پر ہو، ذہنی طور پر آزاد اور پڑھے لکھے افراد کی تعداد بہت کم ہو وہاں

ادب کے اثرات کی بات نہ صرف قبل از وقت بلکہ بے معنی ہے، محض ایک یوٹوپیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو شعر و ادب کی اپنی تہذیبی شناخت اور لسانی جغرافیہ (Linguistic Geography) تو ہے لیکن یہ ابھی تک خطے میں حقیقی انقلابی روح بیدار کرنے میں ممد ثابت نہیں ہو سکا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ادب نعرہ یا خطبہ یا کوئی ریسرچ پیپر نہیں ہوتا۔ شاعر یا ادیب نہ تو سیاستدان ہوتا ہے نہ سوشل ورکر۔ ادب کا کام سمت نمائی ہے، آئیڈیالوجی فراہم کرنا ہے، مطلوبہ نتائج کا حصول اس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

نصیر احمد ناصر

جاپانی صنفِ سخن ہائیکو کا پاکستان میں کیا مستقبل ہے؟

پاکستان میں ہائیکو کا مستقبل اتنا شاندار نہیں جتنا کہ ابتدا میں سمجھا گیا تھا۔ میرے خیال میں اگلے چند برسوں میں یہ صنف محض ایک سفارتی سرگرمی تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اس کی بنیادی وجہ اردو شاعروں کی ہائیکو کے مزاج سے عدم آگاہی اور ہیئت کی بے جا بحث ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا جائے تو ہائیکو کا اصل مزاج ''خاموشی'' ہے۔ اس کے برعکس اردو ہائیکو میں ''شور شرابہ'' در آیا ہے۔ ہائیکو مشاعرے بھی اس صنف کی تخلیقی ابتری کا باعث بنے ہیں۔ بہت سے قارئین کے لئے یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ دو دہائی قبل جب ہائیکو یہاں تخلیقی سطح پر متعارف ہوئی تو خود میں نے بھی بہت سی ہائیکوز لکھیں جو اُس وقت ''اوراق'' اور بعض دوسرے رسائل و اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوتی رہیں۔ میری تقریباً ایک سو ہائیکوز کو انگریزی زبان کے قالب میں بھی ڈھالا گیا ہے۔ لیکن آج جب اتنے سالوں بعد دیکھتا ہوں کہ زیادہ تر ہائیکو نگار پندرہ بیس سال قبل کی اُس فضا اور لفظیات سے آگے نہیں بڑھ سکے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ توارد، تکرار اور ایک دوسرے کی ایکو Echo کی جتنی مثالیں اردو ہائیکو میں ہیں شاید کسی اور صنف میں نہیں۔ اردو کے بیشتر ہائیکو نگاروں نے اپنے پیش روؤں کے نقوشِ پا کو مشعلِ راہ بنانے کے بجائے انہیں باہم گڈمڈ کر کے یا ان کی لفظیات کو اپنی اپنی ہائیکوز میں ضم کر کے ابتدا ہی سے اس صنف کو بہت نقصان پہنچایا اور اس کے امکانات محدود کر دیئے۔

(نصیر احمد ناصر، ''ادبی دنیا'' کے لئے لکھے گئے انٹرویو سے مقتبس)

ردعمل برادا ریہ

سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری کی افادیت

ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور)

جہاں تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری کی افادیت کا تعلق ہے تو حقیقت بلکہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ کسی دور میں بھی شاعری بلکہ تخلیقی ادب کی دیگر اصناف اور فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں کو باعث افادہ نہ سمجھا گیا، یہ تفریح طبع اور وقت کو بہلانے کے بہانے رہے ہیں اور رہیں گے۔ یہ تو ہم سر پھرے نقاد ہیں جو ان میں فلسفے، عمرانی زاویے اور مقصد و افادہ تلاش کرتے یا پیدا کرتے ہیں۔ عام قاری بلکہ بیشتر تخلیق کاروں کا بھی یہ مطمع نظر نہیں ہوتا اور جو کہتے ہیں کہ ان کی شاعری نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا، ان کے افکار نے قوم کو نئی زندگی دی اور وہ تاریخ کی اندھیری رات میں مینارۂ نور ثابت ہوئے تو یہ محض خوش فہمی پر استوار جذباتی کلیشے ہیں۔ ہم نے تو قرآن مجید سے روشنی اخذ نہ کی اور راہنمائی سے محروم رہے تو شعر و شاعری نے ہمارا کیا بگاڑنا ہے۔ ادب برائے مقصد کو اگرچہ سوشلزم کی تخمینی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے مشروط گردانا جاتا ہے لیکن جہاں تک اس تصور کا تعلق ہے تو اردو میں سر سید احمد خان اور ان کے رفقائے کار بالخصوص الطاف حسین حالی نے پہلی مرتبہ گل و بلبل کی غزل کو مسترد کرتے ہوئے شاعری کو صورت حال کا ترجمان بنانے کی شعوری طور پر کوشش کی۔ ان کے بعد علامہ اقبال ہیں جنہوں نے ترقی پسندوں سے بھی پہلے ادب کو مقاصد جلیلہ کے تابع کیا، اپنی شاعری کی صورت میں اور تلقین کی صورت میں بھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ہر عہد کے مقاصد جداگانہ رہے چنانچہ سر سید احمد خان کے مقاصد اقبال اور ترقی پسند ادیبوں کے لئے قابل قبول نہ تھے۔

شاید ماضی میں مشاعرہ کی کوئی تخلیقی افادیت ہوتی ہو اور یہ بطور تہذیبی ادارہ کچھ اہمیت رکھتا ہو۔ آج تو یہ محض کمرشل ازم ہے۔ معاوضہ کے ساتھ قیام و طعام اور بعض صورتوں میں تو شراب کی برانڈ تک کے بارے میں منتظمین سے معاملات طے کئے جاتے ہیں اس پر مستزاد یہ امر کہ بیشتر شعرا اپنی اور غیر آزمودہ غزل سنانے کا خدشہ مول نہیں لیتے چنانچہ دس بارہ غزلوں پر ہی کار طفلاں تمام خواہد شد! حفیظ جالندھری آخری وقت تک مشاعروں میں یہی گاتے رہے: ''ابھی تو میں جوان ہوں۔'' ادھر شاعرات کے جو مسائل ہیں ان کا تو ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ پاکستان میں ریڈیو اب مردہ ہے تو ٹیلی ویژن غیر تخلیقی۔ ان کے مشاعرے سرکاری شیڈولز کے مطابق اور موسمی ہوتے ہیں، یہ مشاعرے بالعموم مذہبی اور قومی دنوں سے مشروط ہوتے ہیں۔ مشاعرہ کی سیاست بہت خوفناک ہوتی ہے۔ کسے مدعو نہیں ہونے دینا اگر آ گیا ہے تو کسی مقام پر پڑھا کر اسے ذلیل کرنا ہے۔ اس ضمن میں شطرنج کی بازی کی مانند چالیں چلی جاتی ہیں یہ امر فراموش کر کے کہ ہوٹ کرانے کو تو شاعر

کی غزل ہی کافی ہوتی ہے مقام سے کیا فرق پڑتا ہے۔

میں اردو ادب کا معلم ہوں اور یہ میرا عقیدہ ہے کہ موجودہ دور میں طلبہ کو اردو سے دور کرنے میں بدمزہ نصاب کا اساسی کردار ہے بالخصوص وہ نصاب جو انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لئے مرتب ہوتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ٹیکسٹ بک بورڈ جیسا سفید ہاتھی ہے جہاں سفارش اور احباب پروری کا سلسلہ چلتا ہے اور اردو بازار کے تاجران کتب در پردہ راج کرتے ہیں۔ میں نے میٹرک میں حافظ محمود شیرانی کی مرتبہ "سرمایہ اردو" پڑھی تھی اور اس سے بہت کچھ حاصل کیا تھا جبکہ آج بی اے کی سطح کا طالب علم اس سطح کی کتاب کا اہل نہیں رہا۔ مطالعہ ادب بھی ایک نوع کا تخلیقی عمل ہے اس لئے یہ عوام کے لئے نہیں۔ میں اعلیٰ تخلیقات کی بات کر رہا ہوں، Pulp لٹریچر کی نہیں۔ زمانہ میں سائنس، ٹیکنالوجی، کمپیوٹر وغیرہ کا چلن کتنا ہی عام کیوں نہ ہو جائے ایک محدود اقلیت کے لئے شاعری کی قدر و قیمت ہمیشہ رہے گی۔ ہم آپ ستاروں پر نہیں جا سکتے لیکن ان پر بنی استعاروں، علامات اور تمثالوں میں ہمارے لئے حسن اور دلکشی ہے اس لئے کہ ہمارے اور ستاروں کے درمیان رابطہ کا یہی واحد ذریعہ ہیں۔ دوستو! الفاظ ہی چاند ستارے ہیں ان سے صرف نظر ممکن نہیں! ہاں اب بھر بند ہو تو اور بات ہے!

ڈاکٹر ستیہ پال آنند (امریکہ)

آپ کا اداریہ "سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری کی افادیت" حسب معمول ایک اہم سوال اٹھاتا ہے۔ مجھے صرف لفظ "افادیت" کچھ کاروباری سا لگا۔ "اہمیت" شاید زیادہ موزوں رہتا۔ بہر حال آپ نے نہایت پتے کی باتیں کی ہیں۔ مجھے کچھ جملے دہرانے کی اجازت دیجئے تاکہ یہ مکتوب لکھتے ہوئے میں خود، اور پڑھتے ہوئے اہل رائے قارئین میرے "ردعمل" کو آپ کے "عمل" کے تناظر میں دیکھ کر رد و قبول کے بارے میں اپنی رائے استوار کر سکیں۔ آپ نے لکھا ہے:

> "بدقسمتی سے ہمارے ہاں جو شاعری مشاعروں میں، الیکٹرانک میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ سے پیش کی جا رہی ہے وہ پیش پا افتادہ ہونے کے باعث افادے کی بجائے الٹا خود شاعری پر منفی اثرات مرتب کر رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف عوام الناس بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھوں اور خود شاعروں کا مذاق سخن سطحی Superficial ہوتا جا رہا ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ جینوئن تخلیق کاروں کو سامنے لایا جائے اور ذرائع ابلاغ کے توسط سے کلیشے سے بھرپور گھٹیا قسم کی شاعری کو فروغ دینے کے بجائے ایسی شاعری پیش کی جائے جو صحیح معنوں میں عصری آگہی سے مملو ہو"

آپ شاید جان بوجھ کر نبض پر انگلی رکھنے کے باوجود مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اس کے Symptoms بتانے میں اس قدر الجھ گئے کہ اس کا نام بتانا بھول گئے۔ لیجئے میں آپ کا کام آسان کر دیتا ہوں۔ مرض کا نام ہے "غزل"۔ اور اس کے زیر اثر پابند نظم، معرا نظم اور آزاد نظم میں بھی پیش پا افتادہ مضامین، استعارات، تلمیحات اور گھسے پٹے امیج کا استعمال۔ آخر کار کون سی شاعری مشاعروں میں پیش ہوتی ہے؟

غزلیہ شاعری، اور وہ بھی ترنم سے! اگر گاہ بگاہ شاعر تحت اللفظ پڑھنے کا ارادہ ظاہر کرے تو سامعین کے اصرار پر اسے ترنم سے پڑھنا پڑتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا (ٹیپ، سی ڈی وغیرہ) بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ اب صاحب ثروت غزل گو شعرا اور شاعرات کسی پروفیشنل سنگر سے اپنا کلام "سنگیت بدھ" کر کے اس کے ٹیپ اور C.D احباب کو پیش کرتے ہیں اور مشاعروں کے باہر سامعین کی خریداری کے لئے دوکان سجا دیتے ہیں۔ میں نے ۱۹۸۵ء میں آل انڈیا ریڈیو کے "کوتا پاٹھ" پروگرام کے تحت جالندھر اسٹیشن کے اعداد و شمار اکٹھا کئے تو معلوم ہوا کہ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۴ء تک جن اردو شعرا کا کلام براڈ کاسٹ کیا گیا وہ لگ بھگ سبھی غزل گو شعرا تھے۔ نظم گو شعرا سے بھی پروڈیوسر اکثر و بیشتر یہی کہتے رہے کہ وہ اپنی غزلیں پڑھیں۔ صرف اسی تناظر میں آپ کے اس جملے کو پڑھیں کہ "نتیجے کے طور پر نہ صرف عوام الناس بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھوں اور خود شاعروں کا مذاق سخن سطحی ہوتا جا رہا ہے۔" تو غزل کی "افادیت" یا "غیر افادیت" کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس سے پیشتر کہ آپ (اور کچھ قارئین) مجھے یہ الزام دیں کہ میں وقت بے وقت یہی راگنی چھیڑ دیتا ہوں اور چونکہ غزل کے بارے میں میرے افکار و خیالات سے آپ آگاہ ہیں، اس لئے شاید اس مکتوب کو بھی اسی سلسلے کی ایک کاوش سمجھ کر درگزر کر دیا جائے۔ لیکن اردو شاعری کے بارے میں مدعی اور نالش کنندہ تو آپ ہیں۔ اس سب و شتم کی گواہی یا صفائی میں مجھے کچھ کہنے کی اجازت دینا ضروری ہے۔

غزل ہماری شاعری کی جان ہے، روح ہے، آبرو ہے، ناموس ہے وغیرہ وغیرہ — یہ الفاظ تو ہم بہت سن چکے۔ کسی زمانے میں Ode اور Sonnet بھی انگریزی شاعری کی آبرو تھے۔ لیکن ان کے مضامین (غزل کی طرح ہی) مخصوص تھے۔ ہیئت بھی غزل کی طرح ہی (خصوصاً سانیٹ کی) طے شدہ تھی۔ انہیں [illegible] حیف، القاب نوازی، ممنونیت، اپیل، عرضداشت، دعا یا پھر آفاقی قدروں کے اظہار و اشتہار کے لئے است[illegible] کیا جاتا تھا۔ کیا ہوا کہ بیسویں صدی کے وسط تک یہ اصناف سخن ناپید ہو گئیں؟ کیا ان کے خلاف کوئی جہاد ہوا؟ کیا کوئی جوش ملیح آبادی، کوئی کلیم الدین احمد یا یہ ناچیز ستیہ پال آنند اٹھا، جس نے بانگ بلند کہا کہ یہ اصناف سخن "عصری آگہی سے مملو" نہیں ہیں۔ یہ موجودہ دور کی برق رفتار زندگی، اس کے گوناگوں تقاضوں اور بدلتی ہوئی قدروں کے اظہار کے لئے ناکافی ہیں۔ ان کی تنگ دامانی مسلمہ ہے۔ بھائی نصیر احمد ناصر صاحب ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ شعرا خود ہی ان اصناف سے متنفر اور بدظن ہو گئے۔ کنارہ کشی اختیار کر لی۔ آج درس گاہوں میں انہیں ایک Historical Curio کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ جیسے وسط بیسویں صدی میں ایک پوری پود پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی ہو کہ سانیٹ اور اوڈ کا زمانہ لد گیا۔ اب بلینک ورس کی بات کرنا چاہئے۔ آج انگریزی کے شعری مجموعے اور ادبی مجلّے اٹھا کر دیکھ لیں، کہیں بھی اوڈ اور سانیٹ کے فارم میں منظومات دکھائی نہیں دیتیں۔

غزل سخت جان ہے اور ہم لوگ طبعاً روایت پسند ہیں۔ یہ درست ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ غزل کے طریق کار کو مضمون آفرینی کے سائنٹیفک صوتی لسانی پیمانوں کے علاوہ Inter-textuality کے زاویوں سے دیکھا جائے۔ مائکل رفاتیر (Michael Riffaterre) نے اپنی تنقیدی نظریہ سازی میں شاعری

صاحب! ہوا یہ کہ سال باسال تک یہ استعارہ جات، جو عجمی غزل کی روایت سے مستعار لئے گئے تھے، اپنا سکہ جمائے رہے۔ اس دوران ان استعارہ جات کا Substitution کی سطح پر One-to-one-equation کے تناظر میں تصویری پہلو عنقا ہو گیا۔ یعنی محفل یا مشاعرے میں بری یا بحری سفر (دشت، قافلہ، قافلہ سالار، محمل، ناقہ، گرد پس کاروان، قزاق، رہ نما، گمراہ ..... یا کشتی، طوفان، ناخدا، ساحل، منجدھار، بازو، بادبان وغیرہ) پر مبنی syntagmatic استعارہ جات کو سن کر سامعین کے ذہن میں کوئی تصویر اجاگر نہیں ہوتی۔ یہ حالت یہاں تک دگرگوں ہو گئی کہ غزل گو شعراء (خصوصی طور پر نو آموز شعراء) ان مضامین کے Sub-syntagmatic پرزوں کے Spare Parts کو اپنے ذہن کے کارخانے میں شیلفوں پر رکھے ہوئے بآسانی اٹھا کر ایک شعر موزوں کر لیتے۔ آج تک اردو میں جو لاکھوں کروڑوں غزلیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ننانوے فیصد اشعار اسی قماش و قبیل کے ہیں اور اس میں دو آراء نہیں ہو سکتی۔

اب آئیں مضمون آفرینی کی طرف۔ چونکہ ہمارے ہاں جدید غزل گو شعراء نے یہ استعارے ترک کرنے کے بعد ایک نئی فہرست ترتیب دے لی ہے، یہ نکتہ بھی زیر بحث آنا ضروری ہو گیا ہے۔ مضمون آفرینی غزل کی بنیادی صفت ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ غزل کے کسی شعر کو بھی مضمون کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن خود شعر مضمون سے مختلف ہوتا ہے۔ یعنی ''معنی'' اور ''مضمون'' دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مغربی شاعری کے طریق کار میں یہ تفریق نہیں ملتی، اسے اگر انگریزی میں کہیں تو کچھ یوں کہا جائے گا

مضمون = what the poem is about

معنی = what the poem means

غزل کا ایک خاص مضمون جو آج بھی جدید شعراء بکثرت استعمال کرتے ہیں، وہ ہے تنہائی، alienation، بھیڑ میں رہ کر بھی تنہا ہونا یا وحشت۔ میں تین اشعار پیش کروں گا جن میں سے ایک ہمارے ہم عصر شاعر کا ہے۔

غالب ؎ وحشت آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

میر ؎ کوئی جہت یاں ایسی نہیں جو خالی ہووے اس سے میر یہ طرفہ ہے شور جرس سے چار طرف ہم تنہا ہوں

سلیم احمد ؎ وہی شب و روز ہیں زندگی کے ہنسی بھی اشکوں کے سلسلے بھی مگر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے اندر سے مر گیا ہوں

میری مصیبت یہ ہے کہ میں مضمون اور معنی کے فرق کو سمجھتا ہوں اور غالب اور میر کے اشعار سلیم احمد کے شعر سے بہتر ہونے کے باوجود کلیشے کے استعمال کی وجہ سے appreciate کرنے کا خود کو اہل نہیں پاتا۔ سلیم احمد بھی اس سے آزاد نہیں ہیں۔ ''شب و روز زندگی کے''۔ ''اشکوں کے سلسلے'' وغیرہ کلیشے ہیں، لیکن ''اندر سے مرنا'' اس شعر کو alienation کی ایک نئی استعاراتی جہت بخشتا ہے۔ میں نے تسطیر کا زیر نظر شمارہ کھولا۔ حصہ غزل کے محض چند صفحات پر آپ پیش پا افتادہ استعارات اور کلیشے ملاحظہ فرمائیے۔ ظلمت کدہ، نور، راہ سفر، خارزار، منزل، چمن زار، موج آب، ساحل، منجدھار، آئینہ، رنگ، خد و خال، مقفل طاق۔ ابر، صحرا، باب، محراب، دشت خوں، تیز ہوا، بام و در، قتل کا الزام، جنون شوق، احساس محبت، گلی، صدا، طاق، کھڑکی وغیرہ۔ میں متعلقہ شعراء احباب سے بے حد معذرت کے ساتھ یہ مثال دے رہا ہوں۔ صورت حال یہ ہے کہ مضمون کو بیان

کرنے کے لئے غزل وہ تمام ہتھیار بروئے کار لاتی ہے، جو آپ کے قول کے مطابق ''پیش پا افتادہ'' ہیں۔ جن میں ''صحیح معنوں میں عصری آ گہی'' نہیں ہے۔ جن میں ''زندگی کے فکری، روحانی اور جمالیاتی پہلو'' نہیں ہیں۔ جو ''ارفع تخلیقی سوچ اور باطنی آسودگی'' سے مملو نہیں ہیں۔ آپ کے ہی الفاظ میں ان میں ''روح عصر'' نہیں ہے۔ یہ اپنے ''عہد سے ہم آہنگ'' نہیں ہیں۔

میں نے اس مکتوب میں جہاں صنف غزل کی حالیہ تاریخ میں کلاسیکی، نیم کلاسیکی اسلوب و معانی کا ذکر کیا ہے، وہاں جدید غزل کے علمبرداروں کی مہمل نگاری کا ذکر بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اس سے آپ کے اداریے کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ مجھے گذشتہ بیس پچیس برسوں کی غزلیہ شاعری میں اس trend سے انحراف کا صرف ایک نمونہ نظر آیا۔ اردو شاعرات (خصوصی طور پر پاکستان میں) اس جدید یا وہ گوئی سے کچھ چھٹکارہ پا چکی ہیں۔ شاعرات کے قلم کی کاشت ہونے کی وجہ سے یہ ایک ایسی تانیثی حیثیت کی بیج کاری کا پتہ دیتی ہیں جس میں گھر گرہست، کنبہ، بچے، عورت کی ثانوی حیثیت وغیرہ کے Images کے گل بوٹے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ تانیثی trend جہاں ایک طرف نقلی کلاسیکی اور جدید مہمل گوئی (بکرا میں میں کرتا ہے / بکری منمناتی ہے) سے انحراف کا پتہ دیتا ہے۔ وہاں غزل کی مختصر ترین دو سطری نظموں کی لڑی میں نئی نئی اشکال، تصاویر، آوازوں، آؤ بھاؤ کی سرگوشیاں اور شکایتیں ملتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شاعرات کے فن کو مردانہ، صرف تانیثی حوالوں سے دیکھنا اور پرکھنا اہم سمجھتے ہیں اور یہ ان کی خود ساختہ فوقیت کا کمپلیکس ہے۔ یعنی مردان کے فن کو خود سے مختلف، بلکہ کمتر درجے کا سمجھ کر، انہیں ایک لیبل دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ چلو گلو خلاصی ہوئی۔ وہ اپنی جگہ خوش، ہم اپنی جگہ مطمئن۔

مشکور حسین یاد (لاہور)

جہاں تک آپ کے اداریہ کے عنوان کا تعلق ہے اس سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔ ''سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری کی افادیت'' صدفی صد ہوتی بھی ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ شاعری کو اپنے عہد سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے یعنی اس میں روح عصر کی موجودگی کا احساس بھی ہونا لازم ہے۔ لیکن اگر ہم آہنگ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو آج کے عہد میں افراتفری مچی ہے جو اعلیٰ قدروں کو خاک میں ملایا جا رہا ہے جس طرح انسان خود ذلیل ہو رہا ہے اور اسے ذلیل کیا جا رہا ہے اُسی طرح شاعری میں بھی افراتفری ہو، اعلیٰ اقدار کا جنازہ ہی نہیں جنازے نکالے جائیں اور انسان بالکل ہی ذلیل کر کے دکھایا جائے کیا روح عصر کا یہ تقاضا ہے۔ کیونکہ آج کے عصر کی روح تو یہی ہے اور اگر ایسی بات نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روح عصر ہمیشہ عصر سے باہر نکل کر اپنا سر پیٹ رہی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں جینوئن شاعری بذات خود روح عصر ہوتی ہے کہ عصر کو اس سے زندگی حاصل ہوتی ہے اعلیٰ شاعری ہمیشہ اپنے عہد سے آگے ہو کر اور بلند ہو کر سوچتی بھی ہے اور اپنے ہونے کا احساس بھی دلاتی ہے۔ گویا شعر و ادب نہ ہوں تو کوئی عصر کوئی عہد کوئی معنی نہیں رکھتا۔

رہی لچر پوچ شعر و ادب کی بات اور ہمارے میڈیا کا ذکر تو اس کو خراب کرنے والے بھی ہمارے جینوئن ادیب و شاعر ہی ہوتے ہیں۔ لچر پوچ شاعری کو بھی یہی لوگ آگے آنے کا موقع دیتے ہیں اور میڈیا والوں کے سامنے بھی یہی لوگ اپنی گردنیں جھکائے رکھتے ہیں۔ گردنیں ان معنی میں جھکائے رکھتے ہیں کہ میڈیا والے ان کے سامنے تو آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں گویا ان کی انا کو تو وہ یا ان کی دُم کو تو وہ سنبھال لیتے ہیں پھر اس کے بعد ان جینوئن اہل قلم میں اتنی جرات نہیں ہوتی کہ وہ میڈیا والوں کو یہ کہہ سکیں کہ ارے بھائی تم نے کن لوگوں کو مدعو کیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ میڈیا کے پروڈیوسر وغیرہ اس طرح مکھی پر مکھی مارتے ہیں کہ جو نام ان کی فہرست میں ایک بار آ جاتے ہیں پھر یہ انہیں لوگوں کو بار بار بلاتے رہتے ہیں۔ ان میڈیا والوں کو جو لوگ مشورہ دیتے ہیں خود ان کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہوتی یعنی وہ خاص لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن چونکہ روزناموں کے ادبی صفحات ان کے پاس ہوتے ہیں اس لئے ہمارے بزرگ جینوئن شعرا ان کو ڈانٹ نہیں سکتے۔ کیونکہ ان کو خوف ہوتا ہے کہ پھر روزناموں کے ادبی صفحات میں ان کا ذکر نہیں آئے گا۔

پروفیسر آفاق صدیقی (کراچی)

''تسطیر'' کے اداریے آج کے دور میں وہی کچھ تحرک پیدا کر رہے ہیں جو کسی زمانے میں نیاز فتحپوری کے ماہنامہ ''نگار'' کی ادارتی تحریروں نے پیدا کیا تھا۔ وہ زمانہ تو ہماری تنقید کے لڑکپن کا تھا اور لڑکوں بالوں کو قدرے آسانی سے قابو کیا جا سکتا ہے ہاں اس دور کے روایتی بقراطوں نے بڑے ہنگامے کھڑے کئے تھے۔ ''ناسمجھی جہالت کا الٹا پیرا ہن ہوتی ہے'' یہ بات کہیں عزیز حامد مدنی نے کہی تھی اُن بقراطوں کا بھی ذہنی مسئلہ یہی کچھ تھا۔ اب آپ جو اکیسویں صدی کے اوائل میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے شاعری کا گٹھ جوڑ کر رہے ہیں اور معقول تجاویز بھی پیش کر دی ہیں تو بھائی میرے! مجھے تو شدت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شعر و ادب بلکہ شاعری اور اعلیٰ شاعری سے آپ کی وابستگی بڑی سچی، پرخلوص اور دُور رس ہے۔ مگر ہم جس معاشرے کے لوگ ہیں وہ معاشرہ ایک ایسی گاڑی کی طرح ہے جس میں دونوں طرف گھوڑے جُتے ہوتے ہیں چہ کلیم؟ اچھی اور سچی شاعری واقعی اتنی قدرت رکھتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو Lead دے سکے۔ جہاں تک اردو تنقید اور تاریخ کے جبر کا مسئلہ ہے، اس بارے میں بے چاری تاریخ کو مورد الزام ٹھہرانا علامتی لحاظ سے تو قرین قیاس ہو سکتا ہے حقیقتاً نہیں کیونکہ تاریخ تو بقول کے افسانہ ہی ہوتی ہے ''جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ''۔ ہماری موجودہ تنقید میں تو اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ والی کیفیت ہے۔ مغربی افکار و نظریات کی ٹوپیاں ہم اپنے سروں کی ماہیت کو سمجھے بغیر بڑی شان سے سجائے بغلیں بجاتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ادب پڑھنے والوں کی تعداد ہماری مجموعی آبادی کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی فکر انگیز باتیں جی کو لگتی ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور دوسرے تمام لکھنے والے بھی لائق تحسین ہیں کہ سنجیدہ موضوعات پر شائستہ معروضات سے ادبی مسائل کو اجاگر کر رہے ہیں۔ اختلاف رائے تو فال نیک ہے۔

جمال اویسی (دربھنگہ، بھارت)

تازہ تسطیر کا اداریہ "سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری کی افادیت" میں نے بغور پڑھا اور قائل ہو گیا کہ آپ کا اداریہ ہر بار تخلیقی حوالوں سے ہوتا ہے۔ لیکن تخلیقی حوالوں سے لکھے گئے اداریوں میں آپ کی زبان بہت حد تک معروضی اور منطقی ہوتی ہے (جیسے اس بار بھی ہے)۔ "صنعتی ترقی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے پھیلتے ہوئے جال میں مرکزی حیثیت بہر حال انسان ہی کی ہے"۔ یہ ایک ایسی صداقت آپ نے بیان کر دی ہے جس سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ٹیکنالوجی کے جدید دور میں بھی شاعری انسان کے لئے سب سے بڑا وسیلۂ اظہار ہے اور اس کے ساتھ ہی شاعری انسان کی سب سے بڑی مونس اور ہمدرد بھی ہے۔ آپ کی یہ شرط بھی قابل قبول ہے کہ "شاعری صرف اس صورت میں اپنی افادیت برقرار رکھ سکتی ہے جب یہ اپنے عہد سے ہم آہنگ ہو، اس میں روح عصر ہو"۔ جدید ٹیکنالوجی اور جدید طرز کے معاشرے کے سیاق و سباق میں میری کچھ نظمیں ہیں جو آپ کو میں آئندہ بھیجوں گا۔ آپ محسوس کریں گے کہ شاعری اپنے اظہار کا راستہ سوپر کمپیوٹر کی موجودگی میں کس طرح تلاش کر لیتی ہے۔ جدید معاشرہ جو پیسے کی ریل پیل کا معاشرہ ہے کس قدر بھونڈے معاشرے کی مثال ہے۔ اس کو بھی مہذب بنانے کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ شاعری بڑی سودمند شے ہے۔ اس اعتبار سے میں مولانا حالؔی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعض ان حصوں پر مکمل یقین رکھتا ہوں جہاں شاعری کی قوت اور اثر آفرینی سے بحث کی گئی ہے اور بلاشبہ حالؔی نے شاعری کو ایک کارآمد آلہ تسلیم کیا تھا۔ شاعری سے متعلق آپ کی چھٹپٹاہٹ مرحوم ن۔م۔ راشدؔ کی یاد دلاتی ہے۔ راشد صاحب بھی شاعری کی افادیت اور اس کی کلیت کے قائل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صرف شاعری پر مبنی ایک رسالہ نکالا جائے۔ انھوں نے شعر و شاعری کے چاروں طرف پھیلی ہوئی آلودگی کے خلاف بھی لکھا اور لوگوں کو ترغیب دی۔ آپ نے بھی راشدؔ صاحب کی طرح شاعری کو پاک اور منزہ کرنے کی مہم چلا رکھی ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اداریہ کی آخری تین چار سطور پڑھ کر ممکن ہے اساتذۂ فکر و فن ہنس پڑیں لیکن مجھے آپ کے خلوص پر پورا یقین ہے۔

احسان الٰہی احسن (اٹک)

بلاشبہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری کی اہمیت اور بھی زیادہ اس لئے ہو جاتی ہے کہ نجانے کتنے تھکن سے چُور، معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں سے نبرد آزما ذہن کچھ دیر کے لئے سہی سکون تو حاصل کرتے ہیں۔ یہی انسان کی باطنی آسودگی ہوتی ہے۔ شاعری کی افادیت ہر دور میں برقرار رہی ہے اور اس میں ہمیشہ عصری ہم آہنگی نمایاں رہی ہے۔ آج کا شاعر لب و رخسار، ہجر و وصال اور کاکل پیچاں جیسے دقیانوسی رجحانات سے منحرف نظر آتا ہے اور اس کی جگہ جدید رجحان نے لے لی ہے۔ مشاعروں، الیکٹرانک میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ پر ہمیشہ بڑے نام اور ادبی قد آور شخصیات کا قبضہ رہا ہے یوں غیر معیاری شاعری اگر عوام الناس اور باذوق سامعین و ناظرین تک پہنچتی ہے تو اس میں میڈیا یا ذرائع ابلاغ بے بس نظر آتے ہیں۔ اس طرح پڑھے لکھے لوگوں اور شاعروں کے مذاق و معیار کا سطحی ہونے میں کسی ٹیکنالوجی یا میڈیا کا ہاتھ نہیں

بلکہ تیسرے درجے کی شاعری کو Promote کرنے کا شاخسانہ ہے اور اس میں ہمارے ملکی ادبی وغیر ادبی جرائد کا بہت بڑا contribution ہے۔ اس بلا کو دبوچنے کے لئے مدیر تسطیر کی یہ رائے کہ جینوئن تخلیق کاروں کو سامنے لایا جائے اگر تسلیم بھی کر لی جائے تو بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔ مراد یہ کہ کسی بھی تخلیق کار کی پیشانی پر جینوئن یا غیر جینوئن ہونے کا Sticker نہیں لگا ہوا۔ اب یہاں ایک فکری سوال یہ ابھرتا ہے کہ غیر جینوئن لکھاری کب، کہاں اور کیسے یا کون تخلیق کرتا ہے تو اس کا جواب جو فوراً ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ کہ ادبی رسائل کے ادارتی کارکنان میں غیر ادبی شخصیات کی شمولیت ہے جو خالص ادب کی بجائے مادی آسودگی کو ترجیح دیتے ہیں یوں غیر جینوئن تخلیق کار سالانہ خریداری کے چور دروازے سے داخل ہوتا ہے اور جینوئن لکھاری پس پردہ رہ جاتا ہے۔

ہماری درسگاہوں میں جب تک غالب، میر اور مومن پڑھائے جائیں گے عصری ہم آہنگی سے مملو شاعری تخلیق نہیں ہو سکتی کہ اس میں ایک Generation Gap بہر حال موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیمی نصاب میں عصر حاضر کے نمائندہ شعراء کا کلام شامل کیا جائے۔ فنی، سائنسی اور ٹیکنالوجی سے وابستہ ماہرین جو ایک عرصہ سے ٹیکنالوجی کی تدریس میں مشغول ہیں، کے لئے شاعری کے ریفریشر کورسز کروانے کا مطلب یہ ہوا کہ ان کو شاعری کا طفل مکتب بنا دیا جائے۔ ریفریشر کورس ہمیشہ اس Subject کا ہوتا ہے جس میں کوئی مدرس نصابی عصری ہم آہنگی کے اسباق سیکھتا ہے اور اپنے طلبہ تک منتقل کرتا ہے یوں ٹیکنالوجی کے ماہرین کے لئے شاعری کی بجائے فنی Refresher cadre زیادہ موزوں ہیں۔

غفور شاہ قاسم (میانوالی)

تسطیر کے اداریہ ''سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری کی افادیت'' سے تحریک اور ترغیب پاتے ہوئے یہ سطور قلم بند کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ تسطیر کا یہ اداریہ بھی حسب سابق بہت بحث انگیز اور فکر افروز ہے۔ آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ شاعری کی افادیت اور ضرورت سائنسی تناظر میں پہلے کی نسبت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور نصابات میں بھی اس کی شمولیت حد درجہ ناگزیر ہو چکی ہے۔ شاعری کی ماہیت، افادیت اور اہمیت کا موضوع ادراک واحساس سے لے کر اظہار و ابلاغ تک پھیلا ہوا ہے۔ افلاطون سے لے کر اب تک شاعری کی افادیت اور عدم افادیت پر بہت سی بحثیں ہو چکی ہیں۔ افلاطون کے بعد ٹامس لوپی کاک، پیورٹن عقائد رکھنے والے عیسائی اور ٹی ایس ایلیٹ تک کسی نہ کسی طور شاعری کی اہمیت کو فروتر بنا کر پیش کرتے رہے اور حالیہ برسوں میں تو مغرب میں Let Wordsworth Die اور End of Peotry جیسی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں شاعری کے جواز کو چیلنج کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ارسطو، لون جائی نس، سر فلپ سڈنی، ورڈز ورتھ، شیلے، میتھیو آرنلڈ اور آئی اے رچرڈز جیسے نابغہ ہائے ادب نے شاعری کی اہمیت اور ناگزیریت پر بہت عمدہ، موثر اور convincing دلائل پیش کئے ہیں۔ ہمارے یہاں علامہ شبلی نعمانی نے ''شعر العجم'' جلد چہارم میں شاعری کا مقدمہ نہایت عمدگی اور مہارت سے پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں

مغرب اور مشرق میں ہمیں ایک بنیادی فرق اور امتیاز دکھائی دیتا ہے۔ مغرب نے اپنے مخصوص تصور حیات و کائنات کی وجہ سے شاعری کے کچھ نمایاں پہلوؤں کو معرض تنقید بنایا ہے اس کے برعکس مشرق میں بالعموم شاعری کو مذہب کے بعد دوسرا درجہ حاصل رہا ہے۔ گذشتہ صدی کے اختتام کے زمانے میں البتہ مغرب کے زیر اثر مشرق میں بھی کچھ آوازیں شعر و ادب کے خلاف اٹھنا شروع ہوئی ہیں۔ یہ آوازیں اتنی توانا تو نہیں کہ جن کے بارے میں بہت زیادہ فکر مندی اور تشویش کا اظہار کیا جائے لیکن انہیں مکمل طور پر نظر انداز بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اس مسئلے کے جملہ پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں تاریخ ادبیات کے اوراق کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

مغرب میں بالعموم شاعری کو عقل و دانش کا دشمن اور حریف بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اسکی بنیادی وجہ مغربی ذہن کا مادہ پرستانہ طرز فکر ہے۔ وہاں جذبے اور روح کو کبھی وہ اہمیت نہیں ملی جو ہمارے یہاں اسے مشرق میں حاصل رہی ہے۔ شاعری کی حقیقت اور ماہیت اور قدر و قیمت کا موضوع سب سے پہلے افلاطون اور ارسطو کے درمیاں موضوع بحث بنا۔ افلاطون نے اپنی آئیڈیل مملکت Republic میں شعراء اور ان کے منصب پر سخت ترین اعتراضات اٹھائے اور انہیں اپنی مثالی مملکت سے جلا وطن کر دینے کا عندیہ ظاہر کیا۔ ارسطو نے اپنی Poetics (بوطیقا) میں شاعری کی قدر و قیمت واضح کرتے ہوئے بالواسطہ انداز میں افلاطون کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا جواب دینے کی سعی بلیغ کی۔ افلاطون کے نزدیک شاعری انسانی روح کے اسفل اور ارذل حصے کی پیداوار ہے یہ سفلی جذبات بھڑکاتی ہے اس لئے افادی نقطہ نظر سے اسے نظم و ضبط کا پابند بنانے کی ضرورت ہے۔ افلاطون نے اس عالم آب و گل کو عالم مثال کی نقل قرار دیا ہے۔ اور شاعری کو اس نقل کی بھی نقل قرار دیتے ہوئے اصل سے بعید تر قرار دیا ہے جب کہ ارسطو افلاطون کے نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کرتا۔ وہ نقل در نقل کا نظریہ مسترد کرتے ہوئے شاعری کو براہ راست اصل تک رسائی کا حامل سمجھتا ہے۔ ارسطو کے خیال میں شاعری تخیل کے ذریعے فطرت کے نئے امکانات کا کھوج لگاتی ہے اور انسانی شخصیت کو بدلنے میں بالواسطہ طور پر اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ارسطو نے شاعر کے بارے میں کہا ہے کہ وہ (۱) چیزوں کو اس طرح پیش کرتا ہے جیسی وہ تھیں یا ہیں۔ یا (۲) جیسی وہ سمجھی جاتی ہیں۔ یا (۳) جیسی انہیں ہونا چاہئے۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ دنیا جیسی ہے شاعر اس کی عکاسی کرتا ہے اور اسے جیسا ہونا چاہئے اس کا تصور پیش کرتا ہے۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعر ''جو ہے'' اس کی ترجمانی کرتے ہوئے ''جو نہیں ہے'' اور ''جسے ہونا چاہیے'' اس کی آرزو اور تمنا کرتا ہے۔ Ideal اور Actual کے مابین مساوات اور توازن کا حصول شاعری کی ایک اہم تخلیقی سرگرمی ہے۔ جب ہم بوطیقا (Poetics) کے ان مباحث پر زیادہ گہرائی میں جا کر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو نے یہ بات ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ شاعر محض کسی امر واقعہ کے بیان یا کسی خارجی شے کی ترجمانی اور عکاسی تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اسے اپنے نظام احساس میں ترتیب دے کر اس طرح نوک قلم پر لاتا ہے کہ ان واقعات اور اشیاء کی ہمہ گیر حقیقت نگاہوں کے سامنے جلوہ ریز ہونے لگتی ہے گویا شاعر مشاہدات اور ممکنات کے پیش نظر تخلیق شعر کرتا ہے۔ کسی اتفاقی امر یا فوریت کے ماتحت نہیں۔ اس لیے وہ مورخ سے زیادہ Scientific اور مقدس ہوتا ہے۔ مورخ تو ایک

مخصوص واقعہ کی حدود میں مقید ہوتا ہے وہ اس سے باہر نکل کر نفسیات انسانی اور فطری امکانات کی روشنی میں اپنے ذہنی افکار کو ترتیب نہیں دے سکتا لیکن یہ کام شاعر انجام دے لیتا ہے۔ مغرب میں افلاطون اور ارسطو کے انہی نظریات اور خیالات کو بنیاد بنا کر عمل یا ردعمل کے طور پر نئے نئے نظریات کا آغاز ہوا اور انکی توضیحات و تشریحات بھی پیش کی گئیں۔ ان دو ممتاز اور نمایاں یونانی فلسفیوں کے بعد لون جائی نس نے اپنی تصنیف On Sublime میں قارئین پر شعروادب کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے نظریہ ترفع پیش کیا اور شاعری کو مسرت اندوزی کا اہم سرچشمہ قرار دیا۔ رومن شاعر ہوریس کا ایک رسالہ جو کہ فن شاعری کی اہمیت کا احاطہ کرتا ہے اس لئے زیادہ قابل ذکر نہیں کہ یہ ارسطو کے ہی خیالات کی صدائے بازگشت ہے۔ ہوریس کے نزدیک شاعری کا مطلوب، مقصود لطف وراحت پہنچانا اور اصلاح کرنا ہے۔ اسے مختصراً ہم تطہیر نفس بھی کہہ سکتے ہیں جو ارسطو کے کتھارسس کے نظریہ کی ہی توسیع اور Extension ہے۔

شاعری پر ہونے والی ناقدانہ بحثوں میں سرفلپ سڈنی کے خیالات اور افکار کو بھی نہایت وقعت کا حامل گردانا جاتا ہے۔ اس کے خیالات اس کے انتقال کے بعد ایک رسالے The Defence of Poesie کی صورت منصۂ شہود پر آئے۔ سرفلپ سڈنی کا زمانہ انگلستان میں Puritan عروج و اقتدار کا زمانہ تھا۔ یہ بہت تنگ نظر لوگ تھے اور افلاطون کے خیالات کی تقلید کرتے ہوئے شاعری کو بعید از صداقت اور اخلاق سوز چیز سمجھتے تھے۔ سڈنی نے جو خود Puritan تھا شاعری کو Puritans کے اس ناروا حملے سے بچانے کی کامیاب کوشش کی۔ وہ کہتا ہے کہ عالم آب و گل مس ہے اور شعراء اس کو کندن بنا کر پیش کرتے ہیں سڈنی نے Puritan تحریک کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ گو شعری تخیل ہمیں حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچاتا البتہ وہ حقیقت کا بہترین نعم البدل ضرور پیش کرتا ہے یعنی The imagination does not give us insight into reality but an alternative to reality وہ شاعری کو معلم اخلاق کی حیثیت سے فلسفے اور تاریخ سے بھی زیادہ بڑا مقام دیتا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ سرفلپ سڈنی کے ان خیالات کے سامنے آنے کے بعد یورپ اور انگلستان میں نقد ونظر کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا جو مذہب اور سائنس کے مباحث کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ ورڈز ورتھ کے مشہور مقدمہ شعروشاعری Preface to the Lyrical Ballads کو ان مباحث میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ارسطو نے شاعری کو دیگر علوم کی نسبت زیادہ فکر انگیز، دانش آموز اور فلسفیانہ قرار دیا تھا۔ ورڈز ورتھ اس نظریے پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شاعری کا مقصد و منتہا، غایت و مدعا ہمہ گیر سطح پر حق و صداقت کی تلاش، جستجو اور دریافت ہے۔ شاعر اور سائنسدان دونوں کی غایت اولیٰ Ultimate end جذبہ مسرت کی تسکین ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں ایک تو فطرت کی لامحدود وسعتوں کا احاطہ کر لیتا ہے جبکہ دوسرا انفرادی اور محدود پیمانے پر تاہم اس کے نزدیک شاعری جملہ علوم وفنون کی روح لطیف ہے وہ کہتا ہے۔

The Poet binds together by passion and knowlege the vast

empire of human society as it is spread over the whole earth and over all time

شاعری، علم کا محرک جذبہ اور اس کا اول و آخر ہے۔ قلب انسانی کی طرح یہ فنا نا آشنا ہے۔ ورڈز ورتھ نے اپنے اس مشہور مقدمہ میں سائنس اور شاعری کو ایک دوسرے کا ممد اور معاون قرار دیا ہے اور انہیں باہم متصادم اور متحارب قوتیں ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ ان میں ایک کی حدود عقل و دانش ہے یعنی سائنس اور دوسرے کی Jurisdiction ذوق و وجدان یعنی شاعری۔ اسکے بقول شاعر ذوق و وجدان اور عقل و دانش کا امتزاج ہوتا ہے وہ اسی امتزاج سے عالمگیر انسانی معاشرے کی ترقی اور تعمیر کے خواب دیکھتا ہے اس لئے شاعری میں زیادہ وسعت اور گہرائی ہے۔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے سائنسدان البرٹ آئن سٹائن نے اپنے اس مشہور قول میں اسی حقیقت کا برملا اعتراف کیا ہے وہ کہتا ہے۔

I am enough of an artist to draw freely my imagination. Imagination is more important than knowledge. Knowledge is limited Imagination encircles the world

ورڈز ورتھ کے بعد ارسطو کے مکتبہ فکر کی مدافعت اور شاعری کی حمایت میں شیلے نے بھی بڑے شدومد سے حصہ لیا۔ اس نے افلاطونی آہنگ اور اسلوب اختیار کرتے ہوئے افلاطون کے اٹھائے گئے اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے وہ شاعری کو ایک ملکوتی اور الہامی یعنی Divine Gifted چیز قرار دیتا ہے۔ وہ شاعری کو کل علوم کا مرکز و محور سمجھتا ہے اس کے نزدیک شاعری کل نظام تخیل کی جز اور سرچشمہ ہے سب کچھ اسی سے پھوٹتا ہے۔ وہ شاعر کو انسانی معاشرے کا غیر تسلیم شدہ قانون ساز قرار دیتا ہے اسکا کہنا ہے کہ

Poets are the unacknowldged legislators of the world.

اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے اوائل میں مذہب کے ساتھ ساتھ شاعری اور دوسرے تمام فنون لطیفہ جن کا تعلق جذب تخیل، ذوق اور وجدان سے ہے شکوک وشبہات کی نظروں سے دیکھے جانے لگے تھے اور مناظرانہ بحث کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا اسی دور میں ٹامس لوپی کاک نے شاعری کو نہایت شدت سے ہدف تنقید بنانا شروع کر دیا تھا۔ اسکا خیال تھا کہ شاعری کا زمانہ گزر چکا ہے یہ معاشرے کے بچپن کا زمانہ تھا۔ ذہنی بلوغت کے دور جدید میں شعر و شاعری کی تخلیق محض بازیچہء اطفال ہے یہ ٹھوس اور مثبت کام نہیں۔ وہ بھی افلاطون کی طرح شاعری کو حقیقت سے بعید اور کار بے کاراں سمجھتا ہے جس میں اسکے بقول انسانی قوت کا ضیاع مضمر ہے۔ یہ شاعری اور سائنس کے نزاع کا زمانہ ہے۔ اس نزاع میں وکٹورین عہد کے مشہور نقاد میتھیو آرنلڈ نے فعال حصہ لیا۔ اس نے شاعری میں ان باطنی اور روحانی قدروں کا کھوج لگانے کی کوشش کی جو سائنس کی دنیا میں بھی قدم جما سکے وہ بجا طور پر یہ کہتا ہے شاعری کے بغیر سائنسی علم کا حصول محض خالی خولی علم کا چربہ ہے۔ سائنس پر ضرورت سے زیادہ انحصار درست نہیں کیونکہ بالآخر انسان کو زندگی میں سکون و راحت کی تلاش کے لئے شاعری کی طرف رجوع کرنا ضروری ہو جائے گا بلکہ وہ تو یہ تک بھی کہہ دیتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب مذہب اور فلسفے کی جگہ شاعری لے لے گی اور سائنس کو ہر قدم پر شاعری کے تعاون کی

ضرورت پڑے گی۔ آرنلڈ نے اپنا موقف انتہائی منطقی اور استدلالی انداز میں پیش کیا۔ اس ضمن میں اسے ورڈز ورتھ پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ عصر حاضر میں آئی۔ اے رچرڈز نے شاعری اور سائنس کے تنازع میں سائنسی اعتراضات کا جواب بھی سائنسی طریقہ کار سے دینے کی کوشش کی ہے۔ شاعری کی حقیقت اور ماہیت کے بارے رچرڈز کے خیالات اُس کی کتاب Science and Poetry میں نہایت وضاحت اور مدلل انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سائنسدان کے خیالات حقیقی اور راست ہوتے ہیں جبکہ شاعر کے بیانات ذہنی اور قیاسی۔ لیکن اگر انتہائیdepth میں جا کر تجزیہ کیا جائی تو یہی بیانات حقیقی اور واقعی کہلائے جانے کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ رچرڈز بھی ورڈز ورتھ، شیلے اور آرنلڈ کی طرح شاعری میں انسانی تہذیب و معاشرت کے تحفظ اور بقا کے امکانات کی جھلک دیکھتا ہے اور اسے انسانیت کے مستقبل کی تاریک راہوں میںLight Tower قرار دیتا ہے۔

اگر ان تمام مباحث کوPrecise اور Summarise کرنے کی کوشش کی جائے تو ہمارے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ سائنس کا اندازِ نظر عقلی اور استدالی جبکہ شعر و ادب کا زاویہ نگاہ ذوقی اور وجدانی ہے۔ ان کے مابین نقطہ مصالحت اور مفاہمت تلاش کیا جانا چاہیئے۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ممکن ہے آئندہ تحت الشعور کی پہنائیوں اور ذوق و وجدان کی گہرائیوں کو ناپنے، انسانی اعمال و افعال کی علت و معلول کا کھوج لگانے کا کوئی ایسا پیمانہ یا فارمولہ دستیاب ہو جائے جس سے شاعری کی جامع اور مانع تعریف بھی کی جا سکے اور انسان عقلی علوم اور وجدانی علوم کو دو الگ الگ اور متحارب چیزیں سمجھنا چھوڑ دے ہم سمجھتے ہیں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب آج کی سائنسی دنیا اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ سائنس محض مادی تقاضوں کی کفیل ہو سکتی ہے احساساتی جذباتی اور وجدانی تقاضوں کی تشفی اسکی دسترس میں نہیں یہ شعر و ادب کا علاقہ ہے۔

مشرق میں شاعری کی اہمیت اور افادیت پر مختصراً اظہار خیال کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ایک مزید مغربی نقادوں کی آراء کا استقصا کر لیا جائے۔

When man acts, he is a puppet when he describes he is a poet (Oscar Wilde)

A good poem is a contribution to reality. The world is never the same once a poem has been added to it. A good poem helps to change the shape of the universe, helps to extend every ones knowledge of himself and the world around him

(Dylan Thomas)

A short History of English Literature کے مصنف Ifor Evans نے موضوع زیر بحث پر بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے ان کی اسی کتاب سے ایک اقتباس دیکھئے:

Each art has its own medium: the painter his pigments, the musician his sounds, and the writer, words. The difficulity of the writer is that words are used for all every day purpose , so that

they become worn like coins rubbed by long use, The poet more than any other writer, tries to look at words afresh. In a poem, he so arranges words that they give pleasure such as we may have from music or from pictures. Much of that pleasure comes form the words themselves, but part of it comes from their rhythmical arrangement. The words are so arranged that their sound please, while the alteration of accent and time give to a pattern of words some of that pleasure which music gives. The poet, compared with the musician, is faced with the added difficulity that words, in their mormal use, convey a meaning. The musician is not controlled by a meaning, and some poets have tried to rid themselves of this embarasment. They wish to create patterns and rhythms disembodied from meaning. At the same time most of the great poets have regarded meaning as of primary importance. They have used poetry to express their knowledge of love, death and their aspirations. They have also used poetry to tell stories, the comedy, the pathos and the tragedy of life.

مغرب کی علمی دنیا میں ہونے والے مباحث کے تجزیے کے بعد جب ہم مشرق کے ایوان ادب میں داخل ہوتے ہیں تو ہم یہاں کی فضا اور ماحول کو مغرب سے بڑی حد تک مختلف پاتے ہیں۔ اسکی وجہ تصور حیات و کائنات کا فرق ہے۔ مشرق کا تصور حیات کل میں جز اور جز میں کل کا احاطہ کرتا ہے یہاں بالعموم زندگی کو اسکی کلیت میں دیکھا گیا ہے اسے کئی خانوں میں تقسیم کر کے نہیں دیکھا گیا۔ مشرق میں مادی، روحانی، عقلی، وجدانی، داخلی، خارجی، جمالیاتی اور اخلاقی اقدار کو ایک حسن امتزاج کی صورت دے دی گئی ہے اس طرح زندگی کی رنگا رنگی میں یک رنگی پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ اسی تصور حیات کی اساس پر شاعری کے بارے نقطہ نظر تشکیل پذیر ہوا ہے۔ مشرق میں شاعری اور علم کے سوتے ایک ہیں البتہ شاعری میں جذبہ اور تخیل مقدم ہیں یہاں شاعری کے بارے ذوقی اور وجدانی نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ جبکہ مغرب میں ایک حلقے نے شاعری کو محض عقل پسندانہ اور مادہ پرستانہ زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہاں جذبے پر جبلت کو فوقیت حاصل ہے۔ البتہ مشرق میں مذہب، اخلاق اور شاعری کے مابین ایک بحث اور نزاع کی کیفیت ہمیشہ موجود رہی ہے لیکن اس نزاع نے کبھی انتہا پسندی کی شکل اختیار نہیں کی۔ مولانا شبلی نعمانی شاعری کو ایک ذوقی اور وجدانی چیز قرار دیتے تھے اور ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انسانی معاشرت کی کل سائنس اور فلسفے سے نہیں بلکہ جذبات سے چل رہی ہے اور شاعری جذبات کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ ''شعر العجم'' جلد چہارم میں سائنس اور شاعری کے تنازع کے ضمن میں اپنا موقف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''سائنس اور مشاہدات کی ممارست میں جبکہ انسانی قلوب سخت اور کٹر بن جاتے ہیں شاعری ان کو رقیق اور نرم کرتی ہے اور ایک ایسے عالم تخیل کی سیر کراتی ہے جہاں تھوڑی دیر کے لئے ہمیں مشاہدات کی بے رحم حکومت سے نجات مل جاتی ہے گویا اس اعتبار سے شاعری ہمیں ایک جہان دگر کی سیر کراتی ہے۔''

شاعری کے مباحث میں ہیئت موضوع اور اسلوب بیان پر بھی بحث و تمحیص ہوتی رہی ہے۔ کبھی الفاظ کی اہمیت پر زور دیا گیا اور کبھی معانی کی ضرورت پر۔ مجموعی طور پر حقیقی شاعری اسی کو قرار دیا گیا ہے جو لفظ و معانی کے ارتباط سے جلوہ پذیر ہو۔ اپنے مختلف خطبات میں سیماب اکبر آبادی میں موضوع زیر بحث کے ضمن میں بہت برمحل اور مناسب گفتگوئیں کی ہیں ان گفتگوؤں سے مقتبس یہ دو حوالے دیکھیے۔

''ایک شاعر کے لئے پہلی منزل منزل احساس، دوسری منزل منزل تاثر اور تیسری منزل منزل فکر ہوتی ہے۔ ان منازل سے گزر جانے کے بعد وہ جو کچھ کہتا ہے وہ اتنا موثر اور دلدوز ہوتا ہے کہ کائنات اسکے استقبال کے لئے دل بدست نظر آتی ہے۔ غالب اسی مقام کی تفسیر اس طرح کرتا ہے۔

ہے پرے منزل ادراک سے اپنا مجود/قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اور ایک مقام پر وہ کہتے ہیں:

''اردو شاعری نے نظام حیات پر جس قدر احسان کیا ہے وہ بجائے خود ایک مبسوط تاریخ ہے۔ شاعری ہمارے تمدن میں، ہماری معاشرت میں، ہماری سیاست میں اور ہماری عمرانی زندگی کی رگ رگ میں جذب ہو چکی ہے۔ مردہ قوموں کو ابھارنا، بجھے ہوئے احساس کو مشتعل کرنا اور عساکر کے قوائے عمل میں حزر و حد پیدا کرنے کے علاوہ الفاظ کے مخارج منضبط کرنا، زبان کے محاورات محفوظ کرنا، سوئی ہوئی فضاؤں کو جگانا اور جاگنے والوں کو عمل کے لئے تیار کرنا اور تخیل کو ان ارتقائی خطوط پر پہنچا دینا جہاں دوسرے فنون لطیفہ کی رسائی ناممکن ہے صرف شاعر کا کام ہے۔''

شاعری ایک شیریں دیوانگی کا نام ہے یہ روح کی Engineering اور Defence Mechanism ہے علامہ اقبال کے بقول ؎

گلشن دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو

پھول نہ ہو کلی نہ ہو سبزہ نہ ہو چمن نہ ہو

اور ایک اور مقام پر اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے ہیں ؎

صد نالہ شبگیر ے صد صبح بلا خیز ے

صد آہ شرر ریز ے یک شعر دلاویز ے

اس ضمن میں نصیر احمد ناصر کی نظموں کے مجموعہ ''عراچی سو گیا ہے'' کا پیش لفظ ایک حوالے کی تحریر قرار پاتا ہے وہ ''لامحدود سمتوں کا اقلیدس'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

''میری نظر میں شاعری ارضی راستوں کو سماوی فاصلوں میں طے کرنے کا نام ہے۔ کبھی کبھی یہ فاصلے اتنے پھیل جاتے ہیں کہ مروج زمینی پیمانے انہیں ناپنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ یا مقام

ہوتا ہے جہاں آ کر تخلیق کار چپکے سے وقت کی لائٹ کونز (Light Cones) میں داخل ہو کر بیک وقت تینوں زمانوں میں جینے لگتا ہے اور اس ماورائی کیفیت میں وہ زبان کے ایسے انوکھے اور نئے سانچے وضع کرتا ہے جن میں ڈھل کر الفاظ فکری اور جمالیاتی امتزاج کا اعلیٰ وارفع پیکر بن جاتے ہیں .... دوسری بات یہ کہ شاعری محض چند اوزان و بحور کی پابندی کا نام نہیں یہ تو لاتعداد اور لامحدود سمتوں کا اقلیدس ہے۔ اس کا اپنا علامتی اور استعاراتی اور فکری و ثقافتی نظام ہوتا ہے۔ پیکر تراشی ہوتی ہے، اسرار و رموز کی محسوسات کی ایک انوکھی دنیا ہوتی ہے، جو بیک وقت فرد سماج اور کائنات کے ظاہر و باطن سے منسلک ہوتی ہے۔ ماضی حال اور مستقبل کی لہر میں شاعری کئی اطراف میں سفر کرتی ہے۔ اس کا کوئی ایک نقطہ، اتصال تلاش کرنا معیار کے کسی ایک ثقہ سانچے میں ڈھال کر کوئی حتمی تعریف بیان کرنا میرے خیال میں ناممکن ہے۔''

وہ حقائق جو انسانی اذہان کی گرفت میں نہیں آ سکتے، وہ یقیناً انسانی وجدان کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ چنانچہ شاعری کے بارے میں یہ کہنا بہت موزوں دکھائی دیتا ہے کہ شاعری ادراک اور وجدان، آنسو اور مسکان، ویران اور مکان، اجنبیت اور پہچان، بے زبانی اور زبان کے درمیان نور کا اور کانچ کا پل ہے۔ شاعر گونگے جذبوں کو گویائی اور اندھے مضامین کو بینائی عطا کر دیتے ہیں۔

اداریہ میں مدیر نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ شاعری انسان کی باطنی آسودگی کا بہترین ذریعہ ہے اور ان کی اس بات سے بھی اتفاق کیا جانا چاہیے کہ شاعری کو روح عصر کا غماز اور عصری آگہی کا ترجمان ہونا چاہیے۔ اداریے کا اختتامیہ تعلیمی اداروں میں شعری نصاب کو اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیتا دکھائی دیتا ہے۔ ادب کے ایک طالب علم اور استاد ہونے کے ناتے میرا چودہ سالہ تدریسی تجربہ بتاتا ہے کہ عمومی طور پر ہمارے طلبا شعری ذوق سے تہی ہیں۔ شعر کی تفہیم تو کجا وہ اس کی صحیح قرأت پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔ اداریہ نویس نوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ سائنس، طب، معاشیات وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کو معاصر شاعری ایک مختصر سے لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے۔ میرے خیال میں صرف اسی صورت ہی ہم آئندہ نسلوں کی شخصیت کے روحانی اور جمالیاتی پہلوؤں کو معدوم ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کی سطح پر آتش کی غزل کا ایک شعر

کم شاعری بھی نسخہ اکسیر سے نہیں
مستغنی ہو گیا جسے آیا یہ فن درست

پڑھاتے ہوئے راقم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ شاعری پر وارد ہونے والے آج کے سائنسی اور کمپیوٹرائز ذہن کے تمام تر اعتراضات کا شافی جواب دے دیا جائے اور شاعری کی افادیت کو اجاگر کیا جائے۔ میں اپنی اس نگارش میں یہ تجویز بھی پیش کرنا چاہوں گا کہ انٹر سے لے کر پوسٹ گریجویٹ لیول تک کسی نہ کسی طور کلاسیکل شعراء کے ساتھ ساتھ جدید شعراء کی تدریس کو لازم قرار دیا جائے۔

نظم کے ایک خوبصورت شاعر وحید احمد کی نظم ''ہم شاعر ہوتے ہیں'' اداریے پر میرے تاثر اور

تجربے کا نقطۂ اختتام ہے۔

ہم شاعر ہوتے ہیں

ہم پیدا کرتے ہیں
ہم گیلی مٹی کو مٹھی میں بھینچا کرتے ہیں
تو شکلیں بنتی ہیں
ہم ان کی چونچیں کھول کے سانسیں پھونکا کرتے ہیں
جو مٹی تھے
وہ چھو لینے سے طائر ہوتے ہیں
ہم شاعر ہوتے ہیں
کنعان میں رہتے ہیں
جب جلوہ کرتے ہیں
تو ششدر انگشتوں کو پوریں نشتر دیتی ہیں
پھر خون نکلتا ہے
جو سرنہیں ہوتا
اک سہو بہا سکتا ہوتا ہے ۔
ورنہیں ہوتا
یونان کے ڈاکو ہیں
ہم دیوتاؤں کے محل میں نقب لگایا کرتے ہیں
ہم آسمان کا نیا اثر دروازہ توڑتے ہیں
ہم آگ چراتے ہیں
تو اس دنیا کی تخ چوٹی سے برف پگھلتی ہے
پھر جمے ہوئے سینے جلتے ہیں، سانس بھکتی ہے
پھر شریانوں کے منہ کھلتے ہیں
خون دھڑکتا ہے
جیون رامائن میں
جب راون استبدادی کاروبار چلاتا ہے
ہم سیتا لکھتے ہیں

جب رتھ کے پہیے جسموں کے خاشاک کچلتے ہیں
تو گیتا لکھتے ہیں
جب ہونٹوں کے سہمے کپڑوں پر بخیہ ہوتا ہے
ہم بولا کرتے ہیں
جب منڈی سے ایک ایک ترازو غائب ہوتا ہے
تو جیون کو میزان پہ رکھ کر تولا کرتے ہیں
مزدوری کرتے ہیں
ہم لفظوں کے جنگل سے لکڑی کاٹا کرتے ہیں
ہم آرہ کشی کے ماہر ہیں، انبار لگاتے ہیں
پھر رندہ پھیرتے ہیں
پھر برما دیتے ہیں
پھر بدھ ملاتے ہیں
پھر چول بٹھاتے ہیں
ہم تھوڑے تھوڑے ہیں
اس بھری بھرائی دنیا میں ہم کم کم ہوتے ہیں
جب شہر میں جنگل در آئے
اور اس کا چلن جنگلائے
تو ہم غار سے آتے ہیں
جب جنگل شہر کی زد میں ہو
اور اس کا سکوں شہرائے تو برگد سے نکلتے ہیں
ہم تھوڑے تھوڑے ہیں
ہم کم کم ہوتے ہیں!

رخسانہ صبا (کراچی)

آپ کا اداریہ "سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری کی افادیت" پڑھا۔ گزشتہ برس نیو ملینیم کی آمد کے موقع پر یہاں بھی یہ سوال بار بار دہرایا جاتا رہا کہ کیا نئی صدی میں شاعری باقی بھی رہے گی یا نہیں؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رفتہ رفتہ شاعری کی اہمیت ختم ہو جائے گی صرف نثر باقی رہے گی۔ لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے شاعری ختم نہیں ہو سکتی کیونکہ جس طرح خون انسان کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے اسی طرح شعری جمالیات کا لطیف احساس ہر انسان کی رگ و پے میں کہیں دوڑتا رہتا ہے خواہ وہ انسان شعر و ادب سے بطور خاص وابستہ ہو یا دیگر شعبہ ہائے حیات سے۔ لیکن جس طرح غفلت اور بد پرہیزی سے ہم انجماد خون کے مسئلے کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہماری جان پر بن آتی ہے اسی طرح نہ صرف دیگر شعبوں سے وابستہ افراد بلکہ خود شاعروں اور ادیبوں نے شاعری کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا ہے اور اس قسم کی غفلت اور بد پرہیزی کا مظاہرہ کیا ہے کہ مسئلہ اب محض دواؤں یا انجیو گرافی تک محدود نہیں رہا بلکہ طویل اور دشوار قسم کے "بائی پاس آپریشن" تک نوبت آ گئی ہے۔ آپ نے اپنے اداریئے میں تین بنیادی نوعیت کی تجاویز پیش کی ہیں۔ (۱) جینوئن تخلیق کاروں کو سامنے لایا جائے اور عصری آ گہی سے مملو شاعری کو فروغ دیا جائے۔ (۲) علمی اداروں میں شعری نصاب کو اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے۔ (۳) سائنس، ٹیکنالوجی، اقتصادیات اور میڈیسن کے شعبوں سے وابستہ ماہرین کو شاعری کے کورسز کرائے جائیں۔

آپ کی پہلی تجویز کے جواب میں عرض ہے کہ جینوئن تخلیق کاروں کو سامنے لانے اور عصری آ گہی سے مملو شاعری کو فروغ دینے کا فریضہ آخر کون سے لوگ سرانجام دیں گے؟ کیا وہ جو جعلی، نقلی اور غیر اہم تخلیق کاروں کی درپردہ پشت پناہی کرتے ہیں؟ جو تازہ فکر رکھنے والے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے حاشیہ بردار اور مادی اسٹیٹس کے حامل مگر تخلیقی قوت کے اعتبار سے کمزور افراد کو پروجیکٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟ جن کی گروہ بندی اور کھینچا تانی نے ادب کی اقلیم میں داخل ہونے والے نئے مگر حقیقی لکھنے والوں کو حیران اور پریشان کر رکھا ہے؟ اور کیا عصری آ گہی سے مملو شاعری کو وہ لوگ فروغ دیں گے جن کی اپنی آ گہی غیر متوازن تنقیدی رویے، مفاد پرستی اور سُپر ایگو کے غبار میں کہیں گم ہو گئی ہے؟ آپ کی دوسری تجویز کے جواب میں میرا کہنا یہ ہے کہ تعلیمی اداروں میں شعری نصاب کو اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق کون لوگ بنائیں گے؟ کیا وہ لوگ جن کے وضع کردہ نظام تعلیم کی دیمک نونہالانِ وطن کی ذہانت و صلاحیت کو چاٹ گئی؟ کیا وہ بیوروکریٹ جو وفاقی وزارت تعلیم، نیشنل بیورو آف کریکولم، پراونشل بیورو آف کریکولم، ٹیکسٹ بک بورڈز اور تعلیمی بورڈز سے وابستہ ہیں اور اپنے اپنے جرائم دوسروں کے کھاتے میں ڈالنے میں مصروف ہیں؟ کیا وہ اساتذہ جو رشوت اور سفارش کے پروردہ ہیں اور جن کا شین قاف اور املا تک درست نہیں یا وہ اساتذہ جو موجودہ صورتحال سے مایوس ہو کر خود بھی اسی دھارے کا حصہ بن چکے ہیں اور طلبہ کی تربیت سے بے نیاز ہیں؟ آپ کی تیسری تجویز کے جواب میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس معاشرے میں مجموعی طور پر شاعری اور شعر کہنے والوں کے لئے استہزائی رویہ اختیار کر کے انھیں معتوب کیا جاتا رہا ہو اور جہاں حکومتیں عوام کے بنیادی حقوق کی

پاسداری کرنے کے قابل بھی نہ ہوں وہاں بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا کون؟ لہذا ہماری نئی نسل زندگی کے فکری، روحانی اور جمالیاتی پہلو کے مفاہیم سے بھی نا آشنا الیکٹرونک میڈیا کی پھیلائی ہوئی دھند میں اپنی منزل کا تعین کئے بغیر آگے بڑھتی رہے گی اور ہم زرد صحراؤں کے بگولوں کی مانند اپنی اپنی فکر کے دائرے میں چکر کاٹتے رہیں گے۔ کہیں یہی تو ہمارا، آپ کا اور سب کا مقدر نہیں ہے؟

صامت وقار (فیصل آباد)

تسطیر شمارہ اپریل تا ستمبر ۲۰۰۱ء کے اداریئے نے حسب سابق بہت سوں کو چونکا دیا ہوگا۔ اس اداریے کے مجموعی تجزیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں آپ کی فکر کا محور انسان اور انسانی جبلتیں ہیں، جو اپنی اصل کے اعتبار سے حیوانی اور بدصورت ہیں۔ انسان اور حیوان میں فرق کی بنیاد، وہ انفرادی و اجتماعی احتسابی نظام ہے جو اول الذکر میں موجود ہے مگر ثانی الذکر میں نہیں۔ یہ احتسابی نظام تعقل اور وجدان کے امتزاج سے وجود میں آتا ہے اور جبلتوں کو مہذب بنانے میں انسان کی مدد کرتا ہے۔ اس نظام کی کارکردگی کے تناسب پر، انبیا، اولیا، اور عبقری انسان بننے کا انحصار ہوتا ہے۔ اس نظام کی کارکردگی جس قدر کم ہوتی جائے گی انسان اسی قدر حیوانی سطح کے نزدیک پہنچتا جائے گا۔ یہی وہ کارکردگی ہے جسے بڑھانے کے لئے انسان کو خارجی ذرائع سے بھی مدد لینا پڑتی ہے اور اپنے باطن سے بھی۔ خارجی مدد کو علم اور باطنی مدد کو فکر کہہ سکتے ہیں دوسروں کی فکر ہمارے لئے اور ہماری فکر دوسروں کے لئے علم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس پس منظر میں پاکستانی قوم بجا طور پر ہدف تنقید بنی ہے کہ دیگر ترقی یافتہ اقوام کے مقابلے میں ہم جبلتوں کو مہذب بنانے والے احتسابی نظام کی کارکردگی بڑھانے کے لئے عملی اقدامات کی ضرورت اور اہمیت کا کوئی شعور نہیں رکھتے۔ اس الزام کے دفاع میں یہ دلیل بھی بے کار ہے کہ اکثر نام نہاد مہذب اقوام جا بجا اپنی بدفطرتی کا مظاہرہ کر چکی ہیں اور اب بھی کرتی رہتی ہیں یعنی ہم اپنی بدی کے دفاع میں منطقی طور پر بدی کو یہ کہہ کر مستحسن قرار نہیں دے سکتے کہ دوسرے بھی برے ہیں لہذا ہم بھی اگر بدفطرت ہیں تو کیا حرج ہے۔ اس مرحلے پر سپر سٹرکچر اور انفراسٹرکچر کے مفاہیم پر غور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لغت کے مطابق یہ دونوں الفاظ کسی ملک، قوم اور معاشرے کی مادی اور اقتصادی تعمیر و ترقی کے دو اہم اجزاء کے تعارف کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہر قوم، وقت کے ساتھ ساتھ، اپنے نظریات کے مطابق اپنے زیریں ڈھانچے کو مضبوط بناتی ہے اور ہاتھ کے ہاتھ، اس پر بالائی ڈھانچہ بھی تعمیر کرتی ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہی دونوں الفاظ انسانی ذات کی تعمیر کے سلسلے میں بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ ہم انسان، اپنی جبلتوں کے گرد پہلے ایک انفراسٹرکچر تعمیر کرتے ہیں جس کے لئے تعقل اور وجدان کے حسین امتزاج کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے بعد علم اور عمل کی مدد سے انسانی ذات کا بالائی ڈھانچہ تشکیل دیا جاتا ہے۔ ذات کی دیانتدارانہ تکمیل سے پہلے معاشرتی ڈھانچے کی تعمیر و تشکیل مصنوعی ثابت ہوتی ہے۔ میرے تجزیے کے مطابق اب تک دنیا کے کسی بھی ملک میں ذات کے Infrastructure کو پوری قوت اور دیانتداری سے بدلنے کی سنجیدہ کوششیں یا تو ہوئی ہی نہیں اور یا ہوئیں تو پوری طرح کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو

سکیں۔ پوری دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور مادی و اقتصادی طاقت کی بنیاد پر فقط معاشرتی Super Structure ہی کو بدلا گیا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ مندرجہ بالا ترقی اور طاقت کے ذریعے عالم انسانیت کو جتنے سکھ پہنچائے گئے شاید اس سے کہیں زیادہ دکھ بھی دیئے گئے۔ اگر انسانی جبلت اور فطرت کو مہذب بنانے کا عمل بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ جاری رہتا تو یقیناً انسانی معاشروں کا انفراسٹرکچر بھی تبدیل ہو جاتا اور پھر پاکستانی قوم میں بھی، دیگر اقوام کی طرح، وہ بے سکونی نہ در آتی جس کا تذکرہ اداریے میں خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں ضرورت کی ہر چیز "Status Symbol" کے طور پر استعمال کی جاتی ہے لیکن یہی رویہ، کہیں کم کہیں زیادہ، دنیا کے تمام معاشروں میں نظر آتا ہے، یعنی سائنسی ایجادات اور اقتصادی طاقت کا غلط استعمال ہمارے معاشرے تک محدود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "انسان تمام تر مادی سہولیات کے باوجود کسی نہ کسی ایسے گوشہء عافیت کا متلاشی ضرور رہتا ہے جہاں وہ تھوڑی دیر کے لئے باطنی آسودگی حاصل کر سکے"۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں سے ہم اس بات کا جائزہ لینا شروع کر سکتے ہیں کہ شاعری انسان کی اس باطنی ضرورت کو بدرجہ اتم پورا کر سکتی ہے یا کسی حد تک یا قطعاً پورا نہیں کرتی۔

اپنے اولین ادوار ہی میں انسان نے، جبکہ وہ حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہا تھا، یہ محسوس کر لیا تھا کہ بھوک پیاس مٹانے، نیند پوری کرنے، ماں کی ممتا حاصل کرنے اور جنسی آسودگی میسر آ جانے کے باوجود اس کی زندگی میں کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ انسان کا یہ احساس تہذیبی ارتقاء کی طرف اس کا پہلا قدم تھا۔ اس احساس نے اسے پتھروں سے اوزار اور ہتھیار بنانے کی ترغیب دی، اس کامیابی نے اسے مجسمہ سازی کی تربیت دی، پھر اسے غاروں کی سنگی دیواروں پر لافانی تصاویر تخلیق کرنے کا خیال سوجھا اور شاید سب سے آخر میں اسے اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اپنی سوچ کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لئے زبان کو بطور اوزار استعمال کرنا چاہیے۔ یہ میرا اندازہ ہے کہ خود کو سکون پہنچانے کے ایک ذریعے کے طور پر انسان نے شعر و ادب کو سب سے آخر میں دریافت کیا۔ اس سے پہلے ہی وہ موسیقی، رقص، تصویر سازی، مجسمہ سازی اور ہتھیار و اوزار سازی کی خوبیاں خود میں دریافت کر چکا تھا۔ ان میں سے دو مؤخر الذکر خوبیوں کو ہم انسان کی اولین سائنسی ترقی کا مظہر کہہ سکتے ہیں جبکہ دیگر تمام خوبیاں انسان کے نزدیک ابتدا میں Extra Curricular Activities کا مرتبہ رکھتی تھیں، لیکن بہت جلد اس نے انہیں اپنی ضرورت کے طور پر پہچان لیا۔ جس جس انسان نے جب جب اپنی ان خوبیوں کو مثبت انداز میں استعمال کیا یہ اس کے لئے سکون کا باعث ثابت ہوئیں اور جب جب اس نے انہیں منفی انداز سے استعمال کیا اسے اور عالمِ انسانیت کو بے سکونی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انسان نے انسان کو مجسموں اور تصویروں کی عبادت پر اکسایا جبکہ دیو مالائی قصوں اور طویل نظموں کے ذریعے دیوی دیوتاؤں کے تصور کو فروغ دیا جس نے انسان میں پوشیدہ جہد مسلسل کے امکانات کو نقصان پہنچا کر بے عملی پر راغب کیا۔ اس تجزیئے کی رو سے میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ فقط شاعری ہی سکون کا ذریعہ نہیں بلکہ انسان میں پوشیدہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں اس کے لئے باعث طمانیت بن سکتی ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ ان کا مثبت استعمال کیا جائے۔ ہر انسان، بطور سائنسدان، ڈاکٹر، وکیل، تاجر، ٹیچر، سیاستدان، مصور، مجسمہ ساز، شاعر اور

مذہبی رہنما، اپنے اپنے شعبے میں گوشہء عافیت تلاش کرسکتا ہے اگر اس کا زاویہء فکر و نظر مثبت ہے۔ بصورت دیگر، آج کے دور میں الیکٹرونک میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ سے پیش کی جانے والی، پیش پا افتادہ اور روح عصر سے محروم شاعری جس طرح انسان کے لئے سکون کا ذریعہ نہیں، اسی طرح انسان کی دیگر تمام خوبیاں بھی اس کے لئے بیکار ہیں اگر ان کا استعمال منفی انداز سے ہو رہا ہو۔

تسطیر کے اداریئے میں، اپنے عہد سے ہم آہنگ اور روح عصر پر مبنی شاعری کو، انسان میں ارفع تخلیقی سوچ اور باطنی آسودگی پیدا کرنے کے واحد ذریعے کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے۔ ﴿ا﴾ بطور انسان میرا مشاہدہ اور بطور معلم میرا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ میری دانست میں، مختلف انسانوں میں مختلف خوبیاں، جبلی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ میں انہیں جبلت نما خوبیاں سمجھتا ہوں کیونکہ ان کا رویہ، انسان کے ساتھ، اُن جبلتوں جیسا ہی ہوتا ہے جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ سائنسی افکار ہوں یا شاعرانہ سوچ، مصوری ہو یا سنگتراشی، موسیقی ہو یا رقص انہیں تخلیق کرنے والے انسان، اُسی طرح کی تسکین حاصل کرسکتے ہیں جس طرح کی بھوک اور پیاس مٹانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اب ان انسانوں کا جائزہ لیجیے جن میں درج بالا جبلت نما خوبیاں موجود نہیں مگر ان سے حظ اٹھانے کی صلاحیت موجود ہے۔ میرے تجربے اور مشاہدے کے مطابق ایسے افراد مختلف النوع ہوتے ہیں اور ہر شخص شاعری سے، خواہ وہ روح عصر کی حامل ہی کیوں نہ ہو، مستفید نہیں ہو سکتا۔ یہ تجربہ کرنے میں البتہ کوئی حرج نہیں کہ اچھی شاعری کو الیکٹرانک میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ، نصابی کتب، ریفریشر کورسز اور لازمی مضمون کی صورت میں ہر نوع کے انسان تک پہنچایا جائے۔ تاریخی حقائق کی بنیاد پر میرا اندازہ یہ ہے کہ ایسا کوئی تجربہ ماضی میں بھی اسی لئے نہیں کیا جا سکا کہ ہر طبع شاعری سے حظ حاصل کرنے کے لئے موزوں نہیں ہوتی۔ ایسی طبیعتوں پر شاعری مسلط کر دی جائے تو یقیناً ان کی زندگیوں میں کوئی روحانی اور جمالیاتی انقلاب بپا نہیں ہوگا۔ ایسے افراد ان گنت ہیں جو شاعری کی کتاب سے زیادہ معاشرتی علوم کی کتاب سے عصری تقاضے کشید کر لیتے ہیں اور بڑے ''سکون'' سے تمام عمر گزار دیتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے افراد بھی ہیں جو شاعری کا ذوق و شوق رکھتے ہیں مگر ان کی زندگیوں میں روحانی اور جمالیاتی پہلو بدستور گم رہتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی لائق توجہ ہے کہ انسان آج تک اچھی شاعری کے غیر متنازعہ پیمانے اتفاق رائے سے تخلیق نہیں کر سکا ہاں کثرت رائے کچھ باتیں ضرور سامنے آئی ہیں اور ان کے مطابق اچھی شاعری وہ ہے جو فقط اپنے عہد سے ہم آہنگ اور روح عصر سے جڑی ہوئی ہی نہ ہو بلکہ اپنے اندر آنے والے ادوار کے لئے بھی دلکشی کے عناصر رکھتی ہو۔ کچھ افراد کی رائے یہ بھی ہے کہ روح عصر سے مراد وہ روح ہے جو ازل سے کروٹیں اور رنگ بدلتی ہوئی چلی آ رہی ہے اور ابد تک چلتی رہے گی۔ یعنی ہر عہد میں یہ سطحی طور پر تبدیل ہوتی ہے باطنی طور پر

﴿ا﴾ اداریئے میں شاعری کو انسان میں ارفع تخلیقی سوچ اور باطنی آسودگی پیدا کرنے کے ''واحد'' ذریعے کے طور پر متعارف نہیں کروایا گیا بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں شاعری انسان کی اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کر سکتی ہے۔ (ن۔ا۔ن)

نہیں۔ اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو روحِ عصر تک رسائی ہر شاعر کے بس کی بات نہیں اور ہر قاری کے لئے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں کہ کون سے شاعر کی رسائی روحِ عصر تک ہو چکی ہے خصوصاً معاصرین اس معاملے میں، دانستہ یا نادانستہ طور پر بہت غلطیاں کرتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی اور مرزا غالب ایسی ہی غلطیوں کا شکار ہوئے، جبکہ ذوق اور ایسے ہی دیگر شاعر معاصرین کی غلطیوں کے باعث اپنے عہد پر چھا گئے۔ ان دانستہ یا نادانستہ غلطیوں کے امکانات آج بھی موجود ہیں۔ دیانتدار انسان بھی غلطی کر سکتا ہے جبکہ گزرتا ہوا وقت بھی بعض اوقات تادیر نااہل انسان کا ساتھ دیتا رہتا ہے البتہ اس میں شک نہیں کہ آسمان سال ہا سال تک پھرتا ہے، نااہل پنپتے ہیں مگر ایک دن خاک کے پردے سے انسان نمودار ہو ہی جاتے ہیں۔ ہمیں اس دن کا انتظار بے عمل انسانوں کی طرح نہیں کرنا چاہئے، بے شک ایک جہدِ مسلسل ہمارا فرض ہے خواہ ایک مستقل مایوسی ہمارا مقدر ہو۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں، ہر نوعیت کی طبع تک اچھی شاعری پہنچانا اور تربیتِ طبع کے لئے کوشش کرنا، پہلے زمانوں کی نسبت آج زیادہ ضروری ہے مگر یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ آج اچھی شاعری کے راستے میں رکاوٹیں بھی پہلے زمانوں کی نسبت زیادہ ہیں۔ آج ایک منظم سازش کے تحت عوامی ذہن کو Sublimity کی طرف جانے سے روکا جا رہا ہے اور گھٹیا پن کی تربیت دی جا رہی ہے۔

محمد فیروز شاہ (میانوالی)

اداریہ میں معکوس اندازِ فکر کی بات کر کے آپ نے مجھے داغستان کے دانشور شاعر رسول حمزہ کی یاد دلا دی ہے۔ جس نے ایسی ہی کسی صورت حال میں خود کو "پچھل پائیوں" کے نرغے میں گھرا پایا تھا۔ حالات کے جبر نے اس کے پیشقدمی کے خواب کو یوں بے آب کر کے رکھ دیا تھا کہ آگے کا سفر بھی پس منظر کے خطر میں گم ہوتا چلا گیا تھا۔ گمشدگی گمراہی کی ہم شکل ہو جائے تو منزلیں بے شکل ہو جایا کرتی ہیں۔ رات کی گھات میں خود فریب سوچوں کی واردات صبح نو سے ملاقات کا خواب گھائل کر کے رکھ دیتی ہے۔ ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم فکری انتشار کا شکار ہیں۔ بے جہت سفر نے مسائل حیات کو بے ثمر کر دیا ہے۔ سمتِ سفر کا تعین کئے بغیر ہم ایک بھگدڑ کا شکار ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ منزل زیست تو متعین تھی مگر ہم فیشن پریڈ کے اشتیاق میں بھاگ پڑے اور یہ تک نہ سوچا کہ راست رفتار کا اپنا ایک اعتبار ہوتا ہے۔ ہمارا گھر خزینوں کا مستقر تھا لیکن ہم دریوزہ گری میں مبتلا ہو گئے۔ سائنس بھی علوم کا ایک شعبہ ہے اور علم تو مومن کی میراث ہے۔ سو سائنسی ترقی کی رفاقت بلکہ قیادت ہمارا حق تھی پر اس سے اندھا دھند اور بے مغز محبت نے ہمیں بھلا دیا کہ باب مدینۃ العلم نے صدیوں پہلے ہمیں بتا رکھا ہے کہ "ادب بہترین ترکہ ہے"۔ اس عظیم ترکہ کو ترک کر کے ہم بے روح جسموں کی زیبائش میں مصروف ہو گئے۔ آرائش بے ذوق عمل کی ہمسفر ہو تو آلائش بن جاتی ہے۔ ہم نے مادی آلائشوں سے دلوں کے سندر محل گھروں کو بھر لیا اور زمانے نے ہمیں بے حیثیت کر دیا۔ وقت صرف اسی کو وقعت عطا کرتا ہے جس کی فکر میں راستی اور کردار میں پختگی ہو ہم نے ایک شوقِ عجیب میں زندگی کا طور عجیب و غریب بنا لیا اور "ثریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا"۔ کبھی سائنسی علوم ہماری درسگاہوں سے دور نہیں تھے۔ اسی شمارہ

میں برادرم حامد سراج نے اپنے مکتوب میں تفصیلاً ان مسلم سائنسدانوں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے ایک زمانے کو روشنی بخشی مگر دکھ یہ ہے کہ آج ہم سائنسی ترقی کے نام پر جس دوڑ میں بے طور ہوئے جا رہے ہیں شعر و ادب کا اس سے کوئی ربط ضبط تسلیم ہی نہیں کیا جاتا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے نظام میں سائنس اور ٹیکنالوجی اگر جسم ہے تو ادب کی حیثیت روح جیسی ہے۔ بے روح بدن کے وطن میں رہتے ہوئے آج ہم کس کرب عظیم کا شکار ہیں، لفظ شاید پوری طرح اس درد بیلے احساس کی زبان نہ بن سکیں کہ یہ دکھ ہی قیامت کا ہے اصل قیامت یہ ہے کہ ہم نے مادیت پرستی کے جال میں الجھ کر روح کی سرشاریوں کے کیف و کم بھلا دیئے ہیں۔ ہم بھول بیٹھے ہیں کہ ہمعصر آگہی سے مملو شاعری کیسی تر و تازہ زندگی عطا کرتی ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاں خرد افروزی کا بڑا چرچا ہے۔ لیکن مجھے ''اقبال نئی تشکیل'' والے عزیز احمد کی یاد آ رہی ہے جنہوں نے لکھا تھا۔

''وہ عقل جو محض ذاتی یا وقتی خود غرضی کے لئے تسخیر فطرت کرتی ہے۔ دراصل عقل خود بیں ہے۔ یہ وہ دانش برہانی ہے جس کا انجام حیرت ہے۔ دانش نورانی یا عقل جہاں بیں اس سے مختلف ہے۔ عقل جہاں بیں عشق سے قریب تر ہے وہ کائنات کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے اور اسے اندر سے منقلب کرتی ہے''

یہی انقلابی قوت معاشرت اور تمدن کی اقدار کو سربلند کرتی ہے۔ لفظ ہر انقلاب کی اساسی کمک ہے۔ حرف و صوت کی معاونت سے سرخرو روایتوں والی تہذیب و ثقافت تشکیل پاتی ہے۔ آج بھی کامران معاشرے کی پہچان وہاں کے اہل ذوق و سخن کی آراء سے بنتی ہیں۔ ایک گیلپ سروے کی گواہی تو یہ بھی ہے کہ انگریزوں سے جب آزادی اور شیکسپیر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا گیا تو بھاری اکثریت نے شیکسپیر کو ترجیح دی تھی۔ شعر تخلیقی شعور کے پُرسرور ظہور کا نام ہے۔ حیرت اور مسرت جب مل کر تخلیق کار کے آنگن میں رنگ اتارتی ہیں تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ شعر و ادب سائنسی علوم کی ہمراہی میں ہمارے تعلیمی اداروں کے لوازمات میں شامل ہو جائے تو ایک مضبوط و منضبط اور جلال و جمال والا تمدن ہماری شناخت بن جائے پر اس کے لئے سب سے اہم یہ احساس ہے کہ شاعری زندگی کا لازمہ ہے اس سے الگ کوئی چیز نہیں۔ میں سمجھتا ہوں شاعری زندگی سنوارتی ہے اور زندگی شاعری کو نکھرنے سنورنے اور پُراثر ہونے کیلئے مواد مہیا کرتی ہے سو جو تخلیق براہ راست زندگی سے مواد لیتی ہے زندہ رہتی ہے زندگی کو تابندگی بنا دیتی ہے۔ فیض احمد فیض نے اسی جانب اشارہ کیا تھا ''تخلیق کا چیلنج ہمہ جہت ہے میڈیم کا چیلنج ...... جو ہمہ جہت ہے ...... ادراک کا چیلنج ...... جو ہیئت ہے ...... اور صداقت کا چیلنج ...... جو بصیرت ہے ...... کوئی بھی فنکار ان سب چیلنجوں سے جس جس قدر بہتر طور پر عہدہ برآ ہوتا ہے اسی قدر بلند پایہ تخلیق کر پاتا ہے'' یہ تخلیقی عمل ہی کا جادو ہے جو ماحول کو خوشبو سے بھر دیتا ہے۔ کاش کوئی سمجھ سکتا کہ سائنسی علوم روشنی ہیں تو تخلیقی ادب خوشبو۔ اور کون نہیں جانتا کہ روشنی اور خوشبو دونوں لوازمات کی طرح ہمسفر ہوں تو سرمست زیست کی کامرانیاں شادمانیاں بن جاتی ہیں۔ بالخصوص شاعری تو سینوں میں مستور خزینوں کو زمانوں اور زمینوں کی آراستگی کا قرینہ عطا کرتی ہے کہ یہ تو انسانیت کے ماتھے کا جھومر ہے۔ زندگی کا زیور ہے۔ چینی حکیم کنفیوشس نے یونہی تو نہیں کہہ دیا تھا۔

''میرے بیٹو! میرے شاگردو! تم شاعری کا مطالعہ کیوں نہیں کرتے؟ شاعری ذہن میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ شاعری سے انسان میں غور و تامل کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے میل جول بڑھتا ہے۔ اس سے کوفت اور پریشانی کم ہوتی ہے۔ وہ انسان کو اس کے قریب تر فرائض اور بعید تر واجبات کی تعلیم دیتی ہے۔''

تعلیم ہمارے ہاں تنظیم اور تربیت کا سلیقہ سکھانے کی بجائے چند بندھے ٹکے بے ربط ضابطوں کی اسیر بنا دی گئی ہے۔ یہ تو آسمانوں میں سربلند اڑانوں کا ہنر بانٹنے کا وسیلہ تھا ہم نے بے ڈھنگے عملوں کا حیلہ بنالیا۔ کسے سمجھاؤں کہ تعلیمی ادارے تہذیب کے استعارے ہوا کرتے ہیں۔ ان گہواروں میں تو مستقبل کے جہت نما ستاروں کی پرورش ہوتی ہے۔ اور انہی تربیت گاہوں میں تمدن کی فضاؤں کو نکھارنے سنوارنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ سو میں سمجھتا ہوں ہمارے ہاں تعلیم و تعلم کے عمل میں تخلیقی روح کی سرشاریاں سمونے کا انصرام بے حد ضروری ہے اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو...... اور...... زندگی بدن میں روح کی معطر تابندگی کا نام ہے......!

ھارون الرشید (بالاکوٹ، ہزارہ)

تسطیر کے پچھلے ایک شمارے میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے کورسز، گائیڈز کے مسلسل استعمال اور انتہائی پڑھے لکھے اساتذہ کی فروغ تعلیم سے عدم دلچسپی کے بارے میں ایک اہم نوٹ لکھا تھا۔ مجھے یقین ہے اسے کسی نے درخور اعتنا نہیں جانا ہوگا۔ دکھ اس امر کا ہے کہ بات گھوم پھر کے وہیں آ جاتی ہے کہ تعلیم جیسا حساس شعبہ اور تعلیمی ادارے کس طرف جا رہے ہیں۔ میں خود شعبہ تدریس سے منسلک ہوں، مجھے اس سلسلے میں نصاب بنانے والوں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن ان کی اپنے شعبے اور کام سے وابستگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کورس کی کتابوں میں غلطیاں تک درست نہیں کی جاتیں۔

ہمارے سکولوں اور کالجوں میں جو نصاب پڑھایا جا رہا ہے، وہ جدید عہد کے تقاضوں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسے از سرِ نو مرتب کیا جائے اور وہ فرسودہ ادب جو ایک عرصے سے ہمارے تعلیمی کورسز میں شامل ہے اس کو تبدیل کیا جائے اور اس کی جگہ ان اہم لکھنے والوں کو نصاب میں جگہ دی جائے جنہیں پڑھنے کی اشد ضرورت ہے نیز غیر ملکی ادب سے بھی اہم چیزیں کورس میں شامل کی جائیں۔ اس سلسلے میں ملک کے مقتدر شعراء، ادبا اور ماہر اساتذہ جن کی خدمات سے کماحقہ استفادہ نہیں کیا گیا انہیں نصاب کی Re-Shuffling کے کام پر مامور کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نصاب میں شاعری اور ادب کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعری کے ضمن میں الیکٹرانک میڈیا کا کردار نہایت مایوس کن ہے۔ اس میں شاعری کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنا اس کا استحقاق ہے۔ شاعری ایک آفاقی صنف ہے لیکن ہماری سوسائٹی میں اس کے ساتھ جس طرح کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے اس سے اس کا مستقبل مخدوش ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے مخلصانہ اور مثبت کوشش کی جائیں اور اس کو فی الفور دفتری زبان قرار دیا جائے۔ یہ بات انتہائی تشویشناک ہے کہ ہمارے ملک میں بڑی تیزی اور سرعت سے

تحریر: جیلانی کامران
ترجمہ: اسماء راجہ

ادب پر نظرِ ثانی

تسطیر پریس میں جانے والا تھا کہ جیلانی کامران کے انتقال پُرملال کی خبر ملی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ جیلانی کامران کا نظمیہ اسلوب، جدید اردو نظم کی اس روایت سے جو میرا جیؔ، ن۔ م۔ راشد، فیض احمد فیض، مجید امجد وغیرہ سے متعلق ہے، بڑی حد تک مختلف تھا۔ ان کی تنقید کا انداز بھی جداگانہ اور مشرق رُو تھا۔ ان کی وفات سے اردو کی کتاب نظم کا ایک بے حد اہم اورمنفرد باب ختم ہو گیا ہے۔ جیلانی کامران ''تسطیر'' سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف تسطیر کواپنی تازہ نظموں سے نوازتے تھے بلکہ انہوں نے اس کے کئی شماروں پر اپنے مخصوص تنقیدی پیرائے میں فکر انگیز کالم بھی تحریر فرمائے۔ تسطیر ۱۷، ۱۸ ان کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری شمارہ تھا۔ اس کے حوالے سے ان کا ''دی نیشن'' میں شائع شدہ ایک انگریزی کالم خراج عقیدت کے طور پر زیر نظر شمارے میں پیش کیا جارہا ہے۔ جسے اسماء راجہ نے بطورِ خاص ''تسطیر'' کے لئے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

(نصیر احمد ناصر)

سہ ماہی ''تسطیر'' لاہور کے حالیہ شمارے (۱۷، ۱۸) میں ادب کے بارے میں دو نہایت اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ ایک تنقید کے جبر کے متعلق اور دوسرا جدید ماحول میں تخلیقی عمل کے بارے میں۔ یہ دونوں سوال اس وجہ سے ادب کے عمومی مزاج سے تعلق رکھتے ہیں کہ تنقید ہمیشہ تخلیقی عمل میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں جدید تنقیدی نظریات نے روایتی توقعات کو تبدیل کر دیا ہے اور ادیب عملی معاملات میں بے یار و مددگار رہ گیا ہے۔ ساختیات سے لے کر ردِ ساختیات اور مابعد جدیدیت تک، پچھلی صدی کی آخری دہائیوں میں ظہور پذیر ہونے والے تمام تنقیدی نظریات نے قاری کو ادب کی تفہیم میں ایک فعال رکن کے طور پر شامل کر لیا ہے۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ قاری ہی وہ کردار ہے جو کسی ادبی تحریر کا متن طے کرتا ہے۔ قاری کے بغیر کوئی بھی ادبی شہ پارہ ایک پہیلی کی طرح ہوتا ہے۔ اس باعث ادب اور قاری کے درمیان ایک جبریہ مساوات یا مشترکہ تقابلی معیار قائم ہو گیا ہے۔ ایک بہت اہم اور تواتر سے پوچھا جانے والا سوال یہ ہے کہ (ادبی) بیان یا

مباحث کی اصل ترسیل کیا ہے؟ تاہم سوال کرنے کی یہ عادت کوئی نئی ادبی تحریک پیدا کرنے میں معاون ثابت نہیں ہوئی۔ اور یہ عمل ایک ابتدائی درجے کی طالب علمانہ کوشش ہی رہا۔ اس طریقہ کار کے استعمال نے قاری کو یہ باور کرایا کہ ادبی متن کے کوئی بھی حتمی معنی ممکن نہیں ہیں۔ نیز یہ معنی بہت سی دوسری شکلوں میں بھی صحیح ہو سکتے ہیں۔ ادبی موضوع جو ابتدا میں ایک مقدس شے سمجھا جاتا تھا بعد ازاں ایک دنیوی نقش بن کر رہ گیا۔ ثقافت میں ہر چیز ایک زندہ حقیقت بن گئی جس نے تمام مقدس اشیا کو دنیاوی ہیئتوں میں تبدیل کر دیا۔ ان معتقدات کی وجہ سے ماضی اور حال میں مخاطبت کی صورت پیدا ہوئی۔ یہ ایک اچھی صورت حال تھی مگر تنقیدی فلسفے کے طور پر اس نے ادب کے لئے کسی نئی وجدانی جہت کو اجاگر کرنے کی ضمانت نہیں دی۔ تاہم مابعد جدیدیت میں ادیب کی غیر موجودگی ایک دلچسپ امر ہے۔ اس رجحان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ادیب دراصل لکھتا نہیں ہے بلکہ صرف الفاظ استعمال کرتا ہے۔ یہ الہامی ادب کی ایک اعلیٰ سطح ہے۔ اس صورت میں الفاظ منتقل تو ہوتے ہیں مگر کون ان کو منتقل کرتا ہے؟ یہ تخلیقی ادب کے لئے ایک سربستہ راز ہی رہتا ہے۔

یہ تنقیدی رویے ہمارے دو کلاسیکی شعرا، غالب اور میر انیس کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ ادب میں لکھاری کا کوئی کردار نہیں ہے تو ان دو عظیم شعرا کی شاعری ایک ایسا راز بن جاتی ہے جو کبھی آشکار نہیں ہونے پاتا۔ شاید ادب کے متن کو سمجھنا اب انسانی فطرت کی اعلیٰ سطحوں کا ایک چیستان بن گیا ہے۔

اب دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں۔ ''تسطیر'' نے ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائنس کے اس دور میں ادب میں تبدیلی کی بات کی ہے۔ مدیر ''تسطیر'' نے واضح کیا ہے کہ جب تک انسان اس کائنات کے مرکز میں موجود ہے ادب کا مستقبل تابناک ہے۔ باوجودیکہ ماحولیاتی تبدیلی ہمیشہ سے انسانی تاریخ کا حصہ رہی ہے اور یہ انسان ہی ہے جو ان تغیرات کے مطابق خود کو ڈھالتا رہا ہے، تاہم ٹیکنالوجی انسان کے سیکولر اور جدید رجحانات کی عکاس ہے۔ مزید براں اس کی بنیاد طاقت اور محور انسان ہی ہے۔ کیا ادبی مفکرین کو جدید ٹیکنالوجی کے پیچھے چھپے انسانی پیکر کو بیان کرنے کے لئے کچھ مزید وقت درکار ہوگا؟

بہرکیف اس توضیح وتصریح میں کچھ بھی قابل فخر نہیں۔ ٹیکنالوجی کی بنیادیں مغرب میں ہیں۔ مشرق ابھی تک ترقی پذیر ہے اور کسی حد تک مشرقی انسان کی بھی یہی صورت حال ہے۔ یہ ایک غیر متوازن مساوات ہے جو موجودہ ماحول میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اس طرح ادب صرف ایک ذریعہ اظہار نہیں رہا بلکہ اب یہ انسانی شعور کے لئے ایک ضروری آلہ بن گیا ہے۔ نئے ماحول نے ایک مختلف قسم کے انسانی شعور کو جنم دیا ہے۔ ایک طویل عرصے تک ادیبوں نے شعور انسانی کو مثبت انداز میں موضوع بحث بنانے سے گریز کیے رکھا۔ چنانچہ ایک بڑے موضوع کے طور پر یہ ادب میں آنے والا ایک نیا موڑ ہے۔ اب تک انسان کو مغربی خاکوں اور اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اب شاید اس کی اہمیت مغرب سے ترقی پذیر دنیا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ ایک نظم میں یہ کیفیت قدرے مختلف طریقے سے بیان کی گئی ہے:

ایک تنے ہوئے رسّے پر
چلتے ہیں — دو انسان

ایک اپنا عکس دیکھتا ہے
بڑا، طاقتور، جارح اور مغرور
دوسرا
بڑائی کے بوجھ تلے کچلا جاتا ہے
چھوٹا
بے معنی اور بے مصرف
کرۂ ارض پر صرف
بڑا آدمی ہے
دوسرا
اس کے عالمگیر سائے میں
گہنا گیا ہے!

انسانی فطرت کی یہ دونوں شکلیں اخلاقی علاج چاہتی ہیں۔ اخلاقی ضابطے کے بغیر انسان کے لئے مشکل ہے کہ وہ موجودہ صورتِ حال سے نباہ کر سکے۔ طاقت کی ہوس اور غلبۂ خوف کو اخلاقی تشخیص کی ضرورت ہے۔

کیا تم مجھ سے ملنے نکلو گے؟

جیلانی کامران نے اپنی نظموں کے آخری مجموعہ ...... ''اور نظمیں'' ...... کے آغاز میں اپنے ادبی اور تخلیقی سفر کے اختتام کا اشارہ دے دیا تھا۔ کتاب کے آغاز میں دی گئی انتہائی مختصر نثری تحریر میں انھوں نے بتایا تھا کہ ''اب یہ نظمیں آپ کے سامنے ہیں اور میرا وہ سفر بھی آپ کی نگاہوں میں ہے جو میں نے اس طویل مدت میں طے کیا ہے۔ اب تو ایک ہی سوال میرے سامنے رہ گیا ہے کہ میں نے عمر بھر کے سفر میں کیا کھویا ہے؟ کیا پایا ہے......؟'' اس وقت مجھے اُس کتاب کی آخری نظم کی آخری لائنیں یاد آ رہی ہیں:

ننھے دیکھ!
یہ کیسی پیاری دنیا ہے
جس میں خوشبو بن کر تجھ کو جینا ہے
ننھے! تجھ سے دور
میں جب چھپ جاؤں گا
تجھ کو اپنے پاس میں دیکھ نہ پاؤں گا
کیا تم تتلی بن کر ڈھونڈنے نکلو گے
مجھ سے ملنے نکلو گے؟

(پروفیسر فتح محمد ملک)

Dreams Lost In Water

Naseer Ahmed Nasir's collection of Urdu poems named "Dreams Lost In Water" is a beautiful contribution to poetic sensibility in our time. He has introduced a new landscape and enabled the reader to enter it without any formal preparation. His poems speak a different language and evoke a world which emerges between wakefulness and dreams. In this sense, his collection of poems is worth reading: it tells us many new things and carries us to a wonderland which is created by a powerful imagination. Naseer Ahmed Nasir has discovered his poetic destiny in an international environment which has given it a new taste and an extraordinary appeal. In contemporary poetic world, he is a distinguished writer of poetry whose poems have been translated into English, Spanish, Russian, Uzbeck and Hindi. Various critics abroad have paid rich tributes to his poetic achivement which is not a small compliment..... Nasir has created the universal tone of his creative word paintings. Nasir's 'Dreams Lost In Water', which is his title poem, is a master piece of poetic workmanship. This poem seems to project a warning to the people of South Asia. Besides the anguish which covers this poem, there is love for the innocent children. The mirror in the eyes of the poet is formed by the tears of the loving men and women who long for innocence and dreams. It is easy to wage war, but inhuman to build one's madness on the death of uncaring young men and children. Nasir has written one of the best poems on the catastrophe which faces mankind today. This collection of poems is a valuable contribution to modern Urdu poetry.

(Gilani Kamran, The Nation, Tuesday May 28, 2002)

جیلانی کامران

حیران کرنے والا لفظ

تمہارے اگر لفظ
ہم تک نہ آتے، تو
ہم کون ہوتے؟

نہ ہونے کی دُنیا میں ہوتے
جو ظاہر میں آتے تو خاموش ہوتے
خود اپنے میں روپوش ہوتے!

تمہیں نے
ہمیں اک نیا لفظ تحفے میں بھیجا ہے
جو میم بنتا ہے
ہونے کی تمہید بنتا ہے
چھوٹی بڑی عید بنتا ہے!

آتی جاتی آواز

ہمیں دیکھ لو.....
ان درختوں میں جھولے ہیں
ان خواہشوں کے
جو آئینہ بن کر تمہیں ڈھونڈتی ہیں
زمان و مکاں سے
یہاں سے،، وہاں سے!

ہمیں ڈھونڈ لو ہم
یہاں راستوں پر
نشانِ قدم بن کے جیتی ہیں
لمحوں کی پوشاک سیتی ہیں
اپنی نشانی بنا کر
تمہاری کہانی بنا کر!

کوئی کہہ رہا ہے.....
زمانے کے چہرے سے پردہ اٹھے گا
پرندوں کی پرواز بن کر
تری میری آواز بن کر
کسی ان سنی صبح کا جانا پہچانا انداز بن کر!

کس نے کہا؟

کس نے ملنے کو کہا؟ آؤ تو خوش خوش آؤ
خود کو دلبر نہ کہو، کچھ نہ کہو، بس آؤ
عمر کا پردہ بنا کر نہ دکھاؤ، آؤ
اس کے آئینے میں اپنے کو بسا کر آؤ!

دل میں انکار نہیں، تیری اداؤں کے لئے
کانچ میں تازہ ہوا چپ ہے، صداؤں کے لئے
منتظر پھول ہیں، اب تیری دعاؤں کے لئے
اپنی خوشبو کو لئے
چند لمحوں کو یہاں، آ جاؤ
کچھ سہی، کچھ بھی سہی، نام بتانے آؤ

ایک بار آؤ، نہ جانے کے لئے آ جاؤ
مسکرانے کے لئے آ جاؤ!

ابرار احمد

کیا زمانہ عدالت ہے؟
(مبارک احمد کے لئے)

مبارک احمد صاحب!
آپ کی شاعری منفرد ہے
اور اس میں ایک خاص خوشبو ہے
آپ کے کوٹ اور رومال کی خوشبو
وقت اور انسان کی خوشبو
اور اداسی
اور وہ ٹیڑھا پن
جو آپ کی طبیعت کا حصہ ہے
آپ نے ساری زندگی
ایک نیم تاریک، قدیم ڈرائنگ روم میں
(جسے اب آپ نے مبارک آڈیٹوریم
کا نام دے رکھا ہے)
خواب دیکھتے گزار دی
اس کمرے کی دیواریں،
اکھڑتا ہوا پلستر، ادھڑا ہوا صوفہ
اور اب دکھائی نہ دینے والا بوڑھا پیڈسٹل فین
اس بات کا گواہ ہے
اور میں خود بھی
کہ میں بھی اس آڈیٹوریم میں
آپ کے آنسوؤں کی تھاپ کے ساتھ
امانت علی خان کی ''کب آؤ گے'' سن چکا ہوں
میں خواب دیکھنے
اور نیند میں چلنے والوں کی تعظیم کرتا ہوں
لیکن نہ جانے کیوں
آپ اتنے سیانے ضرور ہیں
کہ شدید غصے کے باوجود
بڑی سعادت مندی سے ادیبوں سے پوچھ لیتے ہیں
''چینی کتنی ڈالوں؟''
دراصل آپ دوستوئیفسکی کا کوئی کردار ہیں
جو سادگی کی اداکاری کرتا ہے
اور اپنے بخار اور Delirium کو بہانہ بنا کر
قتل بھی کر سکتا ہے
شکر ہے آپ کے آنسوؤں نے
بخار کو بہت تیز نہیں ہونے دیا
آپ خوب آدمی ہیں
ساری عمر گناہ کی میٹھی خواہش لئے
شاعرات کی راہ دیکھتے
انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے
مہمان کرتے رہے
اور کسی سے بھی فطری تعلق استوار نہ کر سکے
تو کیا آپ نے کسی اور سے پوچھا تھا
''ہم کہاں ہیں؟''
لگتا ہے گجرات سے ٹی ہاؤس تک کا سفر
آپ نے ستارے اور درخت گنتے گزار دیا
راستے پر نگاہ نہیں کی
ورنہ آپ کو ضرور معلوم ہوتا
کہ آپ کہاں کھڑے ہیں

مبارک صاحب!
آپ اپنی نسل کے شاید واحد شاعر ہیں
جو اپنی مرضی اور خوشی سے
ضائع ہو جانے کیلئے اس قدر محنت کر رہا ہے
آپ کی نزدیک کی عینک کے نمبر
واقعی درست ہیں
اسی لئے جب آپ
اس میں سے دور تک دیکھتے ہیں
تو ایسی شاندار آپٹیکل الوژن تخلیق ہوتی ہے
جس میں مبارک احمد
اور اس کے مسلسل والہانہ، فاتحانہ رقص کے سوا
کچھ اور دکھائی نہیں دیتا
مبارک صاحب
آپ زندگی کے دستر خوان پر
چاولوں میں موجود
دار چینی کے ذائقے کی طرح مزے دار ہیں
آپ جیسا کھرا مال
ہمارے معاشرے کی فیکٹری میں
تیار ہونا بند ہو گیا ہے
کہ اس کی مارکیٹ موجود نہیں
ہماری نسل
آپ کی غالباً آخری خریدار ہے
ہمارا خریدار کون بنے گا
اس بات کو فی الحال رہنے دیں
ہم آپ کو سینے سے لگا کر
بغل میں دبا کر رکھیں گے
کہ ہم ہر رائیگاں سچائی کو عزیز رکھتے ہیں!

مبارک صاحب!
آپ نے شاعری سے اپنے تعلق کو خوب نبھایا ہے
ایک وفادار، استوار برہمن کی طرح
آپ کو کعبے میں گاڑے جانے کا حق حاصل ہے
آپ کا خیال ہے
''کلیات مبارک'' آنے والی صدی کی
شاعری کی رہنمائی کا کام کرے گی
بہت سے عظیم الشان مغالطوں کے ساتھ ساتھ
اس تعلّی کا بھی آپ کو حق حاصل ہے
لیکن مبارک صاحب!
کامیڈی کو ابدیت پر ترجیح دینا
خطرناک ہوا کرتا ہے
اور "Clown" شاعر سے
آپ چھوٹی موٹی ٹریجڈی ہی کی توقع کر سکتے ہیں
''کلیات مبارک''
اسی ٹریجڈی سے جنم لینے والے
آنسوؤں کی ایک خوبصورت پھوار ہے
اور ہم اس میں بھیگنے کے لئے
بخوشی تیار بھی ہیں
لیکن ایک ایسا سمندر
جس میں آپ کے ساتھی ''پھووُں''
القسم قمر جمیل وغیرہم کے ساتھ ساتھ
ہماری نسل کے کچھ مگر مچھ بھی ڈبکیاں لگا رہے ہوں
آپ ڈوبتے اور ابھرتے رہیں
تو یہ بھی آپ کے لئے کافی ہے
اگر آپ بضد ہیں
تو ہم آپ کو

نثری شاعری کا بابا یا امام تسلیم کر لیتے ہیں
ویسے بھی آپ کو ناراض نہیں کیا جا سکتا
کہ آپ اپنی شاعری سمیت
مجھے اچھے بھی بہت لگتے ہیں
ایک جینوئن شاعر کے لئے
اعتراف کے طور پر لکھی گئی
ایک نظم بھی کافی ہونی چاہئے
خواہ اسے آپ ہی کے انداز میں لکھا گیا ہو
رہی عظیم شاعری
تو اصرار مت کریں
وہ موجود ہوئی تو سر چڑھ کر بولے گی
عظمت کا کچھ حصہ
وقت کے لئے بھی چھوڑ دینا چاہئے
زمانے سے زیادہ گواہیاں لینے کی کیا ضرورت ہے
کیا زمانہ عدالت ہے؟

نوٹ:۔
اس نظم کا عنوان مبارک احمد کی نظم ''زمانہ عدالت نہیں'' سے لیا گیا ہے۔ واوین میں دیئے گئے مصرعے اور لفظ مبارک صاحب کی نظموں سے لئے گئے ہیں۔ یہ نظم کلیات مبارک پر ایک طرح کا تبصرہ ہے اور ان کی زندگی میں چند دوستوں کے درمیان بیٹھ کر انہیں سنا چکا ہوں۔ افسوس وہ ہم میں موجود نہیں رہے لیکن اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتے ہوئے میں آج بھی لاہور کی کسی نیم تاریک راہگذر پر انہیں اپنی پرانی سائیکل کے ہمراہ چلتے پھرتے دیکھتا رہتا ہوں۔
اے دیا کہاں گئے وہ لوگ!

(ابرار احمد)

اسماء راجہ

۲۲ جون

ایک طویل دن کا ماتم
ہلکا ہو گیا ہے
اور بجھی ہوئی، تھکی ہوئی شام
نم ناک درختوں سے اترنے لگی ہے
بارش سے زمین گیلی ہو رہی ہے
تاریک و تاراج بستی میں
لٹے ہوئے لوگوں کے درمیان
رات آہ بھرتی ہے
آسمان کی بلندی
اور زمین کی گہرائی
ایسے دکھ سے بھر گئی ہے
جس کا کوئی مداوا نہیں
جانے والوں کے لیے
راستے ہموار ہیں
اور رہ جانے والوں کے لیے کٹھن
میں اپنے پاش پاش دل کو تھامے ہوئے
اس خارزار سے گزرتی ہوں
میں کہ ابھی زندہ ہوں
اور اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں
ان کی قبروں پر تازہ پھول ہیں!

(بھائی جان مرحوم راجہ مجید کے لیے)

عرفان احمد عرفی / چُپ

محترمی نصیر احمد ناصر، سلام مسنون: اُمید ھے اب آپ خیریت سے ھوں گے۔ خدا آپ کو صحت اور زندگی سے نوازے۔ "تسطیر" کی اشاعت میں تاخیر پر پہلے پہل تشویش ھوئی پھر معلوم ھوا کہ گزشتہ سال جولائی میں آپ کے والد صاحب کی وفات، پھر آپ کی علالت اور میرپور سے راولپنڈی منتقلی اِس کا سبب تھے۔ بہت دعائیں کیں کہ آپ جلد از جلد صحت مند ھو جائیں۔ خدا کا شکر ھے کہ اب آپ صحت مند ھیں۔ میں خود بھی گزشتہ ڈیڑھ برس سے مُلک سے باھر تھا۔ اُنھی دنوں جب میں نیو یارک میں تھا تو لاھور میں ھمارے دوست خاقان خاور دُنیا سے ھی چل بسے۔ کھنے کو خاور صاحب رشتے میں میرے ماموں تھے مگر بچپن سے اُن کے ساتھ وابستگی پھر فکری اور تخلیقی نشوونما میں اس تعلق کا حصہ، خاندانی رشتہ داری سے کھیں آگے بہت سی سطحوں پر تحریک کا باعث تھا۔ ۱۹۹۶ء میں ٹورنٹو کینیڈا میں دورانِ ھجرت ایک طبع آزمائی کی تھی یہ شخصی خاکہ ھے کہ میری تخلیقی و فکری نشوونما کی خود نوشت یا ھجرت کے دنوں میں تنہائی کے کشت میں سیلف ڈسکوری کا کوئی لمحہ، میں یہ فیصلہ دینے سے قاصر ھوں۔ جب وہ حیات تھے تو قاسمی صاحب نے "فنون" میں اسے شائع کیا تھا اور اب جبکہ میں وطن لوٹا ھوں تو خاور صاحب اس دُنیا میں نہیں ھیں۔ آپ کو تسطیر کے لیے ارسال کر رھا ھوں اگرچہ تسطیر کے لیے پھلے سے شائع شدہ تحریر ارسال کرنا روائت، اصول اور آداب کے خلاف ھے لیکن اِس کی دو وجوھات ھیں۔ ایک تو یہ کہ خاور صاحب کے اس دُنیا سے چلے جانے کے بعد اُنھیں Tribute دینے کا بہانہ بن جائے گا پھر "فنون" میں اس تحریر کی شکل اِس کی موجودہ صورت سے قدرے مختلف تھی، اب یہ اپنی مکمل اور ترشی ھوئی شکل میں حاضر ھے۔ تسطیر کے قارئین سے شیئر کرنا چاھتا ھوں۔ ھر لکھاری اور ادب دوست کی زندگی میں کوئی نہ کوئی شخصیت تو ضرور ھوتی ھے جو اُس کی فکری اور روحانی تربیت میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کرتی ھے۔ ممکن ھے پڑھنے والے اپنے تجربے کی روشنی میں اسے اپنے ساتھ Relate کر سکیں۔ یھاں یہ ذکر کرنا بے تعلق نہ ھو گا کہ خاقان خاور صاحب بھی آپ کی طرح ادبی حلقوں سے بہت کم سوشلائز کرتے تھے۔ اُنھوں نے سوائے ریڈیو پاکستان کے چند مشاعروں کے، کبھی کسی مشاعرے میں بھی شرکت نہیں کی تھی لیکن وہ ھم عصر شاعروں اور نثر نگاروں کے کام سے آگاہ

ضرور رهتے تھے۔ مجھ سے اکثر آپ کی نظموں کا تذکرہ کرتے رہتے اور تعریف کرتے، میں یہ سمجھتا رہا کہ آپ لوگوں کی کوئی دیرینہ دوستی بھی ھے مگر اب مُجھ پر کھلا ھے کہ آپ کی تو اُن سے ملاقات ھی بہت کم تھی یا شاید تھی ھی نھیں۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نھیں کہ ھم عصر شعرا کی ھم مزاجی اور قدر مشترک اُنھیں ایک ایسے ناطے میں بھی پرو دیتی ھے جسے لوگ دیرینہ دوستیاں سمجھتے ھیں۔ (عرفی، اسلام آباد، ۲۵ جنوری ۲۰۰۳ء)

تا کا تم می تی تی تام

تی تی تا دھت تی تا

اس روز ہماری استاد نے کلاس کے شروع ہی میں اعلان کر دیا کہ ہم سب عنقریب شہر کے معتبر تھیٹر میں پرفارم کرنے والے ہیں۔ اور ساتھ ہی پہلی مرتبہ پیش کئے جانے والے رقص کی کوریا گرافی (choreography) پر بھی بنیادی کام شروع ہو گیا۔

رقص کے فرش پر ہماری استاد جب ہمیں بنیادی جسمانی مشقیں سکھانے کے لئے اپنے جسم کو ذرا سی جنبش دیتی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھل اٹھتی تھی گویا جسے ہم مشقت سمجھتے اس کے لئے راحت ہوتی۔ من جیرے کے بولوں پر ہم پاؤں مارتے تو فرش پر دھمک تو پڑتی لیکن اندر کہیں لرز نہ اٹھتی۔ آ ڈو کرتے ہوئے بھی پاؤں فرش پر بدن کی ہڈیاں سرکا دیتے روح کی پوٹلی اندر ہی کہیں ڈول رہی ہوتی۔ اندر کا گرو کہیں سویا پڑا تھا، خاصا جھنجھوڑا، انگڑائی تھی کہ جاگتی ہی نہیں تھی۔ خاص طور پر جب سے استاد نے متوقع شو میں پیش کئے جانے والے رقص پر بنیادی کام شروع کروایا تھا تو ہم پر بہت واضح ہونے لگا کہ رقص کرنا اور رقص میں ہونا دو الگ تجربے اور کیفیات ہیں۔ کلاس میں شاید جسم تو ناچ ہی لیتا لیکن ہم نہیں...... نرت بھاؤ میں دھچکے تھے بہاؤ نہیں تھا۔ پھیکاپاہٹ تھی لہر نہیں تھی۔

''ہم نہیں سمجھتے کہ ابھی ہم آڈینس کے سامنے پرفارم کرنے کے قابل ہیں......''

آخر میں نے جرأت سے کام لیا اور تمام ہم جماعتوں کی نمائندگی کا ذمہ لے لیا...... اپنی استاد محترمہ کو میں نے یہ باور کرانے کی کوشش بھی کی کہ ہم میں سے اکثریت رقص اس لئے نہیں سیکھتی کہ اسے کر کے دکھایا بھی جائے۔

''رقص کر کے دکھانا رقص سیکھنے کا ہی ایک مرحلہ ہے۔ پیش کش نتیجہ نہیں سیکھنے کا عمل ہے۔ اتنا آپکو ایک استاد تین سو کلاسوں میں نہیں سکھا سکتا جتنا آپ بیس منٹ کی پرفارمنس میں تین سو کی Audience سے سیکھ لیتے ہیں''

''مگر یہ ناظرین کے ساتھ دیانت داری نہیں...... وہ اپنا وقت ہمیں سکھانے کے لئے تو نہیں نکالتے......''

''رقص دیکھنا بھی تو سیکھنا ہی ہوتا ہے...... رقص دیکھنے دکھانے کی چیز نہیں، سیکھنے سکھانے کی کیفیت کا نام ہے...... اس لئے اس میں شاباش اور تالی کو اتنی اہمیت نہیں جتنی تنقید کو ہے۔ داد اگر کچھ ہے بھی تو محض مزید سیکھتے چلے جانے کی حوصلہ افزائی ہے......''

آخر وہ ہماری استاد تھی، اس کی خواہش کے سامنے ہم نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ استاد کے سامنے گھٹنے ٹیکنا تو اتنا مشکل نہ تھا لیکن ناظرین کے سامنے گھٹنے بٹھائے رکھنا ممکنات میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بھرت ناٹیم کے مطالعہ کی ٹھان تو لی تھی مگر گرہ تھی کہ کھلتی ہی نہ تھی۔ آخر جسم کی اس قدر تکلیف دہ پوزیشن میں کیوں کر رقص کیا جا سکتا ہے۔ کتھک کے مقابلے میں بھرت ناٹیم اس لئے غیر آرام دہ اور غیر فطری محسوس ہوتا ہے کہ اسے اردھ منڈھلی یعنی آدھی بیٹھک میں رہ کر پرفارم کرنا پڑتا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ سچ کی آواز ہوتی ہی نہیں...... یعنی سچ صرف تجربہ کرنے اور محسوس کرنے کی چیز ہے اوڑھنے کی نہیں جب کہ آواز پہناوا ہے، ثبوت ہے اور وہ سچ سچ نہیں جو ثبوت کا مرہون منت ہو......

ہوسکتا ہے جو سچ ثابت کئے جاتے ہوں اصل میں جھوٹ ہوں۔ سچ تو خامشی میں پنہاں ہے ھنائے میں گم ہے اور جسکی امان میں ہے صرف اسی پر روشن ہے۔ سوچتا تھا جب بھی کبھی سچائی پیشکش بنتی ہے، کیا خالص رہتی ہے؟ اپنے سچ میں کسی دوسرے کو شریک کرنا راز کی مٹھی کو کھول کر مصافحہ کرنے والی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ روحانی تجربے کو فارم دے کر پیش کر دیا جائے تو اس کے کھرے پن Genuiness کو کس حد تک ضرب پہنچتی ہے اور پیش کار اس تجربے کی اصلیت کا ابلاغ کس حد تک کر پاتا ہے...... اسی تجسس نے مجھے بھی گرو کی دہلیز پر جوتیاں سیدھی کرنے پر لگا دیا تھا۔

آخر شو والی شام آ گئی، سٹیج پر سے پردہ کیا سرک رہا تھا گویا روح کے اوپر سے جسم سرکنے لگا۔ پتہ نہیں وہ بیس منٹ کیسے گزرے۔ رٹا رٹایا سبق تھا جو دہرا دیا۔

استاد تھی کہ بضد تھی، نئی نئی پیش کش، ریہرسل پر ریہرسل، ریاضت در ریاضت، ہر برس ایک آدھ پبلک پرفارمنس جسے ہم کانپتی ٹانگوں کے ساتھ جیسے تیسے کرتے چلے گئے۔ بات تھی کہ بن نہیں پا رہی تھی۔

مگر تالیوں کے اس شور میں کہیں خاموشی بھی تھی، جس پر ہم نے کبھی کان نہ دھرا تھا۔ ہمارا خیال تھا خاموشیاں بھی کوئی کان دھرنے کی چیز ہیں۔ یہ معلوم نہ تھا کہ دھیان کرنے کی ضرور ہیں۔ آوازوں کو تو ہم فیڈ بیک سمجھتے ہی ہیں، خاموشیوں میں بھی بہت سے پیغام ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہم کم سوچتے ہیں۔ اور وہ جو ہم کم سوچتے ہیں، وہی قابل توجہ بھی ہوتا ہے۔ معلوم ہوا ناظر کی اصل داد وہ ہے جو تالی تک پہنچ نہیں پاتی۔ تماشائی جو رقص میں گم ہے۔ اصل میں خود رقص میں ہی ہے، سو اپنے آپ پر تالی بجانا کسے زیب دیتا ہے؟ تھیٹر میں دراصل وہ موجود ہے جو خود کو اسٹیج پر بھی دیکھ رہا ہے اور جب ہمارے کانوں میں ہماری اصل آڈینس کی وہ "واہ" اور وہ "تالی" پڑی جو اندر رہ جاتی ہے تو ہم پر کھلا کہ اب ہم بھی سٹیج پر رقص کر نہیں رہے ہوتے رقص میں ہوتے ہیں...... اب کہیں جا کر پہلی گرہ ڈھیلی پڑی کہ سارا عمل اندر کی دریافت کا ہے...... رقص تو اندر کا ایک موسم ہے۔ استاد رقص دیتا نہیں نکالتا ہے...... رقاص رقص کرنے والا نہیں، روحانی اور جسمانی سطح پر ایک ایسے تشخص کا نام ہے جو بنتے بنتے بنتا ہے۔ پھر وہ جو کچھ بھی کہتا، کرتا، لکھتا، سوچتا اور سونپتا ہے، رقص ہے۔ رقص تو ایک ایسا توازن ایسا Posture ہے جو صرف جسم کو نہیں روح کو بھی اپنانا ہوتا ہے۔ سیکھنے اور اپنانے میں یہی فرق ہے۔ جسے ہم ڈسپلن سمجھتے رہے وہ ڈسپلن نہیں ڈسکوری ہے۔ ڈسپلن تو کیلنڈروں اور گھڑیوں میں تقسیم اور محدود رہ کر

کلاسوں، ورکشاپوں، سیمیناروں، مقالوں، مباحثوں اور مذاکروں سے حاصل کرنے کی چیز ہے۔ رقص ''حصول'' نہیں ''دین'' ہے یہ وقت نہیں سپردگی مانگتا ہے۔ باہمی دستبرداری ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان، پرفارمر اور آڈینس کے بیچ۔

پہلا در جو وا ہوا تو معلوم ہوا کہ استاد کوئی نہیں...... وہ ''ایک'' جو اپنے سامنے ''بہت سوں'' کو بتا رہا ہوتا ہے اصل میں اپنا آپ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اپنا کام آگے بڑھا رہا ہوتا ہے۔

سٹوڈنٹ منزل نہیں راستہ ہے۔ جو تھک جاتا ہے جس کی سانس پھولنے لگتی ہے ''گرو'' کی پیڑھی پر براجمان ہے دوسروں کو آگے اور آگے جاتا دیکھتا ہے۔

''خاقان خاوریت'' بھی کچھ اس طرح کا ایک وقوعہ ہے۔ ایک ایسا Outlook لائف اسٹائل جو ہفتوں، مہینوں اور برسوں پر محیط جانکاری سے نہیں Live کرنے سے کھلتا ہے۔ زندگی کو دیکھنے اور کرنے کا رویہ ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس زاویے کی دریافت میں کسی شاگردی، بیعت یا سپردگی کی ضرورت نہیں۔ اس میں کسی گرو، استادی، پیری مریدی یا آستانے کا عمل دخل نہیں، یہ کسی فورم، پلیٹ فارم پر بھی حاصل نہیں ہوتی اور نہ اس میں کسی تراش خراش کا ہنر درکار ہے...... یہ کسی بھی طرح کی شفقت یا وابستگی کے سائے میں ملنے کی چیز نہیں...... کسی روشنی، گیان کا اعلان نہیں جو حواریوں اور ماننے والوں کی فوج تشکیل دے۔

دراصل ''خاقان خاوریت'' تربیت نہیں پرورش ہے اپنے آپ اپنی رو میں بہے چلے جانے کی۔ ''جو جیسے ہے اور جدھر ہے'' کے پہنچنے کا نام ہے ''جو ہونا اور نہیں ہونا چاہیے'' کی قائل نہیں۔ ذات کے تشخص میں فراہم شدہ فطری امکانات کے روشن ہونے کا نام ''خاقان خاوریت'' ہے بیک وقت کھلنا، مرجھانا، بلکنا، بہہ جانا، ملنا اور گم جانا خاقان خاوریت ہے۔ اب یہ میرا تجربہ کیسے بنی، دیکھیے میں کس حد تک گرفت میں لا سکتا ہوں۔

یہ بچپن کے ان دنوں کی بات ہے، جب پہلی بار جاڑے کی گرم دھوپ میں سرسراتا سنہرا پن دکھائی دیتا ہے۔ ایک مسکراتا ہوا چہرہ اور نرم گرم روئی سے کچھ بھرا کچھ خالی لحاف نما آرام دہ سا شخص ہمارے گھر طویل وقفوں کے تسلسل میں نہایت بے قاعدگی سے آیا کرتا تھا، اس کے بارے میں دو تین باتیں سن رکھی تھیں کہ وہ ''ماموں اعجاز'' ہے۔ امی کا کزن ہے۔ شاعر ہے اور یہ کہ بال بچے دار نہیں ''لالہ جی'' میرے نانا جان پیر فضل گجراتی کو امی سے بہتر طور پر جاننے والا ایک ہی Package میں بوڑھا، بچہ، لڑکا، لڑکی، بڑھیا، ادھیڑ عمر، آدمی، عورت، عجیب Genderless Ageless اور Timeless سا، یہ بادل نما شخص، بے کون شاید اتنا تو معلوم تھا آتا کہاں سے تھا اور کیوں آجاتا تھا پتہ نہ چلتا تھا...... اب یہ سامنے بیٹھے شخص پر منحصر ہے، کہ وہ اس پیکج میں سے اپنے لئے کیا منتخب کرتا ہے...... میری بہن غیناں جسے عمر بھر لفظوں، پھولوں اور بچوں نے کملائے رکھا، پہروں اسے پاس بٹھائے رکھتی شاید وہ واحد انسان تھا، جو اس کے ساتھ اسی کی عمر کے موسم میں ٹھہر جاتا۔ وہ ان دنوں رنگ رنگ کے کاغذ کے پھول بنانے میں لگی رہتی اور یہ شخص مٹی کا برتن بنا اس کے سامنے پڑا رہتا جسے وہ کبھی ''ڈسٹ بن'' سمجھ کر برتتی اور جب چاہتی گلدان کہ گملا بنا دیتی...... یہ گل گر کی مرضی پر تھا اس شخص کی دستیابی کس سے مس نہ ہوتی۔ ائی کے پاس بھی بیٹھا ہوا کم اور سامنے پڑا ہوا زیادہ ہوتا...... امی بولے چلی جاتیں

اور یہ سنے جاتا۔ اگر کوئی بات کہتا بھی تو وہ بات بھی اس کی نہ ہوتی، امی کی ہی ہوتی جسے وہ خود لفظ نہ دے سکتی تھیں ۔ حالانکہ وہ زمانہ ریموٹ کنٹرول اور ملٹی چینلز کا نہیں تھا لیکن اب یاد آتا ہے کہ امی اس سہولت سے بہت پہلے لطف اندوز ہو چکی تھیں۔ گویا ان کی ہر بات بٹن پریس کرنے کے مترادف ہوتی اور سامنے سکرین پر کبھی ان کی خالہ، کبھی ماں جی، کبھی کوئی کزن، کبھی سہیلی، کبھی بھائی، ہر رشتہ ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہوتا اور ہر وہ بات جو وہ اس خاص رشتے کے سامنے نہ کہہ سکتی تھیں اس بہانے کہے چلی جاتیں ...... ابا جان کے ساتھ بیٹھا ہوتا تو لگتا دو نوجوان زندگی کی گلی میں مخالف سمتوں سے آتے ہوئے اچانک بزرگی کے موڑ پر آ ملے ہیں۔ باجی اپنی سوچوں کے کمرے سمیت عمر کے دوپٹے سے بے نیاز یوں دوڑی آتی جیسے ان کی کوئی کلاس فیلو شادی کے بعد پہلی بار ملنے آئی ہو...... رہی بات بھائی جان کی تو اس شخص کی جیب میں بھرے پرس پر بھائی جان کم اور ان کے دوست زیادہ حق جتاتے۔ میرے کلاس فیلو بھائی مٹھے کی دال کھٹی بھی ہوتی تو اس شخص سے پھوٹتی حرارت کے سامنے گل جاتی۔ میرے لئے اس کا شاعر ہونا باعث کشش ضرور تھا لیکن کسی کام کا نہ تھا...... ان دنوں نیشنل سنٹر میں اگر کسی تقریری مقابلے میں جاتا اور کسی سے ذکر کر بیٹھتا کہ میرے ایک ماموں ہیں جن کا نام خاقان خاور ہے اور شاعر ہیں تو ساتھ یہ بھی بتانا پڑ جاتا کہ بہت اچھے شاعر ہیں...... فخر کی ساری جھاگ بیٹھ جاتی کوئی جانتا ہی نہ تھا'' خاقان خاور'' نام کا بھی کوئی شاعر ہے، تو اس کے اچھے یا بہت اچھے ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا...... یہ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ شاعر خاقان خاور کو ہر وہ شخص جانتا ہے جسے دراصل جاننا چاہیے۔ اور جو شاعر خاقان خاور کو نہیں جانتا وہ جاننا چاہتا ہی نہیں کہ اردو شاعری کن جدید رستوں پر رواں ہے۔

خیر بات ہو رہی تھی'' ماموں اعجاز'' کی۔ ہوتا یہ تھا کہ اس ماموں کا ظہور ہوتا اور پھر پردہ غیب میں غائب...... مہینوں، برسوں کوئی خبر نہ ہوتی...... کوئی پتہ، کوئی ٹھکانہ کوئی فون نمبر؟...... کسی کے پاس کوئی سرا نہ ہوتا......

لیکن ٹھکانے کے بارے میں کسی بھی طرح کی معلومات کی اہمیت بھی کیونکر...... کیا وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر گیا ہوتا...... کوئی کمٹمنٹ، کوئی پروگرام، کوئی ارادہ...... یا وہ ہماری کوئی چیز لے گیا ہوتا جس کی واپسی درکار ہوتی...... نہیں ایسا کچھ بھی تو نہیں ہوتا...... تو پھر کیا اس سے ملاقات کرنے کو جی چاہتا، اسے ہم مس کر رہے ہوتے، کوئی اداسی، زیارت کے لئے تڑپ...... کچھ بھی نہیں......

ہم سب اپنے اپنے شور میں زور کیے جاتے کہ اچانک کسی بھی سہ پہر اس کی چاپ قریب آتی سنائی دیتی تو بے اختیار ہم اس کی آمد پر تالی بجا کر اپنے اپنے دربار میں تخلئے کا اعلان کر دیتے۔ معلوم ہوتا گم وہ نہیں ہم ہو گئے تھے، امی کچھ عرصے سے رونا چاہتی تھی، انہیں کوئی پلا نہیں مل رہا تھا جس سے وہ آنکھوں کی نمی، آنسو بننے سے پہلے پونچھ سکتیں، نیناں کی قینچیاں کہیں گم ہو چکی ہوتیں جس کی وجہ سے اس نے کوئی پھول نہیں بنایا تھا۔ ابا جان کہیں کوئی کتاب رکھ کر بھول گئے ہوتے، باجی اپنی بھنوئیں باریک کرنا بھول گئی تھیں، میں اپنے امتحانوں کی ڈیٹ شیٹ الٹی سیدھی طبع آزمائی سے کالے کیے کاغذوں میں گما چکا ہوتا۔ مثلاً اپنا رزلٹ معلوم کرنے ابھی سکول نہیں گیا تھا اور بھائی جان نے ابھی تک اپنا Resume ٹائپ نہیں کروایا تھا، وہ ہر ایک کو یاددہانیاں دے کر پھر چلتا بنتا۔ یوں بھی وہ گم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا کنبہ اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ وہ جہاں تک جاتا، فیملی میں

ہی رہتا، اسے ''اعجاز'' چاچا'' ''بھائی جان'' ''چاچا جی'' ''خاور صاحب'' ''خاور'' اور ''یار'' کہنے والے اور والیاں ہی بہت نہیں تھے درخت، پھول، پتے، آندھیاں، کبوتر، چڑیاں، گائے بھینسیں، کتے، بلیاں، پارک، بنچ، کوے، شامیں، فٹ پاتھ، سڑکیں، ریل کی پٹریاں، نہریں، پگڈنڈیاں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر، ریگ زار اور تالاب بھی اس سے سے باتیں کرتے، اس کا خیال رکھتے، اور اس کے استقبال میں سرنگوں رہتے۔ یوں بہت سی زاہدہ باجیاں، ایاز، تاجی، نابی، عرفی، شیخ، فیدیاں، مسرتیں، آپا عصمتیں، مودے، اختر، عالم گیر، زبیر، فطینیں اسے ڈھونڈھنے میں گم رہتے ہیں، حیرانی کی بات ہے کہ وہ اتنے ساروں میں بٹ چکا ہے، مگر پھر بھی ہر ایک کو ''پورا'' میسر ہے اس کی وجہ بھی شاید یہ ہے کہ وہ جڑنے کا نہیں پھیلاؤ کا قائل ہے۔ کسی کو بھی اپنانے کی آرزو شاید احساسِ عدم تحفظ کا نتیجہ ہوتی ہے اور جس کا کوئی Social Ambition ہی نہیں اسے Insecurity کیسی...... ؟ دوسروں کو خود سے بہتر نہ صرف دیکھنا، بلکہ خوشی سے برداشت کرنے کا ظرف معمولی بات نہیں کم از کم میرے لئے، اس پر یہ کہ اس بہتری کی اساس محض آپ کی عمر بھر کی فکری جمع پونجی ہی نہیں معاشی تو تیں بھی ہوں جب کہ آپ کسی بھی طرح کی پذیرائی، نیک نامی اور اجر کی خواہش کے بغیر یہ سب کچھ تیاگ رہے ہوں...... ایسے بے لوث جذبوں کا قحط تو انسان دوستی کے جزیرے میں موسموں سے نازل ہے مگر اس کے ہاں درویش کے لنگر کی سی فراخدلانہ رسد ہے۔ ان واقعات کی نہ تو اسے گواہیاں درکار ہیں اور نہ شاباشیں، وہ ثابت کرنے، متاثر کرنے، منوانے اور قائل کرنے کے تمام شوقوں سے آزاد ہے، اسے بھی اس کا شوق ہی کہیئے، کبھی تو مجھے یہ اس کی ایک ادا محسوس ہوتی ہے۔ اصل میں اس نے بھی اُن سودوں کی منڈی لگا رکھی ہے جو جتنا لٹتے جائیں اور بھی ذخیرہ ہونے لگتے ہیں......

اب ایسا بھی نہیں کہ وہ کوئی فیملی کونسلر یا ماہر نفسیات ہے جو اس نے ہر گھر میں اہل خانہ کو فرداً فرداً ان کی جذباتی اور نفسیاتی کجرویوں کا شعور دے رکھا ہے اور یوں اپنے چلے آنے کی جگہ بنا رکھی ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو گوجرانوالہ میں تعینات کسی ڈپٹی کمشنر کے آفس کا وزٹر روم، جہلم کے کسی حجام کی ٹوٹی ہوئی کرسی اور گجرات کے کسی سوسہ فروش کا بینچ اس کا راستہ نہ دیکھ رہا ہوتا۔

اگر اس نے یاریوں میں کبھی کسی دکھائی دیتی زندگی کا پیمانہ نہیں رکھا تو اپنے لئے بھی زندگی کی سہولتوں کو ضروری نہیں جانا...... ملازمت کی منڈی میں اگر اس کی خدمات کی بولی زیادہ لگی ہے تو اس نے خود ہی اپنی قیمت کم لگائی ہے۔ اس کے لئے زندگی سہولت ہے حق نہیں۔ بھلے وہ گجرات، جہلم، پنڈی اسلام آباد کی بسیں، ویگنیں، رکشے، تانگے ہیں کہ Chauffer(Shah Sahib)Driven Car ہے وہ انہیں Fringe Benefits ہی سمجھتا ہے Entitlements نہیں۔ اصل میں وہ سب کو سہیلی بنا لیتا ہے۔ یہاں میں لفظ دوست، یار Friend، غمگسار، ہمدرد کچھ بھی استعمال کر سکتا تھا لیکن ''چنی سہیلی ہی بدلتی ہے...... '' اب ہوتا یہ ہے کہ اس کو جو بدلے میں چنی ملتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بھیگی ہوتی ہے بلکہ اس کے رنگ بھی گھل چکے ہوتے ہیں۔ لیکن اس نے جو ''چنیاں'' اپنے پاس لگا رکھی ہیں ان پر نہ تو کوئی آنسو ہے نہ رنگ پھیکے، میں نے اسے ماں جیسی بہن تو کیا ماں کے جنازے پر بھی مسکراہٹ میں ہی دیکھا ہے، لوگوں میں جو گھرا ہوتا ہے، لیکن مجھے یقین ہے

کہ جب اس کا منہ کسی درخت کی جانب ہوگا تو شاخوں نے جھک کر اپنے پتوں میں اس کے آنسو رکھ لئے ہوں گے۔اصل میں اس کی غم گسار اس کی محبوبہ ''نیچر'' ہی ہے۔
کبھی تو مجھے لگتا ہے فن ایک ایسی ہی پناہ ہے جو''نمائش کے جذبے'' کو کچھ اس خوبصورتی سے کیموفلاج کرتی ہے کہ آپ اسے فکری بقا کا سوبر سا رتبہ دے سکتے ہیں۔کبھی کبھار مجھے شاعر کے کام پر بھی شبہ ہوتا ہے۔اگر چہ وہ اپنے تجربے کو مارکیٹ تو نہیں کرتا لیکن نہایت محتاط الفاظ میں اس مارکیٹنگ کو شیئرنگ کہہ دیتا ہے۔لیکن پھر بھی اسے منڈی میں پہلے سے موجود مقابلے کی فضا میں تو بہر طور حصہ لینا ہی پڑتا ہے۔یوں بہتری کے معیار قائم کرنے کے لئے متاثر کرنے اور چونکانے یا ثابت کرنے کی کوشش کو شعوری گر تو کہا ہی جا سکتا ہے۔پھر ایسے میں دعا اور داد کا طلب گار کون نہیں...... جبکہ بذاب خود بقا کی اپنی واحد جبلت بھی اظہار ہی ہے۔جہاں اظہار ہے بقا بھی وہیں ہے۔گویا بقا اور اظہار لازم وملزوم ٹھہرے۔لیکن میں نے اس شخص کو اپنے اظہار، اپنی تخلیق اور اپنے فن کو بھی مسترد کرتے ہوئے دیکھا ہے...... اپنے شاعر ہونے پر سوال اٹھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔
شاعری کا پہناوا بھی زندگی کی ترجیحات میں اہم اور غیر اہم حوالوں سے اپنا مقام اسی طرح بدلتا رہا جیسے Two Pieces Summer Suit کا ارادہ پرونے میں ہی موسم گنوا دیا جاتا ہے...... اگر کسی چیز میں اس نے اپنی کمٹمنٹ ثابت کی ہے تو وہ ''تجرد'' ہے۔اب تجرد بھی کئی قسم کا ہوتا ہے شاعرانہ، راہبانہ، غائبانہ، معذرت خواہانہ، عاجزانہ، ہمدردانہ، منافقانہ، فاتحانہ، یا صوفیانہ وغیرہ وغیرہ،لیکن خاقان خاوری تجرد ایسی کسی بھی کلاسیفیکیشن کے زمرے میں نہیں...... پھر بھی اگر قریب قریب کسی خانے میں مختص کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ ''رضا کارانہ'' ہے...... اکیلے ہونے اور تنہا ہونے میں فرق ہے۔
تجرد کا خیال آتے ہی سب سے پہلے جو بات ذہن میں آتی ہے وہ جنسیت ہے اور جنسی امر کو ہم Narrow Understanding (تنگ فہمی) میں فقط Genetal Activity تک محدود کر دیتے ہیں۔اس سے زیادہ ہم اس کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔سو یہ ہم پر اس سے زیادہ کھلتا بھی نہیں...... یہی وجہ ہے کہ تجرد کے بارے میں بھی مروجہ تصورات جنس کے گرد ہی گھوم رہے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے تہذیبی شعور کی موجودہ فضا اتنی صحت مند ضرور ہے کہ متذکرہ باب میں پہلے سے موجود بہت سے الفاظ اور تراکیب ریٹائر کر دیئے جائیں۔ورنہ یہ الفاظ یہ Big Bosses ہماری سوچ کے امکانات پر مزید کئی صدیاں حکومت کرتے رہیں گے۔کیا ہم اپنی آنے والی نسل کے لئے جنس کے حوالے سے صحت مند، روشن، پاکیزہ، اور خوبصورت الفاظ اور تراکیب نہیں چھوڑ سکتے۔یوں تعفن، گھن یا ملامت کے لال بیگوں سے صاف فضا میں جنسیت سانس لے سکے گی۔کیوں نہ ہم اپنے بچوں کو ''خود لذتی'' کی بجائے استغراق نفس یا نفسانی مراقبہ (sensual meditaition) کی ترکیب ورثے میں دے کر جائیں۔اول تو اس ضمن میں ابھی ہماری ادبی فضا، ہماری زبان اردو کا بھی اپنے منافقانہ رویے پر غور کرنا باقی ہے چہ جائیکہ ہم بہتر فکری ورثہ چھوڑنے کی بات کریں۔
یہاں میں واضح کرتا چلوں کہ خاقان خاوریت کسی بھی مکتبہ فکر، روحانی سلسلے یا ادبی تحریک یا فلسفے کا نام نہیں......

وہ تو علم کی بات ہی نہیں کرتا، آ گہی کی بات کرتا ہے وہ بھی ''نہ جاننے'' کی آ گہی Awareness of ignorance، وہ کوئی صوفی یا درویش بھی نہیں۔ روحانیت بھی جب Clinical ہو کر گدی پر آ بیٹھتی ہے تو کس حد تک اپنے اصل مقام پر ہے، یہ گتھی سلجھانا ابھی باقی ہے۔

اپنی بصیرت پر مجھے مان تو نہیں لیکن حس جمالیات پر اتنا اعتبار ضرور ہے کہ حسن جسے ادراک حسن ہو اور وہ حسن جسے خبر نہ ہو اپنے حسن کی، میں کیا فرق ہے پہچان سکتا ہوں۔

حسن پر تو کسی کا حسن نظر بھی روشنی ڈال دے تو حسن کے کھرے پن پر تعصب کا سایہ منڈلا جاتا ہے شاید اسی لئے ہم سب Highlighted Beauties اور Pointed Out Pureties اور نشاندہیوں کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ حسن کو اپنے تجربے میں براہ راست Capture کرنے کے بہت سے خوبصورت مواقع کھو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سچائی (حسن) کا First Hand Experiecne ہماری توجہ کے دائرے سے باہر ہے۔ (یعنی ہم بدھ مت پر ایمان تو لے آئیں گے بدھا بن کر جنگل میں نہ نکلیں گے۔) اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہم ''موجود'' کو اس کے مقام پر ٹھہر کر دیکھتے ہی نہیں، جو لمحہ پاس ہے، جس میں جی رہے ہیں اس پر رکتے نہیں، کل کیا ہوگا؟ کی زیادہ فکر ہے۔ ''آج کیا ہے...... ابھی کیا ہے کا گیان ہی نہیں...... کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں تو زیر نظر لفظ محسوس نہیں کریں گے، آنے والے لفظوں کے بارے میں زیادہ سوچیں گے...... کتاب، مضمون، کہانی، ڈرامہ، فلم...... ختم کب ہو رہا ہے، آگے کیا ہے نتیجہ کیا ہے؟ انجام کیا ہے......؟ کی عجلت میں وہ سارا لطف، سارا لمس، سارا احساس جانے دیتے ہیں جو ''لمحہ موجود'' ہمارے لئے لے کر آیا تھا۔ ناموجود کی تلاش میں موجود گنوا رہے ہیں اس Future oriented life مستقبل تناظری میں ''حال'' نکلا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ''فرصتیں'' کھو رہے ہیں اور مصروفیتیں ڈھو رہے ہیں......

حتیٰ کہ ہم اپنے بچوں میں ان کا بچپن رہنے نہیں دے رہے، ساری تیاری بڑھاپے کی کر رہے ہیں۔ سارا ''فوکس'' ان کے کچھ بن جانے پر ہے...... اور ان کا کچھ بن جانا، بھی دراصل ہماری اپنی محرومیوں، حسرتوں اور خواہشوں کی تعبیر ہے...... جس تعبیر کی اساس، خواب، راکھ اور خیال ہوں ایسے ڈھانچے پر کیا تکیہ......؟

دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے بچوں کے پاس Thrill کیا ہے......؟ حیرت اور کہانی کون سی ہے......؟ انجان سے مکالمہ یعنی Alien سے ڈائیلاگ...... تو کیا جب کل کے انسان کا انجان سے پہلا مکالمہ ٹھہرے گا تو اسے کسی یوم احتساب کی بشارت دے گا......؟ ہرگز نہیں...... اسے سٹار وارز کا بھی نہیں Star Peace کا پیغام دینا ہے اور انسان کو اپنا تعارف کرواتا ہے تو کچھ یوں کہ ''میں انسان ہوں اور سمندروں، صحراؤں، جزیروں، جنگلوں، پرندوں اور درندوں کے ساتھ ایک اور سیارے پر رہتا ہوں جسے زمین کہتے ہیں۔''

سیلف نالج بھی تو منزل نہیں اسی لئے میں کہتا ہوں خاقان خاور علامت نہیں، استعارہ نہیں، اشارہ ہے اس سمت کا جو اس خود استفساری کی طرف لے کر جاتا ہے جب ''میں'' اور ''انسان'' کے بیچ کسی شناخت، کسی نام کی کوئی لکیر نہیں رہتی۔

دور اندیشی آج کے ''جدید انسان'' کی دانش مندی سمجھی جاتی ہے...... سکوت، خالی پن، ٹھہراؤ کو ''اکتاہٹ''

(بوریت) جانا جاتا ہے اور Excitement (غل غپاڑے) thrills بے چینیاں، اٹھکیلیاں، اضطراب زندگی منانے Celebrate کرنے کے گُر جانے جاتے ہیں اصل میں یہ تمام Created joy خودساختہ مسرتیں ''جو ہے'' سے فرار کا راستہ ہے...... فاسٹ فارورڈ کے بٹن کو دبا کر نارمل سپیڈ پر چلتے ہوتے ہوئے موڈ سے بھاگ رہے ہیں۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ سارا سفر The end کی جانب ہے...... مگر میں نے اس شخص کو آج تک ''بور'' ہوتے نہیں سنا اور نہ ہی دیکھا ہے۔ میں نے کیا کسی نے بھی خاقان خاور سے اکتاہٹ کی شکایت نہ سنی ہوگی...... اور نہ ہی اس نے آج تک تنگیٔ وقت کا اظہار کیا ہے...... آپ اسے جب چاہیں اپنے کسی مقصد کے لئے بلا لیجئے اس کی ڈائری میں Appointment کا صفحہ خالی ہوگا، آپ کی سہولت کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف آپ ہی کا نام لکھ دیا جائے گا...... وہ کبھی نہ کہے گا ''میرے پاس وقت نہیں۔ میں بہت مصروف ہوں......''

آپ نے کبھی سوچا ہے ایسا کیوں ہے...... جب تک جھیل اپنے سکوت میں گم ہے بور نہیں ہو رہی بھلے اس میں کوئی کنکر پھینکے یا نہ پھینکے، دریا اپنی روانی میں بہہ رہا ہے اکتا نہیں رہا، پیڑ اپنی جگہ پر ہیں، موسم زرد آئیں کہ سبز وہ اچاٹ نہیں ہوتے، پہاڑ اپنے مقام پر صدیوں سے پڑے ہیں، چڑیا شاخ پر پہروں بیٹھی ہے، پھول کیاری میں ہے کہ گلدان میں، اس کے پاس وقت ہے، اکتاہٹ نہیں، ہر آنکھ کے لئے ہر سانس کے لئے وہ دستیاب ہے، جب تک ''فطرت'' بور نہیں ہوتی خاقان خاور بور نہیں ہوگا۔ جب تک آپ کے لئے آسمان کے پاس وقت ہے، ہوا کے پاس وقت ہے، گھاس کے پاس وقت ہے، برگد کے سائے کے پاس وقت ہے، لان کے پاس وقت ہے، فٹ پاتھ کے پاس وقت ہے، خاقان خاور کے پاس بھی وقت ہے۔

بہت سال پہلے جب میں لندن میں ایک سڑک کے کنارے ایک بچے کو سکول چھوڑنے جا رہا تھا تو اس نے اچانک راستے میں ہی سکول جانے سے انکار کر دیا۔

Mamoon I do not want to go to school I want to be with you

میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا ....I do not wnat to act as a good boy

I have to be a good boy in school تو کیا جب وہ اسکول کے علاوہ ہوتا تھا تو بیڈ بوائے ہوتا تھا......؟ یہ ''گڈ بوائے'' یا ''بیڈ بوائے'' میں کیا فرق ہے؟

وہی جو ''جو ہے'' اور ''جو ہونا اور نہیں ہونا چاہیے......'' میں ہے۔

''اچھا آدمی'' تو مر کر ہوتا ہے۔ خوبیاں تو مرحومین میں ہوتی ہیں، زندگی کے ساتھ اچھائی کا کیا واسطہ۔ اپنے اپنے مقام کا قرینہ تو ''عجائب گھروں'' میں ہوتا ہے، یادگاریں، اور مزار مؤدب ہوتے ہیں، چلڈرن پارکس نہیں...... وہاں تو زندگی پر تول رہی ہوتی ہے...... اور آج پندرہ برس بعد جب کہ میں ادھر ٹورنٹو کینیڈا میں ہوں اور وہ بوائے جو پتہ نہیں گڈ ہے کہ بیڈ لندن کی ایک یونیورسٹی میں عمر کے اس موسم میں ہے جب خبر نہیں ہوتی کہ کس شام نظم ہو جائے کہ محبت، سامنے میز پر اس کا خط پڑا ہوا ہے، مجھے جس کا جواب لکھنا ہے۔ آیئے آپ بھی میرے ساتھ شامل ہو جائیں اسے خط لکھتے ہیں۔ یوں بھی لکھی ہوئی ہر سطر کی اپنی ایک بھلو گرانی

Bibliography ہوتی ہے۔ ہم جو کچھ بھی لکھتے اور سوچتے ہیں اس میں اکیلے نہیں ہوتے، ہمارے ساتھ بہت سی جگہیں، لوگ، دوست، کتابیں اور موسم بھی اس مصرعے اور خیال میں اپنا حصہ رکھتے ہیں۔

پیارے جنید!

تمہاری نظم میرے سامنے ہے تمھیں اس سے محبت ہے جسے کسی او سے ہے اور تم جس جذباتی کرب سے گزر رہے ہو مجھے اس کا انداز ہے لیکن ساتھ ہی مجھے خوشی بھی ہے کہ اس بہانے تم محبت کے لفظ سے واقف ہوئے ..... مگر محبت کے لفظ سے وقف ہونا محبت سے واقف ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ محبت کو اس سے وابستہ تمام لفظوں سے الگ کر کے سمجھنے کی کوشش کی جائے آؤ دیکھتے ہیں محبت کیا ہے..... ؟

کیا محبت حادثہ ہے جو فقط اک تجربہ ہوتا ہے ..... جس کی یاد سی رہ جاتی ہے ..... مگر یاد مرے ہوئے لمحوں کی قبر ہوتی ہے جب کہ محبت زندگی ہے ..... سو محبت اس سے بھی زیادہ کچھ اور ہے۔ تو کیا محبت ایک احساس ہے۔ مگر احساس تو وقتی طور پر جاگتا ہے اور اس وقت تک رہتا ہے جب تک جگے رہنے کی وجہ رہتی ہے۔ تو کیا محبت اعتراف ہے۔ مگر اعتراف تو نمائش ہے اور محبت میں کوئی ''میں'' اور ''تم'' نہیں۔ میرا اور تمہارا نہیں ..... ''میں'' اور ''تم'' تو ناطہ ہوتا ہے۔ محبت تعلق بھی نہیں۔ تعلق وسوسہ ہوتا ہے۔ کھو دینے کا ڈر۔ خود کو بھی اور دوسرے کو بھی۔ تعلق آئینہ ہوتا ہے جس میں ہم اپنا آپ دیکھتے ہیں کبھی محبوب کی شکل میں کبھی عاشق کی صورت میں، آئینہ ٹوٹ جاتا ہے اور یہ سب نرگسیت ہے، محبت اس سے بھی زیادہ اور کچھ ہے، تو پھر کیا محبت اپنائیت ہے ..... لیکن اپنائیت میں ملکیت ہوتی ہے، جلن ہوتی ہے، مقابلہ ہوتا ہے، احساس عدم تحفظ ہوتا ہے، لاحاصلی ہوتی ہے۔

محبت جذبہ بھی نہیں ..... جذبوں کا استحصال ہوتا ہے ..... جذبوں کی عمر ہوتی ہے، محبت تو بے عمر ہوتی ہے۔

محبت منزل بھی نہیں ..... منزل تو ایک اور راستہ ہوتی ہے، محبت سفر نہیں، سفر میں تو فاصلہ ہوتا ہے جب کہ محبت کی کوئی ابتداء انتہا نہیں، یہ تو ہر جگہ ہے۔

محبت لمس بھی نہیں ..... چھونا ہمدردی ہوتا ہے غمگساری ہوتا ہے، محبت خیرات یا رحم جیسی چیز نہیں۔

محبت اداسی بھی نہیں ..... اداسی لگن میں ہوتی ہے، ملنے کی لگن یا کچھ پانے کی لگن، اداسی دور ہو جاتی ہے، محبت تو امر ہوتی ہے۔

محبت دوستی بھی نہیں، دوستی میں کچھ مشترک ہونا ضروری ہوتا ہے لہٰذا دوستی مشروط ہوتی ہے وقتی بھی ہو سکتی ہے۔

محبت غم نہیں، غم صرف دل میں ہوتا ہے، محبت سارے جسم میں ہوتی ہے۔

محبت امتحان بھی نہیں ہوتی، محبت میں کوئی نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں ناکامی اور کامیابی کا کوئی مسئلہ نہیں۔

محبت محبوب، عاشق، گرل فرینڈ، بوائے فرینڈ نہیں ..... یہ سب انائیں ہیں، شناختیں ہیں، محبت اس سے مبرا ہے، شناخت مطالبہ ہوتی ہے اور محبت میں کوئی مطالبہ نہیں ہوتا۔

محبت وابستگی بھی نہیں، وابستگی میں ضروری ہوتا ہے کہ کوئی ہو، جس سے آپ وابستہ ہو سکیں، جبکہ محبت کسی کے ہونے کی مرہون منت نہیں، محبت کسی کی تابع نہیں بلکہ سب کچھ محبت کا تابع ہے۔ محبت نسبت سے ماورا ہے۔

محبت ایمان بھی نہیں، ایمان تو پناہ ہوتا ہے۔ محبت اس سے زیادہ کچھ اور ہے

محبت خدا نہیں، خدا ایک تصور ہے، یقین اور گمان کے درمیان رہتا ہے۔

محبت روحانیت نہیں ...... روحانیت امنگ ہے بقا کی، لالچ ہے امن کی جسے حاصل کرنے کے لئے ریاضت چاہیئے ہوتی ہے۔

محبت ایثار نہیں، ایثار کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ محبت کا کوئی مقصد نہیں ہوتا......

محبت خواہش بھی نہیں، خواہش محرومی ہوتی ہے......

محبت راز بھی نہیں، راز رکھنے کے لئے ہوتا ہے، محبت میں اپنا کچھ نہیں ہوتا محبت کسی ایک کے لئے تو ہوتی ہی نہیں......

محبت Dating بھی نہیں۔ ڈیٹنگ میں وقت اور جگہ درکار ہوتی ہے محبت بے وقت ہوتی ہے۔ بے جگہ ہوتی ہے۔ محبت رومان نہیں، رومان فقط ایک دھیان ہے، جب رہا، رہا ہٹ گیا، گیا......

محبت فلسفہ نہیں، فلسفہ توجیح ہوتا ہے، محبت میں کوئی ''اگر'' ''چونکہ'' ''چنانچہ'' ''شاید'' نہیں ہوتا......

محبت جنسی امر بھی نہیں...... جسمانی تعلق تو وعدہ ہوتا ہے۔ اس میں عہد و پیمان ہوتے ہیں ...... اور وعدے کی عمر ہوتی ہے۔ پیمان ٹوٹ جاتا ہے۔ محبت اس سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے۔

محبت سچ بھی نہیں، سچ سب کا اپنا اپنا ہوتا ہے، محبت سب کے لئے محبت ہے......

محبت جنگ بھی نہیں، محبت کی جنگ تو نفرت سے بھی نہیں محبت کے سامنے ہر کوئی نہتا ہے......

محبت عقیدت یا شفقت بھی نہیں، ان میں فرمانبرداری اور رواداری چاہیے ہوتی ہے۔

اور فرمانبرداری اور رواداری فاصلہ ہے۔ محبت بے فاصلہ ہوتی ہے......

محبت قوت نہیں مقناطیسیت نہیں، یہ سب ''جال'' ہے ''گرفتاریاں'' ہیں۔

محبت تو آزادی ہوتی ہے، محبت تو جانے دینے کا نام ہے، محبت اعتبار بھی نہیں، اعتبار متزلزل ہوتا رہتا ہے۔

محبت فرض بھی نہیں، فرض مجبوری ہوتا ہے...... محبت علم بھی نہیں علم بڑے بڑے سوالوں کے چھوٹے چھوٹے جوابوں کو کہتے ہیں۔ کچھ جواب تسلیاں ہوتے ہیں جو یقین بن جاتے ہیں اور ایمان کہلاتے ہیں......

محبت نفسیات بھی نہیں، نفسیات بدلتی رہتی ہے۔

محبت حسن نہیں، حسن کا معیار ہوتا ہے، پیمانہ ہوتا ہے محبت ناپنے تولنے، جانچنے اور پرکھنے کی چیز نہیں، محبت محبت ہے، بیان سے باہر ہے...... لیکن پھر بھی محبت کیا ہے......؟

مائی ڈیئر جنید......

ہوسکتا ہے اوپر بیان کی گئی بہت سی باتیں محبت کی طرف آتی جاتی خیال کی روشیں ضرور ہوں لیکن محبت نہیں......

محبت محبت ہے...... اسے کسی بھی لفظ، تصور یا خیال میں قید نہیں کیا جاسکتا، یہ تو ہر طرف ہے، ہر جگہ ہے...... اسے خود میں سمونا ہوتا ہے...... محبت کو ''لفظ'' ''نہیں'' ''وجود'' چاہیے ہوتا ہے، بکھر جانے کے لئے۔

یہ جیسے جیسے بوند بوند لمحہ لمحہ بھرتی جاتی ہے، تعصب، غصہ، حسد، نفرت، استرداد، بے چینی، امتیاز، اکتاہٹ، ملامت، برتری، کمتری، لاحاصلی، بے چارگی، کرب سب کچھ دھلتا جاتا ہے، کہیں بہہ جاتا ہے...... اور

''وجود...... ''''مجبتی ہوجاتا ہے....A loving person''

تم بھی اسے اپنے اندر اتار لو......

پھر تم جدھر دیکھو گے، تم جو چھوؤ گے محبت ہوگی، تم سوچو گے محبت کو، اوڑھو گے محبت کو، تمہاری اداسیاں بھی محبت ہوں گی، تنہائیاں بھی محبت،

تمہیں ہر آن محبت ہوگی، تم سے ہر آن محبت کی جائے گی، کوئی پیڑ ہو، ریل کی پٹڑی، پرندہ ہو کہ بادل، گلدان ہو کہ گل، سانپ ہو یا تتلی، ہر طرف محبت ہوگی، ہر چیز Loveable ہوگی۔ محبت عاشق Lover اور محبوب Beloved نہیں، مجبتی A loving being بناتی ہے...... اور ''مجبتی'' کتنے ہی سمندروں، صحراؤں، پہاڑوں، براعظموں کے اس پار بھی ہو وہ آپ کے قریب رکھا لیمپ بھی ہے، سر کے نیچے رکھا سرہانہ بھی اور کرسی کا بازو بھی وہی ہے...... آپ کے گھر میں پالتو بلی بھی ہے۔ وہ آپ سے دور نہیں...... آپ کے قریب ہے، اتنا قریب کہ آپ خود وہ ہو......

اس تک کسی بھی طرح کی رسائی درکار نہیں ہوتی...... کوئی ویزا، ٹکٹ، فاصلہ، سفر ضروری نہیں...... محبت مذہب ہے ایک ایسا مذہب جو کسی کے بتائے ہوئے راستے پر نہیں ہوتا، مجبتی مذہبی ہوتا ہے، وہ جہاں جہاں جاتا ہے راستہ بنتا جاتا ہے۔

تم سوچو گے مجھے یہ سب کیسے پتہ چلا......

بتاتا ہوں...... چھوٹا سا واقعہ ہے......

جیسے تم ابھی ابھی محبت کے لفظ سے واقف ہوئے ہو میں بھی پاکستان میں رقص کے پہلے سبق سے واقف ہوا تھا، کتنے ہی سالوں کی ریاضت اور Public performances کے بعد، صرف رقص سیکھنا سیکھا تھا، یہ جان پایا تھا کہ سیکھنے کے لئے شروع کہاں سے کیا جاتا ہے...... مگر افسوس وہ دن کلاس میں میرا آخری دن تھا، ہجرت کی جوٹھان لی تھی۔ بالکل اسی طرح ایک مجبتی (خاقان خاور) اُس شام مجھے خدا حافظ کہنے آیا تھا تو زندگی میں پہلے بار میں اس سے بغل گیر ہوا تھا۔ اس بغل گیری میں کوئی پیغام، شدت اظہار یا حرارت نہیں تھی، بس ایک خوشبو تھی، وہ خوشبو مجھے آج بھی آ رہی ہے۔ اور ادھر تک آ رہی ہے...... اگر وہ خوشبو تھوڑی سی بھی Strong ہوتی تو اس کی وقعت جاتی رہتی......

محبت خوشبو ہوتی ہے اور خوشبو خاموش ہوتی ہے...... خاموشی بھی ایسی جو نہ کم ہوتی ہے اور نہ زیادہ...... مگر یہ رقص میں رہتی ہے، محبت رقص ہوتی ہے۔

اب تم جان ہی گئے ہو گے کہ اصل میں کچھ بھی نہ ہونا مجبتی ہونا ہوتا ہے، اسی Egolessness کو زندگی دینا رقص ہے۔

تئی تئی تا دھت تئی تا

تئی تئی تام دھت تئی تام

چپ

ستیہ پال آنند

ہیرا نند سوز

ـــــــ کچھ ذاتی تاثرات ـــــــ

ابھی ابھی انڈیا سے ہیرا نند سوز کی رحلت کی خبر احمد سہیل نے ٹیکساس سے فون پر دی ہے

(انا لله و انا علیه راجعون)

کچھ دن پہلے معروف افسانہ نگار ہرچرن چاولہ کی وفات کی خبر اسی طرح ناروے سے ایک دوست نے فون پر دی تھی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ موت کا بے رحم فرشتہ یکے بعد دیگرے مجھ سے میرے پرانے دوستوں کو چھیننے کے در پے ہے رام لال، ہیرا نند سوز اور ہرچرن چاولہ، تینوں میانوالی کی زمین کی اپج تھے۔ تینوں ایک ہی عمر کے تھے۔ رام لال (رام "لعل" لکھنے سے چڑتے تھے!) عمر میں چاولہ اور سوز دونوں سے ایک ڈیڑھ برس چھوٹے تھے، لیکن ان سے پہلے وفات پا گئے۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ میری پہلی ملاقات تینوں سے ایک ساتھ ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت میری عمر سولہ برس کی تھی۔ پنڈی سے لدھیانہ پہنچنے پر وہیں قیام کیا۔ (میرے والد راستے میں فسادیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے) لدھیانہ ریلوے اسٹیشن پر مہاجرین کی امداد کے لیے نوجوانوں کی جو ایک والنٹیر فورس تشکیل دی گئی تھی میں بھی اس میں شامل تھا۔ کپڑوں، کمبلوں اور خوراک کی فراہمی ہمارا کام تھا۔ ایک دن میں نے خود سے عمر میں بڑے تین اشخاص کو تھرڈ کلاس بکنگ آفس کے باہر کھلے سے چائے پیتے ہوئے اردو افسانہ نگاروں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سنا تو میں ٹھٹھک گیا۔ بغیر کسی جھجک کے میں ان کے قریب پہنچا۔ اپنا تعارف دیا اور بلا تکلف پوچھا، "کیا آپ لوگ بھی افسانے لکھتے ہیں؟" تینوں زیر لب مسکرائے، کچھ مسخرانہ انداز میں ایک نے کہا "جی ہاں، لیکن حضرت آپ کو اس سے کیا؟ آپ تو ابھی اسکول میں پڑھتے ہوں گے!" یہ رام لال تھے، جو ہیرا نند سوز سے ملنے کے لیے لدھیانہ آئے تھے۔ سوز لدھیانہ ریلوے اسٹیشن پر بکنگ کلرک تھے اور رام لال نے تقسیم کے بعد گڈز کلرک کے طور پر اپنی ڈیوٹی سنبھالی تھی۔ دہلی سے ہرچرن چاولہ کو ساتھ لیے ہوئے رام لال کچھ دنوں کے لیے لدھیانہ آئے تھے، تاکہ اگر کسی متروکہ مکان کی الاٹمنٹ ہو سکے، تو وہیں ٹرانسفر کروا لیں۔

رام لال (میانوالی کے لہجے میں سوز اور چاولہ دونوں انہیں "روم لال" بلاتے تھے) اور چاولہ تو چلے گئے، لیکن ہیرا نند سوز سے میری گہری اور نصف صدی سے زائد عرصے کی دیرپا دوستی کی بنیاد وہیں سے پڑی۔ ہم لوگ چھ چھ سات سات گھنٹے روزانہ اکٹھے رہنے لگے۔ اس کی ڈیوٹی کے اوقات میں بھی میں بکنگ آفس میں اس کے ساتھ اندر اس کے اسٹول کے ساتھ اپنا اسٹول جمائے بیٹھا رہتا۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگ مجھے ریلوے کا کارکن سمجھنے لگے۔ ہم لوگ گھنٹوں تک بے سر پیر کی باتیں کرتے۔ لیکن ان بے سر پیر کی باتوں میں بھی اردو

افسانے کی مختصر تاریخ، اردو کے افسانہ نگاروں، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، اپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی اور دیگر بڑے قلم کاروں کے افسانوں پر کھل کر بحث ہوتی۔ پلاٹ، کردار نگاری، زبان و بیان کا التزام، فحاشی یا سہل اخلاق پسندی وغیرہ موضوعات زیر بحث ہوتے۔ ریلوے کے ہی ایک اور کارکن جگدیش چندر کوکب (جو پشاور سے ہجرت کر کے آئے تھے) اکثر و بیشتر ہمارے ساتھ مل بیٹھتے۔ ہم تینوں شام کو، اور کئی بار دیر رات تک سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے نظمیں، غزلیں سناتے، بحث کرتے، اونچے اونچے قہقہے لگاتے اور کئی بار آدھی رات کے بعد گھر پہنچتے۔ ہیرانند سوز لاولد تھے۔ جگدیش چندر کوکب اور میں دونوں غیر شادی شدہ تھے۔ چونکہ سوز کی اہلیہ ان کی نائیٹ ڈیوٹی کی عادی تھی اور اپنے چھوٹے بھائی کو بیٹا بنا کر گود لیا ہوا تھا، اس لیے یہ تنہائی اس پر گراں نہ گذرتی۔ سوز کے بارے میں میری یادوں کے جمگھٹے میں جو ایک شام روشن افشاں کی طرح ابھرتی ہے وہ ہماری پہلی ملاقات سے دس برس بعد ۱۲۴ کتوبر ۱۹۵۷ء کی شام ہے۔ اس شام تقسیم وطن کے بعد لاہور چلے جانے، اور پھر وہاں سے واپس آ کر بمبئی میں مقیم ہونے کے بعد، ساحر لدھیانوی بمعہ اپنی والدہ پہلی بار اپنے آبائی شہر لدھیانہ میں آئے تھے۔ ساحر کے علاوہ دہلی سے خوشتر گرامی (مدیر بیسویں صدی)، نریش کمار شاد، موگا سے کنہیا لعل کپور، جالندھر سے بزرگ شعراء میلا رام وفا اور شاد کے والد نوہریارام درد نکودروی، مالیر کوٹلہ سے پریم وار برٹنی اور اردو کے علاوہ ایک درجن کے قریب ہندی اور پنجابی کے شاعر اور ادیب، بشمولیت موہن راکیش، رویندر کالیہ، کمار وکل (ہندی) اور سنتو کھ سنگھ دھیر، سنت سنگھ سکیھوں، جسونت سنگھ کنول، عجائب چتر کار (پنجابی) بھی موجود تھے۔ موقع میری شادی کا تھا اور رات کے اندھیرے میں گیسوں کی روشنی کے ساتھ، یہ سبھی حضرات کچھ سرور میں اور کچھ نشے میں دھت، برات کے دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شادی کے انتظامات ہیرانند سوز نے کیے تھے۔ اور ان انتظامات میں دوستوں کے لکھے ہوئے سہروں کا ایک کتابچہ بھی شامل تھا۔ ساحر لدھیانوی کے لکھے ہوئے سہرے کی ابتدائی سطریں مجھے اب تک یاد ہیں۔ یہ سہرا اٹھلاشیوں کی لڑی کی شکل میں تھا۔ جس میں آخری سطریں منظے تھیں۔

خوب ہے چہرے کی تزئین کو سہرا، لیکن
کیا ضروری ہے کہ سہرا ہی بندھے دلہا کے
اور بھی لاکھ طریقے ہیں سنورنے کے لیے! (ساحر لدھیانوی)

ہیرانند سوز کا سہرا آزاد نظم کی شکل میں تھا۔

یہ عیش و عشرت کے چند لمحے
جو ہم کو بے چارگی کے دقتوں میں آج حاصل ہوئے ہیں آنند
فریب دے کر نہ زندگی کو
ابھی سے وقفِ عذاب کر دیں
اسی لیے تیرا سہرا لکھنے کو جی نہیں مانتا کہ تم خود
رواجِ کہنہ سے ماورا ہو! (ہیرانند سوز)

ظاہر ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر یہ منظومات، سہرے ہوتے ہوئے بھی، روائتی سہروں کی شکل میں نہیں تھی، ۱۹۷۵ء میں یعنی میری شادی کے اٹھارہ برس بعد تک بھی ہیرانند سوز کے ریکارڈ میں اس کتابچے کی کچھ کاپیاں موجود تھیں۔ اب ان کی وفات کے بعد بھی شاید ان کے پرانے کاغذات میں کہیں پڑی ہوں۔

ہیرانند سوز بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ لیکن بے حد خوبصورت غزل گو بھی تھے۔ اس وقت تک ان کے افسانوں کے چار مجموعے اور دو شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ غزلوں میں ان کا انداز بیان اور مضامین کا انتخاب ''کلاسیکی'' اور ''جدید'' کے مابین کہیں قائم ہے۔

ہے لاشعور میں کہیں خواہش فقیر کی/ چادر ہو آسمان کی بستر زمین کا

دھرتی تو سوز ماں کی سکون بخش گود ہے/ دامن نہ آنسوؤں سے کرو تر زمین کا

مجھ پہ یوں بار گذرتی نہ غریب الوطنی/ شہر میں کوئی اگر میرا شناسا ہوتا

یہ کیا ہوا ہے کہ دنیا سے کٹ گیا ہوں میں/ اور اپنے حجرۂ جاں میں سمٹ گیا ہوں میں

کتاب زیست کا حاصل تھے سوز جو اوراق/ بغیر دیکھے ہی ان کو الٹ گیا ہوں میں

میانوالی کے یہ تین فرزند، رام لال، ہرچرن چاولہ اور ہیرانند سوز اردو افسانے کے مضبوط ستونوں کی طرح انڈیا میں نصف صدی تک اس عمارت کو اپنے سروں پر تھامے ہوئے کھڑے رہے ہیں۔ جس کی بنیاد اردو افسانہ نگاروں کی پہلی پود نے رکھی تھی۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد اب انڈیا میں تو خال خال ہی کوئی نام نظر آتا ہے، جس کا تعلق میانوالی، ملتان، پشاور، پنڈی یا لاہور کی سرزمین سے ہو۔ (۱۸ جنوری ۲۰۰۲ء)

ظہیر غازی پوری صاحب نے ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی نظمیہ شاعری پر متوازن انداز سے روشنی ڈالی ہے اور صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر آنند کا غزلیہ شاعری سے انحراف اور ان کی مغربی انداز سے آراستہ نظموں پر کچھ شعراء اور ناقدین کے نظریات متنازع فیہ رہے ہیں اور ان کے شعری اسلوب کی مخالفت بھی ہوئی ہے مگر ظہیر غازی پوری کا خیال ہے کہ یہ سارا ہنگامہ تھامس گرے کے پراجیکٹ کی دین ہے۔ آنند کی شاعری کو اگر عالمی فکری رویوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو شاید بار نہ گزرے مگر اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو شاعری کی اپنی تہذیب ہے، اپنا مزاج ہے، اسلوبیات ہیں۔ اس میں انگریزی فکر و شعور اور اسلوب کی پیوند کاری اسے بدذائقہ بنا سکتی ہے۔ ظہیر غازی پوری نے اندر موہن کیف کے اچھے جملے کا حوالہ دیا ہے کہ آنند صاحب کے بیانیہ ڈکشن میں وہ حسن نہیں جس کا اردو شاعری تقاضا کرتی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر آنند کی اس کاوش کو ایک تجربہ سمجھ کر پرکھا جائے تو یہ تائید اور تنقید دونوں کا شکار ہوگی۔

(ہیرانند سوز...... نصیر احمد ناصر کے نام خط سے مقتبس)

ہیرانند سوزؔ کے خطوط

۲۹مارچ،۲۰۰۰ء

محترمی جناب نصیر احمد ناصر، تسلیم و نیاز!

آپ کا ۲۱ مارچ ۲۰۰۰ء کا دوسرا کرم نامہ اور اس کے ساتھ تسطیر کے مزید چار شمارے موصول ہوئے جو حسب ہدایت متعلقہ حضرات کو بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیج دیئے گئے ہیں۔ شرون کمار ورما ایڈووکیٹ میرے دیرینہ دوست ہیں۔ انھیں ان کے افسانے ''کس کے گھر جائے گا'' کی تسطیر میں اشاعت کی اطلاع دینے پر انھوں نے شکایت بھی کی تھی کہ مذکورہ شمارہ انھیں تو نہیں ملا۔ خیر اب ان کی شکایت دور ہو گئی ہوگی۔ امید ہے سب صاحبان اس کی رسید کی اطلاع دیں گے۔ رجسٹریشن کی رسیدیں میں آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے امید ہے جناب حامدی کاشمیری، سیدہ نسرین نقاش اور جناب آر ڈی شرما تاثیر نے بھی یہ شمارہ پہنچنے کی اطلاع دے دی ہوگی۔ وہ رسیدیں میرے پاس محفوظ ہیں۔ شرون کمار ورما نے اپنے بھائیوں سے الگ اپنا مکان بنوا لیا ہے۔ اب ان کا ایڈریس یہ ہے: ۱۲۵۲، گلی اونٹھاں والی، چوک پراگ داس، امرتسر۔ ۱۴۳۰۰۶۔ آپ نے میرا افسانہ پسند فرمایا، اس سوزنوازی اور عزت افزائی کے لئے شکر گزار ہوں۔ عزیزہ شافعہ شاد اپنے خط کے جواب میں آپ کے کرم نامے کا انتظار کر رہی ہیں۔ گزشتہ سال کے وسط میں جناب افتخار نسیم شکاگو سے دلی تشریف لائے تھے۔ انھوں نے غالبؔ سیمینار میں شرکت کرنا تھی۔ اس تقریب میں شافعہ شاد میرے ساتھ گئی تھیں۔ افتخار نسیم صاحب نے ہم تینوں کا گروپ فوٹو لینے کی خواہش ظاہر کی جس کی تعمیل کی گئی۔ فوٹو کی ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں تاکہ آپ ہم دونوں سے کچھ روشناس ہو سکیں، افتخار نسیم صاحب تو ڈھکی چھپی شخصیت نہیں ہیں۔ آپ نے تسطیر میں ہر صنفِ ادب کو جگہ دی ہے اور پرچے کی ترتیب و تدوین میں بھی ایسی خوش سلیقگی ہے کہ ہر ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے۔ ''وطن میں جلا وطن'' اس مجلّے کو بہت بڑی دین ہے۔ نثری نظم اور ماہیے کے اوزان کے بارے میں کارٹون کمال کے ہیں۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

آپ کا ...... ہیرانند سوزؔ

(۲)

۲۵مئی ۲۰۰۰ء

بھائی نصیر احمد ناصر! تسلیم و نیاز!

آپ کے کرم ناموں کی تعمیل میں مَیں نے آپ کے سہ ماہی تسطیر کے ۱۳ نسخے پروفیسر حامدی کاشمیری، سیدہ نسرین نقاش، شرون کمار ورما، کرشن کمار طور، آر۔ ڈی شرما تاثیر، محترمہ ترنم ریاض، عزیز پریہار، ڈاکٹر کیول دھیر، جناب انور خان، ڈاکٹر م۔ ق۔ خان، پریم کمار نظر اور شمارہ ۱۰، ۹ اور ۱۲، ۱۱ جناب غلام نبی خیال

کو ارسال کر دیئے ہیں۔ جناب عزیز پری ہار نے اپنا نیا مکان بنوالیا ہے۔ اور ماہ مارچ میں وہ اس مکان میں شفٹ کر گئے ہیں۔ میری ان سے خط و کتابت رہتی ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند ماہ جون میں انڈیا تشریف لا رہے ہیں۔ چند دن میرے ہاں بھی قیام کریں گے۔ ''اردو تنقید کے اصطلاحاتی شگاف'' پر دیگر دانشور اہل قلم حضرات کے علاوہ ڈاکٹر آنند نے بھی عالمانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ جس سے ان کی جہاں گردی اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں بھی متنوع موضوعات کے ساتھ فکر و خیال کے وسیع کینوس کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ناہید قمر صاحبہ نے بھی شافعہ شاد کی طرح آپ کی نظموں کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ افسانے تمام اچھے ہیں۔ ترنم ریاض صاحبہ نے کہانی ''ایجاد کی ماں'' کا آغاز تو توہمات سے کیا مگر آخر میں اسے زندگی کے قریب لے آئی ہیں۔ جناب محمد صلاح الدین پرویز نے ''کتاب عشق'' کو نہایت خوبصورت ابواب میں پیش کیا ہے۔ یہ شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے، مزید تاثرات لکھوں گا۔ شافعہ شاد صاحبہ کو بھی دونوں شمارے موصول ہو گئے ہیں۔ وہ بھی عنقریب خط لکھیں گی۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

آپ کا ..... ہیرانند سوز

ناصر بھائی! سلامِ عقیدت!

سہ ماہی تسطیر محترم جناب سوز صاحب کے حوالے سے دستیاب ہوا۔ میں رکھ رکھاؤ کی عادی نہیں بلا تکلف اپنی بات کہہ ڈالتی ہوں۔ نہ تو میں کوئی شاعرہ ہوں نہ ہی مفکر۔ مجھے تو بس یہ کہنا ہے کہ آپ کی نظموں کی مداح ہوں۔ کہیں دھیرے دھیرے زندگی کا چراغ نہ گل ہو جائے، اس سے پہلے کہ شام ہو جائے اور آپ کو پتہ ہی نہ چلے۔ میں اپنی عقیدت کا اظہار ضروری سمجھتی ہوں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کو اس صدی کی نظموں کا عظیم خالق تسلیم کرتی۔ اتنا کرب کیسے سمیٹ کر لاتے ہیں آپ..... میری نجی ڈائری آپ کی خوبصورت تراشی ہوئی نظموں کی روشنی سے بھری پڑی ہے۔ میرا تعارف کوئی خاص نہیں، سال میں ایک آدھ افسانہ لکھ لیتی ہوں۔ مجھ پر بڑا احسان کیا ادب پر اور اپنی برادری پر۔ کیونکہ فرصت نہیں اور اگر ہو بھی تو گھر کے کام سانس نہیں لینے دیتے، بہت بڑی ذمہ داری ہے پھر بھی کبھی کبھی فرصت نکال لیتی ہوں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند میرے رفیق اور سرپرست ہیں اور جناب ہیرانند سوز کی پدرانہ شفقت کی احسان مند ہوں۔ وہی فرید آباد کی ادبی سرگرمیوں کے ہیرو ہیں۔ ناصر بھائی یہ میرا ذاتی مراسلہ ہے، اس میں کچھ ایسا نہیں۔ بس میری یہی خواہش ہے کہ آپ کی تخلیق خوب سے خوب تر ہو۔ زوالِ عمر کی گونج سے ٹھہرا ہو۔ کیونکہ قلم کار کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ احساسات جوان ہوں تو تخلیق بھی مہکتی ہے اور اس کی خوشبو دور دور تک پھیلنی چاہیے۔ یہی ہمارا سرمایہ حیات ہے اور یہی زندگی کی علامت۔ امید ہے آپ مایوس نہیں ہونے دیں گے۔ باقی دعائیں .... تا حیات آپ اور آپ کا قلم آسمانِ ادب پر روشن ستارے کی مانند چمکتا رہے۔

آپ کی بہن ..... شافعہ شاد

۷ مارچ ۲۰۰۰ء

دانش محمود
ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

مستنصر حسین تارڑ سے مکالمہ (۲)

☆چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ سفرنامہ نگار، ناول و افسانہ میں بھی سفر کے چٹخارے لیے بغیر نہیں رہتا۔ کیا یہ عمل غیر شعوری ہے؟

☆☆آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ میں اب گھر سے بہت دور نہیں جاتا۔ خواہ آپ اسے عمر کا تقاضا کہہ لیں۔ شادی شدہ زندگی کے مسائل اور محدود وسائل کا نام دے لیں یا افسانہ و ناول کی طرف میرا رجحان کہہ لیں۔ سفر میں اب بھی کرتا ہوں۔ خواہ کسی میٹنگ کے بہانے، کسی سیمینار کے نام پر یا ذوقِ آوارہ گردی کی تسکین کے لیے۔ پھر یہ کہ میں اپنی تحریر سے خود کو کیسے الگ کر سکتا ہوں۔ چاہے میں سفرنامہ لکھ رہا ہوں یا ناول یا افسانہ۔

☆''پیار کا پہلا شہر'' کی معذور پاسکل اور فاختہ کی نابینا لڑکی، سفر میں حادثی طور پر ملنے والی لڑکیاں، کیا ان دونوں ناولوں کی تخلیق کا محرک جذبہ ہمدردی تھا؟ اسی سلسلے کا دوسرا سوال یہ کہ ''نکلے تری تلاش میں'' کا ایک باب ''اپاہج وینس'' کے نام سے صفحہ ۴۲۸ سے ۴۸۱ تک ہے۔ آپ کے ناول ''پیار کا پہلا شہر'' (صفحات:۲۶۲) میں صیغہ واحد متکلم کی جگہ سنان کے کردار نے لے لی ہے۔ اگر آپ صیغہ واحد متکلم ہی رہنے دیتے تو کیا فرق پڑتا؟ کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ سنان کے پردے میں مستنصر موجود ہے۔

☆☆''نکلے تری تلاش میں'' کے پچاس صفحات ''پیار کا پہلا شہر'' کی بنیاد ہیں۔ پاسکل کا کردار حقیقی ہے۔ وہ یسی اپاہج ہے۔ مکمل اپاہج نہیں ہے۔ ہمارے ہاں روایت ہے کہ اپاہج کو معذور کہہ کر ہمدردی جتانے لگتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ ہماری ہمدردی اسے کسی اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ دوسرا کردار فاختہ کی نابینا لڑکی کا ہے۔ وہ اصل کردار نہیں ہے۔ وہ فکشنائز کیا گیا ہے۔ اس کا نابینا ہونا کردار کی ضرورت تھی۔ اب رہی یہ بات کہ پیار کا پہلا شہر صیغہ واحد متکلم میں لکھا جاتا ہے۔ تو ایسا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۷۵ء میں مجھے جانا تھا سیر کے لیے، میں دنیا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہاں سے آ کر میں نے خانہ بدوش لکھا۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ ''دستک'' رسالے کے ایڈیٹر سرور سکھیرا کو ''نکلے تری تلاش میں'' بہت پسند تھا۔ خاص طور سے ''اپاہج وینس'' نے انہیں بہت متاثر کیا تھا۔ یہ باب ویسے بھی مشہور یوں ہوا کہ ماسکو یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے میں پیسے دینے کے لیے تیار ہوں لیکن ایک شرط ہے۔ میں نے کہا کون سی شرط۔ کہنے لگے، آپ اپاہج وینس کا ناول بنا دیں۔ میں اسے قسط وار بھی چھاپوں گا اور

الگ سے کتابی صورت میں بھی۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اپاہج ویفس سامنے رکھ کر پندرہ دن میں ناول مکمل کر کے ان کے حوالے کیا۔ اس کا محرک تخلیقی اضطراب نہیں، مالی ضرورت تھی۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وہ اس کا کیا کرتے ہیں۔ میں نے پیسے لیے اور روانہ ہو گیا۔ سرور سکھیرا نے اسے چھاپا۔ وہ ایڈیٹر تو تھا۔ تقسیم کار نہ تھا۔ مجھے نہیں معلوم کتنی تعداد میں چھپا اور کتنی تعداد میں بکا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناول ڈمپ ہو گیا۔ بس گودام میں پڑا رہا۔ بس وہ ناول ضائع ہو گیا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے پیسے مل چکے تھے۔ اور میں اس بات کو بھول گیا۔ کئی سال بعد میرے پاس ایک صاحب تشریف لائے کہنے لگے میری بیٹی لاء کالج میں پڑھتی ہے۔ اس نے کالج لائبریری سے وہ ناول ایشو کروایا۔ لیکن کہیں گم کر بیٹھی ہے۔ کالج والوں کو قیمت دیتے ہیں لیکن وہ نہیں لیتے، وہ کہتے ہیں کتاب لاؤ۔ اب انہوں نے اس بچی کا داخلہ روک رکھا ہے۔ ہم بہت پریشان ہیں۔ ناول کہیں نہیں مل رہا۔ مجھے بتایا گیا کہ فلاں صاحب سے جا کر لیں۔ وہاں پہنچا تو ان کا دفتر بند ہو چکا تھا۔ اب میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ اگر آپ کے پاس وہ ناول ہو تو اس کا ایک نسخہ مجھے عنایت کر دیں۔ میں نے کہا کہ میرے پاس اس کا صرف ایک نسخہ ہے آپ ایسا کریں کہ یہ پتا کریں کہ اسے کس پریس نے شائع کیا تھا۔ انہوں نے کھوج لگایا کہ شوکت پرنٹنگ پریس میں شائع ہوا تھا۔ ان کے پاس اس مسودے کی کتابت ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس کی ایک کاپی شائع کر دیں۔ شوکت پرنٹنگ پریس والوں نے ۵۰۰، ۴ خرچہ بتایا۔ اور ساتھ کہا کہ مصنف کی اجازت کے بغیر ہم اسے شائع نہیں کر سکتے آپ ایسا کریں کہ مصنف سے تحریری اجازت لے آئیں۔ وہ صاحب پھر میرے پاس آئے۔ میرے پاس ایک کاپی موجود تھی، بچی کے داخلے کا معاملہ تھا۔ میں نے اپنی کتاب انہیں دے دی۔ سنگ میل پبلی کیشنز سے میری طویل شراکت ہے۔ میر[illegible]رت میں ان کا بہت ہاتھ ہے بیس سال پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ کی کوئی کتاب اگر تیار ہے تو ہم چھاپیں گے۔ مجھے یاد آیا شوکت پرنٹنگ پریس میں "پیار کا پہلا شہر" کا کتابت شدہ مسودہ موجود ہے۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے مسودہ دے دیں اور حساب کتاب کر لیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں کوئی رقم واجب الادا نہیں ہے۔ مسودہ مصنف کی ملکیت ہوتا ہے۔ یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ لے لیں میں نے وہ مسودہ سنگ میل کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے ایک ہفتے میں کتاب چھاپی اور دو ہفتے میں اسکا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ انہوں نے پھر چھاپی اب تک اس کے پینتالیس یا چھیالیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ میری بیگم کی سوچ یہ ہے کہ کتاب پر ایڈیشن نہیں دینا چاہئے۔ نظر لگ جاتی ہے۔ حاسدین میں اضافہ ہوتا ہے، پھر میں بھی حاسدین کو مزید اذیت دینا نہیں چاہتا۔ ہمارے گھر کا نصف خرچ اس کی رائلٹی پر چلتا ہے۔

☆ میں اگر یہ سب کچھ لکھ دوں تو انکم ٹیکس والے آپ کا گھیراؤ کر لیں گے۔

☆☆ بے شک لکھ دیں۔ میں پورا انکم ٹیکس ادا کرتا ہوں۔

☆ انسان اس دنیا میں کہیں بھی ہو، اپنی اصل اپنی مٹی کو فراموش نہیں کر سکتا۔

"کچھ لوگ مقبرے کے محافظ سے، چوری چھپے صندوق کو جلدی سے چھو لیتے جیسے ہمارے ہاں قوال لہک لہک کر [illegible] تیری خیر ہووے پہرے دارا روزے دی جالی چم لین دے۔" اپنے ہیں ہو سکتا ہے اسی طرح روس

میں بھی لینن کا صندوق چھو لینے کی خواہش کا اظہار لوگ گیتوں میں کرتے ہوں''۔ (فاختہ۔صفحہ ۴۶)
''ماسکو کی خنک شب میں، لاہور کی تپتی دوپہر میں پھوٹنے والے پسینے کی نمی شامل ہوگئی''۔ (صفحہ ۵۵)
''جشن کی رات تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے'' عقاب نے چونچ کھولی
''مادھو لال حسین کے میلے میں تو ایسا نہیں ہوتا'' میں نے تنک کر کہا (صفحہ ۵۹)
'فاختہ' میں جگہ جگہ تقابلی جائزے نظر آتے ہیں۔ روس کے نقاب پوش میلے اور مادھو لال حسین کے میلہ، چراغاں میں کیا فرق محسوس کیا؟

☆☆'فاختہ' یہ مختصر کہانی تھی۔ ''جشن کی رات'' کے نام سے اوراق میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا کہ اس میں ناول کی تمام تر خصوصیات ہیں۔ تمہیں اسے مختصر کہانی کے بجائے ناول کی شکل میں لکھنا چاہئے تھا۔ ان کے کہنے پر میں نے اسے از سرِ نو لکھنا شروع کیا۔ ناول کی شکل میں کچھ صفحات لکھے پھر رک گیا۔ چلا نہیں۔ کئی ماہ گذر گئے۔ اسی اثناء میں مادھو لال کا میلہ چراغاں آ گیا۔ میں نے وہ اٹینڈ کیا۔ تو غیر شعوری طور پر تقابل شروع ہو گیا۔ روس کا ہتھوڑا، امریکہ کا عقاب، چین کا اژدھا، اس اژدہے کے دانت نہیں اگر دانت ہو جائیں تو وہ تیسری دنیا کو کاٹ کھائے۔ شاہ حسین کے ہاں تیسری دنیا کے حوالے بہت ملتے ہیں۔ تیسری دنیا کی تمام تر خصوصیات ان کی شاعری میں اپنا آپ دکھلا جاتی ہیں۔ نکر منگ منگ کھاؤنا، تو فاختہ کا خرگوش بھی مانگ مانگ کر کھاتا ہے۔ سانوں مرشد نال پیار، وہاں میلے میں شاہ حسین کی شاعری اور ایک مخصوص ماحول دیکھنے کے بعد، میں جو اتنے عرصے سے رکا ہوا تھا، مجھے رابطہ مل گیا، میرا قلم چل پڑا۔ اب یہ بات کہ وطن کیوں آ جاتا ہے۔ میں نے مغربی ادب پڑھا۔ بہت پڑھا۔ لیکن میرا رویہ دیہاتی ہے۔ علم بھی ہے مرے اندر اپنی مٹی کے متعلق۔ اس مٹی کے لیے جو کشش ہے۔ میں کہیں بھی موجود ہوں، گھوم پھر کر، میری تحریروں میں حوالہ میری مٹی کا ہی ہوگا۔ لینڈ سکیپ بہت ہے۔ حفیظ الرحمن نے لکھا۔ اردو ناول میں سوائے کرداروں کے Confict کے، کوئی لینڈ سکیپ پر توجہ نہیں دیتا۔ راکھ ایک مکمل ناول ہے کہ اس میں سوات، لاہور، اسلام آباد، سادھوکی سب شہر اپنی تمام تر خصوصیات سمیت آ گئے ہیں۔ ہمارے ناول نگاروں کے کردار اشخاص ہوتے ہیں، مقامات نہیں۔ جبکہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ ''قربت مرگ میں محبت'' میں دریائے سندھ اور بھارہ کہو مرکزی کردار ہے۔ کردار اپنے پس منظر کے بغیر سینس لیس ہے۔ ایک ذات ایک کمرے میں بند ہے۔ اس کی آسودگیاں، محبتیں، نفرتیں، ان سب کا بیان بے معنی ہے۔ جب تک اس کی مٹی کا، خوراک کا، پھل پتوں کا، ایک پورے پس منظر کا تذکرہ نہ ہو، سب بے کار ہے۔ سفرنامہ، ناول، ڈرامہ میں کچھ بھی لکھ رہا ہوں اس سرزمین کا حوالہ کسی نہ کسی روپ میں آئے گا۔ عبداللہ حسین نے بہاؤ کے متعلق لکھا کہ تارڑ اس دھرتی کا بائیوگرافر ہے۔ میں اس سرزمین کا کہانی کار ہوں۔ باہر کے ریفرنس بھی بہانہ ہیں اس سرزمین کی کہانی لکھنے کا۔

☆آپ نے دنیا پہلے دیکھی، اپنا وطن بعد میں، سفر کی یہ ترتیب کیسی گی؟

☆☆اس میں میرا عمل دخل نہ تھا۔ زندگی نے جس طرح رواں رکھا، میں چلتا رہا۔ بیشتر ادیبوں نے اپنا وطن پہلے دیکھا۔ بلکہ دیکھا ہی کہاں۔ پھر باہر گئے۔ آج کل جو ادیب باہر جا رہے ہیں، وہ فرسٹریشن کا شکار ہیں۔

خواہشات کی تکمیل پیش نظر ہے۔ وہ باہر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہ چیز ان کی تحریر کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ میں نے باہر کی دنیا پہلے دیکھی۔ پھر اپنا وطن دیکھا۔ اگر ترتیب الٹ جاتی تو شاید میں نقصان میں رہتا۔ میرا خیال ہے کہ بغیر منصوبے کے جو کچھ ہوا، وہ میری تخلیقی اپج کے لیے بہتر رہا۔

☆'' ...... میں یک لخت خاموش ہو گیا۔ میں فاختہ کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ وطن سے دور اس بوڑھے کے سینے سے لگ کر میں نے اپنے باپ کی شفقت کی حرارت محسوس کر لی تھی۔ اور پھر میں بلک بلک کر رونے لگا تھا'' کیا ''فاختہ'' کی یہ سطریں احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''مامتا'' کی یاد نہیں دلاتیں؟

☆☆ ہر سیاح ان محسوسات سے گزرتا ہے۔ وطن اور رشتے اسے ہر قدم پر یاد آتے ہیں۔ میں اپنی بات سناتا ہوں۔ میرا خالہ زاد بھائی، ائیر کریش میں اس کی موت کی خبر ملی۔ میں اکیلا اجنبی شہر میں۔ مجھے محسوس ہوا کہ غم کے اظہار کے لیے بھی لوگ چاہئیں۔ میں دو دن تک سناٹے کے عالم میں گھومتا رہا۔ برن سوئٹزرلینڈ کی ایک سڑک پر جا رہا تھا۔ ایک دم میرا جی بھر آیا۔ صبر و ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ قریب میں ایک درخت تھا میں اس کے تنے سے لپٹ کر کوئی پون گھنٹہ روتا رہا۔ مجھے کچھ احساس نہ تھا کہ مجھے کوئی دیکھ کر کیا سوچے گا۔ تو ایسا ہو جاتا ہے۔ جب کوئی انسان نہ ملے تو درخت کے ساتھ بھی دکھ شیئر کیے جا سکتے ہیں۔ امام غزالی نے کہا تھا کہ درویش جب جنگل میں جاتا ہے تو پودے، شجر، پتھر سبھی اس سے کلام کرتے ہیں۔ یہ بھی زندہ چیزیں ہیں اور احساسات رکھتے ہیں۔

☆ ایک سوال دانش کی طرف سے، آپ کی تحریروں میں جھوٹ اور سچ کا تناسب کیا ہے؟

☆☆ 'نکلے تیری تلاش میں' جب شائع ہوئی تو لوگوں نے پہلی دفعہ میرا نام سنا تھا۔ کافی ہاؤس نہ ادبی پرچے۔ میرا گزر کہیں نہ تھا۔ میں نے ہیجوں کی دکان پر بیٹھ کر یہ سفرنامہ لکھا۔ اس کا اپنا سحر تھا۔ سفرنامہ سامنے آیا تو لوگوں نے کہا کہ پتا کرنا چاہئے یہ کون ہے۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ہمارے نقاد یک لخت میرے ہمعصر بن گئے۔ اس میں لڑکیوں کا بڑا ذکر ہے۔ میری نو کتابیں شمال کے بارے میں آئی ہیں۔ پتھروں ویرانوں اور پہاڑوں کے ذکر سے بھری ہوئی۔ ان میں تو کوئی لڑکی نہیں۔ وہ کیوں مشہور ہوئیں۔ جھوٹ کہیں نہیں ہوتا۔ یہ انحصار کرتا ہے کہ میری کیفیت کیا تھی۔ کیفیت میں مبالغہ آ گیا ہے۔ احساسات میں مبالغہ آ گیا ہے۔ شدت آ گئی ہے۔ جھوٹ کہیں نہیں ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کہیں دور دیس میں، میں کسی ایسے منظر کا اسیر ہو کر رہ گیا کہ مجھے خیال آیا کہ میں جب اس کے متعلق لکھنے بیٹھوں گا تو دس صفحے لکھ جاؤں گا۔ لیکن اکثر ایسا ہوا کہ دس سطروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اور کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ سرسری نگاہ سے دیکھے ہوئے منظر نے مجھے اپنی گرفت میں، لکھتے ہوئے یوں لیا کہ میں اس پر دس صفحے لکھ گیا۔ دراصل تحریر کے وقت میں دوبارہ زندہ ہوتا ہوں۔ لکھتے ہوئے میں پورے سفر کو ری لائیو کر رہا ہوتا ہوں۔ بعض مرتبہ یوں بھی ہوا کہ کوئی سخت مقام آ گیا، میں دو چار صفحے لکھ کر ہی جذباتی، بدنی اور ذہنی طور پر اتنا تھک چکا ہوتا ہوں کہ پھر میں کچھ اور نہیں لکھ پاتا۔ تو یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی منظر عام سا منظر ہے۔ اتنا خوبصورت نہیں لیکن جب وہ میرے ذہن پر ابھرا، یا جیسے میں نے اسے محسوس کیا تو میں نے اسے اسی طرح پینٹ کر دیا۔ شاید آپ اسے جھوٹ کہتے ہیں۔ امام غزالی کی یہ بات درست ہے کہ جب ایک

درویش یا سیاح دنیاوی مفادات کو پس پشت ڈال کر اپنے آرام وسکون کو چھوڑ کر، گھر بار سے کنارہ کر کے جنگلوں میں، فطرت کا رخ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہ سوچ بھی گھر چھوڑ آتا ہے کہ میں کچھ اور کرتا تو کتنا کچھ کما سکتا تھا۔ بہتر گزارا کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ ترک کر کے جنگل میں چلا جاتا ہے۔ ویرانوں میں گھومتا پھرتا ہے۔ کیونکہ وہ درویش ہے۔ یہ عمل اسکے لیے باعث اذیت نہیں، وجہ تسکین ہے۔ تو ایسے میں راہ میں چلنے والے پتھر، پہاڑ، شجر، دریا وہ سب اس کے سنگی ساتھی ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں افسوس ہے کہ ان کی وضاحت کے لیے ذخیرہ الفاظ کی بے حد کمی ہے۔

☆ ہنزہ داستان کا بابا آپ سے کہتا ہے۔ ''یہاں تو کتابوں کی کوئی دکان نہیں اخبار بھی کم آتا ہے۔ ٹیلی ویژن بھی نہیں...... اور کیا کرتے ہو'' واقعی آپ اور کیا کرتے ہیں۔ اور کیا کچھ اور کرنے کے لیے آپ کے پاس وقت ہے؟

☆☆ میڈیا اور لکھنے کے لیے تو وقت نکالنا ہی پڑتا ہے کہ میرا رزق اس سے وابستہ ہے۔ اس کے علاوہ آوارہ گردی اور مطالعہ، میری کوشش ہوتی ہے کہ سال میں دو تین چار اچھی کتابیں تو ضرور پڑھ لوں۔ بعض دفعہ مہینے بھر میں دو ایک اچھی کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر مجھے گندھارا آرٹ سے دلچسپی ہے پینٹنگ کرتا نہیں لیکن تصویری نمائش میں ضرور جاتا ہوں۔ پھر میرے ذاتی دوست بیوی بچے گھر یہی مصروفیت ہے۔

☆ عطاالحق قاسمی کی یہ بات کہ دوران سفر ''کسی'' کا سر کندھے پر آ گئے تو یہ کہنا کہ معاف کرنا میں مستنصر نہیں ہوں۔ کیسا لگتا ہے؟

☆☆ وہ خاتون غالباً نابینا خاتون تھیں۔ ورنہ شکلوں میں تو خاصا فرق ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ قاسمی صاحب کو زحمت ہوئی۔

☆ انیس ناگی نے ایک انٹرویو (گفت وشنید، حسن رضوی صفحہ ۱۳۹) میں کہا ہے ''میں نے تارڑ کا ایک سفرنامہ پڑھا تھا وہ تو بالکل چالو قسم کا تھا، جو انگلستان اور یورپ کے بارے میں تھا۔ میں فرانس میں رہا ہوں۔ انہوں نے بہت سی گلیوں کے نام ہی غلط لکھے ہیں۔ پیرس کی تفصیلات بھی غلط ہیں۔ مجھے یہ گمان گزرا کہ ہوسکتا ہے کہ تارڑ صاحب نے ان علاقوں کا دورہ ہی نہ کیا ہو۔ لیکن زیب داستان کے طور پر ان علاقوں کو حوالہ بنایا'' آپ کیا کہتے ہیں؟

☆☆ یہ ممکن ہے، نام میں نے انگریزی میں پڑھے اور ان کا فرانسیسی تلفظ میرے علم میں نہ ہو۔ آپ مال روڈ پر جا رہے ہوں۔ چیمبرلین روڈ آ جائے تو اس کا تلفظ کوئی غیر ملکی کچھ اور لکھ جائے، یہ ممکن ہے۔ پھر میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ انیس ناگی کے بیانات کو سنجیدہ نہیں لینا چاہئے۔ وہ یہاں صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میں بھی فرانس گیا ہوں۔ پھر اعتراضات کا کیا ہے۔ راکھ پر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ مستنصر تو کبھی کرشمی منشن لاہور میں رہا ہی نہیں۔ اس کا بچپن، لڑکپن تو گجرات میں گزرا ہے۔ اب میں اس اعتراض کا کیا جواب دوں۔

☆ ''مستنصر جس حیرت کو جگاتا تھا اب وہ حیرت ختم ہوگئی ہے۔ اور وہ سیاح کے بجائے افسانہ نگار نظر آنے لگے ہیں۔ ہنزہ داستان اور خانہ بدوش پڑھ کر مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔'' (انور سدید۔ گفت وشنید صفحہ ۲۵۶)

☆☆ ہر ایک کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ بنیادی تحریروں میں کچا پن تھا۔ اب بہتری آ گئی ہے۔ ''بہاؤ'' ناول تو اپنی جگہ ہے لیکن وہ حیرت ہی حیرت ہے، تمام کا تمام۔ میرا پورا رویہ ہی حیرت کا ہے۔ میں اگر سیاح ہوں تو اس کی بنیاد، ۹ کتابوں کی حیرت ہی ہے۔ میں افسانہ نگار ہوتا تو کمرے سے باہر نہ نکلتا۔ ہر ایک کی اپنی رائے ہوتی ہے۔ وہ درست بھی ہو سکتے ہیں۔

☆ ''مستنصر روس میں سب سے مشہور پاکستانی نثر نگار ہے، اردو ادب کا چیخوف ہے'' بعض لوگ اس رائے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ وجہ؟

☆☆ یہ منصور قیصر نے لکھا تھا۔ روس میں اردو پڑھنے والے طبقے کے متعلق انہوں نے لکھا تھا۔ کافی پہلے کی بات ہے شاید ۸۰ کی دہائی کی۔ میں اسلام آباد میں تھا۔ ایک روز اعجاز راہی نے فون کیا کہ یہاں ایک میاں بیوی، 'مرینا اور الیکسانڈر' غالباً ٹمل میں پڑھا رہے ہیں۔ ان کے سامنے ذکر ہوا آپ کا تو وہ بہت ایکسائیٹڈ ہوئے کہ یہاں وہ شخص رہتا ہے جسے ہم اپنی طالب علمی کے زمانے میں بہت محبت کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ ہم اس سے ضرور ملنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں میاں بیوی نے سوائے اس باب کے جو ان کے نصاب شامل تھا، میری کوئی اور تحریر نہ پڑھی تھی۔ اب وہ مجھے اسی حوالے سے ملنا چاہتے تھے۔ روس کے عروج کا دور تھا۔ ان کو ملنا خطرناک تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے اور میرے بیوی بچوں کو اتنے خلوص سے بلایا کہ میں رد نہ کر سکا۔ بڑی دیر ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ اٹھتے ہوئے انہوں نے ایک ناول، فیودر دستوئیفسکی کا 'ایڈیٹ' مجھے عنایت کیا اور اس پر کچھ تحریر بھی کیا۔ میں نے کہا کہ جو کچھ آپ لکھ رہے ہیں، وہ روسی زبان میں ہے، جسے نہ تو میں سمجھ سکوں گا اور نہ میرے دوست۔ تو پھر انہوں نے اسی صفحے پر اردو میں بھی لکھ دیا۔ یہ ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔ ''سوویت یونین میں سب سے مشہور ادیب مستنصر حسین تارڑ کو سویت دوستوں مارینا اور الیکسانڈر کی طرف سے'' (۸۹-۱۲-۲۷)

☆ ایک رائے کے مطابق ''بیسٹ سیلر ادب'' کبھی اچھا ادب نہیں ہوتا۔ تبصرہ کیجیے۔

☆☆ اس حوالے میں ''کبھی'' جو ہے وہ اضافی ہے۔ بیسٹ سیلر کبھی اچھا ادب ہوتا ہے اور کبھی اچھا ادب نہیں ہوتا۔ شروع میں ایسا ہوتا تھا کہ جب لوگ تعریف کرتے تھے یا کسی بھی لہجے میں مجھے آ کر کہتے تھے، آپ تو بڑے مشہور اور بیسٹ سیلر ہیں، تو میں شرمندہ ہو جاتا تھا۔ اب میں نے کسرِ نفسی چھوڑ دی ہے۔ میں ہوں، میں تسلیم کرتا ہوں۔ ۱۵ سال ہو گئے ہیں۔ میرے لیے یہ شرمندگی کی نہیں فخر کی بات ہے۔ بیسٹ سیلنگ ادب ضروری نہیں کہ اچھا ادب ہو۔ بیسٹ سیلنگ ضروری نہیں کہ وہ اچھا نہ ہو۔ آپ مارکیٹ جائیں۔ اس وقت منٹو، بیدی، کرشن چندر، کرنل محمد خان، قرۃ العین حیدر، شفیق الرحمن سب بیسٹ سیلر ہیں۔ انتظار حسین کے ''چراغوں کا دھواں'' کا چوتھا ایڈیشن بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس لیے اس رائے پر میں کیا تبصرہ کروں۔

☆ آپ کو اپنی تخلیقات میں، جو مختلف اصناف ادب سے تعلق رکھتی ہیں، کون سی کتاب زیادہ عزیز ہے، کس کتاب نے زیادہ محنت طلب کی؟ کس کتاب کو لکھتے ہوئے مزہ آیا؟ کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ مالی فائدہ پہنچایا؟ کس کتاب کے سب سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے؟ کس کتاب سے نظریں چرانے کو جی چاہتا ہے؟

☆☆سب کتابیں عزیز ہیں...... بہاؤ...... کوئی کتاب ایسی نہیں جسے لکھتے ہوئے مجھے لطف نہ آیا ہو۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ میں نے کوئی کتاب شروع کی ہو، چند یا کافی صفحات لکھ لیے ہوں پھر بات نہیں بنی۔ لطف نہ آیا لکھتے ہوئے تو چھوڑ دی۔ میں تخلیقی کام فریضے کے طور پر نہیں کرتا۔ میں کچھ بھی لکھ رہا ہوں۔ مجھے دن بھر بے چینی رہتی ہے کہ کب سات بجیں گے۔ کب میں لکھنے بیٹھوں گا۔ اور دیکھوں گا کہ کردار کیا رخ ادا کرتے ہیں۔ میری مرضی کے مطابق چلتے ہیں یا من مانی کرنے لگیں گے۔ یہ ایکسائٹمنٹ عشق میں بھی ہے اور کتاب لکھتے ہوئے بھی میں اسی کیفیت سے گزرتا ہوں...... پیار کا پہلا شہر...... نکلے تیری تلاش میں...... مجھے بزرگ ہونے کی وجہ سے اب تھوڑی سی شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ اس سے بہتر انداز میں لکھی جا سکتی تھی۔

☆ایک سوال اور دانش کی طرف سے، آپ کا پہلا سفر کون سا تھا۔ اور آپ کتنے پیسے لے کر چلے تھے؟

☆☆پہلا سفر کوہ نوردی کا تھا۔ میں ایف اے گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔ کالج کے ٹرپ کے ساتھ ہم وادی کشن گنگا گئے تھے۔ ہم مسلمان تاریخ جغرافیے کا لحاظ نہیں کرتے۔ اور نام تبدیل کرنے کے شوقین ہیں۔ وادیء نیلم کا نام وادیء کشن گنگا تھا۔ ہم نے اسے مسلمان کر لیا۔ اس سے متعلق بڑی دیو مالائی کہانیاں وابستہ ہیں۔ ہم نے رتی گلی کی چوٹی سر کی۔ مجھے کالج کی طرف سے کلر بھی ملا۔ اب رہی یہ بات کہ میری جیب میں کتنے پیسے تھے۔ والد صاحب متمول حالت میں تھے۔ پیسے کافی ہوتے تھے۔

☆پرندے میں پکھیرو اور انسان کا موازنہ کیا گیا ہے۔ پرندے اور انسان دونوں ہی میں دو قسمیں موجود ہیں، ظالم اور مظلوم...... "وہ ہمیشہ سے ساتھی تھے...... ان کی ہڈیوں پر وار کرنے والی چونچیں ایک تھیں۔ اور ان کی ہڈیتی ایک تھی۔ یہی تو وہ الجھاؤ تھا کہ ان میں بندہ کون سا ہے اور پکھیرو کون۔ پکھیرو کون ہے اور بندہ کون سا ہے؟ (پکھیرو صفحہ ۵۸) کون زیادہ اذیت ناک ہے، انسان یا گدھ؟

☆☆دونوں ہی۔ وہ بندہ پکھیرو بھی ہے اور گدھ بھی۔ یہ الگ الگ شناخت نہیں۔ گدھ کی بات کرتے ہیں تو اس میں انسان بھی شامل ہے۔ منطق الطیر...... سچ کی تلاش میں...... سی مرغ کی تلاش میں...... ہر انسان نکلتا ہے اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق حاصل کر لیتا ہے۔

☆سچ کے پکھیرو کو قید میں رکھ کر ہی انسان بہتر زندگی گزار سکتا ہے۔ پھر بھی ہم اس پکھیرو کی آزادی کے منتظر ہیں۔ کیا ایسا وقت کبھی آئے گا؟

☆☆نہیں! کبھی نہیں آئے گا۔ خواب کبھی پورے ہوئے ہیں؟ سچ کے پکھیرو کی آزادی کی صورت میں عریاں حقیقت اپنی تمام تر تلخی کے ساتھ عیاں ہوگی۔ خواب دم توڑ جائیں گے یا ان کا کچھ حصہ پورا ہوگا۔ مکمل نہیں۔

☆آپ کے کالموں میں ہمارے اردگرد بسنے والوں کے منفی رویوں پر آپ کی لطیف اور کاری ضربیں قاری کو مزا بھی دے جاتی ہیں۔ ان حالات پر وہ دکھی بھی ہوتا ہے۔ لیکن کیا ان تحریروں کا کبھی مذکورہ فرد یا ادارے پر اثر بھی ہوا ہے، مسئلے کی بہتری کی طرف پیش قدمی ہوئی ہے؟

☆☆نہیں! کسی کے کالم میں اثر نہیں ہوتا کہ وہ معاشرے کو تبدیل کر سکے۔ یہ کالم نگار کا فرض بھی نہیں ہے۔ وہ صرف جرم کا، غلطی کا احساس بیدار کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ ان کا یہی کام ہے کہ وہ غلطی کی نشاندہی کر دیں۔

☆ آپ کے افسانے بیانیہ بھی ہیں، علامتی اور تجریدی بھی۔ بابا بگلوس، کوٹ مراد، پریم سادہ بیانیہ کہانیاں ہیں۔ بادشاہ اور سیاہ آنکھ میں تصویر میں علامتوں کے سائے بھی نظر آتے ہیں۔ گیس چیمبر اور آکٹوپس میں تجریدیت نمایاں ہے۔ کیا ہر خیال اپنی فارم خود لے کر آتا ہے یا آپ کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ کس بات کو کس انداز میں کہنا ہے؟

☆☆ کبھی تخصیص نہیں کی۔ جو موضوع ہے وہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کو کس ہیئت میں لکھنا ہے۔ ہمارے ہاں ان مصنفین کی کمی نہیں جو صرف اظہار پر توجہ دیتے ہیں۔ ٹریڈ مارک بنا لیتے ہیں۔ دس چیزیں ان کے ذہن میں ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے سانچے میں صرف دو فٹ آئی ہیں تو وہ باقی آٹھ کو چھوڑ دیں گے۔ یہ سبجیکٹ میٹر پر منحصر ہے کہ وہ کیسے بیان ہو سکتا ہے، پھر اسلوب تکنیک خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

☆ ''انسان کو انسان سے قریب رکھنے والے مقامات تانگہ، حجام کی دکان، ٹی ہاؤس، چوپال، تھڑا، حجرہ، آج کا انسان ان سب سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ہم خاموش رہ کر اپنے ماڈرن ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ بولنا ہو تو نفسیاتی معالج کو بھاری فیس دے کر کتھارسس کرا لیتے ہیں'' کیا اس کا کوئی اور حل ممکن نہیں؟

☆☆ دراصل اب اس کے لیے وقت نہیں رہا۔ پھر اگر میرا جی چاہا کہ میں تانگے پر بیٹھوں تو اول تو جس جگہ مجھے جانا ہے معلوم ہوا کہ تانگا وہاں جاتا ہی نہیں۔ پھر میرے اندر جو عہد ہے اس کی برق رفتاری مجھے تانگے کی سواری سے لطف اندوز نہیں ہونے دے گی۔ میرا میٹر تیز چل رہا ہوگا اور تانگے کا آہستہ۔ پہلے ایک چینل تھا۔ آرام سے بیٹھے اسے دیکھتے رہتے تھے۔ اب ۸۰ چینل ہیں، ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حجام کی دکان پر بیٹھنا، اخبار پڑھنا، حالاتِ حاضرہ پر تبصرے کرنا، یہ ناسٹلجیا تو ہو سکتا ہے لیکن ہماری زندگی کا حصہ نہیں۔ ان چیزوں کے لیے میری پیاس، ذوق کوہ نوردی سے سیراب ہو جاتی ہے۔

☆ نکلے تیری تلاش میں، آپ تنہا نکلتے ہیں۔ ہنزہ داستان میں سلجوق آپ کے ہمراہ ہے۔ چترال داستان میں آپ کا پورا خاندان ساتھ ہے۔ زمانی، مکانی، جذباتی تبدیلی کا یہ احساس آپ کو کیسا لگا؟ یا یہ سوال یوں بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہمارے بیشتر شاعر اور ادیب اپنی عمر کی انتہا تک، ابتدائی عمر کے نوخیز تجربات ہی دہراتے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں ارتقاء کا احساس نہیں ہوتا۔ کیا یہ صورت حال ادب کے لیے مضر نہیں؟

☆☆ میرے سفر ناموں میں سب کو لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ میں نے اپنی عمر کے حساب سے لکھا۔ نکلے تیری تلاش میں، وہ ایک عہد تھا کہ جس میں صنفِ نازک میں دلچسپی یقینی ہے۔ خانہ بدوش میں لڑکیاں نہیں۔ ہنزہ داستان، سفر شمال کے، چترال داستان اور دوسرے سفر نامے، ان میں لڑکیاں نہیں ہیں۔ پہاڑ اور پتھر ہی ہیں۔ پھر بھی پسند کیے گئے۔ رہے وہ شاعر اور ادیب جو خود کو دہراتے رہتے ہیں دراصل وہ خود کو بیان نہیں کر رہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس میں ان کی ذات شامل نہیں۔ وہ ایک ایسا تجوتشی بنا رہے ہیں جس میں ان کے اپنے بدن کی مٹی شامل نہیں۔ میں جس تجربے سے گذرتا ہوں اس سے الگ ہو کر نہیں بیٹھ سکتا۔ جتنی سچویشن متقاضی ہوتی ہے میں اسے چھپاتا نہیں کھل کر لکھ دیتا ہوں۔ مجھے چہرے، خوبصورت چہرے اچھے لگتے ہیں۔ میں نے لکھ دیا۔ ہنزہ داستان میں سلجوق ہمراہ ہے۔ اب میرا حوالہ کچھ تبدیل ہوا ہوگا۔ پھر بیٹی بڑی ہوئی اس کی شادی

کی۔اس کے حوالے سے میری ذات اور میری تحریر میں تبدیلی ناگزیر تھی۔ میرے پڑھنے والوں نے یہ اعتراض کیا کہ آپ خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگے ہیں۔ جبکہ ہم ایسا محسوس نہیں کرتے یا محسوس کرنا نہیں چاہتے۔ میں جو محسوس کرتا ہوں، اسی طرح لکھتا جاتا ہوں۔ پھر پڑھنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی تحریروں میں آپ بہت ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ میں ہوں تو تحریر میں بھی نظر آؤں گا۔ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ نثر نگار ہوں۔ میں اپنی ذاتی کیفیت، عمر اور تجربے کے مطابق اظہار کرسکتا ہوں۔ شاعر ہوتا تو آج سے پانچ سات سال پہلے بھی عشقیہ غزل کبھی نہ لکھ پاتا۔

☆ آپ نے کہا ہے کہ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ نثر نگار ہوں۔ آج کل تو نثر لکھنے والے حسرت سے شاعر حضرات کی جانب نگاہ کرتے ہیں کہ وہ شاعر کیوں نہ ہوئے کہ جنھیں ہاتھوں ہاتھ، امریکہ، کینیڈا، دوبئی، مسقط لیا جارہا ہے۔ نثر لکھنے والے تو بیچارے کسی شمار وقطار میں ہی نہیں۔

☆☆ شاعر اینٹرٹینر ہوتا ہے۔ خصوصاً مشاعرہ باز شاعر۔ وہ کسی ادبی ترویج میں حصہ نہیں لے رہا۔ وہ سنجیدہ ادب سے واسطہ نہیں رکھتا ﴿۱﴾۔ مشاعرے میں شاعر محظوظ ہونے کے لیے آتے ہیں۔ مزاحیہ شاعروں کے سامنے، جذباتی ورومانی شاعروں کے سامنے منیر نیازی ہوٹ ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کہ لوگوں کا مذاق ہی نہیں ہے۔ باہر مافیاز بنے ہوئے ہیں۔ باقاعدہ کاروبار ہورہا ہے۔ پھر ہمارے ملک میں ان شاعروں کی بھی کمی نہیں کہ جن کے پاس پیسہ آگیا ہے۔ اب شہرت مزید شہرت کی طلب چین نہیں لینے دیتی۔ لاکھ دو لاکھ لگائیں گے، کتاب شائع ہوگی، فنکشن ہوگا۔ ان کی مدد کے لیے مافیاز موجود ہیں جو سب کچھ ارینج کردیتے ہیں۔ اور پھر جو باہر مشاعرے ہورہے ہیں ان کے آرگنائزر باذوق ہوں یا نہ ہوں، کاروباری ذہن ضرور رکھتے ہیں۔ ہمارے عوام جو روٹی روزی کے چکر میں باہر گئے ہوئے ہیں وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں، باشعور نہیں، شاعری کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اور مشاعرے کے منتظمین بھی اسی سطح کے لوگ ہیں۔ وہ اپنے ذ[illegible]ق کے مطابق ہی شاعروں کو مدعو کرتے ہیں۔ شاعر شہرت اور لفافے، دونوں کے حصول کے لیے اس دعوت کو بخوشی قبول کرلیتے ہیں۔ ان حالات میں ایک نثر نگار کو فرسٹریشن ہوسکتی ہے کہ مجھے کیوں موقع نہیں ملتا۔ اب تخلیق کار سنجیدہ ادب کے پیچھے جائے یا لفافے کے، یہ اس پر منحصر ہے۔

﴿۱﴾ شاعر کے بارے میں یہ تصور سراسر غلط اور فرسودہ ہے۔ اُردو کے چند میڈیا پرست، مشاعرہ باز اور "Clown" قسم کے شاعروں کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرلینا کہ ''شاعر Entertainer ہوتا ہے، وہ کسی ادبی ترویج میں حصہ نہیں لے رہا، وہ سنجیدہ ادب سے واسطہ نہیں رکھتا''، چنداں درست نہیں۔ شاعری ادب کی سب سے زیادہ Refined صنف ہے، ازلی سچائیوں اور عصری حقیقتوں کے امتزاج کا انوکھا اظہار ہے۔ نیز اس کا زمانی ومکانی علاقہ ''منیر نیازی'' تک محدود نہیں۔ ہزار ہا سال سے انسان اور شاعری کی تاریخ ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور چلتی رہے گی۔ آپ نے جو صورت حال بیان فرمائی ہے وہ ایک زوال آمادہ علم دشمن معاشرے کا عمومی المیہ اور ادبی سطحی پن ہے۔ حقیقی شاعری الیکٹرانک میڈیا، اندرون یا بیرون ملک مشاعروں اور ادبی مافیاز کی محتاج نہیں ہوتی۔ (ن۔ا۔ن)

☆ تجربوں اور خواہشوں سے بھرپور زندگی کا مزا چکھنے کے بعد، ادیب زیادہ اور بجنل ہوتا ہے یا ٹی ہاؤسوں، مذاکروں، کانفرنسوں میں نشوونما پانے والا ادیب۔ اس سوال کو یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ کتاب کا مطالعہ ادیب کے لیے مفید ہے یا زندگی کا؟

☆☆ کتاب اور زندگی دونوں کا بیلنس ہونا چاہئے۔ میری بیوی کے بڑے بھائی اگر مصنف ہوتے تو بہت بڑے ادیب ہوتے کہ انھوں نے بھرپور زندگی گزاری ہے۔ بہر حال ادب کی تخلیق کے لیے، اس کی توانائی کے لیے کتاب زیست کا مطالعہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ایک تحریر کا۔

☆ نیپال نگری میں آپ کی سیاحت کا جغرافیہ کسی اور جانب سفر کر رہا ہے۔ وجہ؟

☆☆ نیپال میں مجھے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ میں گیا لیکن میں نے سیمینار کو یکسر نظر انداز کیا۔ مجھے اس کی تقریروں، قراردادوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نیپال دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے اپنے ساتھی میری اس روش سے اکتا بھی جاتے تھے۔ ان کے نزدیک ماؤنٹ ایورسٹ میں ڈھلتی شام کے منظر سے زیادہ ایک گرم شال کی شاپنگ میں کشش تھی۔ میں ان کے ساتھ ساتھ بھی تھا اور ان سے الگ بھی۔ میرے ساتھی بھی کبھی میرا ساتھ خوشی سے دیتے کبھی تنگ آ جاتے۔ اب وہ چند روزہ قیام جس کے بارے میں، میں ایک سفر نامہ، ایک مکمل کتاب لکھ رہا تھا، تو میرے پاس جغرافیے سے متعلق، سیاحت سے متعلق مواد کم تھا۔ نتیجتاً میرا قلم ادھر سے اُدھر بھٹکتا رہا اور میں نے اسے روکا نہیں۔ ایسا اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ اس کا احساس ممتاز مفتی کو بھی تھا کہ تو لکھتے لکھتے کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ سیدھی راہ نہیں چلتا۔ مفتی جی یاد آئے تو ان کی ایک آدھ بات اور یاد آ گئی۔ مفتی جی مجھ سے دس پندرہ برس ناراض رہے۔ ہوا یوں کہ ایک روز موج میں تھے۔ مجھے کہنے لگے۔ مستنصر یار تُو بڑا کہانی کار بن سکتا ہے لیکن تُو میڈیا کی طرف نکل گیا ہے، میڈیا تجھے برباد کر دے گا، شہرت تجھے فنا کر دے گی، تو یہ سب کچھ چھوڑ کر کل وقتی ادب کی طرف توجہ دے تو کہیں کا کہیں پہنچ جائے، کیوں اپنے آپ کو ضائع کر رہا ہے۔ میں نے کہا مفتی صاحب بات یہ ہے کہ میڈیا میری روزی ہے، میں شہرت کے شوق کے لیے نہیں اس سے وابستہ ہوا بلکہ روزی کے چکر نے مجھے اس میں لا ڈالا ہے۔ یہ نہ کروں تو اور کیا کروں۔ ادب ہمیشہ سے میری پہلی ترجیح رہا ہے۔ میں نے اس طویل وابستگی کے دوران ٹی۔ وی کے لیے چار پانچ سیریل لکھے۔ اتنے سیریل تو پیشہ ور لکھنے والے ایک سال میں لکھ لیتے ہیں۔ مفتی صاحب میرے جواز سے مطمئن نہ ہوئے۔ میں نے ان کی بات نہ مانی تھی۔ وہ مجھ سے دس سال ناراض رہے۔ کہیں کسی محفل میں، کسی نشست میں ان سے بات ہو جاتی تو صرف سلام دعا ہو جاتی، لیکن وہ مجھ سے رخ پھیرے رہتے۔ میں ان کی ناراضگی سے لطف لیتا رہا۔ اپنی وفات سے کوئی چھ ماہ قبل انھوں نے مجھے خط لکھا، بہاؤ پڑھنے کے بعد۔ خط کا مفہوم کچھ اس طرح سے تھا، کہ مستنصر میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں غلط کہتا تھا کہ میڈیا تمھیں برباد کر کے رکھ دے گا، شہرت تمھیں کہیں کا نہ رہنے دے گی۔ مفتی صاحب اکثر باتیں طنزیہ کرتے تھے، طنزیہ لکھ جاتے تھے۔ لیکن اس خط میں سنجیدگی تھی۔ انھوں نے لکھا کہ میں نے غلطی کی کہ تم سے ناراض رہا۔ تم ایک بڑے لکھنے والے بن چکے ہو۔ میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔ میرے لیے ان کا یہ خط کیا ہے، یہ بتانے کی

ضرورت نہیں۔ اب یہ بات کہ میں لکھتے لکھتے کہاں سے کہاں نکل جاتا ہوں تو مفتی صاحب نے بھی مجھے یہی کہا۔ یہ واقعہ بھی سن لیں۔ ویسے میں اسے نیپال نگری میں لکھ چکا ہوں۔ پروفیسر رفیق اختر میرے قدیمی دوست ہیں۔ گوجر خان سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے وہ کچھ حاصل کیا جو مجھے کسی اور سے، کہیں اور سے نہ مل سکتا تھا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میری خواہش رہی کہ میں ان جیسا ایک جملہ بول سکوں، لکھ سکوں۔ ان جیسا ایکسپریشن مجھے حاصل ہو جائے۔ انہوں نے دین و مذہب کے بارے میں جس طرح قائل کیا، میرے شکوک کو رفع کیا، یہ انہی کا حصہ ہے۔ دین کے بارے میں جتنے واضح تھے کوئی اور نہیں۔ آخر عمر میں مفتی صاحب ان کے مرید ہو گئے تھے۔ مفتی صاحب کے داماد اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ ان کے گھر پروفیسر رفیق اختر کی دعوت تھی۔ پروفیسر صاحب نے مفتی صاحب سے کہا کہ تارڑ کو بھی بلا لیجئے۔ یوں میں بھی چلا گیا۔ لاہور سے بانو اور اشفاق بھی آئے ہوئے تھے۔ پندرہ بیس اور لوگ ہوں گے۔ مفتی صاحب اچانک بول اٹھے۔ ''تارڑ ایہہ جہڑا توں لکھدیاں کسے ہور پاسے نکل جاندا ایں ایہہ توں کھتوں لیا''۔ میں نے کہا مفتی صاحب! میں کدھروں نئیں لیا...... ایدیہوں پہلے وی دل کرداسی کہ صراط مستقیم تے چلدا چلدا بندہ بھٹک جاوے، کسے ہور پاسے نکل جاوے، لیکن اودھوں اینی ہمت نئیں سی۔ شاید میں خطرہ مول لینا نئیں چاہندا ساں۔ ہن میں موضوع توں بھٹک کے کسی ہور راہ لگ جاکے ویکھنا چاہندا آں کہ او تھے کی اے، ہن تے جاچ آ گئی اے تھوڑی جیہی۔ لیکن مفتی صاحب اسرار جاننے پر تلے بیٹھے تھے کہنے لگے'' اے توں ایدھے کولوں نئیں لیا'' انہوں نے پروفیسر رفیق اختر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ''نہیں! میں ان کی عزت کرتا ہوں۔ یہ میرا سب کچھ ہیں۔'' (وہ مجھے شرمندہ کرنے پر تلے ہوئے تھے) کہنے لگے...... ''توں ایدھا مرید نئیں''۔ ''نہیں...... میں ان کی عزت کرتا ہوں''...... پروفیسر صاحب سے مخاطب ہو کر بولے'' یہ آپ کو نہیں مانتا۔ اسے آپ سے عقیدت نہیں ہے''۔ پروفیسر صاحب نے اطمینان سے کش لگایا اور جواب دیا۔ ''میں تارڑ صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ یہ مجھے نہیں مانتے کیونکہ جہاں سے عقیدت شروع ہوتی ہے وہیں سے جہالت کا آغاز ہوتا ہے''۔

☆''قربتِ مرگ میں محبت'' میں کئی کردار واضح طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی ہمدردی ان کا حسد سب جانے بوجھے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا ناول کے مرکزی کردار خاور کا کردار بھی حقیقی ہے۔ کیا اس ناول میں موجود تینوں نسوانی کرداروں کا تعلق حقیقت سے ہو سکتا ہے۔ کیا پاکستانی معاشرے میں، اسلامی معاشرے میں ایسا ممکن ہے؟

☆☆ میرا تعلق کم و بیش بتیس سال میڈیا سے رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میڈیا کے حوالے سے عوام میں ایک خاص توقیر اور عزت ہوتی ہے۔ ہیرو ورشپ کا ایلیمنٹ شامل ہو جاتا ہے۔ اسے بہت کچھ سمجھا جانے لگتا ہے۔ اس کے ردِعمل میں کئی قسم کی کہانیاں سامنے آ سکتی ہے۔ اس وقت آپ پاکستانی ہیں یا آپ کا تعلق مسلم معاشرے سے ہے، یہ سب کچھ پس منظر میں چلا جاتا ہے اور صرف انسانی ردِعمل سامنے آتا ہے۔ ہمارا معاشرہ تین سطحوں میں منقسم ہے۔ دو طبقوں کو تو چھوڑ دیں۔ تیسری کلاس جو ہے وہ ان تمام اصول و عقائد سے مبرا ہے،

بلکہ ان کی اپنی اقدار ہیں۔ جیسے کہ ہم آج کل دیکھتے ہیں کہ طالبان میں برقع پوش خواتین کا بہت تذکرہ ہو رہا ہے تو یہ ان کا اپنا کلچر ہے، اپنا مذہبی رجحان ہے۔ ہم انہیں کیسے غلط کہہ سکتے ہیں۔ ''قربت مرگ میں محبت'' کے تینوں کردار بالکل حقیقی ہیں۔ بلکہ دو سے تو میری بیگم بھی مل چکی ہیں۔ دراصل یہ اتنے known (معروف) نہیں کہ پہچانے جاسکیں۔ لیکن یہ موجود ہیں۔

☆ ''راکھ'' پڑھتے ہوئے جی چاہتا تھا کہ ناول ایک طرف رکھیں اور F/10 اسلام آباد میں جا کر زاہد کالیا کی جڑواں کوٹھیاں دیکھیں کہ جہاں اس نے نوادرات کے سالم پیس چھپا کر رکھے ہیں۔ ''قربت مرگ میں محبت'' کے مطالعے کے دوران بھی یہی احساس جاگا۔ کیا اس ناول کا لینڈ سکیپ آپ کے تخیل کا کرشمہ ہے؟

☆☆ بھارہ کہو میں سوائے گھر کے باقی تمام مقامات، راستے، پتھر، چٹان سبھی کچھ موجود ہے۔ تمام لینڈ سکیپ درست ہے۔ آپ لینڈ سکیپ کو فکشنا ئز نہیں کر سکتے۔

☆ زاہد کالیا کہتا ہے۔ ''میں ان نوادرات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتا ہوں۔ وہ دنیا کے کسی بھی میوزیم میں نمائش پر ہوں، کسی بھی کولیکشن میں ہوں، وہ پاکستان کی ہزاروں برس پرانی کارگزاری کی مثالیں ہوں گی۔ ہماری ثقافت وہاں جا کر محفوظ ہو جاتی ہے۔ اگر میں سمگل آؤٹ نہ کرتا تو لوگ انہیں کوٹ کوٹ کر ان کی قلعی بنا کر دیواروں پر سیاسی نعرے لکھتے''۔ کیا ہماری تہذیبیں ہمارا روزگار ہیں، اثاثہ نہیں۔ ہم اپنا تمدن بیچ کر کوٹھیاں کھڑی کر رہے ہیں کیا یہ عمل دل دکھانے والا نہیں؟

☆☆ زاہد مثبت کام کر رہا ہے۔ مثلاً جاپان میں ایک میوزیم ایسا ہے کہ جہاں، یہاں سے نوادرات گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے یہاں یہ سب کچھ رہتا تو کسی نہ کسی صورت ضائع ہو جاتا۔ اب وہ موجود تو ہیں نا۔ پاکستان کے نام سے ہی ان کی پہچان ہے۔ مصر کی چیزیں لندن کے میوزیم میں ہیں تو حوالہ تو مصر کا ہی محفوظ ہے۔

☆ زاہد کالیا کی کوٹھی کے تہہ خانوں میں قرآن مجید کے نایاب نسخے، خالص سونے کے پانی سے لکھے اوراق، ظروف، شالیں، فرنیچر، منی ایچر تصاویر، غزنی سے نکلے ہوئے کوفی عہد کے نوادرات، اور دوسری کوٹھی میں گندھارا، ہڑپہ، مہر گڑھ کے نایاب اور یونیک مجسمے ہیں۔ زاہد کالیا کہتا ہے۔ ''جو بہترین ہیں وہ میں نے سنبھال رکھے ہیں۔ اپنی تاریخ کی بقا کے لیے۔ ہم نے شرمندہ تو نہیں ہونا آئندہ نسلوں کے سامنے''۔

☆☆ یہ کردار سو فیصد موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کردار میرا ناول نہ پڑھے۔ بلکہ میں نے اس یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ اسے پڑھے گا ہی نہیں۔ اور یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ مثبت کام کر رہا ہے۔

☆ آپ سفر کرتے ہیں، سفر سے واپسی پر تخلیقی اضطراب کے باعث آپ سفر نامہ تحریر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اپنے تجربے، مشاہدے میں قاری کو شریک کر کے اطمینان اور مسرت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ کیا ناول کی تخلیق کا باعث کوئی خاص واقعہ، خیال، کردار، منظر یا عصری حقائق ہوتے ہیں؟

☆☆ بہاؤ کے سلسلے میں، کسی حد تک اس کا جواب دے چکا ہوں۔ دراصل کسی بھی تخلیق کے لیے کوئی لمحہ، آپ کو گرفت میں لے سکتا ہے۔ اور بسا اوقات ایک خیال صدیوں آپ کے ذہن میں، دل میں پرورش پاتا رہتا ہوں۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے، کوئی ایسا واقعہ، معمولی سا واقعہ ایسا رونما ہوتا ہے کہ آپ اسے کاغذ پر منتقل

کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ اسلام آباد سے ایک بے حد دلکش جوڑا مجھے ملنے آیا۔ انہوں نے میری تمام کتابیں پڑھی ہوئی بلکہ حفظ کی ہوئی تھیں۔ وہ میرے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بلکہ میں اور وہ صاحب باتیں کرتے رہے۔ خاتون خاموشی سے ہماری باتیں سنتی رہیں۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ میں آپ کے شمالی سفر کے ان دور دراز مقامات کی داستان پڑھ رہی تھی، جب میں اس مقام پر پہنچی کہ مصنف کو شمالی برفانی علاقے میں، جہاں تک رسائی ہر کسی کے لیے ممکن نہیں، گھوڑے پر سوار ایک ڈاکیہ محمد علی ملتا ہے، مصنف اس سے پوچھتا ہے کہ میرے نام کا کوئی خط ہے، ڈاکیہ نفی میں جواب دیتا ہے۔ اگر وہ ڈاکیہ کوئی ایک خط اٹھا کر کہتا کہ ہاں آپ کے نام کا ایک خط ہے تو اُس ویرانے میں وہ خط کس کا ہوتا۔ اب وہ خاتون کہتی ہیں کہ یہاں پہنچ کر میں نے کتاب بند کر دی۔ میری سوچ یہاں آ کر رک گئی یا زیادہ بھٹکنے لگی کہ یہ کس کے علم میں ہوگا کہ عین اس وقت ایک سیاح اس دشوار گزار برفانی علاقے سے گزرے گا اور ڈاکیہ اس کے نام کا خط اسی وقت اسے دے گا۔ وہ خط لکھنے والا کون ہوگا، اس کا اس سے کیا رشتہ ہوگا۔ کیا کسی سے کسی کا روحانی جذباتی تعلق اتنا مضبوط ہو سکتا ہے۔ وہ خاتون کہتی ہیں کہ میں اس سے آگے پندرہ بیس دن کچھ پڑھ ہی نہ سکی۔ میں اس کے حصار میں رہی۔ اب وہ خاتون تو یہ بات کہہ کر چلی گئیں۔ اور میرے ذہن کے دروا ہونے لگے۔ میں بھی سوچنے لگا کہ وہ خط کس کا ہوگا۔ یہاں تک کہ میں نے ارادہ کیا کہ اس کے بارے میں ناول لکھوں گا۔ میں نے ڈیڑھ صفحہ لکھا۔ پھر اس کو بڑھا کر پندرہ صفحے تک لے گیا۔ اب اس میں تفصیل آنے لگی۔ پانچ باب لکھے۔ تمام مختلف ہیں کہ شاید اِس کردار نے خط لکھا ہوگا یا شاید اُس کردار نے۔ میں دو چار ماہ پہلے ایک مقام پر آ کر رک گیا کہ یہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں یہ تو ہزار صفحات تک جا سکتا ہے۔ میں نے آج تک تناسب سے لکھا ہے جو غیر متناسب بھی ہو سکتا ہے۔ اب قلم کاغذ جو فیصلہ کریں۔ یہ ان کا حق ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ ناول میری گرفت سے نکلتا جا رہا ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ اسے کون سا موڑ دوں۔ یہ ایک موزیک ناول ہوتا جا رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑ کر ایک تصویر بنتی ہے۔ اس کے پتہ نہیں کوئی تصویر بنتی ہے کہ نہیں۔ چنانچہ میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا لمحہ، کوئی ایسی بات کوئی ایسا واقعہ ہو جائے کہ میرا ذہن، میرا قلم پھر دوڑنے لگے۔ اب آج کل میں جس ناول پر کام کر رہا ہوں وہ بڑے نہیں چھوٹے سے Incident سے نکلتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا پھیلاؤ سامنے آتا ہے۔ جیسے ایک ننھی سی کونپل سے ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ناول بھی اسی طرح آگے بڑھتا ہے۔ میں ذاتی طور پر طالبان کے حق میں نہیں رہا۔ میں افغان جنگ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے نزدیک یہ سب کچھ طالبان کی حماقت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں امریکی حملے کو قطعی ناپسند کرتا ہوں۔ میری اخلاقیات مجھے امریکی حمایت کی اجازت نہیں دیتی۔ میں افغانستان کئی مرتبہ جا چکا ہوں۔ بہت گھوما پھرا ہوں۔ لیکن مزار شریف میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اب اس جنگ کے حوالے سے اس کا بڑا ذکر رہا۔ پھر قلعہ جنگی میں سات آٹھ سو طالبان کو قید کیا گیا۔ خیال تھا کہ قیدیوں سے عالمی قوانین کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ قیدی جو ہتھیار ڈال چکے تھے اس قلعے میں محصور تھے۔ امریکی جہازوں نے اندھا دھند بمباری کر کے انہیں شہید کر دیا۔ یہ واقعہ مجھ پر شدت سے اثر انداز ہوا۔ میرا سیاست

سے کوئی تعلق نہیں۔ شمالی اتحاد، طالبان سے کوئی واسطہ نہیں۔ صرف انسان سے رشتہ ہے۔ انسانیت کے ناطے مجھے اس واقعے سے انتہائی اذیت پہنچی۔ کشمیر، فلسطین، ویتنام، افغانستان، سبھی کو وہاں پر ہونے والے مظالم کا شدید دکھ ہے۔ میں افغانستان کے متعلق بہت کچھ پڑھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا، انٹرنیٹ، میں سبھی سے منسلک رہا۔ میں خصوصی طور پر قلعہ جنگی کے متعلق ایک ایک بات جاننا چاہتا تھا۔ میں اس کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہا۔ قلعہ جنگی میں قتل و غارت گری کے بعد معلوم ہوا کہ قلعے کے تہہ خانے میں چھ سات طالبان ہیں جو ہتھیار نہیں ڈال رہے۔ ان کو ہلاک کرنے کے لیے راکٹ پانی پیٹرول گیس سب کچھ چھوڑا گیا۔ سارے طریقے آزمائے گئے۔ دو تین دن بعد، اس یقین کے ساتھ کہ اب ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا ہوگا، ریڈکراس کی ٹیم لاشیں اٹھانے کے لیے آئی تو ان پر فائرنگ کی گئی جس سے معلوم ہوا کہ ان میں سے کوئی ایک تو ضرور زندہ ہے۔ مجھے اس واقعہ نے بہت فیسی نیٹ کیا۔ نوجوان نسل کو آئیڈیل کی تلاش ہوتی ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب، نسل، قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ ۱۹۷۵ء میں، میں بیروت میں تھا۔ اور میں وہاں کے حریت پسند نوجوانوں اور قائدین سے بہت متاثر ہوا۔ یہاں تک کہ میں P.L.O کو جوائن کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے وہ مسلمان تھے اور یہ پلس پوائنٹ تھا۔ وہ حق بجانب تھے اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتا تھا۔ تو یہاں بھی کچھ ایسے ہی حالات تھے۔ طالبان میں بھی کوئی ایسا ہی طلسم تھا جس کی وجہ سے ہزاروں نوجوان اس کے سحر میں گرفتار ہوئے اور اپنے پیاروں کو، اپنے گھربار، آرام و آسائش کو یکسر نظرانداز کر کے طالبان کی مدد کے لیے خود کو آگ اور آزمائش کے کارزار میں لاکھڑا کیا۔ میرا ناول وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں قتل و غارت گری ہو چکی ہے۔ تہہ خانے میں چھ سات نوجوان ہیں جو ہتھیار نہیں ڈال رہے۔ یہ ناول انہی چھ سات کرداروں پر مشتمل ہے۔ ہیومین ٹریجڈی اس کا موضوع ہے۔ مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ اس انسانی المیے کا شکار تمام غیر ملکی ہیں۔ ان میں کوئی مقامی طالبان نہیں ہے۔ ان کرداروں میں سب سے بڑا، تیس برس کا ہے۔ باقی بیس بائیس چوبیس برس کے نوجوان ہیں۔ جہاں مجھے ان نوجوانوں کے خون کے رائیگاں جانے کا افسوس ہے وہیں میرے دل میں ان مولویوں اور ملاؤں کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے جو نوجوان نسل کو وہاں تک لے گئے۔ خود یا تو گئے ہی نہیں یا گئے تو اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانیں بچا کر لے آئے۔ اور ان مظلوموں کو اذیت کے اندھے کنویں میں دھکیل آئے۔ اب آپ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی س بات کا انتظار ہے کہ حالات کیسے بدلتے ہیں اور یہ ناول کیا رخ اختیار کرتا ہے۔ اور اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔

☆ ناول کا نام؟

☆☆ شاید ''گھوڑے کو کون مارے گا''

مستنصر حسین تارڑ

سرسوتی سے سندھ تک

جب عورت کے اندر ایک بے شکل لوتھڑا دھیرے دھیرے ایک شباہت اختیار کرتا جاتا ہے اس کے نین نقش واضح ہوتے چلے جاتے ہیں ایسے ہی ایک ادیب کے اندر ایک بے شکل خیال پرورش پاتا ہے اور پھر نقش و نگار جو کہ کردار ہوتے ہیں اسے ایک واضح شکل دینے لگتے ہیں۔ جہاں ایک جنسی عمل کے نتیجے میں ہی حمل ٹھہرتا ہے اسی طور ایک تخلیقی عمل کے تحت ہی ایک خیال ادیب کے بدن میں وجود میں آتا ہے...... اگرچہ ان دنوں تخلیقی عمل کے بغیر ہی خیالی بچے پیدا کیے جا رہے ہیں۔

کسی ناول یا کہانی کے کرداروں کی اگر ایک غیر واضح تقسیم کی جائے تو پہلی قسم میں وہ کردار آتے ہیں جو سراسر ناول نگار کے تخیل میں سے جنم لیتے ہیں اور ایک بڑا ادیب ہی ایسے کرداروں کو تخلیق کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ دوسری قسم اُن کرداروں کی ہوتی ہے جن میں کہیں نہ کہیں کوئی چہرہ، ایک سرسری ملاقات، کوئی کتاب، کوئی تجربہ آپ کو ایک مبہم سا اشارہ مہیا کرتا ہے اور آپ اُس اشارے کی راہ پر چلتے ہوئے سوچ کے مسلسل عمل سے رنگ بھرتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک باقاعدہ کردار کی صورت میں آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔ تیسری نوعیت کے کردار دراصل بہت سارے کرداروں میں سے کشید کر کے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ ان میں خصلت کسی اور کی ہوگی اور زندگی کے بارے میں رویہ کسی اور کا۔ روزمرہ کی عادات کہیں اور سے مستعار لی ہوتی ہیں اور پس منظر یکسر کسی اور کا ہوگا۔ ان سب کو یکجا کر کے ناول نگار اپنی مرضی پر چلنے والا ایک کردار بنا لیتا ہے۔ آخری قسم کے کرداروں کے لئے آپ کو کوئی تردد نہیں کرنا پڑتا۔ یہ بنے بنائے گھڑے گھڑائے اپنے مخصوص لہجے میں اپنی محبتوں اور کمینگیوں سمیت مکمل حالت میں آپ کے سامنے موجود ہوتے ہیں اور آپ صرف اتنا کرتے ہیں کہ انہیں ناول میں جڑ دیتے ہیں۔ اب یہ آپ کی تکنیکی صلاحیت پر منحصر ہے کہ اُس مکمل کردار کو ناول کے بہاؤ میں شامل کریں تو وہ اُس کے ماحول اور اُتار چڑھاؤ میں یوں مدغم ہو جائے کہ گویا وہ ہمیشہ سے اُس کا ایک لازمی جُز رہا ہو۔ اور اگر لاپروائی برتیں گے تو وہی کردار جو ایک بڑا کردار بن جانے کی صلاحیت رکھتا تھا ناول میں ایک پیوند کی صورت الگ اور بے جوڑ نظر آنے لگے گا۔

میرے ناولوں، سفر ناموں اور افسانوں میں چار اقسام کے کردار نظر آئیں گے۔ اگرچہ سفر ناموں کا معاملہ قدرے مختلف ہے کہ اُن میں کردار تخلیق نہیں کئے جاتے بلکہ وہ چوتھی قسم سے متعلق ہوتے ہیں یعنی مکمل حالت میں آپ کے سامنے موجود ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود کم از کم میں اُن کو جوں کا توں بیان نہیں کرتا کہ یہ کام صرف منشی حضرات کرتے ہیں یا پھر صحافیوں کو بھی اس صف میں شامل کیا جا سکتا ہے کہ یہ اُن کی صحافتی مجبوری ہوتی ہے۔ جیسے ایک خاص موسم میں درختوں کی کانٹ چھانٹ ضروری ہوتی ہے تا کہ غیر ضروری شاخیں اور ٹہنیاں زمین سے حاصل کردہ قوت ضائع نہ کریں اسی طور سفر نامے کے کرداروں میں بھی

کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ واضح طور پر سامنے آئیں جھاڑ جھنکار میں گم نہ ہو جائیں۔

میرے سفرناموں میں بہت سے ایسے کردار آئے جنھوں نے پڑھنے والوں کے دل میں ایسی جگہ بنائی کہ وہ اُنہیں مجھ سے زیادہ عزیز ہو گئے۔ ان میں پیرس کی اپاہج لڑکی پاسکل سرفہرست ہے جس کے انجام کو شدید ناپسند کرتے ہوئے آج بھی مجھے قارئین کی جانب سے دشنام بھرے خط ملتے ہیں۔ شکھ دیپ، مائیک ملر، مرسیڈس، ربیکا، جیسی، ناڑؔا سعد ایسے کردار جن میں سے بیشتر وقت کی راکھ میں گم ہو چکے ہیں لیکن قارئین اُن کے بارے میں اب بھی متجسس ہیں کہ وہ کہاں ہیں کیا کرتے ہیں۔ پاکستانی شمال کے سفرناموں میں میرے بیشتر ساتھیوں کے کردار بھی مقبول عام ہوئے۔ نظامی صاحب، مطیع الرحمٰن، مولوی رحمٰن، میاں صاحب، خالد ندیم، سلمان، پورٹر سلطان، نگیر وغیرہ ان میں سے چند ایک ہیں۔ ابھی ابھی میں نے پاسکل کے کردار کے حوالے سے دشنام بھرے خطوط کا تذکرہ کیا تو مجھے یاد آیا کہ دو خطوط ایسے تھے جن میں نہائت سنجیدگی سے مجھے یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر "پیار کا پہلا شہر" کے اگلے ایڈیشن میں اُس کے المیہ انجام کو نہ بدلا گیا تو مجھے اپنی جان سے جانا ہوگا۔ ظاہر ہے میں نے ان ہر دو قارئین کو تسلی اور معذرت بھرے خطوط لکھ کر اُنہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس موضوع پر ایک فلم کا حوالہ بے جا نہ ہوگا جس میں ایک خاتون اپنے پسندیدہ مصنف کے ایک ناول کے مرکزی کردار سے اتنی شدت کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے کہ وہ ناول کے اختتام پر اُس کی موت برداشت نہیں کر سکتی اور مصنف کی کنپٹی پر پستول رکھ کر اُسے ناول کا انجام بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے تا کہ اُس کا مرکزی کردار زندہ رہ سکے۔

میرے ناولوں کے بیشتر کردار جو زیادہ قوت کے ساتھ اُبھرے اور نمایاں ہوئے اور جن کا تذکرہ ہوا وہ عورتوں کے ہیں۔ بلکہ عبداللہ حسین نے میرے ناول "بہاؤ" کے مرکزی کردار پاروشنی کے بارے میں لکھا کہ اردو ادب میں یہ سی بھی نسوانی کردار کی طاقت ور ترین شکل ہے۔ "بہاؤ" لکھتے ہوئے پاروشنی کا کردار مجھ پر حاوی ہو گیا تھا بلکہ اُس نے مجھے بہت بے بس کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے قطع تعلق کر کے اپنی الگ زندگی گزارنے لگا تھا۔ میں اُسے ناول میں اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلا سکتا تھا۔ پاروشنی نہ صرف مجھ پر حاوی ہو گئی تھی بلکہ کسی حد تک میں اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں تخیل کی سطح پر اس کے ساتھ ایک جذباتی اور جنسی زندگی بسر کرنے لگا تھا اور "بہاؤ" لکھتے ہوئے ایک ایسا لمحہ بھی آیا جب میں نے محسوس کیا کہ دراصل میں بھی پاروشنی ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شائد میں بچے کی پیدائش کی اذیت نہ بیان کر سکتا۔ "بہاؤ" کے دیگر اہم کرداروں کی مانند ورچن اور سمرو بھی سراسر تخیلاتی تھے لیکن پاروشنی کے لئے اُن کے بدن میں جو جذبات تھے وہ میرے اپنے تھے۔ "بہاؤ" کے اختتام کے بعد میں ایک عرصہ تک ڈیپریشن کا شکار رہا اور کئی ماہ تک اپنی سٹڈی ٹیبل کے قریب نہ آ سکا کہ میں پاروشنی کے معدوم ہو جانے کے سوگ میں تھا۔

"بہاؤ" کے سب کردار ان دیکھے تھے لیکن "راکھ" کے بیشتر کردار دیکھے ہوئے تھے۔ اگر وہ میرے دیکھے ہوئے نہیں تھے تو وہ کسی جاننے والے کے دیکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے صرف شوبھا، نوراں، برگیتا، ڈاکٹر ارشد، بھو اور کرسٹین کو میں نے جنم دیا تھا۔ بقیہ کردار مختلف حالتوں اور زمانوں میں میرے آس پاس

سانس لیتے رہے تھے۔ فاطمہ، بابو، مردان علی، راڈنی، مشائلہ، اُرسلا، جنرل صاحب کمال، عارفین اور نازنین وغیرہ اسی کیٹگری میں آتے ہیں۔ شاہد علی کا کردار کسی حد تک خودنوشتی تھا۔ البتہ زاہد کالیا، مسز حسین کو کسی کانٹ چھانٹ کی ضرورت نہ تھی، وہ سراسر اوریجنل تھے۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ منٹو صاحب بھی اوریجنل تھے۔
''راکھ'' میں کسی ایک کردار کو مکمل طور پر مرکزی حیثیت حاصل نہ ہو سکی اور کچھ نقاد اسے ناول کی سب سے بڑی خامی قرار دیتے ہیں۔ وہ درست بھی ہو سکتے ہیں لیکن میں نے ''راکھ'' میں پاکستان کے پہلے تیس پینتیس برسوں کا احاطہ کیا ہے۔ اس میں جتنے بھی کردار آتے ہیں وہ اپنے اپنے عہد کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں اور یا تو اُس عہد میں رہ جاتے ہیں یا پھر آگے چلے جاتے ہیں۔ میں بڑی آسانی سے کسی ایک کردار کو زیادہ اہمیت دے کر اسے مرکزی بنا سکتا تھا، دوسرے کرداروں کی زندگی کو اُس کے تابع بنا سکتا تھا لیکن یہ دوسرے کرداروں کے ساتھ زیادتی ہوتی کہ ''راکھ'' کے وسیع کینوس پر وہ اپنے اپنے مقام پر اہم اور مرکزی تھے۔ یہاں تک کہ زاہد کالیے کا برادرِ عزیز ''کتورا'' بھی ایک پلے کی حیثیت سے اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب وہ ایک جنرل کو دیکھ کر ''وف وف'' کرتا ہے۔

ایک مرتبہ پھر میرے ناول ''قربت مرگ میں محبت'' میں کوئی ایک مرکزی کردار نہیں ہے کہ وہاں صرف محبت اپنے پھیلاؤ میں ہی مرکزی کردار ہے۔ غلافی آنکھیں، عابدہ سومرو اور سلطانہ شاہ حقیقی زندگی میں سے کشید کیے گئے کردار ہیں لیکن اُن کی آپس میں بُنت اور خاور کے ساتھ ان کی وابستگی تخیلاتی ہے۔ اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نقاد نے لکھا تھا کہ یہ تینوں کردار ابنارمل کیوں ہیں۔ ایسا میں نے اپنی من مرضی سے نہیں کیا کہ وہ تھے ہی ایسے۔ یوں بھی ایک عمر رسیدہ اور تنہا شخص کی قربت میں آنے والی خواتین عام طور پر نارمل نہیں ہو سکتیں۔

اور ہاں ان تینوں ناولوں میں دراصل مرکزی کردار دریاؤں کے ہیں جن کے خشک ہو جانے کا ڈر دوسرے کرداروں کی نفسیات پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ''بہاؤ'' میں دریائے سرسوتی، ''راکھ'' میں دریائے راوی اور ''قربت مرگ میں محبت'' میں دریائے سندھ ان تینوں ناولوں کے کرداروں کو اپنے بہاؤ میں شامل کر کے ایک بڑے المیے کی نشاندہی کرتے ہیں۔

دُعا کی طرف لوٹتے ہیں

شعری رویے کے اعتبار سے مجھے آپ اساطیری غزل کے داعی شعراء کے قبیلے سے قدم ملا کر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ آپ کی شاعری قدیم تہذیبی حوالوں سے لبریز نہیں مگر ایک اساطیری کیفیت کی حامل ضرور ہے۔ ایسی کیفیت جو موجود و غیر موجود کے مابین، ایک خطہ خواب پر زیست کرنے کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ ایک جادوئی فضا میں زندگی کی مروّجہ حقیقتوں کو گوندھ کر ایک نیا جہانِ حیرت پیدا کرنے کی سعی۔ جس کے باعث ہمارے موجود کی ہر شے بدل کر رہ جاتی ہے اور مظاہرِ فطرت ایک نئے تخلیقی سراپے میں ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ **(غلام حسین ساجد...... مکتوب بنام کاشف مجید)**

ڈاکٹر سلیم اختر

تذکرۂ اشجار

(نخاس سے حاصل کردہ مخطوطہ، ناقص الاول، ناقص الآخر۔ ترقیمہ ندارد)

عاجز شہنشاہ دو عالم، گیتی پناہ، صریر آرائے تخت سلیمانی، فخر دو جہان پشتینی غلاموں میں سے ہے۔ جب آج سے قبل اڑھائی صدی، شہنشاہ عالم کے نیر رخشندہ جیسے جد، ماورالنہر سے مقدر آزمائی اور مہم جوئی کے لیے نکلے اور اس خطہ مینوسواد کا رخ کیا تو اس غلام کے آبا بھی ہم رکاب تھے۔ انہوں نے معرکہ آرائیوں میں قوت بازو کا مظاہرہ کیا، لشکر جرار کی قیادت کی، دشمنوں کی سرکوبی کی، بدخواہوں کو نیست کیا، مفسدوں کے سر کچلے اور سازشیوں کو نابود کیا۔ یوں ایک مضبوط سلطنت کی بنا استوار کی۔ یہی نہیں سلطنت تو ہر فاتح بھی حاصل کر سکتا ہے مگر اسے قابو میں رکھنا اور رعیت کی محبت حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بانیء سلطنت اس رمز سے آگاہ تھے لہٰذا انہوں نے اگر ایک طرف مملکت کو زور بازو سے آفاق تک پھیلایا تو دوسری جانب حسن تدبیر، عدل و انصاف اور معاملہ فہمی سے رعایا کے دل جیت لیے لہٰذا ہمہ وقت رعیت ان کے لیے دعا گو رہتی یوں سلطنت کو داخلی استحکام بھی نصیب ہوا۔

بندۂ حقیر کے آباء نے چار پشت تک تیغ کی وفاداری سے حق نمک ادا کیا، چنانچہ تمام بادشاہوں نے انہیں سرفراز کیا۔ عاجز پیدائشی کمزور تھا، بچپن ہی سے کم گو اور کم آمیز تھا۔ کھیلوں، ورزش اور کسرت سے نفور، درختوں پر چڑھنا، تیرنا، کشتی رانی ناپسند، نہ میں اسپ تازی کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر رانوں کے سخت دباؤ سے اسے قابو میں رکھ سکتا تھا، نہ شمشیر زنی میرے بس کا روگ تھی، نیزہ بازی اور خنجر زنی سب میں نالائق، شمشیر زنوں کے خاندان اور معرکہ آراؤں کے گھرانہ میں ایسا مریل بچہ، میری ناتوانی اور اس کی پیدا کردہ کم ہمتی کی وجہ سے قبلہ گاہی ملول خاطر رہتے کہ میدان جنگ میں موت پانے والوں کی نسل میں ایسا پیدا ہوا جو بستر پر تپ سے مرے گا۔ فنونِ حرب میں تربیت اور اسلحہ کے استعمال میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں مگر میں ان امور میں نا اہل ثابت ہوا، تب سیانوں کے مشورہ کے بموجب مجھے مدرسہ میں اساتذہ کے سپرد کر دیا گیا۔ قدرت کے عجب کھیل ہیں اور اسی لیے فہم سے بعید بھی، جو دست اہل شمشیر نہ بنے وہ قلم سے یوں مانوس ہوئے کہ میں ذہین و فطین طلبہ میں شمار کیا جانے لگا، مجھے خوش نویسی سے خصوصی لگاؤ تھا۔ چنانچہ خوش نویسی کے مروج اسالیب جیسے ...... تعلیق، نستعلیق، ثلث، طغریٰ، ریحان اور بہار میں خصوصی مشق بہم پہنچائی، اللہ نے حافظہ بھی بہت اچھا دیا تھا، ایک مرتبہ سنا ہوا لفظ، دیکھا ہوا چہرہ اور سونگھی ہوئی خوشبو کبھی نہ بھولتا۔

جب مدارج علم طے ہوئے اور خوش نویسی میں شہرت حاصل کر لی تو ایک روز سعید قبلہ گاہ نے حضور شاہ پیش کیا۔ شاہ دوراں نے کمال لطف و کرم سے آبا کی جان ارزانی مد نظر رکھتے ہوئے۔ وقائع نگار کے عہدہ پر سرفراز فرمایا۔ مجھ سیاہ بخت کا بخت خوابیدہ یوں بیدار ہوا کہ حضور پرنور کے قدموں کے نیچے بیٹھنے کا دائمی اعزاز حاصل

ہوا کہ حضور پُر نور کے دہنِ مبارک سے جو تکلف آمیز کلمات واحکامات وارشادات واقوال ادا ہوتے میں انہیں قرطاس ابیض پر رقم کرلیتا۔
دربار اور امورِ مملکت سے فراغت کے بعد، یہ عاجز، دن بھر میں قلم بند کیے گئے اقوال زریں گوش گزار حضور کے کرتا، حضور پرنور دستِ خاص سے بنفسِ نفیس عبارات کے بعض اجزا کی تصحیح فرماتے یا بعض الفاظ کی جگہ زیادہ با معنی الفاظ لکھ دیتے یوں ملاحظہ ارزانی اور تصحیح کے بعد یہ عاجز قرطاس منقش ومذہب پر اقوال وارشادات خوش نویسی کے بہترین اسلوب میں رقم کردیتا کہ مورخین اور آئندہ نسلیں، شہنشاہ عدل پناہ اور نوشیرانِ عصر کی کارگزاریوں، احکامات اور فرامین کے بارے میں، دستِ اول معلومات حاصل کریں۔
دربار سے تعلق کے بعد، ایک صبح، قبلہ گاہی نے فجر کی نماز کی ادائیگی اور تسبیح کے بعد مجھ سے یوں خطاب فرمایا:
''اے نور چشم! ہم نے صدیوں تک دودمان شاہی کی خدمت کی اور جان دے کر حق نمک ادا کیا، تم بھی راہِ وفا پر استقامت سے گامزن رہنا۔
یہ بات غور سے سنو اور اسے گرہ میں باندھ لو۔ بادشاہ اور بچہ میں صرف عمر کا فرق ہوتا ہے مزاج کا نہیں، کچھ علم نہیں کہ کب ضد میں کیا طلب کرلے اور توڑ پھوڑ شروع کردے، بچہ جب غصہ کے باعث ضد میں آتا ہے تو اسے کھلایا پلایا محبت شفقت الفت کچھ یاد نہیں رہتی، بعینہ بادشاہ پر جب غصہ ہو تو اسے بھی جان سپاری اور جاں نثاری کچھ یاد نہیں رہتی لہذا اسے کبھی غصہ نہ دلاؤ ہمیشہ اللہ کا فضل چاہو اور بادشاہ کے غصہ سے پناہ مانگو، ہمارا بادشاہ نیک نہاد ہے لیکن بیٹا بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے۔
فرزندِ من! دربار بھڑوں کا چھتہ ہوتا ہے۔ زرق برق ملبوسات میں کورنش بجالاتے وزرا، عمائدین سلطنت اور اراکینِ دربار کے دل میں بادشاہ کے لیے کبھی بھی محبت نہیں ہوتی۔ اس کی قوت کا خوف ہوتا ہے اس لیے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ گردن اس لیے جھکاتے ہیں کہ عمامہ بچانا ہوتا ہے۔
بیٹا! دربار میں سرفراز رہتے ہوئے سر بچانے کا ایک ہی سنہرا اصول ہے گوش وچشم کھلے رہیں اور منہ بند رہے۔ کام سے کام رکھو، شاہ وقت کی خوشنودی ملحوظ رہے، دن عافیت سے گزرے تو رات کو شکرانہ کے نوافل ادا کرو بس اسی سے فلاح پاؤ گے''
عاجز نے پدرِ محترم کے پند سودمند کو حرزِ جان بنایا......''
(...... یہاں سے مخطوطہ پڑھا نہ جا سکا......)
''......... اس عامی کو کیونکہ اسلحہ اور جنگی مشقوں سے دلچسپی نہ تھی اس لیے فارغ اوقات کتب بینی میں بسر ہوتے، وقت کا اس سے بہتر اور کوئی مصرف نہیں کہ بے معنی اشخاص کی بجائے معنی آفرین کتب کے ساتھ گزارا جائے۔ اسی لیے میں نے کتاب سے مکالمہ کو ترجیح دی۔
ایک شام، بلا مقصد، بے ارادہ گھومتا کاروان سرائے جا نکلا۔ وہاں تازہ قافلہ وارد ہوا تھا۔ اشیاء کمیاب اور نوادر برائے فروخت تھے، ایسے نفیس ومہین پارچات گویا تارنگاہ سے بنے ہوں، مصوری کی تصویریں شاہ کار تصویریں کہ پرچھچھا اٹھیں، نرم کولہوں اور سخت چھاتیوں والی کنیزیں، آہو چشم ترک لڑکے، قوت وتوانائی کے فیل گراں

حبشی غلام، چراغوں کی مانند لو دیتے ہیرے اور ستاروں سے چشمک کرتے منور موتی .... الغرض! دامن دل کھینچنے کو ایک سے بڑھ کر ایک انمول تحفہ!

میں اشیاء دیکھتا ہوا گزر رہا تھا، کہ ملک خطا کا ایک کہن سالہ تاجر دکھائی دیا جو بھیڑ سے جدا، چند کتابیں لیے بیٹھا تھا۔ میں نے ادب سے سلام کیا جس کا اس نے خندہ جبینی سے جواب دیا۔ میرے استفسار پر اس نے منقش و مطلا کتابیں دکھانی شروع کیں۔ میں خوش ہو کر کتابیں دیکھتا رہا۔ جب اس نے اپنے تئیں اندازہ لگالیا کہ واقعی مجھے کتابوں سے دلچسپی ہے تو اس نے ایک تھیلے میں سے خاصی خستہ کتاب نکالی اور یوں گویا ہوا۔

''اگر چہ یہ رزمیہ مثنویوں کی مانند مصور نہیں نہ ہی کتب قصص جیسے مطلا حواشی ہیں، نہ ہی شعراء کے دواوین کی مانند خوش نظر مگر ہے یہ سونے میں تو لنے لائق تحفہ ءشاہاں!!''

میں نے مارے اشتیاق کے نسخہ اس کے ہاتھ سے لیا۔ وہ بتا رہا تھا۔

''اس میں عقل و دانش کا نچوڑ ایسے جواہر پارے ہیں جو راہِ زیست میں چراغ ہدایت ثابت ہو سکتے ہیں''

اسی اسلوب میں وہ کتاب کی خوبیاں گنواتا رہا۔

''اے نوجوان! اس کتاب کو اپنا بزرگ، مرشد اور محبّ جانو گے تو ہمیشہ اسے مفید اور کار آمد پاؤ گے''

میں اگر چہ مشتاق تھا مگر قیمت خاصی زیادہ تھی۔ مجھے متردّد دیکھ کر اس بزرگ نے یوں کلام کیا۔

''بیٹا! کتاب خریدو یا نہ خریدو، مگر ایک بات سمجھ لو! کتاب رقم کی میزان میں نہیں تلتی۔ کتاب کاغذ پر لکھی مجلد شے نہیں، کاغذ کا مول لگا سکتے ہو مگر اس پر تحریر دانش انمول ہوتی ہے''

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''کیا تم سقراط، افلاطون اور ارسطو کی سوچ کی قیمت بصورت سکہ ادا کر سکتے ہو؟''

''ہرگز نہیں''

''سوچو!'' وہ انگشت شہادت کھڑی کر کے بولا ''اگر یہ اور ان جیسے دیگر مصلحین نہ ہوتے تو آج دنیا جہالت کے کس مقام پر ہوتی؟''

''بجا فرمایا!''

''ہمارے ملک خطا میں بھی ایسا ہی ایک معلم گزرا ہے، کنفیوشس''۔ یہ نام میرے لیے نیا تھا۔ چنانچہ پورے انہماک سے میں اس کی بات سنتا رہا۔ وہ بتا رہا تھا۔

''کنفیوشش ہمارا عظیم معلم ہے۔ ہم نے اس سے دانش اور اخلاق حاصل کیا ہے، اس کتاب میں زیادہ تر اسی کے اقوال دلنشین ہیں''۔

وہ ایک لمحہ کو رکا اور پھر زوردار، لہجہ میں گویا اعلان کیا

''کنفیوشش زر میں نہیں تولا جا سکتا کہ اس کی دانش ہی زرِ خالص ہے''

میں نے منہ مانگے دام ادا کیے، کتاب گھر لایا، پہلا صفحہ ہی پڑھا تو کمرہ میں جیسے اجالا ہو گیا۔

''زندگی میں کم از کم ایک معقول کتاب ضرور لکھو، یہ ممکن نہیں تو زندگی میں کم از کم ایک پیڑ ضرور اگاؤ، یہ بھی ممکن

نہیں تو پیڑ کی چھاؤں میں الفاظ سے مکالمہ کرو''
کتاب کیا تھی اقوال کا موتیوں بھرا خزانہ تھی، رات بھر محوِ مطالعہ رہا، اگلی صبح، کتاب ریشمی غلاف میں لپیٹی اور حضورِ عالم کی خدمت عالی میں پیش کردی، مجھ کم سواد کے لیے یہ کتاب نہ تھی، واقعی شاہوں کے شایان شان تحفہ تھی! قربت کے باعث اس غلام کو علم تھا کہ حضورِ عالم بھی کتب بینی سے شغف رکھتے ہیں۔
سلطنت میں امن و امان، رعیت خوشحال، دشمن نابود، غنیم عنقا، سازشی مفرور شہنشاہ گیتی پناہ کو فراغت حاصل تھی، حضور کتاب کا تحفہ پا کر بے حد مسرور ہوئے۔ گلو مبارک کی مالائے مروارید عنایت فرما کر کمتر کا رتبہ بڑھایا۔ عالم پناہ مسلسل محوِ مطالعہ رہتے، کتاب سے دانش و حکمت کے موتی اخذ کر کے اہلِ دربار کی خردمندی میں اضافہ فرماتے............''
(......مخطوط کے کچھ صفحات غائب......)
''........ حضور کا معمول تھا کہ امورِ سلطنت سے فراغت کے بعد، مجھے ساتھ لیتے اور خاموشی سے کجلی بن کا رخ کرتے، عیش و نشاط یا شکار کے لئے نہیں، مطالعہ کی تشفی کے لیے۔ پچھلے پہر کی نرم دھوپ میں شاہ کسی پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے، کتاب سے محوِ کلام نظر آتے۔
ایک شام کہ درختوں کے سائے لمبے ہو رہے تھے، دن بھر کی اڑان کے بعد آشیانوں کو لوٹتے پرندوں کی آوازوں سے کجلی بن گونج رہا تھا............ ہم نے اسے دیکھا۔
برق گزیدہ درخت کے جلے سیاہ تنے کے ساتھ ٹیک لگائے وہ شاداب پھول کی مانند تھی۔ رخصت ہوتی دھوپ تن شجر کو روشن کر رہی تھی بے حجاب سنہری جسم نار پھل اور ماس مسام تار پیرہن کا کام کر رہے تھے۔ ہم دیدۂ حیران! یہ حسن نہ تھا جادو اور طلسم تھا، عورت تھی کہ جنگل کی روح مجسم ہو گئی تھی، تنِ بے لباس سے غیر مرئی شعاعیں نکلتی اور اپنے گرم حصار میں لیتی محسوس ہو رہی تھیں۔
شاہ نے جب اسے مرد بن کر دیکھا تو پھر اور کسی عورت کو نہ دیکھا حرم میں عورتوں کی کمی نہ تھی لیکن شاہ عالم پناہ اس کے طلسمی حسن کے قفس میں گویا پنچھی کی مانند اسیر ہو گئے۔
اب شاہ کے ارشادات میں بعض اوقات ایسے کنائے ہوتے جنہیں یہ بے خبر سمجھنے سے قاصر رہتا۔
میں تا دمِ مرگ وہ شام نہ بھول پاؤں گا۔
اس کے حسن میں شہنشاہ چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک تناور شجر گویا سیاہ مضبوط جسم اور پُر قوت بازو میں تبدیل ہو گیا، ایک لمحہ کو چیخ قبض بلند ہوئی، اگلے لمحہ وہ سینہ ء مبارک میں اتر گئی، جو گڑھا پہلے سے کھودا گیا تھا، جسد مبارک کہ ہنوز اس میں سے خون ابل رہا تھا، بے دردی سے اس میں پھینک دیا گیا، ماہر ہاتھوں نے گڑھا پُر کیا، شاخیں اور پتے اس پر ڈال کر نشانِ ستم مٹا دیا گیا۔ زنِ بے حجاب ادائے خاص سے یہ سب دیکھا کی۔
میں مانند شجر ساکت!''
(مخطوط کی چند سطریں پڑھی نہ جا سکیں)
''نیا سورج نئے شاہ کے ساتھ طلوع ہوا، نقاروں پر چوٹ پڑی، اعلان کنندگان نے اعلانات کئے، وزراء،

امراء، عمائدین، اراکین نئے شاہ کے حضور کورنش بجالائے، شعرائے کرام نے نئے شاہ کی مدح میں نئی تشبیب و گریز کے ساتھ، جو قصائد تصنیف فرمائے، ان میں نئے شاہ کی ثناء کی وہ صفات گنوائیں وہ خصوصیات اجاگر کیں اور عظمت کے ایسے اسلوب میں گن گائے کہ تشبیہ و استعارہ کا کال پڑ گیا۔

مجھے یہ علم ہو چکا تھا کہ دراصل ایک زن غیر منکوحہ کے بداطوار اور نام نہاد، پسر غیر شرعی کی یہ سازش تھی۔ وہ زنِ بے حجاب کہ درحقیقت زنِ نابکار تھی، شہنشاہ کو ورغلا کر کجلی بن تک لے آنے کے لیے مامور کی گئی تھی۔

جنت مکانی پدرِ محترم کی کارآمد نصیحت کے بموجب میں اور میرا قلم خاموش رہے۔ میں کہ شاہی مؤرخ اور وقائع نگار خصوصی تھا، اب نئے حالات کی روش سے تاریخ نویسی پر مامور ہوا چنانچہ میں نئے شاہ کے کمالات، عزم و صحت اور عدل گستری پر مبنی تاریخ لکھتا رہا..........حسب دستور!.........''

(مخطوط کی چند سطریں مٹی ہوئی ہیں)

''..........وقت اچھا گزر رہا تھا مگر میں مطمئن نہ تھا۔ طبیعت میں بے کلی رہتی، آسودگی کے باوجود عدم آسودگی کا احساس۔

جب بھی وقت ملتا شہنشاہ عالم کے بے نشان مدفن پر چلا جاتا۔ کجلی بن کا وحشت بھرا ماحول ملول دل کے لئے سکون آور محسوس ہوتا۔ خاموش جنگل میں میں تنہا ہوتا۔ کوئی متنفس نہ سنگی نہ ساتھی، خاموش مدفن پر بیٹھا شاہ مہربان کو یاد کرتا۔

ایک دن دیکھا کہ مدفن کی سیاہ مردہ گھاس میں قطرہ ہائے شبنم کی مانند پھولوں کے رنگ چمک رہے ہیں۔ مدفن کشت میں تبدیل ہو رہا تھا۔ میں نے باقاعدگی سے دیکھ بھال شروع کر دی۔ بہار آئی تو مدفن گلبن میں تبدیل ہو گیا۔ اردگرد کے مردہ شجر بھی تر و تازہ ہو کر، نئے سبز ملبوسات سے بنے سنورے۔

کجلی بن میں صرف یہی قطعہ خوش گوار، خوش مہک اور خوش منظر تھا۔ میں بے نشان مدفن کا مجاور بن چکا تھا..........''

(مخطوطہ..........یہاں سے پڑھا نہ جا سکا)

''..........بادشاہوں کا دستور ہے کہ مقصد براری کے لیے دغا، مکر، فریب، سازش اور قتل تک کسی فعل سے بھی اجتناب نہیں کرتے لیکن حصولِ مقصد کے بعد سازشی کارندوں سے خوفزدہ بھی رہتے ہیں اسی لیے سمجھدار بادشاہ نے بطریق احسن اور بہ تدبیر خفیہ، سازش کے ساتھیوں سے پیچھا چھڑانا شروع کر دیا یوں کجلی بن کی زیرِ زمین آبادی میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔

میں کہ وقائع نگار خصوصی اور دربارشاہی کا مؤرخ تھا مجھ سے یہ حقیقت کیسے روپوش رہ سکتی تھی کہ چالاک بادشاہ مخالفین اور سابق ساتھیوں کو جس رفتار سے قتل کر رہا تھا، اس کا امکان تھا کہ جلد ہی کجلی بن گورستانِ شاہی میں تبدیل ہو جائے گا۔

میں پدرِ مرحوم کی نصیحت پر کاربند رہا، منہ بند رکھا اور قلم حکم شاہ کے تابع!

حکم شاہ سب سازشی مفسد اور دغاباز زیرِ زمین آباد تھے۔ البتہ اس سازش کا اہم ترین مہرہ زنِ نابکار ہنوز زندہ

تھی اپنی کارگزاری کے بدلہ میں مناکحت کی خواہاں تھی جبکہ سیاست کا تقاضہ یہ تھا کہ پڑوسی بادشاہ کی دختر قبیح صورت کو عقد میں لاکر، مشرقی سرحدیں محفوظ بنالی جائیں جبکہ زنِ نانہجار کو مملکت اور سیاست کے مقابلہ میں اپنا مستقبل زیادہ عزیز تھا سو تُو تکرار رہنے لگی۔ تب بادشاہ نے اس الجھن کا وہی حل نکالنا چاہا جو بادشاہ نکالا کرتے ہیں۔ کارِ لائقہ کے لیے وفادار حاضر تھے۔ یہ میری زندگی کی دوسری ایسی شام ثابت ہوئی جو لوحِ حافظہ پر دائمی نقش ثبت کر جاتی ہے۔

میں باتوں کی آوازیں سن کر مدفن سے اٹھ کر ایک گھنے جھاڑ کے پیچھے دبک گیا۔ بادشاہ اور زنِ نانہجار ہنستے بولتے چلے آرہے تھے۔ مارے خوف کے میں پسینہ میں شرابور ہوگیا۔ اگر دیکھ لیا گیا تو زندہ نہ بچوں گا۔

سر سبز گھاس، پھولوں، پودوں اور اشجار و اثمار کو دیکھ کر وہ بولی ''کیسی خوبصورت جگہ ہے''۔

بادشاہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ بالآخر بولا ''تمہیں یاد ہے نا، اسی جنگل میں تم نے اس کا کام تمام کیا تھا''

وہ ہنسی، دلبر ہنسی

''یہ کیا قصہ لے بیٹھے، مجھے تو یاد بھی نہیں''

''مگر مجھے یاد ہے''

وہ دوبارہ ہنسی

ابھی اس کی ہنسی کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک طویل القامت شجر جھکا، اسکی مضبوط شاخوں کے پھیلے بازوؤں نے انہیں جھپٹ لیا۔ پیشتر اس کے کہ انکے کھلے حلقوں سے خوف کی چیخیں برآمد ہوتیں، دونوں شجر میں سما چکے تھے۔

یا مظہر العجائب!!

میں نے کیا دیکھا؟ ہاتھوں سے آنکھیں مسلیں، پھر کھولیں پھر بند کیں۔ پرندوں کی اچانک خاموشی ماحول کو مزید پر اسرار بنا رہی تھی۔ اشجار، پھل، پھول ساکت، منظر پر خاموشی کا پہرہ!

تب دیدۂ حیراں نے دیکھا کہ موٹے موٹے سیاہ چیونٹوں نے جو ادھر اُدھر پھر رہے تھے یک قطار ہو کر اس شجر کا رخ کر لیا.........''

(اس کے بعد مخطوط میں کوئی صفحہ نہیں)

انور سلیم / غزل

صحرا مرے اندر یہ اتر آیا کدھر سے	بادل کوئی چپکے سے گزر جائے نہ سر سے
مانا کہ ابھی آنکھ ملاتے ہو بھنور سے	کشتی بھی ذرا دیکھ لو تم میری نظر سے
پوچھو نہ مرا حال فقط دیکھ لو اتنا	چہرے پہ جمی گرد میں لایا ہوں سفر سے
در آئی صدا مجھ میں شکستہ کسی پل کی	حالانکہ نہ رشتہ ہے کوئی میرا کھنڈر سے

رشید امجد

دمِ واپسیں

دن کے آخری ایوانوں کی سیڑھیوں سے اترتے شام کے سائے لمبے اور گہرے ہوئے جا رہے تھے۔ روشنی کی آنکھوں میں سرمئی دھند پھیل گئی تھی اور ایک ہلکی سی دھندلاہٹ نے اس کی چمک کو ماند کر دیا تھا۔ شام کی تھاپ پر تھرکتی خاموشی کے پاؤں میں بجتے گھنگھروؤں کی تھرتھراہٹ بڑھتی جا رہی تھی' اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا، گھونسلوں میں جانے سے پہلے پرندے آخری اڑانیں بھر رہے تھے، اور ایک ایک کر کے درختوں کی گھنی شاخوں میں اتر رہے تھے۔

''تھوڑی دیر کے بعد یہ اپنی چونچوں کو پروں میں واپس دبا کر خاموشی کی چادر اوڑھ لیں گے'' اس نے لمحہ بھر کے لئے سوچا۔ آنکھیں بند ہونے اور اندھیرا گہرا ہونے کے تصور ہی سے اس کے سارے وجود میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ ساری عمر وہ اندھیروں سے ڈرتا رہا تھا، مگر اب...... عمر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے قدم زمین پر لگنے ہی والے تھے، ایک ٹھنڈی تاریک زمین جو اسے ایک ڈراؤنے اندھیرے خلا کی سی لگتی تھی۔ معلوم نہیں، اس خلاء کا انت کیا ہے۔

''یقین بھی اک عجب دولت ہے'' اس نے سوچا، وہ ہمیشہ اس دولت سے محروم رہا تھا، رسے پر ڈولنے کی کیفیت، اِدھر کیا ہے اور اُدھر کیا ہے۔ بس ساری زندگی اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی۔ اور اب آگے تو ایک نامعلوم دنیا تھی۔ اس نامعلوم دنیا کو دیکھنے کی تمنا ہمیشہ اس کے اندر انگڑائیاں لیتی رہی اور اب جب وہ اس اَن دیکھی دنیا کی جانب قدم قدم بڑھ رہا تھا تو ایک عجب طرح کا خوف دبے پاؤں پیچھے پیچھے چلا آتا تھا...... آگے کیا ہے، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں تو پھر...... اس خیال ہی سے کانپ سا جاتا۔ میں ختم ہو جاؤں گا، کھیل ختم ہو جائے گا۔

کھیل کے ختم ہو جانے کا احساس بہت ہی تکلیف دہ تھا' لیکن عمر بھر اس نے کوئی عمدہ کھیل کھیلا بھی نہیں تھا، بس ایک سادہ سی تحریر، سادے سے اوراق پر۔ درمیانے طبقے کے ایک آنگن میں کھلا تو وہ پھول کی طرح تھا، لیکن اس پھول کی خوشبو کی مہک زیادہ دنوں برقرار نہ رہی۔ زندگی کی طویل تپتی سڑک پر چلتے چلتے تھکن کب اس کے وجود کی گلیوں میں داخل ہوئی، اسے اس کا احساس ہی نہ ہوا۔ بس یوں لگا جیسے کسی ایک دن وہ تھک سا گیا ہے۔ اس احساس نے اس پر ایک جھلاہٹ سی طاری کر دی۔ اس کی بیوی اس جھلاہٹ سے بہت چڑتی تھی،

''اور کیا چاہتے ہو' بیٹیوں کی شادی ہو گئی، لڑکے اپنے اپنے کام سے لگ گئے، عزت سے ریٹائر ہو گئے، گھر بن گیا...... اور تم کیا چاہتے ہو؟ ''

یہ تو اسے بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اور کیا چاہتا ہے۔ لوگ اسے خوش نصیب کہتے تو لگتا طنز کر رہے ہیں، لیکن پھر خود

سے پوچھتا...... ''واقعی میں اور کیا چاہتا ہوں''

دن کے ایوانوں کی آخری سیڑھیوں سے اترتے شام کے لمبے سایوں میں اب اندھیرا گھلنے لگا تھا، فضاء میں اڑتے پرندے آہستہ آہستہ گھنی شاخوں میں چھپے اپنے گھونسلوں میں اتر رہے تھے، فضا، صاف سی ہونے لگی تھی، اب کچھ دیر بعد یہ پرندے اپنی چونچیں اپنے پروں میں چھپا لیں گے۔

اس نے اپنے سامنے پھیلی سڑک پر نگاہ ڈالی۔ آگے ایک موڑ تھا، اس کی سیر کا آخری نقطہ۔ اس موڑ سے واپسی ہوتی، خاموشی سے گیٹ کھول کر اپنے کمرے میں جانا تھوڑی دیر بعد بیوی میز پر چائے رکھ جاتی، گھونٹ گھونٹ چائے پیتے بس خاموشی سے دیواروں کو گھورے جانا۔ کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتے نئے نئے خیالات اس کے ذہن میں اترتے، جیسے کبوتر آسمان کی پہنائیوں سے ہوتے ہوئے اپنی چھتری پر اترتے ہیں، اس وقت اسے خیال بھی نہیں تھا کہ وہ موڑ سے واپس آجاتا ہے، آگے جانے اور موڑ سے پرے دیکھنے کی خواہش تو بہر حال ہمیشہ اس کے اندر رہی لیکن وقت کی طنابیں اتنی کسی ہوئی تھیں کہ بس تھوڑی سی دیر کے لئے سوچا ہی جاسکتا تھا' پھر وہی ہاؤ ہو۔ اور اسی ہاؤ ہو میں آہستہ آہستہ سب کچھ ہوتا گیا۔

بیٹیوں کی شادیاں بھی ہوگئیں، لڑکے پڑھ پڑھا کر اپنے اپنے دھندوں میں پھنس گئے اور اس کی ریٹائرمنٹ کا لمحہ آن پہنچا، کئی دن تو یہ سمجھنے میں لگ گئے کہ اب صبح سویرے تیار ہو کر دفتر جانے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کے مزاج میں مفاہمت کا جو پہلو تھا' اس نے یہاں بھی اس کا ساتھ دیا۔ چائے پی کر دیر تک اخبار دیکھنا، پھر بازار جا کر کچھ خرید لانا' مصروف رکھنے کی کوئی نہ کوئی صورت روز ہی پیدا ہو جاتی۔ اب فرصت کے ان لمحات میں ایک لذت سی محسوس ہونے لگی۔ نوکری کے طویل عرصہ میں بیوی کے ساتھ بات کرنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ صبح اٹھتے ہی تیاری' دن بھر فائلوں کا اِدھر اُدھر ہونا' شام کو تھکن چائے کی پیالی اور پھر یہ سنسان سڑک، قدم قدم چلتے دفتر کے، فائلوں کے خیال، وہ چیز رہ گئی ہوگی، یہ چیز صبح جاتے ہی کرنا ہے، ان ہی الجھنوں میں موڑ آجانا، واپسی پر کچھ دیر ٹی وی دیکھنا اور سو رہنا' میں تو کولہو کا بیل ہوں، وہ اکثر اپنے آپ سے کہتا۔

یہ قدم قدم سیڑھیاں چڑھنے کے دن تھے، دور سے چمکتی چھت، آنکھیں مار مار کر اپنی طرف بلاتی تھی۔ اس کے گرد اگرد خیالوں' باتوں کے، تصورات کے دائرے رقص کرتے تھے، رات گئے تک کسی چائے خانے کی میز کے گرد دوستوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ اپنی زندگی میں تبدیلیاں آ ہی رہی تھیں، ساری دنیا ساری کائنات کو بدلنے کا خواب بے چین کئے رکھتا۔ جینے کی آسائشوں میں خود کو جاننے' پانے اور کبھی کبھار اپنے اندر اتر جانے کی تمنا اکثر چٹکیاں لیتی رہتی اور ان سب میں قدم قدم اوپر چڑھتے جانا، ہر سالگرہ پر ایک موم بتی کا اضافہ، پھر معلوم نہیں وہ کب چمکتی چھت پر پہنچا، کتنی دیر وہاں رہا، یا رہا بھی یا نہیں، اس کا احساس تو اس وقت ہوا جب دوسری جانب اترنے کا آغاز ہو چکا تھا، ایک روز آئینہ کے سامنے کنگھی کرتے ہوئے پہلے سفید بال نے احساس کرایا کہ وہ نیچے اتر رہا ہے، دیکھا تو مونچھوں میں بھی دو ایک سفید سی لہریں گویا اپنے آپ کو کالے بالوں میں چھپا رہی تھیں، تو واپسی کا سفر شروع ہو گیا...... اس نے اپنے آپ سے کہا، اور پھر شانے ہلا دیئے...... یہ تو ہونا ہی تھا۔ اب اس کی رفتار میں ذرا آہستہ خرامی آگئی، کبھی

کبھار زیادہ دیر تک بولتے رہنے سے سانس پھولنے لگی، اس دوران وہ دفتر میں بڑے سے اکیلے کمرے میں پہنچ گیا۔ اب صبح کچھ دیر بھی ہو جاتی تو بغیر کسی خوف کے گھر سے نکلتا۔ اس کا چپڑاسی بڑے گیٹ پر ہی منتظر ہوتا اور اس کے اترتے اترتے گاڑی میں سے بریف کیس نکال لیتا۔ ایک شاہانہ انداز سے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ بڑے کمرے پر ایک نظر ڈالتا، کیف سے لبریز ایک نیم گرم لہر اس کے سارے وجود میں دوڑ جاتی۔ قدم قدم نیچے اترنے کا احساس تک نہ ہوتا، لیکن جس دن وہ ریٹائر ہوا اسے لگا وہ تو ایک دم آخری سیڑھیوں تک آن پہنچا ہے جس کے آگے......

یہ آگے کیا ہے، اس کی سیر کی آخری حد اور موڑ سے آگے، اس موڑ سے آگے کیا ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ فضاء اب پرندوں سے خالی ہو گئی تھی اور شام کے لمبے پھیلے سائے اندھیرے کی بغل میں دبک گئے تھے۔ واپسی کا وقت ہو گیا تھا، لیکن یہ موڑ، اس موڑ سے آگے کیا ہے، کبھی تو ادھر جانا ہی ہے۔ اس نے اپنے آپ پر ایک نظر ڈالی، اب شاید سیڑھی کے چند ہی تختے رہ گئے تھے، اس کے بعد اس نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرا خاصا گاڑھا ہو گیا تھا۔ شائد اس کے بعد کچھ ہو، شائد نہ ہو......شائد! ایک عجب طرح کی تھکاوٹ سی، جس میں نشہ سا تھا، اس کے سارے وجود پر رینگ رہی تھی۔

''شاید میں آج کچھ تیز چل رہا ہوں'' اس نے اپنے آپ سے کہا، ایک مست کر دینے والی غنودگی نے اسے تھپکنا شروع کر دیا، ایک شفیق مہربان ماں کی طرح جو اپنے بچے کو گود میں ہلا ہلا کر لوری سناتی ہے، ایک گیت جس کے بول واضح نہ تھے، لیکن اس کے سُر اس کے سارے بدن پر گدگدیاں کر رہے تھے۔ اس کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ آئی، لگا جیسے وہ یکدم دو چار زینے نیچے اتر گیا ہے۔ خیال سا آیا کہ اس سڑک پر ایک درخت کے نیچے پتھر کا ایک ٹوٹا سا بنچ ہے۔ جانے کب سے وہاں پڑا کسی کے بیٹھنے کا منتظر، وہ روز آتے جاتے اسے دیکھا کرتا تھا، معلوم نہیں اسے یہاں کس نے رکھا ہے اس نے کئی بار سوچا تھا۔

اس سرمئی نیم غنودگی میں اسے لگا یہ بنچ اس کے لئے رکھا گیا تھا اس خیال سے اسے ایک سرور سا آیا، اس نے نیم کھلی غنودہ آنکھوں سے بنچ کو دیکھا اور آہستگی سے اس پر بیٹھ گیا۔ بنچ کی کمر ابھی سلامت تھی، اس نے اپنی کمر کو ٹیک دیا اور ایک لمبا سانس لے کر فضا میں دیکھا، فضا خالی تھی، سڑک بھی دور دور تک ویران، ایک پراسرار خاموشی، اندھیرے اور سرشاری کی لذت میں لپٹی ہلکی ہلکی ٹھنڈ دائرہ بنائے اس پر جھکی ہوئی تھی۔

اس رات جب وہ دیر تک گھر نہ لوٹا تو اس کی بیوی نے بڑے بیٹے سے کہا...... ''گاڑی نکالو، تمہارے ابو ابھی تک نہیں لوٹے''۔ گاڑی کی روشنی میں وہ انہیں دُور ہی سے بنچ پر بیٹھا نظر آ گیا۔ گاڑی روک کر پہلے بیٹا، پھر ماں باہر نکلے۔

''ابو جی......'' بیٹے نے اسے چُھوا تو وہ آہستگی سے ایک طرف گر گیا۔

ماں بیٹا دونوں کے منہ سے ایک ساتھ چیخ نکلی لیکن وہ نہ سن سکا کہ وہ تو کبھی کا موڑ مڑ چکا تھا!

ناصر بغدادی / بے عیب

اُس کو سامنے سے آتا دیکھ کر ایک مرتبہ پھر میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ اُس کے تنومند، صحت و جوانی سے لبالب جسم پر سیاہ سوٹ جیسے سونے پہ سہاگہ کا کام کر رہا تھا۔ یوں لگا جیسے کسی مندر کے سب سے خوب صورت بت کو چشمِ بد سے بچانے کی خاطر سیاہ لباس پہنا دیا گیا ہو۔ اُسی رنگ کی ٹائی، اُس کے سفید بزاق، کلف دار قمیص پر یوں جھول رہی تھی جیسے کالا ناگ سفید مرمریں فرش پر مست ہو کر جھوم رہا ہو۔ اس کا رنگ اتنا صاف، اتنا روشن تھا کہ اس کو دیکھنے کے بعد اردگرد کی ہر شے ماند ماند سی، دھندلی دھندلی سی نظر آتی تھی۔ میں نے ہمیشہ اس کی گلابی رنگت کو دیکھ کر یہی محسوس کیا تھا جیسے دودھ، میدہ اور ارغوان کو آپس میں ملا دیا گیا ہو۔ اگر کوئی اس کی بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھوں کو دیکھ کر چھلکتے ہوئے شراب کے پیالوں کے متعلق سوچتا تو ہرگز حیرت کی بات نہ ہوتی۔ میں اکثر سوچتا کہ اس کو تو عورت ہونا چاہیے تھا مگر نہ معلوم قدرت کی کس غلطی نے اس کو مرد کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ لیکن مرد بن جانے کے باوجود اس کا زنانہ حسن قائم تھا کہ شاید قدرت آج کی تڑپتی زلیخاؤں کی چارہ گری کے سلسلے میں اُس سے یوسف کا کام لینا چاہتی تھی۔

اور اس کا نام بھی یوسف ہی تھا۔۔۔!!

میں ہمیشہ اس کو اپنے روبرو پا کر اپنے اوپر احساسِ کمتری کا ایک ایسا بوجھ محسوس کرتا تھا جو میرے سارے وجود کو توڑ میں بوس نہیں کرتا تھا لیکن میرا سر میکانکی انداز میں از خود جھک جاتا تھا۔ جب کبھی ہم دونوں اکٹھا ہوتے تو میں سوا نیزے پر کھڑے سورج اور ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے متعلق بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگتا۔ ایسے موقعوں پر میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اسطوری مجسمہ ساز پگمیلین (Pygmalion) بھی اگر اس کو دیکھ لیتا تو وہ گلیٹا جیسا مجسمہ تراشنے کی بجائے یوسف کے لافانی حسن کو خوب صورت ترین مجسمے کے قالب میں ڈھال لیتا اور فنافی العشق ہو کر اپنی تمام زندگی اس پر نچھاور کر دیتا۔ میں خدا کا شکر بھی ادا کرتا کہ وہ صنفِ نازک کے روپ میں میرے سامنے نہیں آیا تھا ورنہ میرا اس کی محبت میں گرفتار ہونا ہرگز تعجب کی بات نہ ہوتی۔ اور اگر بالفرض وہ کٹھور ہوتا تو پھر ایسی صورت میں پیدا ہونے والے مضمرات میرے لئے تباہ کن ہوتے۔ یہ عین ممکن ہوتا کہ میں اس کی بے وفائی برداشت نہ کر کے خودکشی کر لیتا۔ اور اگر کسی وجہ سے ایسا انتہا پسند قدم اٹھانے سے اجتناب کرتا تو دوسری صورت میں مجھے پاگل ہو جانے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

وہ میرا بہت ہی پیارا دوست تھا، اور یہ احساس میرے لئے کچھ کم خوش آئند نہ تھا کہ وہ بھی مجھ کو اپنا یار جانی سمجھتا تھا۔ پچھلے چند برسوں میں ہم دونوں نے جو وقت اکٹھا گزارا تھا، اس کو بلاشبہ ہماری مستحکم دوستی کا مشترکہ سرمایہ کہا جا سکتا تھا۔ شاید اس مرحلے پر پہنچنے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ظاہر و باطن میں سرِ مُو فرق نہیں تھا۔ جس طرح اس کا ظاہر دوپہر کے سورج کی طرح آنکھوں کو خیرہ کرتا تھا، اسی طرح اس کا باطن بھی تابناک اور بے داغ تھا۔ اگرچہ اس کا تعلق طبقۂ اشرافیہ سے تھا مگر تکبر نام کی شے اس کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ ہر ایک سے شائستگی اور خوش آدابی سے پیش آنا گویا اس کی فطرت ثانیہ تھی۔ بزرگوں سے اس طرح

کھڑے ہو کر مؤدبانہ انداز سے ملتا کہ وہ اس کی سعادت مندانہ وضع داری سے بے حد متاثر ہوتے۔ کم عمر بچوں میں تو اس کی مقبولیت کے ریکارڈ کو توڑنا شاید کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ خود میرے چھوٹے بھائی کو جب اس کی آمد کی خبر ہوتی تو وہ اچھلتا کودتا ہوا اس کے پاس چلا آتا۔ اس کا کہنا تھا کہ "یوسف بھائی سے گپیں لگا کر مزہ آتا ہے"۔ اس کے انتظار کی شاید ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ یوسف کبھی کبھی اس کے لئے کھانے کی یا کھیلنے کی کوئی چیز خرید کر لے آتا تھا۔ اگر چہ اس نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا مگر معتبر ذرائع سے میں اس کے حسنِ سلوک کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ نامساعد حالات وحوادث میں گھرے ہوئے چند خاندانوں کی یوں پس منظر میں رہ کر مالی معاونت کر رہا تھا کہ ان کی عزت نفس اور خودداری پر کوئی حرف نہیں آیا تھا۔

یہ سچ تھا کہ میں اس کی شخصیت کے مقناطیسی طلسم میں یوں گم ہو چکا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کا تصور میرے ذہن کے افق پر جگمگاتا تھا۔ بعض اوقات مجھے یوں لگتا جیسے اس کے سامنے میری حیثیت ایک بے بس معمول سے زیادہ نہیں، اور وہ مجھے ایک طاقت ور عامل کی طرح اپنی ٹرانس کے شکنجے میں دبوچ چکا ہے۔ اس کے بھرپور مطالعے کے بعد میں جس نتیجے پر پہنچا تھا، اس کے متعلق کہتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔ شاید اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میرے مافی الضمیر کا برملا اظہار بزرگوں کے اس قول پر خطِ تنسیخ پھیرنے کے مترادف ہوگا جس کو عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔ مگر میں نے اس کے حوالے سے جو کچھ محسوس کیا تھا اس کو چھپانا بھی میرے بس کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا ہر قسم کا ممکنہ خطرہ مول لے کر میں اپنے دل کی بات کہنے پر مجبور ہوں۔

میں نے برگزیدہ ہستیوں کا یہ قول سنا اور پڑھا تھا کہ صرف اور صرف خدا کی ذات بے عیب ہے۔ مجھ کو دانا اور پاک باطن بزرگوں نے یہی بتایا تھا کہ انسان کبھی بے عیب نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے ناقص تجربے اور خام مشاہدے سے یہی جانا تھا کہ انسان عیوب اور کمزوریوں کا پتلا ہے۔ لہٰذا اس کو کبھی انسانِ کامل کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک بے بضاعت انسان ہونے کے ناطے میں اپنی ذاتی کوتاہیوں سے خوب آگاہ تھا۔ اس لئے اپنے حوالے سے انسانی نسل کی اجتماعی عیب جوئی سے آگاہی مشکل بات نہ تھی۔ ہم سب انسانوں کو اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اس بات کا علم ہے کہ ہماری زندگی کے ترازو میں منفی کارگزاریوں کا پلڑا مثبت کارناموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھاری ہے۔ جب مجھ کو انسانی زندگی کے حقائق کا ادراک تھا تو پھر یہ خیال میرے ذہن میں کیوں بار بار ابھرتا تھا کہ میرا دوست یوسف ہر لحاظ سے بے عیب ہے، اور اس کی زندگی ہر قسم کی کوتاہیوں اور اسقام سے عاری ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ برسوں کے بھرپور شخصی مطالعے کے باوجود میں نے اس کے کردار کو بے داغ پایا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں مجھ سے کئی مرتبہ عجیب و غریب قسم کی حماقتیں بھی سرزد ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا تھا کہ میں اپنے ممدوح کے متعلق سوچتے ہوئے بہک جاتا اور اس کو اس سطح پر لے جاتا تھا جہاں سے وہ کائنات کی ہر شے کو للکار سکتا تھا۔ اگر چہ میرے اندر کے ہمزاد نے بارہا میرے اس طرزِ عمل پر مجھ کو سرزنش بھی کی تھی، اور میں بھی جانتا تھا کہ اس قسم کی ذہنی قلابازیوں کا کوئی منطقی جواز بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بار بار میری نظروں میں تمام انسانی عیوب سے مبرا ایک بے عیب انسان بن کر ابھرا تھا۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ انسانی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے

میں ایک بے عیب اور بے خطا انسان نہیں تھا۔

یوسف کی زندگی، اس کا کردار میرے مطالعے کا ایک دل پسند موضوع تھا جس کو میں نے اپنا کل وقتی مشغلہ بنا رکھا تھا۔ مجھے یہ زعم تھا کہ اس کی تمام تر شخصیت میرے سامنے ایک کتاب کی مانند کھلی ہوئی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ عنفوانِ شباب میں طبقہ اشرافیہ کی نہ معلوم کتنی پری چہرہ دوشیزاؤں نے اپنی بھرپور جوانی اور مقناطیسی حسن کے متعدی جراثیم کی مدد سے اس کو اپنے قبضے میں لینے کی سرتوڑ کوششیں کی تھیں۔ مگر وہ تو جیسے پتھر کا دیوتا تھا کہ اس پر کسی کا جادو نہیں چل سکا تھا۔ اس نے جواب میں کسی حسینہ کے قریب آنا تو کجا کبھی غلط انداز نظروں سے بھی نہیں دیکھا تھا، اور نہ اس کی شائستہ مزاجی سے کسی ایسی سستی قسم کی ناشائستہ حرکت کی توقع ہو سکتی تھی۔ اور پھر اس کو ایسا کچھ کرنے کی یوں بھی ضرورت نہیں تھی کہ وہ پہلے ہی اپنے بچپن کی ساتھی زلیخا کو اپنا سب کچھ دے چکا تھا۔ زلیخا اس کی خالہ زاد بہن تھی اور بچپن میں دونوں نے ایک ساتھ مل کر ریت کا جو پہلا گھروندہ بنایا تھا، اس نے اب محبت کے مضبوط اور ناقابلِ تسخیر قلعے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس نے بارہا مجھ سے کہا تھا کہ زلیخا کے بغیر اس کی زندگی کبھی مکمل نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے مطابق وہ اس کے وجود کا نصف حصہ تھی، اور جب تک یہ پچاس فیصد حصہ اس کی زندگی کا باقاعدہ جزو نہ ہو جاتا، اس کے نزدیک، اس اکائی کی تکمیل ممکن نہ ہوتی جس کو دونوں کی زندگیوں کے ایک دوسرے میں سمٹ جانے کے بعد وجود میں آنا تھا۔

میں زلیخا سے چند مرتبہ مل چکا تھا۔ وہ یقیناً ایک بے حد خوبصورت دوشیزہ تھی، اور اس کی اٹھتی ہوئی جوانی نہ معلوم کتنے طوفانوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے دیکھنے کے بعد ایک تخلیقی شاعر بھی جذبات میں بہہ کر اپنے ذہن میں بہت ساری نادر تشبیہات کو مجسم کر سکتا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ بھری ہوئی سڑک پر اس گداز جسم والی لڑکی سے ٹکرا جانے کی خواہش میں بہت سارے لوگ ایک دوسرے سے ٹکرا بھی سکتے ہیں۔ زلیخا کی قوتِ اعتماد قابلِ رشک تھی کہ وہ اطراف کی بے شمار آنکھوں کے فحش اشاروں، کنایوں کو مطلق خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ یوسف اور زلیخا کی اس بے مثل جوڑی کا جواب ملنا مشکل ہے۔ دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے سے مجھے ہمیشہ ایک طرح کی ایسی خوشی کا احساس ہوتا تھا کہ جس کا شاید کوئی نام نہیں تھا مگر جس کے سبب میرے اندر کا ہمزاد بے اختیار جھوم اٹھتا تھا۔ لیکن ایسے موقعوں پر نہ معلوم کیوں میرے اندرون میں خوف کا اُفعی اچانک سر سرانے لگتا تو میں بے اختیار ان اندیشوں، ان وسوسوں کے بارے میں سوچنے لگتا جن کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

مجھے خوب علم تھا کہ زمانے میں ثبات صرف تغیر ہی کو حاصل ہے اور جب تبدیلیوں کا موسم آتا ہے تو انسانی زندگیوں کو اتھل پتھل کی کیفیات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سمتِ غیب سے چلنے والی ہوا کا اثر ہو یا قدرت کا اپنا ازلی قانون کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور جنون و پری کی سحر آسا باتیں کہ جو داستان کا حاصل ہوتی ہیں، ان کا رشتہ داستان کے تعلق سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس دوران میں نے اپنے ہر دل عزیز دوست کے طرزِ عمل میں کچھ اجنبی اجنبی سی تبدیلیوں کو محسوس کیا جو ہر لحاظ سے میرے لئے تعجب کا باعث تھیں۔ اب وہ پہلے کی طرح فراخدلی کے ساتھ اپنے قہقہوں کی موسیقی فضا میں نہیں بکھیر رہا تھا۔ اس کی بجائے زیرِ لب مسکراتا تو

لگتا جیسے وہ بہت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ باتیں کرتے کرتے وہ نہ معلوم سوچ کی کس اندھی گپھا میں بیٹھ جاتا تھا کہ اس کی پیشانی پر بار بار تہہ دار سلوٹیں ابھرتیں اور کٹورا جیسی آنکھیں گہری دھند سے لبریز ہو جاتیں۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے بتایا کہ زلیخا نے اس سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لئے ہیں، اور اب وہ اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہے۔ بات ایسی نہ تھی کہ مجھ پر اپنے اثرات مرتب نہ کرتی۔ میں اسے چند لمحوں تک عدم تیقن کی کیفیت کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس قسم کی واردات کے بارے میں میں نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا تھا۔ میرے نزدیک تو دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنا ناممکن تھا۔ یوسف نے مجھے ششدر دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک زخم خوردہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ میرا پرابلم یہ تھا کہ میں اس صلاحیت سے قطعی محروم تھا جس کے ذریعے ایسے موقعوں پر زبان کے ہنر مندانہ استعمال سے دوسرے کے غم کو غلط کیا جاتا ہے۔ میں اس کے آتشی احساسات کی حدت کو تو محسوس کر سکتا تھا مگر پیغمبرانہ شان سے دہکتی ہوئی آگ کو گل گلزار بنانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب کچھ یوں تھا۔

شاید یہ دو ہفتے پہلے کی بات تھی۔ باہر شام کی دھوپ درختوں کی پھننگوں سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھی اور وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا زلیخا کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سرخ رنگ کی کار ہلکورے لیتی ہوئی گیٹ سے پورٹیکو کی طرف بڑھی۔ زلیخا اور اس کی امی کو کار سے برآمد ہوتے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اچانک جیسے اس کے اردگرد ملکوتی نغموں کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر گرم جوشی کے ساتھ دونوں کا استقبال کرنا چاہا مگر دونوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس وقت سخت غصے کی حالت میں ہیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ اس کو کچا چبا جاتیں اور اس کے ڈھانچے کو بھوکے کتوں کے آگے پھینک دیتیں۔ زلیخا کی ماں تو غیظ و غضب اور نفرت و حقارت کی ملی جلی نظروں سے اسے یک ٹک گھورے جا رہی تھی۔ اس غیر متوقع صورتِ حال کی وجہ سے خوف نے اس کی منطقی حس کو منجمد کر دیا تھا ورنہ وہ ان سے پوچھتا کہ آخر ان کے اس بلا جواز غصے کی وجہ کیا ہے؟ اس کو یاد تھا کہ اس نے کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر الفاظ تو جیسے ہر قسم کے صوت و آہنگ سے محروم ہو کر رہ گئے تھے۔ شاید دونوں ماں بیٹی کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ وہ کچھ وقت اس کے قریب کھڑے رہ کر اسے اپنے تضحیک آمیز طرزِ عمل کو ہدف بنائے رکھتیں۔ جب وہ دونوں پیر پٹختی ہوئیں اس کی امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا سارا وجود لاوے کی طرح پگھلتا جا رہا ہے۔ چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

وہ دونوں ماں بیٹی شاید کافی دیر تک اس کی امی کے کمرے سے نہیں نکلی تھیں اور یہاں اس کا ہر لمحہ عذاب کے سو برسوں کی مانند بے کراں ہوتا گیا تھا۔ کافی دیر بعد کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ محسوس کیا تھا کہ اس کی محبت کا جو ڈرامہ بچپن میں ریت کے ایک گھروندے کے بنانے سے شروع ہوا تھا آج اس کا ڈراپ سین ایک انہونے مگر بے حد المناک انداز میں ہو گیا ہے۔ یوسف کو اس بات کا غم نہ تھا کہ زلیخا نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اگر وہ وجہ بتائے بغیر اس سے صرف اتنا کہتی کہ اب دونوں کا ایک راستے پر چلنا ممکن نہیں ہے تو یوسف کی انانیت، اس کی خودداری زلیخا کے دامن کو پکڑ کر اس کو روکنے کی مطلق کوشش نہ کرتی۔

مگر جس نا قابل فہم طریقے سے ان دونوں کی راہیں ایک دوسرے سے جدا ہوگئی تھیں اس نے یوسف کی زندگی کو ابدی اذیت کے جہنم میں پھینک دیا تھا۔ بات محض یہاں پر ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان دونوں کے چلے جانے کے بعد اس کی امی نے بھی تقریباً اس سے بول چال بند کر دی تھی۔ پراسراریت کا سلسلہ تھا کہ دراز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ہر ایک کا واسطہ دے کر اپنی امی سے حقیقت اگلوانے کی ہزار کوششیں کی تھیں مگر انھوں نے تو جیسے کچھ نہ بتانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ان کی خاموشی کا برت کسی طرح بھی ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جب یوسف کا مسلسل اصرار انھیں زچ کر دیتا تو وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی جاتیں اور اندر سے دروازہ مقفل کر کے اپنے آپ پر کئی کئی گھنٹوں کی قید تنہائی مسلط کر دیتیں۔ اُس نے اس پراسرار واردات کے بعد یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اس کی امی کبھی کبھار بڑی عجیب و غریب نظروں سے دیکھتی تھیں جیسے اس کو اس کی شخصیت کی تمام تر جزئیات کے ساتھ سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کر رہی ہوں، جیسے سوچ رہی ہوں کہ یوسف واقعی ان کا بیٹا ہے یا انھوں نے بیٹے کے دھوکے میں کسی اور کے بچے کو پال پوس کر اتنا بڑا کر دیا تھا۔ جس گھر میں اس نے اپنی اب تک کی تمام زندگی گزار دی تھی اب وہ اس کے لئے قید خانہ سا بن گیا تھا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے اس گھر کی ہر شے سے اس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا ہے، اور جیسے اس گھر کے در و دیوار بھی اس کو ایک اجنبی سمجھ کر دھتکار رہے ہوں۔

اب یوسف اپنا زیادہ تر وقت میرے ساتھ گزارنے لگا تھا، اور میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے گھر کا زندانی ہو کر خواہ مخواہ کی فکروں کا عذاب جھیلتا رہے۔ مگر ایک مرتبہ جب وہ مسلسل ایک ہفتے تک غائب رہا تو میرے ذہن کے دروازے پر طرح طرح کے وسوسوں نے دستک دینا شروع کر دیا۔ اگر چہ اس کے گھر پر فون کرتے ہوئے مجھے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی مگر اس کے ماسوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ چند لمحوں تک فون کی گھنٹی بجنے کے بعد کسی نے ریسیور اٹھایا تو میں نے جوں ہی اس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو جیسے دوسرے ہی لمحے میرے رخسار پر ایک کرارا سا تھپڑ لگا۔ پہلے تو نسوانی آواز میں بعید از فہم الفاظ ادا کئے گئے اور پھر اس زوردار انداز سے ریسیور کو فون پر پٹکا گیا کہ میرے کان دیر تک جھنجھناتے رہے۔ اس واقعہ کے بعد اس کے گھر جانے یا اسے دوبارہ فون کرنے کی بابت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

یوسف کی پراسرار گمشدگی نے میرے پریشان ذہن کی گتھیوں کو اور زیادہ الجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کو جلد از جلد اور ہر ممکن طریقے سے ڈھونڈ نکالنا بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ حالات ایسے نہیں تھے کہ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھا جا سکتا تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا کہ اس کی خاموش جذباتیت کے تعلق سے کام کرنے والی آتش فشانی قوتوں سے میں بے خبر نہیں تھا۔ شہر کے جن دو چار ٹھکانوں پر اس کی امکانی موجودگی ہو سکتی تھی، ان کو میں نے اچھی طرح کھنگال ڈالا تھا مگر کافی غور و فکر کے بعد بھی میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ مجھ میں وہ جرأت، وہ حوصلہ نہیں ہے جس کو اپنے ساتھ لے کر میں اس کی امی سے ملاقات کر سکتا تھا۔ جس خاتون کی تنک مزاجی نے اپنے اکلوتے سگے بیٹے کی پرواہ نہ کی ہو وہ بھلا کس طرح اس کے دوست کو برداشت کر سکتی تھی۔
اسی تذبذب اور بے چینی میں میرا وقت گزر رہا تھا کہ ایک دن دوپہر کو کال بیل نے وقفے وقفے سے تین مرتبہ گھر

میں گونج پیدا کی تو میں شادکامی کے جذبات سے مالا مال ہو کر اچھل پڑا۔ میں خوب جانتا تھا کہ دروازے پر وسنت ہی ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے علاوہ آج تک کسی اور نے بیل کے ذریعہ اس منفرد انداز سے اپنی آمد کی خبر گھر میں نہیں پہنچائی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہ اپنی کار کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں پچھلے دو ہفتوں کی فکرمندی اور تردد کو بھول چکا تھا۔ اور پھر جب وہ اپنے مخصوص انداز میں میری طرف بڑھا تو ایک مرتبہ پھر میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ وہ روایتی سج دھج میں مردانہ حسن کا ایک شاہکار نظر آ رہا تھا۔ اس کے تنومند، کسرتی اور توانائی سے لبالب جسم پر سفید سوٹ جیسے سونے پر سہاگہ کا کام کر رہا تھا۔ مگر میں نے جب ڈرائنگ روم میں اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو مجھے خوشی ہوئی کہ اس کا چہرہ منفی تاثرات سے عاری تھا اور اس کا طرزِ عمل ایک ایسے نارمل انسان کے رویے کا غماز تھا جس نے زندگی کے حادثات میں گھر کر بھی ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچنے کے فوری بعد میں نے سوال کیا کہ وہ اتنے روز کہاں غائب رہا؟ اس نے فوری جواب نہیں دیا اور چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ اگرچہ وہ میری طرف مسلسل دیکھے جا رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اس کا ذہن سوچ کے دھندلکوں میں ڈوبا ہوا ہے۔

''میں ......'' اس نے کچھ توقف کے بعد ایک طویل سانس لی۔ ''میں اتنے دنوں بلا شرکت غیرے اپنے ساتھ رہا اور اپنے آپ کو برداشت کرتا رہا۔ میں ایک ایسی جگہ پر تھا جہاں ہر طرف ازلی و ابدی سناٹوں کی حکمرانی تھی۔ بس کبھی کبھی بہت دور پہاڑی پگڈنڈیوں پر چلنے والے پرچھائیوں کی طرح نظر آ جاتے تھے۔ مگر نہ میں ان کی آواز سن سکتا تھا اور نہ انھیں میرے وجود سے آگاہی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے تم شمال میں پہاڑوں کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے تھے۔''

ہاں۔ تمھارا قیاس غلط نہیں ہے۔'' اس بار اس کے بے تاثر چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

''یار ...... وہاں پہنچ کر پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ زندگی کا لائحہ عمل طے کرنے یا اپنے حوالے سے کوئی اہم ترین فیصلہ کرنے کے لئے انسانوں کی بھیڑ سے الگ تھلگ رہ کر مسلسل سوچتے رہنا بے حد ضروری ہے۔ پہاڑوں کی مفرح فضا ذہنی کنفیوژن کو دور کرنے کے ساتھ فکری توانائی بھی بخشتی ہے۔''

''کیا تمھیں اردگرد کے سناٹوں نے خوف زدہ نہیں کیا؟''

''نہیں بالکل نہیں۔'' اس نے میرے سوال کو تحمل سے سنا اور پھر پُر اعتماد لہجے میں گویا ہوا۔ ''بلکہ اس کے برعکس میں نے محسوس کیا کہ زندگی اور وقت کی تاریخ سنانے میں آوازوں کی طرح خاموشیوں کا بھی ایک اہم پارٹ ہوتا ہے۔ جس ان کہی کو ہم نہیں سن سکتے اس کی تہہ تک پہنچنے میں خاموشی ہماری معاونت کرتی ہے۔'' اس کی آواز میں ایک فلسفی کا تیقّن اجاگر تھا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ تمھیں یہ بشارت کس نے دی تھی کہ اتنی خطرناک جگہ پر پہنچ کر تم کو نروان مل سکتا ہے؟'' میرے اس سوال پر اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ ایک بھرپور مسکراہٹ ابھری۔

''بس اچانک یہ خیال ذہن میں آ گیا کہ ہجوم سے بھاگ کر دیکھنا چاہئے کہ زندگی کا پھیلاؤ کتنی دور

تک ہے۔'' اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ''میں نے اتنی بسیط تنہائی میں اپنے آپ کو کبھی آزما کر نہیں دیکھا تھا۔ سنا تو یہی تھا کہ ساری خدائی سے کٹ کر آدمی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ مگر مجھے تو اپنے اطراف کی خدائی نے زندہ درگور کر دیا تھا لہٰذا سوچا کہ خدا کی بھری پُری بستی سے دور، فلک بوس پہاڑوں کے بیچوں بیچ، اپنے ذہن کی دنیا میں سمٹ کر دیکھا جائے کہ اکیلے آدمی کا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔''

''تم جس جگہ مقیم رہے، کیا وہاں کوئی نہیں تھا؟''

''میں نے ایک ایسے چھوٹے سے معمولی ہوٹل میں پندرہ روز قیام کیا جس کو ایک بوڑھی عورت اور اس کا نوجوان بیٹا چلا رہے تھے۔'' چونکہ یوسف کی روداد بتدریج دلچسپ ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے میں اپنی ساری توجہ اس طرف منعطف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''چونکہ سیاحت کا سیزن ختم ہو چکا تھا اس لئے جب تک میں وہاں رہا میں نے شاذ ہی ان دونوں کے علاوہ کسی اور کو دیکھا تھا۔ ممکن ہو خطرات سے کھیلنے والا کوئی سیلانی بھٹکتا ہوا وہاں پہنچ گیا ہو مگر چونکہ میں زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں مقید رہتا تھا اس لئے میں نے کسی کو دیکھنا تو درکنار، کسی کی آواز بھی نہیں سنی۔ وہ جھونپڑی جیسا چھوٹا سا ہوٹل ایک بے حد خوبصورت جھیل سے کچھ دور اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔ کافی نیچے پہاڑوں کی سطح پر توں پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے خستہ حال مکانات نہ معلوم کب سے یہاں کے مکینوں کی بے سروسامانی کا احوال سنا رہے تھے۔ مقامی بازار بھی محض چند دکانوں پر مشتمل تھا، اور درمیان میں یخ تودوں کی وجہ سے گھوڑوں کا استعمال ناگزیر تھا۔ مجھے بھی ہوٹل پر پہنچنے اور واپسی کے سلسلے میں سواری کے اسی واحد ذریعہ کا سہارا لینا پڑا تھا۔ میں نے ہوٹل میں پہنچتے ہی بوڑھیا اور اس کے بیٹے سے کہہ دیا تھا کہ مجھے بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے، اور تین وقتوں کے کھانے کے سلسلے میں انھیں ضروری ہدایات دے کر اپنے آپ کو کمرے میں ایک طرح سے مقید کر لیا تھا۔ میں صرف شام کے وقت بلند قامت درختوں کے اردگرد بکھرے ہوئے خشک اور رنگارنگ پتوں کو کچلتے ہوئے جھیل کے کنارے پہنچ جاتا۔ اور اس وقت تک یہاں ہوتا جب تک سورج اپنے مغربی افق میں ڈوبنے کی تیاری کا اعلان نہ کر دیتا۔''

اتنا کہہ کر اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا تو میری جذباتی بے چینی اپنے نقطۂ کمال پر پہنچ گئی۔ گفتگو کا یہ اچانک انقطاع میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ اور شاید اس نے بھی میری اندرونی کیفیت کو بھانپ لیا تھا کیونکہ اس کی طرف سے بلا تاخیر گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔

''میرے یار......'' وہ گویا ہوا ''یہ پرسکون جھیل خدا معلوم کتنے ہزار برسوں سے اپنی ہی اتھاہ خاموشیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد کے روح پرور مناظر کو الفاظ میں بیان کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ تین طرف جھیل کو برف پوش پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ میرے آس پاس چھوٹے چھوٹے یخ تودوں کا ڈھیر سا بکھرا ہوتا تھا۔ میں کنارے پر آرام سے لیٹ جاتا اور ہر طرف سے سائیں سائیں کرتی ہوئی خاموشی کے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے یہاں کے دلفریب قدرتی مناظر خاموشی کی زبان میں ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے ہیں۔ پھر یکایک مجھے ایسا لگتا جیسے میری روح زمین سے رشتہ توڑ کر حسین و جمیل نظاروں کی دولت سے لبریز کسی نامعلوم سیارے پر پہنچ گئی ہے، اور وہاں کے غیر مانوس مگر رعنائیوں سے

بھرپور مظاہرِ قدرت میری روحانی حیرانگی کو ہزار چند کرتے جا رہے ہیں۔ مجھے وقت کے گزرنے کا مطلق احساس نہ ہوتا۔ میں اُس وقت چونک کر دوبارہ اس کرۂ ارض پر قدم رکھتا جب شام کی سیاہیاں رات کی تاریک سرحد کے قریب پہنچ جاتیں۔ میں ایک سرشار اور طمانیت سے بھرپور روح کی طرح، ان نظاروں کا ایک حصہ بن کر جب واپس لوٹتا تو کمرے کی خاموشیاں آگے بڑھ کر میرا انتظار کرتیں......''

''آخر تم دن بھر کرتے کیا تھے؟'' اس نے جب بات ختم کی تو میرے تجسس کی کوکھ سے ایک سوال ابھرا۔ ''کیا کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے یا......''

''میں اپنے ساتھ کتابیں تو کیا ایک اخبار بھی نہیں لے گیا تھا۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس پر میرا اظہارِ تعجب بے معنی نہیں تھا۔ شاید وہ بھی میرے احساسات کو بھانپ چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے خاموش ردِ عمل پر اس کی مسکراہٹ اس کے سارے چہرے پر پھیل چکی ہے۔

''ہر روز صبح کے ناشتے کے بعد میں بستر پر دراز ہو جاتا تھا، اور آنکھیں مضبوطی سے میچ کر ذہن کو بے مہار چھوڑ دیتا تھا۔'' اس نے اپنی روداد شروع کی تو میرے اشتیاق نے مجھے ہمہ تن گوش کر دیا۔ ''کچھ دیر تک تو جیسے میرے اندر بے شمار چیزیں آپس میں خلط ملط ہو کر رہ جاتی تھیں، اور میرا ذہن خیالاتِ پریشاں سے لبریز ہو جاتا تھا۔ ایسے موقع پر میں اپنے خیالات کو شعوری طور پر کسی تعین شدہ مرکز پر جمع کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرتا تھا۔ بس ہر خیال کسی چرواہے کی بھٹکی ہوئی بھیڑ کی طرح بے سمت انداز میں بھٹکنے لگتا۔ کافی دیر تک یہ عمل جاری رہتا۔ پھر مجھے یوں لگتا جیسے میرا ذہن میرے جسم سے الگ ہو کر خلاء میں اپنی گمشدہ دنیا کو تلاش کر رہا ہے۔ اس وقت کی ذہنی کیفیت کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ بس محسوس ہوتا کہ میں اونچے اونچے پہاڑوں کے اوپر نیلے آسمانوں [illegible] واز کر رہا ہوں، اور میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی نیلاہٹیں میرے اندرون میں ایک خاص قسم کی لطیف طما[illegible] کو بیدار کر رہی ہیں۔'' وہ سانس لینے کے لئے رکا تو میں نے محسوس کیا کہ اندرونی بے چینی کے سبب میری حالت ماہیٔ بے آب سے مختلف نہیں ہے۔

''پھر......'' میری آواز خود مجھے اجنبی سی محسوس ہوئی۔

''پھر اس کے بعد میں جو کچھ کرتا اس کے متعلق سوچتے ہوئے آج بھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں ایسا کیوں کرتا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی میں نے کیا اس پر مجھے تأسف نہیں بلکہ خوشی ہے کہ اس غیر ارادی تجربے نے انجانے میں مجھے صداقتِ مطلق سے متعارف کرا دیا تھا۔'' اس کی آواز مجھے کائنات کے کسی نامعلوم، دور افتادہ گوشے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''پہلے تو میں شعوری طور پر اپنے ذہن کو قوسِ قزح کے سات رنگوں سے لبریز کر دیتا۔ پھر میری سوچ باری باری ہر رنگ کو دوسرے رنگوں سے جدا کر کے، اس کے اندرونی گوشوں کا باریک بینی سے مطالعہ کرتی۔ پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ نامعلوم سیاروں کی طرح [illegible] رنگ کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ ان رنگوں کو کسی طلسم زار کی بھول بھلیاں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ ایک عمر گزار دینے کے باوجود ہمارا ذہن ان کے پیچ و خم کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بہر حال یہ ایک الگ بحث ہے۔ اس وقت میں ان کے حوالے سے جو کہنا چاہتا ہوں اس کی نوعیت کچھ اور ہے۔ اس کو حقیقتِ عالیہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ جب مجھے اس کا

ادراک ہوا تو میرا سارا وجود یوں تھرا کر رہ گیا جیسے میرے اندرون میں روح القدس کا نزول ہو گیا ہو۔ ہر رنگ کو اس کی تمام تر جزئیات کے تعلق سے پرکھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اس کرۂ ارض اور اس کے ساکنان کی تخلیق کے تناظر میں ایک مخصوص رنگ سب رنگوں پر حاوی ہے، اور یہ رنگ براہِ راست ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔''

''کون سا رنگ؟'' مَیں نے محسوس کیا میرا اعصابی نظام متاثر ہو رہا ہے۔

''نیلا رنگ......'' اس نے بے اختیار کہا۔ ''میرے تجربے نے بتایا ہے کہ ہم اشیاء کے تعلق سے کسی بھی رنگ پر اپنی تمام توجہ مرتکز کر دیں، بالآخر وہ رنگ نیلے رنگ میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔''

''اگرچہ تم اپنے تجربے کے سلسلے میں بڑے خود اعتماد دکھائی دے رہے ہو'' مَیں نے اس کی فلسفیانہ سنجیدگی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایسا تو نہیں کہ تم اس مرتبہ بھی خود فریبی میں مبتلا ہو گئے ہو۔'' اس نے میری بات کو بڑے تحمل سے سنا۔ اس کا چہرہ اب بھی تأثرات سے عاری تھا۔

''تم نے جو کچھ کہا ہے معاملہ اس کے بالکل ہی برعکس ہے۔'' اس کی سنجیدگی برقرار تھی۔ ''فی الحقیقت اس تجربے نے مجھ کو میری تمام زندگی کی خود فریبی سے آزاد کیا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں مجھے یہ سب کچھ غیر منطقی سا لگا تھا۔ مگر ہر مرتبہ جب میری سوچ کا ماحصل برقرار رہا تو مجھے بھی اس کو ایک تسلیم شدہ حقیقت کے طور پر تسلیم کرنا پڑا۔ اس وقت مَیں اس کی معروضیت کا اور زیادہ قائل ہو گیا۔ جب تجربے کے دوران غور و خوض کرتے وقت میرے لاشعور کی بہت ساری بند کھڑکیاں کھل گئیں اور اس تجربے کے ماحصل نے کسوٹی کا کردار ادا کرتے ہوئے مجھ کو میری زندگی کی ایک بہت بڑی سچائی سے متعارف کرا دیا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' مَیں بے اختیار چونک پڑا۔ اس وقت یوسف مجھے بڑا پُر اسرار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی عاملِ تنویم کسی معمول کو زیرِ تنویم لانے سے پہلے دیکھتا ہے۔

''اگر مَیں پہاڑوں پر پہنچ کر خود کو سوچ کے پُر پیچ دائروں میں مقید نہ کرتا تو شاید زندگی کا یہ سربستہ آفاقی راز مجھ پر کبھی نہیں کھل سکتا۔'' اس مرتبہ اس نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''واپس لوٹنے سے دو ایک روز قبل جب سوچتے سوچتے میرا ذہن تھک گیا تو مَیں نے کھڑکی سے باہر قدرت کے نظاروں پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ جہاں تک میری نظریں جا سکتی تھیں، اور جن اشیاء کو مَیں دیکھ سکتا تھا، مَیں انھیں بار بار دیکھتا رہا، اور دیکھتا رہا۔ اس وقت میرا ذہن مسلسل سوچ میں مصروف بھی تھا۔ اور پھر جیسے اچانک میرے اندر اتھل پتھل کی کیفیت جاگ اٹھی۔ مجھے بے اختیار محسوس ہوا کہ قدرت کے نظاروں نے مجھے زندگی کی ایک بڑی سچائی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ مَیں ارشمیدس نہ تھا کہ یوریکا یوریکا کا نعرہ لگاتے ہوئے برہنگی کے عالم میں سمندر سے باہر نکل آتا۔ تم یہ تو جانتے ہو نا کہ جو چیز ہم سے دور ہوتی ہے وہ ہمیں نیلے رنگ میں ملبوس نظر آتی ہے۔ نیلے پہاڑ قریب پہنچنے پر نیلے نظر نہیں آتے۔ مگر دور سے نظارہ کرنے پر ہماری نظریں کتنی آسانی سے دھوکہ کھا جاتی ہیں!! اگر تم بادبانی کشتی میں سفر کرو تو اپنے قریب کے پانیوں کے سوا تمھیں سمندر تا حدِ نظر تمام کا تمام نیلا ہی نظر آئے گا۔''

''اس نیلے رنگ نے تمھیں کس آفاقی سچائی سے روشناس کرایا ہے۔'' میرے سوال پر اُس نے پُر خیال انداز میں سر ہلا دیا۔

''اس سچائی کا کہ ہم دور سے انسانوں اور اشیاء کو دیکھ کر دھوکہ کھا سکتے ہیں۔'' اس مرتبہ اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی بھی شامل ہوگئی تھی۔ ''حقیقت کو سمجھنے اور پرکھنے کی خاطر ضروری ہے کہ ہم ہر چیز کا قریب سے جائزہ لیں۔ میں نے جب اس سچائی کا انطباق اپنی زندگی پر کرنا چاہا تو تھرّا کر رہ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب تک کا میری زندگی کا سفر رائگاں ہی گیا ہے۔ خیر...... جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا ہے۔ سوچا ہے آئندہ ماضی کی غلطی کبھی نہیں دہراؤں گا۔''

اس کے بعد بھی وہ بہت دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں وہ میرا بہت پرانا دوست تھا مگر اس دن وہ مجھے بہت پراسرار دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کے جسم میں کسی نامعلوم سیارے کے مکین کی روح حلول کر گئی تھی۔ اس کے روبرو میری کیفیت قصہ حاتم طائی کے ان افراد سے مختلف نہیں تھی جو یا اخی یا اخی کی آوازیں سن کر کوہِ ندا کی جانب زقندیں بھرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میں خود فراموشی کے عالم میں گوش بر آواز بیٹھا نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا، اور اس کی آوازیں میرے کانوں سے مسلسل ٹکرا رہی تھی جیسے بلندی سے آبشار کہیں دُور نشیب میں گرتا ہے۔ ایک عرصہ قبل میں اس کے مردانہ حسن کو ''یکتائے عصر'' کا سرٹیفکیٹ دے چکا تھا۔ لیکن آج تو جیسے اس کی بے پایاں ذہانت نے مجھے مرعوب و مسحور کر دیا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر سوچا کہ اس شخص کو خدا نے کتنی فراخ دلی سے نوازا ہے۔ یہ احساسِ تفاخر میرے لئے ایک اعزاز سے کم نہ تھا کہ میرا دوست خدائے لم یزل کی ایک ایسی خاص الخاص تخلیق ہے جو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے کامل بھی ہے اور بے عیب بھی...... اس موقع پر اچانک مجھے زلیخا کی یاد آ گئی تو مجھے اس کی بدقسمتی سے زیادہ اس کی حماقت پر افسوس ہوا۔ یہ نادانی نہیں تو اور کیا تھا کہ اس نے طلسمات کی مملکت کے خوش اندام شہزادے کو ٹھکرا دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اپنی اس بے عقلی پر اس کی ساری زندگی پچھتاوے کے آنسو بہاتے ہوئے گزر جائے گی۔ میں اس بات پر بھی بہت خوش تھا کہ یوسف نے اپنے ذہن سے زلیخا کے تصور کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ قدرت نے اس کو قلبِ ماہیئت کے مرحلے سے گزار کر ایک حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ اس نے خود کہا تھا کہ آئندہ وہ ماضی کی غلطیوں کا بھول کر بھی اعادہ نہیں کرے گا، اور زندگی کو اپنے آدرشوں کے مطابق گزارے گا اور اس سلسلے میں لوگوں کے منافقانہ طرزِ عمل کو بالکل خاطر میں نہیں لائے گا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے بعض ایسی باتیں کی تھیں جن کا مفہوم میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ مثلاً اس نے معاشرے کے دوہرے معیار کا تذکرہ کیا تھا، اور نام نہاد اخلاقی اقدار کی مذمت کی تھی جن کی بدولت سماج سے خوف زدہ ہو کر کوئی شخص اپنی مرضی کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ میں نے اس بارے میں سوالات اٹھانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد میں نے اس کو اتنے خوش گوار موڈ میں دیکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وضاحت طلب کر کے خواہ مخواہ اس کو بعض ایسی باتیں یاد دلا دوں جن کو بھول کر اس نے قوسِ قزح کے سات شوخ رنگوں کو اپنے اندرون میں اتار لیا تھا۔

یوسف کی فلسفہ آرائی جاری تھی اور میں اس کی دل پذیر گفتگو کے سیلاب میں بہتا جا رہا تھا کہ اچانک ڈرائنگ روم کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور میرا چھوٹا بھائی اختر بھاگتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ شاید وہ باہر دھوپ میں کافی دیر کھیلتا رہا تھا کہ اس کا سارا چہرہ تانبے کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ پہلے تو میں نے اس

کے یوں دخل در معقولات پر اس کو سخت سُست کہنے کا ارادہ کیا تھا، مگر یوسف کی موجودگی کی بنا پر مجھے بادلِ نا خواستہ خاموش رہنا پڑا تھا کیونکہ اختر اُس کا منظورِ نظر تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ اُس کو چھوٹے بچوں سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ اکثر مَیں نے دیکھا تھا کہ بچوں کے دیکھنے کے بعد اس سے نچلا بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ یوں ان میں گھل مل جاتا تھا جیسے وہ اس کے ہم عمر ہوں یا وہ انھیں مدتوں سے جانتا ہو۔ اکثر ایسا بھی ہوا تھا کہ سڑک پر بچوں کو کرکٹ کھیلتا دیکھ کر وہ خود بھی کھیل میں شامل ہو جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کے اندر کا چھوٹا سا معصوم لڑکا اس سے عجیب وغریب قسم کی حرکتیں کروانے لگتا تھا۔

''اختر...... یہ کیا حرکت تھی۔'' مَیں نے اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھ میں کرکٹ کی گیند کو دیکھ کر کہا۔'' کیا ڈرائنگ روم کو کرکٹ گراؤنڈ بنانے کا ارادہ ہے؟''

''بھائی جان...... ہمیں بلا دِلا دیجیے نا؟''

''کیوں...... وہ پرانا بلاّ کدھر گیا؟''

''وہ...... وہ تو ٹوٹ گیا بھائی جان......''

''اچھا۔ دِلا دیں گے۔ اب تم جاؤ۔ جب بڑے بات کرتے ہوں تو یوں دخل اندازی نہیں کرتے۔'' مَیں نے نصیحت کے پیرائے میں اختر کو ٹالنا چاہا لیکن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ یوسف نے فوری آواز دے کر اُس کو اپنے پاس بلایا اور اپنے مخصوص انداز میں چمکارتے ہوئے اپنی دونوں بانہیں اس کی کمر میں ڈال دیں۔

''یار...... بچوں کو یوں نہیں ڈانٹنا چاہیے۔'' وہ بولا۔'' اس قسم کا برتاؤ انھیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر سکتا ہے۔'' اس کے بعد وہ کچھ دیر تک پیار سے اختر کی پیٹھ سہلاتا رہا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں انجانے جذبات کی قندیلیں جل رہی تھیں۔

''جاؤ بیٹا...... کپڑے تبدیل کر کے آؤ......'' اس نے اپنائیت سے بھرپور لہجے میں اختر کو مخاطب کیا۔'' آج تم کو ایسا شاندار بلاّ دِلائیں گے کہ تم وَن ڈے کرکٹ کے چیمپئن بن جاؤ گے۔'' اختر کا چہرہ معصوم جذبات کی یورش سے سرخ انار کے شربت کو شرمانے لگا۔ اس نے ملتجی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔'' بھائی جان۔ پلیز آپ مجھے جانے سے نہ روکیں''

''اچھا بھئی جاؤ۔ مگر دیکھو زیادہ شیطانی مت کرنا۔'' میرے اور یوسف کے تعلقات ایسے نہیں تھے کہ مَیں اس کی کسی بات کو ٹال سکتا۔ مَیں نے دیکھا کہ اختر خوشی سے پھول اٹھا تھا۔ اس کے لب مسکرا رہے تھے اور آنکھیں بے ساختہ کھلکھلا رہی تھیں۔

جب دونوں چلے گئے تو مَیں کمرے میں بہت دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تنہائی اچانک زخم خوردہ شیرنی کی شکل میں سامنے آئی تو مجھے اپنے آپ سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ انسان کی ازلی اور ابدی تنہائی کا فلسفہ مجھے زبانی یاد تھا مگر اس کے باوجود مَیں شاذ ہی اپنے آپ کی مصاحبت سے محظوظ ہو سکتا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مَیں نے اُس دن ہی اپنے آپ کو کرۂ ارض کے ننانوے فیصد (۹۹٪) معمولی، عام

انسانوں میں شمار کرلیا تھا جب مَیں نے کافی عرصے پہلے کہیں پڑھا تھا کہ صرف عظیم دماغ رکھنے والے ہی اپنے مقدر کی مرگِ مسلسل تنہائی برداشت کرتے ہوئے ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ مَیں تو ان لوگوں میں سے تھا جو نیند کی حالت کے ماسوا چند گھنٹوں کی خوش گوار تنہائی کو بھی قیدِ تنہائی کے عذاب سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یوسف نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے انسانوں کی بستیوں کو تیاگ کر سناٹوں سے بھرپور اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان پندرہ روز تک گوشہ نشینی اختیار کی تھی تو حیرانی کی شدت سے میرا چہرہ اجنبی تاثرات سے آباد ہو گیا تھا۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد مَیں نے سوچا تھا کہ اس انسان کی عظمت کو شاید محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر خراجِ تحسین کی ادائیگی کے سلسلے میں مناسب الفاظ کو کسی لغات میں تلاش کرنا اس لئے کارِ عبث ہے کہ تا حال کوئی انسانی ذہن ایسے الفاظ خلق ہی نہیں کر سکا تھا۔ اور تب میرا تیقن اور مضبوط ہو گیا تھا کہ میرا دوست اشرف المخلوقات کے نام پر کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گزارنے والے کروڑوں انسانوں کی بھیڑ میں کسی آسمانی فرشتے کی طرح بے عیب ہے۔

پھر اچانک مَیں نے محسوس کیا تھا کہ بے وقت کی تنہائی سے پیدا شدہ بوریت میرے لئے جان کا روگ ثابت ہونے لگی تھی۔ مَیں نے سوچا یوسف کے ساتھ نہ جا کر ایک بڑی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ اکیلا کمرہ، خاموش در و دیوار، سناٹے میں ڈوبا ہوا ماحول، اور اس پر مستزاد کہ اس وقت مکان بھی مکینوں سے خالی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو شیلف سے ایک کتاب نکال کر ورق گردانی کی کوشش شروع کر دی مگر یہاں بھی اندرون کی بے چینی کو سکون نہ مل سکا تھا۔ ایک ہی پیراگراف کو بار بار پڑھنے کے باوجود جب نفسِ مضمون کا ابلاغ نہ ہو سکا تو مَیں نے ایک فرانسیسی ادیب کی منطق کو آزمانا چاہا جس کی ایک تحریر کا مَیں بہت پہلے مذاق اڑا چکا تھا۔ اس رائٹر نے طرزِ عمل کی تبدیلی کے حوالے سے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ انسان کو کنوئیں کے مینڈک سے مختلف ہونا چاہیے۔ حالات کو بہتر بنانے کی خاطر اس کو رشتے داروں اور احباب کے علاوہ اپنے گھر اور اپنے کمرے کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ ظاہر ہے اہلِ خاندان اور دوستوں کو الوداع کہنے کا مَیں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لہٰذا سوچا کہ وقتی طور پر اپنے گھر اور اپنے کمرے کو چھوڑ کر اس کی منطق کو آزماؤں۔

باہر نکلا تو موسم کافی خوشگوار ہو چکا تھا۔ چونکہ اس وقت میرے ذہن میں کسی متعین منزل کا تصور نہیں تھا اس لئے سڑکوں کی پیمائش کے علاوہ مَیں وقت گزاری کے سلسلے میں کچھ اور کرنے کی بابت سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی بے مقصد جادہ پیمائی کے بعد یکایک میرے قدم خود بخود تھم سے گئے۔ اس وقت مَیں جس علاقے میں تھا وہ کافی بلندی پر واقع تھا، اور مَیں نیلگوں آسمان کو خاکی زمین سے گلے ملتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ یہ ایک ایسا نظارہ تھا کہ جس نے پلک جھپکتے ہی میرے احساسات کی زنبیل کو قوسِ قزح کے سات شوخ رنگوں سے بھر دیا تھا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ بےزاری اور اکتاہٹ نام کی چیزوں نے کب میرے وجود کے اندھے کنوئیں میں دم توڑ دیا تھا۔ مجھے لگا قدرت کا یہ روح پرور نظارہ اشاروں میں مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے، اور جو کچھ کہہ رہا ہے اس کو کسی بھی صورت منفی ردِ عمل کا شاخسانہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مَیں کچھ دیر وہیں کھڑا زمین اور آسمان کے اس خوب صورت اتصال کو دیکھتا رہا تھا۔ عین اسی وقت میرے ذہن کے گنبدِ بے در میں فرانسیسی ادیب کی منطق

مسلسل گونج پیدا کرنے لگی تھی۔ مَیں نے وقتی طور پر اپنے گھر اور اپنے کمرے کو چھوڑ کر دیکھ لیا تھا اور واقعی اس تجربے نے میرے اندر کے ہم زاد کو قلبِ ماہیئت کے مراحل سے گزار کر ایک ایسا انسان بنا دیا تھا جس کو بوریت کے احساسات جیسے چھو کر بھی نہیں گزرے تھے۔ جہاں تک اس منطق کے پہلے حصے کا تعلق تھا، شاید میرے باب میں وہ غیر متعلق تھا کہ اس کو آزمانے کے متعلق کبھی مَیں بھول کر بھی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد جب اپنے آپ میں میری واپسی ہوئی تو مَیں نے دیکھا کہ بہت سارے لوگ اِدھر اُدھر کی گلیوں سے نکل کر خراماں خراماں ایک تعین شدہ سمت میں قدم بڑھا رہے تھے۔ تقریباً ہر ایک کے ساتھ نوعمر بچے بھی تھے جو چلتے ہوئے شرارتوں کی پھلجھڑیاں بھی چھوڑتے جا رہے تھے۔ چونکہ میرے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں تھی اور تجسس میرے اندر چار کھونٹ پھدک رہا تھا۔ اس لئے منزل سے بے نیاز ہو کر مَیں بھی انجانے لوگوں کی اس ٹولی میں شامل ہو گیا۔ آدھا کلومیٹر سے شاید کچھ زیادہ چلے تھے کہ ایک پارک نظر آ گیا، اور مَیں نے دیکھا کہ اس ٹولی کے سارے شرکا، اس میں داخل ہو گئے تھے۔ عین اس وقت میرے اندرون میں ہلچل سی پیدا ہو گئی تو مَیں سمجھ گیا کہ مجھے بھی پارک میں داخل ہونے کا سبز سگنل مل گیا ہے۔ اطراف کے چھوٹے بڑے مکانات سے ڈھکا ہوا یہ ایک بہت ہی خوبصورت پارک تھا جس کا ہر گوشہ کسی دھنک رنگ خواب کے دلفریب منظر کی طرح ہر آنے والے کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ گرمیوں کی اس سہ پہر نے سمندر سے موسیقی مستعار لے کر ہلکے ہلکے سانسوں کا جادو جگانا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت آسمان کے کچھ حصوں کو بدلیوں نے ڈھک لیا تھا جس کی وجہ سے دھوپ کی تمازت میں کافی کمی آ گئی تھی۔ میرے اردگرد بچوں کا جم غفیر بچپن کے معصوم کھیل رچانے میں مصروف نظر آ رہا تھا، اور میرا ذہن اِدھر اُدھر بے مقصد بھٹکتے ہوئے بھی اونچے آسمانوں میں پرواز کرنے والے کسی پرندے کی طرح خود کو ہر فکر سے آزاد محسوس کر رہا تھا۔

پارک کے دو چار چکر کاٹنے کے بعد مَیں ایک فوارے کے قریب ایک پتھر کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ چونکہ پارک کا یہ ایک دور اُفتادہ گوشہ تھا اس لئے کنجِ عافیت سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ بچوں کے یہاں نہ آنے کی شاید واحد وجہ یہ تھی کہ یہاں ان کی دلبستگی کا کوئی سامان نہیں تھا، اس لئے وہ سب کے سب یہاں سے پرے ایک ایسی جگہ جمع تھے جہاں کھیل کود کے مختلف النوع تفریحی ساز و سامان ان کی شام کو سیر سپاٹے اور ہوا خوری کے تعلق سے یادگار بنانے کے لئے موجود تھے۔ فوارے کی پشت پر پتھر سے تراشا ہوا ایک کم عمر لڑکی کا قدرتی لباس میں ملبوس ایک مجسمہ کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دلنشین مسکراہٹ کا پھول کھلا ہوا تھا، جیسے وہ بھی شام کے جوان ہنگاموں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور تب مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں بھی مسکرا رہا ہوں۔

کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد مَیں نے سوچا کہ اب مجھے واپس گھر لوٹنا چاہیے۔ اس کو مَیں تساہل ہی کہوں گا کہ اٹھنے کا ارادہ باندھنے کے باوجود مَیں پانچ دس منٹوں تک وہیں بیٹھا رہا۔ اس وقت کوئی طاقت نہ جانے کیوں مجھے اٹھنے سے روک رہی تھی۔ لیکن کھڑے ہونے سے پہلے جوں ہی مَیں نے دائیں طرف نظریں دوڑائیں تو اچانک میرے احساسات کا پیالہ آتشی سیال کی حدت سے چٹخ کر رہ گیا۔ میرا جسم اور میرا ذہن دونوں غصے کی دوزخی آگ سے جلنے لگے تھے۔ مَیں نے دیکھا کہ زلیخا اور اس کی ماں منر گشتی کے انتہائی خوشگوار

انداز میں مسکراتی ہوئیں، باتیں کرتی ہوئیں فوارے کی طرف چلی آ رہی تھیں۔ مَیں اس بوڑھی کٹنی اور اس کی وفا دشمن، فسادی بیٹی کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔ ان کو دیکھ کر مجھے اپنے عزیز ترین دوست کی یاد آ گئی جس کی زندگی ایک عرصے تک ان جھانسے باز حرافاؤں کے چنگل میں پھنس کر مسلسل اذیت کا ہدف بنی رہی تھی۔ اگرچہ اس وقت دونوں کے خلاف میرا سینہ غصے کی پگھلی ہوئی آگ سے جل رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں دونوں کے خلاف تنفّر کے کلائمیکس پر پہنچنے کے باوجود میں دل ہی دل میں ان کے مرمر جیسے باتمکنت پیکر، ان کے پُرشکوہ حسن کے کرّ وفر کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ زلیخا کو دیکھ کر تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اساطیری دیوی وینس کا روپ لے کر ابھی ابھی جھاگ سے برآمد ہوئی تھی۔ اگرچہ مَیں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح میرا ان سے ٹکراؤ نہ ہو، لیکن جہاں مَیں بیٹھا ہوا تھا وہ ایسی جگہ نہ تھی کہ مَیں اس تصادم سے کسی طرح خود کو بچا سکتا۔

دونوں نے جب مجھے دیکھا تو اوّلاً ان کے چہروں پر حیرانگی کے آثار نمودار ہو گئے۔ پھر چند لمحوں کے بعد دونوں نے یوں بُرا منہ بنایا جیسے شہد کے دھوکے میں کسی بدمزہ چیز کو حلق سے نیچے اتار لیا تھا۔ اگرچہ ان چھنالوں کی اس حرکت پر مجھے غصہ تو بہت آیا مگر مصلحتاً مَیں نے منفی ردِ عمل کے طور پر کچھ کہہ کر بات کو بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب میرے قریب پہنچ کر ٹھٹھکنے کے ساتھ دونوں ٹھہر گئیں تو دل پر جبر کر کے اخلاقاً مجھے بھی کھڑا ہو جانا پڑا تھا۔

''اخاہ...... تو یہ آپ ہیں۔'' زلیخا کی ماں نے دیدے مٹکاتے ہوئے کہا۔ ''بھلا کیا نام ہے آپ کا......'' اس نے رک کر یوں سوچ بچار کی اداکاری شروع کر دی جیسے میرا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ اس وقت اس کی بے حیا بیٹی کے سارے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا تھا۔

''نام میں بھلا کیا رکھا ہے محترمہ......'' میرا جملہ بھی طنز کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔ مَیں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ معذرت خواہانہ انداز اختیار نہیں کروں گا اور نہ اپنا نام یاد دلوانے کی کوشش کروں گا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ دونوں حرام زادیوں کو میرا نام بخوبی یاد ہو گا لیکن صرف مجھے چڑانے کی غرض سے نازنخروں کے تیروں کو استعمال کیا جا رہا تھا۔

''یہ تو آپ نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔'' عیّار بڑھیا نے پھر کسی ہتِ طنّاز کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''آدمی اپنے نام سے زیادہ اپنے کام سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ تو اس کے دوست ہیں نا......؟'' وہ کہتے کہتے رک سی گئی۔ اُس لمحے شدید غصے کی وجہ سے مَیں اپنے آپ سے باہر ہو رہا تھا۔ کم بخت بڑھیا نے اشاروں اور کنایوں میں طعنہ زنی کی انتہا کر دی تھی۔ میرے نزدیک یہ تحقیر و حقارت کا نقطۂ کمال تھا کہ اس نے یوسف کا نام لینے کی بجائے دانستہ طور پر ''اُس'' کا صیغہ استعمال کیا تھا۔

''کیا اُس کا دوست ہونا کوئی جرم ہے؟'' مَیں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''جی ہاں...... مَیں یوسف کا دوست ہوں اور اس پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔''

''آدمی تو اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔'' اس نے چھری کی طرح زبان چلاتے ہوئے کہا۔

''جب آپ نے خود اعتراف کیا کہ آپ اس کے دوست ہیں تو پھر آپ کی حرکتیں بھی اس کی حرکتوں سے مختلف نہیں ہوں گی۔'' بوڑھیا نے یہ بات کچھ اس انداز سے کی کہ میرا خون کھول اٹھا۔ جی چاہا کہ کٹنی کا گلا دبا دوں۔ لیکن اطراف کے ماحول کا تقاضہ تھا کہ غصے کو قابو میں رکھ کر عقلمندی کا ثبوت فراہم کیا جائے۔

''معاف کیجئے۔ آپ نے اس کو کون سی بُری حرکت کا مرتکب پایا؟'' میرا لہجہ میری غضب ناکی کا مظہر تھا۔ ''کیا وہ قاتل ہے؟ کیا وہ جواری ہے؟ کیا اس نے کسی کی بیٹی کو اغوا کیا؟ کیا وہ منشیات کا عادی ہے؟ آخر اس بیچارے نے کون سی ایسی حرکت کی ہے کہ آپ اُس سے متنفر ہو گئیں؟'' اُس نے میری باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنا۔ میں نے دیکھا اس وقت اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ جب میں نے بات ختم کی تو اس کے ہونٹوں پر ایک پُر اسرار سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ مجھے اُس کی یہ مسکراہٹ زہر سے بھی زیادہ کڑوی لگی کیونکہ میرا خیال تھا کہ ہم ایک ایسے سنجیدہ موضوع پر گفتگو کر رہے تھے جو اس بلا جواز مسکراہٹ کا متقاضی نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس وقت اس کو کوئی نام دینا بھی آسان نہیں تھا کہ شاید نفرت، حقارت، طنز اور تمکنت جیسے منفی جذبات کے باہمی اختلاط نے اس مسکراہٹ کو جنم دیا تھا۔

''زلیخا۔ تم کار میں بیٹھو۔ میں ابھی آ رہی ہوں۔'' اس نے تکبرانہ شان سے گیٹ کی طرف جاتی ہوئی اپنی بیٹی کو دیکھا۔ پھر مجھے بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بے تکلفی سے میرے قریب بیٹھ گئی۔ میں نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ اب اس کے چہرے سے وہ پُر اسرار مسکراہٹ رخصت ہو چکی تھی مگر پیشانی پر تہہ دار شکنوں اور سلوٹوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔

''کیا آپ کو اپنے دوست سے بڑی محبت ہے؟'' اچانک اُس نے ایک غیر متوقع سوال میری طرف اچھال دیا۔

''یقیناً۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔'' میں نے غیر متزلزل تیقن کے ساتھ جواب دیا۔ ''وہ میرا عزیز ترین دوست ہے۔ اُس کی بربادی کا تصور کر کے میرا دل سسک اٹھتا ہے۔''

''وہ خود اپنی بربادی کا ذمہ دار ہے۔'' بے رحم بڑھیا کا لہجہ بحرالکاہل سکون کا غماز تھا۔ اور اس مرتبہ میں کوشش کے باوجود اپنے غصے کو بے لگام ہونے سے نہیں روک سکا تھا۔

''معاف کیجئے محترمہ۔ آپ اپنا نام لیتے ہوئے کیوں شرماتی ہیں؟'' میں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اس کی حسرتوں کا خون کیا ہے۔ آپ نے اپنی صاحب زادی زلیخا کو اس سے جدا کیا۔ اگر اس کی شادی زلیخا سے ہو جاتی تو کیا اس کی یہ حالت ہوتی؟'' میری بات سن کر وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا جسم وفورِ جذبات سے کانپنے لگا تھا۔ اس کی رگوں کا سارا خون جیسے اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ وہ شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔

''میں اس کی شادی زلیخا سے کروں؟'' اُس نے زہر خند کے ساتھ کہا۔ ''اُس کو بھلا عورتوں سے کیا دلچسپی؟ اپنے دوست سے جا کر کہو کہ وہ کسی خوبصورت لڑکے کے ساتھ شادی کر لے۔'' اتنا کہہ کر اُس نے میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی، اور تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اچانک ایک بم پھٹا۔ شعلے بلند

ہوئے اور میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم کے چیتھڑے فضا میں بکھرتے جارہے ہیں۔ مجھے لگا میرا ذہن قوتِ سوچ سے محروم ہوکر رہ گیا ہے۔ میں نے گھبرا کر فوارے کے قریب کھڑی پتھر کی لڑکی کو دیکھا۔ اس وقت وہ بھی میری حیرت اور بے بسی پر مسکرارہی تھی۔

میں دوبارہ تھکے ہوئے انداز میں پتھر کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میرا ذہن تارِ عنکبوت کی طرح الجھا ہوا تھا۔ میرے اطراف میں شام کی سیاہیاں ہر شے کو تیزی سے اپنی بانہوں میں سمیٹتی جارہی تھیں۔ مغربی افق پر شفق کی سرخیوں نے جیسے آگ لگادی تھی۔ میں نے کچھ دیر بعد دیکھا کہ پارک تقریباً ویران ہوچکا تھا۔ میں بھی مضمحل انداز میں اٹھا اور ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ سارے راستے میرا وجود متضاد خیالات کا میدانِ کارزار بنا رہا تھا۔ میں آس پاس کی ٹریفک، لوگوں کی ریل پیل اور خود اپنے آپ سے بے خبر فٹ پاتھ پر تھکے ہوئے انداز میں چلتا جارہا تھا، اور میرے اندرون کے گنبدِ بے دَر میں زلیخا کی ماں کی باتیں لگاتار گونج پیدا کرتی جارہی تھیں۔ اچانک ایک درخت کے قریب مجھے ٹھٹک کر کھڑا ہوجانا پڑا تھا۔ یقیناً یہ چھتنار درخت برگد کا وہ درخت نہیں تھا جس کی چھاؤں میں کپل وستو کے شہزادے کو آفاقی نروان کی روشنی حاصل ہوئی تھی۔ لیکن اس مخصوص لمحے میں میں نے سوچا تھا کہ اگر جذبہ صادق ہو تو انسان کو کسی بھی درخت کی چھاؤں میں انسانی ذات کے تناظر میں الجھے ہوئے سوالات کے وہ جواب بھی مل سکتے ہیں جس کے بعد انسانی رشتوں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ وہ بھی وقت کا ایک عجیب لمحہ تھا کہ میں درخت کی پھیلی ہوئی بانہوں کے قریب کھڑا تھا اور میرے اندر یکا یک طمانیت کے احساسات نے لاتعداد قندیلیں روشن کردی تھیں۔ زلیخا کی حرافہ ماں نے جس چالاکی سے میری سوچ کی گتھیوں کو الجھا کر رکھ دیا تھا اب وہ صحیح جواب کے ملنے کے بعد خود بخود سلجھ گئی تھیں۔ اس وقت میرا یہ سوچنا حق بجانب تھا کہ زلیخا کی ماں نے یوسف کے خلاف جس سنگین الزام تراشی سے کام لیا تھا، اس کا صداقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں یہ تو نہیں جانتا تھا کہ اس دروغ گوئی کے پس منظر میں کون سے محرکات کارفرما تھے مگر مجھے کامل یقین تھا کہ اُس نے میرے عزیز دوست کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ سولہ آنے جھوٹ تھا، اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے بعد جیسے میرا کنفیوژن بھاپ بن کر معدوم ہوگیا تھا، اور جیسے میرے اندرون کے احساسات پھیلتے ہوئے لامتناہی ہوتے گئے تھے۔

اب میں واپس اپنی دنیا میں لوٹ آیا تھا، اور محسوس کررہا تھا کہ اردگرد کی ہر شے میں میری زندگی بھی شامل ہوگئی ہے۔ اس کے بعد گھر پہنچنے میں جتنا وقت لگا وہ ایک خوب صورت ایڈونچر کی طرح تیزی سے گزر گیا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی ایک اور قیامت نے بڑھ کر گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا تھا۔ میں نے دیکھا میرے سارے گھر والے کنفیوژن کے عالم میں مبتلا ہیں، اور میرا چھوٹا بھائی اختر کمرے میں بیٹھا دھاڑیں مار مار کر آسمان اٹھانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ ہر ایک مختلف انداز سے اس کو خاموش کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر اس کی آنکھوں کی موسلادھار بارش نے تو جیسے کبھی نہ رکنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

''یہ کیا طوفانِ بدتمیزی ہے؟'' میں نے برہمی سے کہا۔

''نہ جانے کیا بات ہے۔'' میری چھوٹی بہن نے سرگوشی کی۔ ''جب سے یوسف بھائی اس کو چھوڑ

کر گئے ہیں، مسلسل روتا جا رہا ہے۔''

''اور بھائی جان۔ کسی کو کچھ بتاتا بھی نہیں ہے۔'' دوسری بہن نے حاشیہ آرائی کی تھی۔

مجھے یاد ہے میں نے بڑی مشکل سے ایک ایک کر کے سب کو اپنے کمرے سے رخصت کیا تھا۔ سب کے چلے جانے کے بعد میں نے اختر کو دیکھا جس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بہ تر تھا، اور ہچکیوں کی وجہ سے اُس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔

''اختر...... یہ کیا ڈرامہ؟'' اگرچہ میری آواز میں ہلکی سی خفگی تھی مگر اس وقت میری چھٹی حس نے کسی طوفان کی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا دل تیز رفتاری سے دھڑک رہا ہے۔

''بھائی جان۔ آپ نے مجھے اُس یوسف کے بچے کے ساتھ کیوں جانے دیا۔'' وہ زار و قطار روتے ہوئے بولا۔ ''اب میں اُس حرام زادے کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔'' وہ سسکتا رہا۔ اس وقت صورتحال ایسی تھی کہ میں اس سے مزید معلومات کے سلسلے میں کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کافی دیر تک مسلسل روتا اور سسکتا رہا تھا۔ اُس وقت میرا سارا وجود نہ معلوم کس اجنبی دنیا کے سناٹوں میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ کافی دیر بعد جب نارمل سچویشن بحال ہوئی تو میرے ذہن کی ساری گرہیں بھی پرت در پرت کھلتی گئیں۔ میں نے بزرگوں کا یہ قول سنا اور پڑھا تھا، میں نے اپنے ناقص تجربے و مشاہدے سے یہی جانا تھا، عقل و فہم نے مجھے یہی بتایا تھا کہ صرف خدا کی ذات بے عیب ہے، انسانوں کا بے عیب ہونا ممکن نہیں۔ لیکن جب بھی میں نے یوسف کا تجزیاتی مطالعہ کیا تھا تو میں اس قول کے متعلق سوچ کر الجھ جاتا تھا۔ لیکن آج...... آج جب میں نے صورتحال کا دوبارہ جائزہ لیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ انسان کبھی بے عیب نہیں ہو سکتا!!

گلابی موسموں کے بادباں

مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

اُس نے کہا تھا ''خواب دیکھو!''

اجنبی لڑکی کی آنکھوں میں کوئی چہرہ نہیں ہوتا

مجھے معلوم تھا لیکن

کسی خواہش کے نیلے پانیوں میں

عکس بنتے دیکھ کر میں نے دعا کی تھی

''گلابی موسموں کے بادباں کھلنے سے پہلے

آندھیوں کو موت آ جائے......!''

(نصیر احمد ناصر...... "اک بے لفظ کہانی" مطبوعہ "اوراق" نومبر ۱۹۸۴ء سے مقتبس)

مشرف عالم ذوقی / میڈونا کی اُلٹی تصویر

(۱)

''وہ محبت بھی کر سکتے ہیں اور نفرت بھی
وہ غصہ سہہ بھی سکتے ہیں اور کر بھی سکتے ہیں
تم یہ مت سمجھو کہ وہ کسی کام کے نہیں
ہمیشہ قائم رہنے والی یہ دنیا سب کا استعمال کھوج نکالتی ہے
ہاں استعمال
جن کے بارے میں تم بھی سوچتے ہو
کہ کوڑھیوں کا استعمال کیا ہے
اور دنیا کے سینے پر دھبے کی طرح جی رہے اپاہج ٹولیوں کے وجود کا''

(۲)

بے معنی ان فلسفوں میں جان یوں ہی نہیں پڑی تھی بلکہ لاشعوری طور پر ہی سہی، کہیں سے یہ میری سوچ کا ایک حصہ ضرور رہے تھے۔ میں نے ہنسی میں اس بات کو ٹالنا چاہا اور چمکتی آنکھوں سے درشن کی طرف دیکھا۔

'تم کیا سمجھتے ہو؟'

'کس کے بارے میں'

اس نے اخبار سے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے نظر کی سیدھ میں اشارہ کر دیا۔ سامنے ایک قطار سے جھگی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بیچ میں سڑک تھی اور اس طرف میرا ڈی۔ ڈی۔ اے کا فلیٹ۔ اکیلے ہونے کے اپنے کئی فائدے ہیں۔ جیسے یہ کہ خالی ہوں تو کچھ نہ کچھ سوچتے رہیے۔ یہ کیا ہوا؟ وہ کیسے ہوا؟ یہ کیسے جیتے ہیں؟ وہ کیسے رہتے ہیں؟......... اور اگر آپ ادب اور صحافت سے جڑے ہوں، تو ایسی ہر چیز، تصویر کے ہر فریم میں آپ کو کہانی نظر آئے گی۔ خالی پن کا ایک فائدہ میں ادھر پھر محسوس کر رہا تھا۔ جب ان جھگی جھونپڑی والوں سے ہو کر میری محسوسات کے صحرا میں کھلبلی مچی تھی۔ اب بھلا ان کا استعمال کیا ہے۔ یعنی، یہ دنیا میں تو آ گئے اب جیسے ہم ہیں، ہم پڑھتے ہیں، لکھتے ہیں، تبادلۂ خیال سے نئے نئے زاویے اور نئے نئے فلسفے سامنے آتے ہیں یعنی کچھ دے رہے ہیں۔ ملک کو...... دنیا کو...... چلئے یہ بحث بہت لمبی ہو جائے گی۔ مگر ان کا فائدہ؟ آپ کہہ سکتے ہیں۔ یہ مزدور ہیں تو گھر بناتے ہیں اور جس کسی بھی چھوٹے موٹے پیشے سے منسلک ہیں آپ کو سکھ تو پہنچاتے ہیں۔ لیکن میں اس استعمال کو نہیں جانتا، کوئی بڑا استعمال یا......... پتہ نہیں میں کیا سوچ رہا تھا۔ شاید پوری طرح میں خود اپنی سوچ کو سمیٹ نہیں پایا تھا۔

کبھی کبھی چھٹی کے موقع پر درشن بھی چلا آتا۔ درشن اخبار میں میرا ساتھی تھا۔ کرائم رپورٹر۔ کرائم کا صفحہ وہی دیکھتا ہے۔ اکثر وہ عجیب چٹخارے دار خبروں کے ساتھ میرے کمرے میں آ دھمکتا۔ پھر اس کی خرمستیاں شروع

ہو جاتی ہیں...... کہ سالے بھابی لے آ...... چل چائے پلا۔ خالی خولی آلتو فالتو سوچتا رہتا ہے۔
میں نے اچانک درشن سے پوچھ لیا تو وہ چونک پڑا......
میں نے بات آگے بڑھائی...... تم کیا سمجھتے ہو ان کا کوئی استعمال ہے؟ یا ہو سکتا ہے...... یہ پڑھے لکھے بھی نہیں۔ اپنے طور پر کوئی نظریہ بھی نہیں بن سکتے۔ ذہن کا استعمال نہیں جانتے۔ پھر یہ کیوں ہیں؟ کس لیے ہیں...... دو وقت کی روٹی پیدا کر لی۔ بس......؟
اور تم......؟
میں جانتا تھا درشن یہی کہے گا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ میرا استعمال...... میں کچھ تو دے رہا ہوں۔ ملک کو...... دنیا کو...... تحریر کے ذریعے پورے نظام کو بدل سکتا ہوں۔ ہوا کا رخ موڑ سکتا ہوں اور کیا چاہیے تمہیں؟
درشن نے پھر اخبار پر نظریں جما دیں۔ صرف اتنا کہا...... تم کہہ سکتے ہو ابھی تمہارا سوال میں پوری طرح نہیں سمجھ سکا...... جب سمجھوں گا، تب کہوں گا...... اور......
لیکن شاید اس وقت تک اپنا سوال میں خود پوری طرح نہیں سمجھ سکا تھا۔ ہاں جھونپڑی کے لوگوں میں میری دلچسپی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ صبح صبح جب بالکنی پر آتا تو سامنے کے نل پر ان کی عورتیں، مرد، بچے سب مل کر نہار ہے ہوتے۔ جھونپڑی بہاری جا رہی ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے چولہے سلگ جاتے۔ لیپا پوتی کا کام بھی چل رہا ہوتا پھر نہا دھو کر جھونپڑیوں میں کھونسی گئی لکڑی کی کانتی کی بنی ٹوکریاں نکال دی جاتیں۔
اور کچھ اپنا راستہ ناپ لیتے۔ میں جانتا تھا۔ یہ مزدور ہونگے۔ لیکن ان میں سب مزدور نہیں تھے۔ کچھ کے دھندے مجھے نہیں معلوم تھے۔ کچھ تو بہت سویرے ہی نکل جاتے۔ اس لیے کہ جس وقت میں سو کر اٹھتا اس وقت کچھ جھونپڑیاں بالکل شانت نظر آتیں اور دروازے پر چمار کی کترنوں والا چمڑا پردے کے طور پر جھول رہا ہوتا۔ مطلب ان جھونپڑیوں کے باسی کام پر چلے گئے۔ میرے خیال میں اس کام کی نوعیت بھیک جیسی ہوگی۔ اس لیے یہ ''کامی'' آدمی جب واپس آتے تو شکل صورت سے بھی بھکاری ہی معلوم ہوتے۔
اس دن صبح ہی صبح دروازہ زور زور سے تھپتھپائے جانے پر میری نیند ٹوٹ گئی۔ سوچا، بھنگی ہوگا یا فلیٹ کا چوکیدار اس لیے کہ اتنی صبح صبح کسی کے آنے کی امید نہیں تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے اسی جھونپڑپٹی کی ایک عورت کھڑی تھی۔ عمر تیس کے آس پاس جسم بھرا بھرا جسے میں نے اکثر چاپاکل کے پاس نہاتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھ پاتا وہ خود ہی بول پڑی۔
''کچھ کام ہو تو بولیں بابو جی۔ ہم سب کام جانتے ہیں۔ پانی بھرنے سے لے کر کھانا پکانا، جھاڑو بہارن، برتن دھوئل سب کام، ڈیم پر کام بند ہے نا! بابو جی...... سو ہمرا تو بیکاری ہو گئی۔''
اس کا لہجہ کچھ کچھ اپنے علاقے جیسا تھا۔ بھوجپوری...... میرے شہر سے ہے کیا؟ اس علاقائی تعصب نے فوراً اس سے سوال جڑ دیا۔
''کہاں کی رہنے والی ہو''
''ہم بہار سے آئے ہیں بابو جی''

بہار میں کہاں کی؟

''بھوجپور۔ سوندیا ہمار گھر ہے بابو جی''

سوندیا بھوجپور کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مجھے مزا آیا۔ اپنے علاقے کی ہے۔ ہم ہے کام جانتے ہیں۔ بابو جی...... وہ پھر بولی

شاید میرے اتنے سارے سوالوں کو اس نے میری منظوری سمجھ لی تھی۔ وہ دندناتی ہوئی اندر آئی۔ دو ہی کمرے تھے۔ ایک کچن کم باتھ روم۔ دوسرا میرا بیڈ روم۔ کچن میں ڈھیر سارے گندے برتنوں کو دیکھ کر بولی

''بس پٹاپٹ۔ برتنوا سب دھوئے دیتے ہیں۔ ناستے میں کا کھائیں گے بابو......''

پھر ہفتوں گذر گئے۔ صبح ہوتی۔ دروازے پر تھاپ پڑتی اور بسمیتا اپنا کام سنبھال لیتی۔

''اس دن وہ پھر حاضر تھی۔ مگر عام دنوں کی طرح نہیں۔''

بابو جی......

برتن دھو لئے............؟

ہاں بابو جی.........

ناشتہ.........؟

وہ بھی بن گیا بابو جی.........

وہ پھر کھڑی رہی۔ عمر کے کھٹے میٹھے تجربات سے گزرنے کے بعد اتنا تو جان ہی گیا تھا کہ ہر خاموشی کے پیچھے کوئی قصہ ہے اور ہر مسکراہٹ کسی نہ کسی وجہ پر آ کر ختم ہوتی ہے.........

بابو جی.........

''پیسے چاہئیں؟''

لگا، کوئی تھرتھراتا مکالمہ اس کے ہونٹوں تک آ کر چپ لگا گیا۔ کچھ کہتے کہتے ٹھہری گئی ہے...... لگا اس کے جسم سے میزائیلیں چھوٹ رہی ہوں.........

(۳)

اس دن درشن محض اس بات پر خفا تھا کہ اپنا ملک میزائلیں کیوں خرید رہا ہے۔ جو اربوں روپے ان میزائلوں پر خرچ ہوتے ہیں، وہ کس کے ہیں...... اور پھر خبر کیا ملتی ہے...... فلاں میزائل پھس پھس نکل گئی۔ ایک اور ناکام تجربہ کروڑوں بھوکی انتڑیوں اور سٹے پیٹوں والے بھوکے ننگوں کے اس ملک کو میزائیلوں سے کیا کام؟

چھجے پر کھڑے ہو کر سامنے والی جھگیاں گنتا ہوں۔ ایک...... دو...... دس...... بارہ...... بیس، آواز لہراتی ہے......

''ڈیم بن رہا ہے بابو جی...... ہم تو کموا کی تلاش میں دوڑتے رہتے ہیں بابو جی۔ اپنے ہاں بہار میں کام نہیں ہے نا۔ سو ہمرا مرد ہم کو لے کے ای ہاں چلا آیا۔ آج یہاں...... کل اوہاں، ہم بھی ماٹی ڈھوتے تھے بابو جی۔ ٹھیکیدار کہلس ہے...... ابھی کام بند ہے۔ بعد میں ہو گا تو بلائے گا۔''

''تمہارا مرد کون ہے۔''

وہ مسکرائی تھی۔

''اسے پتہ ہے تم یہاں کام کرتی ہو؟''

''ہاں بابو جی اوکرا کے پتہ نہیں رہے گا''۔ اس نے جیسے میرا مذاق اڑایا تھا..........

پیچھے سے جھونپڑیوں کو تکتی آنکھیں جب کمرے میں لوٹتی ہیں، بسمیتا کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ میز ایلیلیں بھی نہیں۔ جذبات بھی نہیں.......... بسمیتا کی پیٹھ ہوتی ہے۔ ساڑی کے پلو سے جھانکنے والے انگارے ہوتے ہیں اور دیوار پر ٹنگی ہوئی میڈونا کی تصویر ہوتی ہے۔ تصویر ہلتی ہے۔ سرگوشیاں کرتی ہے.......... پھر کوئی نہیں ہوتا اپنے آس پاس.......... سٹی انتڑیاں بھی نہیں.......... بھوکے پیٹ بھی نہیں.......... اور ہر خاموشی کے پیچھے کوئی نہ کوئی قصہ ہوتا ہے اور ہر مسکراہٹ..........

اور...... دروازے پر بسمیتا کھڑی ہے...... مجھے لگا میری ٹانگیں میرے قد سے بڑھ گئی ہوں...... میرے آدرشوں سے...... میری سوچ سے...... دھت...... کچھ بھی تو نہیں ہوا...... جذبات سے صرف ہم ہی کھیلتے ہیں...... اوڑھتے جو ہیں...... پڑھتے جو ہیں...... لکھتے جو ہیں...... بسمیتا کے لیے وہ عام دنوں جیسا ہی ایک دن تھا۔ اس کا مرد بیمار تھا۔ اور اسے پیسے چاہیے تھے۔

درشن سنتار ہا...... کبھی کبھی اس کی مٹھیاں بھنچتی ہیں۔ گندی سی گالی دیتا ہے...... سالے...... ان پونجی پتیوں کے سب سے بڑے دلال تو ہم ہیں۔ ذرا سا موقع مل جائے تو...... اس نے پھر ایک سڑی ہوئی گالی دی......

لفظ...... صرف لفظ...... جذبات بھی لفظ ہے...... جس سے کھیلتے رہتے ہیں ہم...... بچوں کے کھلونوں کی طرح...... کبھی نوچتے ہیں...... کبھی توڑتے ہیں...... کبھی جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں...... پھر توڑتے ہیں......

لگا، درشن اندر کے آدمی کو ہتھوڑے سے توڑ رہا ہے۔ نکڑ کے کا آدمی۔ یہ بچگانہ فلسفے کیوں پال پوس کر اپنے اندر بڑا کرتے ہیں ہم..........

رات، خیالوں کی سیج پر جب کوئی ترقی پسندانہ جذبہ اندر سر نکالتا، کوئی نظم...... کسی فساد زدہ علاقے سے دورہ کے بعد چبھتی ہوئی وحشیانہ آنکھیں...... اجڑے مکان...... آنکھوں کے ویرانے اور سناٹے میں جیسے پوری تصویر اتری ہوئی بے چین کر جاتی۔

لو دیکھو...... مجھے بھی دیکھو......

سنو! میں گوتھنا چاہتا ہوں تمہیں

ایک ہی بار میں وہ بھی کچے لفظوں کی گانٹھ سے

اور سنو

ایک نہیں ہزاروں بار گوتھا ہے تمہیں (شاید یہی سچ ہے!)

اور گانٹھ ٹوٹ گئی ہے

سنو تمہیں اپنے جذبات سے گوتھنا چاہتا ہوں

سنو، تمہیں اپنے احساس سے گوتھنا چاہتا ہوں

مگر سنو......

مجھے جیون کی عام ہلچل میں اپنے ساتھ مت باندھنا

نہیں چل پاؤں گا میں

میرے ٹھٹھرے ہوئے ہیں ہاتھ.........

پیر کھردرے، پتھریلے رستوں پر کبھی نہیں چلے

میں نے لکھی ہیں صرف وہی کویتائیں چاند ستاروں کی شکل میں جو آسمان سے پریوں کی طرح اترتی تھیں میرے خیالوں میں اور مجھے لکھنے کی دعوت دیتیں......... سنو میں گوتھنا چاہتا ہوں میں تمہیں؟.........

''کورے جذبات سے زیادہ بھی کچھ رہا ہے تمہارے پاس؟'' درشن ہنستا ہے......... زیادہ نسلی مت مارو ایک دن تمہیں ہمیں...... سب کومل کر اجتماعی خودکشی کرنی پڑے گی......... سچ، اپنے سڑے ہوئے جسم سے ایسی سڑان آئے گی کہ.........

میڈونا کی تصویر ہلتی ہے

بسمیتا ساڑھی برابر کرتی ہے

پوچھتا ہوں تمہارا مرد جانتا ہے یہ سب؟

وہ ہنستی ہے......... ''کیسے نہیں جانے گا بابو جی......... اتنے پیسے کہاں سے آئے ہیں ہموے پاس......''

''پوچھا بھی ہے.........''

''نہیں پوچھا نہیں۔ کبھی کبھی پٹائی کر دیتا ہے جوروں سے۔'' وہ ہنستی ہے...... ''بس سمجھ جاتی ہوں...... اندر کے مرد نے [illegible] مارا ہے......'' مجھے لگا وہ کہہ رہی ہو...... کشمکش چلتی ہے اس کے اندر بھی خود سے لڑتے لڑتے جب ہار جاتا ہے [illegible] کی پٹائی کر دیتا ہے۔'' دیکھو......'' وہ پیٹھ اور سینے کے آس پاس کے نشانات دکھاتی.........

''اچھا چلتی ہوں۔ مرد رستہ دیکھتا ہوگا.........''

پھر وہی چھچھا...... اس کا مرد بیڑی پیتا ہوا آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اندر ایک کھینچا تانی چلتی ہے۔ سوچتا ہوں، دیوار پر لگی میڈونا کی تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ مگر غلط کیا کیا ہے میں نے، تیس بتیس، چلو تیس مان لیتے ہیں۔ ۳۰ برس، ۳۰ برس میں ہم ہندوستانی، عورت کے بدن اور اس کے گداز کا تصور صرف کتابوں اور خیالوں کے سہارے کرتے ہیں یا اس سے زیادہ اور کیا جانتے ہیں بس...... اندر پل رہے انقلاب والا آدمی جب گھر آ کر میڈونا کی تصویر سے رشتہ جوڑتا ہے تو.........؟ روٹی کی آگ سے بھی زیادہ ضروری ایک آگ ہے۔ ۳۰ سال گذر جانے کے بعد بھی ہم جسے جسم کے قید خانے میں تپائے رہتے ہیں۔ آگ بھڑکتی ہے تو شرافت کے نام پر اسے سو جانے کو کہتے ہی......... سوجا......... شریف آدمی...... شادی؟ ایک کڑکے سے شادی کون کرے گا۔ صحافت کے پیشے میں آنے کے بعد ہی لگا تھا۔ ماں باپ نے شادی کی ذمہ داری اپنے کندھے سے اتار کر اس پر ڈال دی ہو......... اب تم جانو.........

لڑائی، باہر کی اور اندر کی...... اندر باہر دونوں کی بھوک شانت ہو، تب تو مشعل اٹھائی جائے۔ روٹی اور جسم

دونوں کی پیاس بجھے، تبھی تو کسی نظریہ پر آ کر ٹھہرا جائے۔ بسمیتا کے جسم سے میڈونا کی تصویر کی طرف لوٹتے ہوئے لگتا ہے...... اس نے کوئی غلطی نہیں کی لیکن

بوڑھا پیچھے سے دیکھ رہا ہے......... کام ختم ہوا یا نہیں......... چٹنی آ رہی ہے یا نہیں..........

میڈونا کی تصویر ہلتی ہے......... اسے لگتا ہے......... وہ پیسے پیسے بول رہا ہے......... نہیں کل سے وہ منع کر دے گا کوئی ضرورت نہیں۔ وہ باہر جا رہا ہے......... ہاں یہ کہنا زیادہ ٹھیک رہے گا......... وہ دیکھ لے گی تو......... ؟ وہ پیسے ہاتھوں میں رکھ دیگا......... اب ضرورت نہیں ہے......... مت آنا بس اور کیا......... ؟

(۴)

نہیں...... اور ہے، زیادہ کچھ ہے۔ باہر کے مسائل، باہر کی ہی میز پر میزائل اور توپ کیوں بنتے ہیں...... ؟ گھر آ کر پھس کیوں ہو جاتے ہیں۔ اور مشعلیں...... اندر پلتا ہوا انقلاب سب کمرے میں آنے تک بستر کی ہزار سلوٹوں میں کہاں گم ہو جاتا ہے؟ پھر وہی سوال.........

''مردے ہو تم.........

اور بجھی ہوئی ہے تمہارے انقلاب کی مشعل

دیکھو، محسوس کرو، تمہارے اندر آگ لگی ہے

جسم کے پور پور میں آگ بھری ہے

اتنا زیادہ اپنے آپ سے مت لڑو

مت لڑو.........''

خود سے بار بار ہزاروں، بے غیرت قسم کے سوال کرتا کمرہ......... ایسا کیوں ہے درشن؟ درشن چپ ہے۔ پاؤں سے زمین کریدتا ہے.........

''اس طرف زیادہ توجہ کیوں نہیں دی گئی؟ یہ آگ تو انقلاب کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے''۔ اور درشن پھر چپ ہے۔

''جینوئن کون ہے درشن؟ ہم...... کیا نہیں؟ خود کے جینوئن ہونے سے انکار ہے کیا؟ ہم بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، سوچتے ہیں، پھر...... یہ آگ آڑے کیوں آ جاتی ہے۔ ایک خاص عمر میں یہ آگ سب کو ڈستی ہے...... ہمارے جیسوں کو بھی شادی کی عمر نکل جانے کے بعد بھی ہمیں ڈراتی رہتی ہے۔ مذاق اڑاتی ہے......... کہ اب کوئی پوچھے گا بھی نہیں.........!''

درشن کے چہرے پر گہری لکیریں ہیں......... ''سنو میں پھر کہتا ہوں...... ایک دن ہم تم سب خودکشی کر لیں گے...... کیوں؟ ہم تم سب گٹر کے ڈھیر پر پڑے؟ ہیں بس...... خودکشی بزدل لوگ کرتے ہیں نا...... نہیں ایک دن سب احساس کی سطح پر اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ.........''

(۵)

سناٹا، گہرا سناٹا، زندگی کے اتنے پڑاؤ پار کرنے پر بھی سچ مچ کی زندگی سے اتنا سا بھی واسطہ نہیں ہے کیوں؟ وقت

کتنی جلد اپنے احساس کو بوڑھا اور اپاہج بنا دیتا ہے۔ اس دن بسمیتا اداس تھی۔

''بابو جی.......... میں جا رہی ہوں.......... ڈیم پر کام رک گیا ہے نا.......... اس لیے.......... کنٹریکٹر پیسہ لے کر بھاگ گیا بابو جی..........''

''پھر تم لوگوں کا کیا ہوگا..........؟''

''یہ جگہ چھوڑ دیں گے.......... ہمارا مرد کام ڈھونڈ رہا ہے''۔

لگا، بسمیتا کا جسم دیمک کا گھر بن گیا ہو.......... باس آنے لگی جسم سے.......... سنو میں اپنا کام کرلوں گا.......... ادھ کچی سی مسکراہٹ..... فل ٹائم بیچلر ہوں یوں بھی زندگی بھر اکیلے ہی تو کام کرنا ہے۔ سمجھ رہی ہو نا تم..... برتن بھی دھولوں گا، بس ایک ادھار لی گئی مسکراہٹ..... اور..... لگا تھا بسمیتا کے جانے کے بعد کچھ ٹوٹے گا ضرور

ہاں، درشن کے چہرے پر ایک قاتل مسکراہٹ دیکھ رہا تھا۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ جھگیاں ویسی ہی رہیں۔ شام میں ہر روز دفتر لوٹتے ہوئے لگتا ہے آج جھگی نہیں ملے گی۔ سب لوٹ چکے ہوں گے۔ نہیں بھی لوٹے ہوں تو مجھے کیا لیکن لگتا ہے اندر ایک اداسی سی پسری جا رہی ہے۔

ایک دن بسمیتا کو ٹوکا بھی'' کام نہیں ہے تو تم لوگ بہار لوٹ کیوں نہیں جاتے؟''

وہ جیسے اس سوال سے دکھ گئی ہو۔'' او وہاں سے تو ای ہاں آئے ہیں بابو جی..... کام کی تلاش میں سب کچھ چھوڑ کر..........''

محسوس ہوا جیسے ایک گندی سی گالی بکی ہو بسمیتا نے.......... میں کون سا الگ ہوں ان سے کیا میں جا سکتا ہوں لوٹ کر واپس بہار..... اپنے وطن..... وہاں اکھڑے اکھڑے سے سوال منتظر ہونگے، شرمائے شرمائے سے جواب سننے کو۔ بس پیدا ہو جاتے ہیں بے حیا پودوں کی طرح کہیں بھی، پیدا ہو جاتے ہیں کسی بوجھ کی طرح..... ہم جلتی گرمی میں، دھوپ کے سائے میں تپتی ہوئی سڑک پر بھی سو جاتے ہیں..... کہ ہمیں زندگی کی طرف جاتے ہوئے کسی راستے کا کوئی علم نہیں ہوتا..... پھر ہمارے ہاتھ پاؤں بڑے ہوتے ہیں اور ہم سے کہا جاتا ہے محنت کرو..... رزق تلاش کرو..... اور ہم گھر بار سب کچھ چھوڑ کر نکل جاتے ہیں..........

پھر شام ہو جاتی ہے..........

پھر شام ڈھل جاتی ہے..........

''پھر؟''

درشن میری طرف دیکھتا ہے

''ہم سے پوچھو۔ کیا ہم واپس گھر لوٹ سکتے ہیں۔ وہ بھی نہیں گئے۔ بس جھونپڑی بدل گئی۔ یہاں وقت نہیں کمرے بدلتے ہیں۔ جھونپڑی بدلتی ہے اور جھونپڑی اجڑ گئی۔ جھونپڑی بدل گئی۔ جانے سے پہلے ایک دن اس نے مجھ سے ۱۰۰ روپے مانگے۔ گھر پر چولہا جلانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا اور دوسری شام کہانی ختم ہوگئی۔ میں دفتر سے لوٹا تو جھگی اجڑ چکی تھی۔ کوئی نہیں تھا۔ کچھ جھگیاں باقی تھیں، جو سمیٹی جا رہی تھیں..... بس کہانی ختم ہوگئی۔ یہ کہانیاں ایسے ہی شروع ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں.....''

''نہیں......''

پہلی بار دیکھا درشن کے چہرے پر وحشت کی ہزاروں آنکھیں اُبل پڑی ہیں۔ اچانک بڑھ کر اس نے میری ہتھیلیاں تھام لیں ...... سنو، ہم سب وقت کا استعمال ہیں بس ......

میرا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ بالکنی تک لے آیا ...... وہاں سامنے دور تک خالی پن تھا ...... جہاں کل تک جھگیاں ہوا کرتی تھیں ...... دیکھو، سب کچھ صاف کہانی ختم ہوگئی کہانی میں تھا ہی کیا ...... اس خالی پن میں ہوتا بھی کیا جو کہانی بنتا۔ وہ بھی اپنے وطن سے منھ چھپائے چھپائے پھرتے ہیں اور تم بھی ...... تم ان سے زیادہ کماتے ہو ...... تم نے ۱۰۰ روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور کہانی ختم، بھول گئے

درشن کی آنکھوں میں ڈھیر سارا خون سمٹ آیا ...... یاد ہے ایک بار تم نے ایک انوکھے لفظ کو اپنی زبان سے صدا دی تھی۔ استعمال، تم ہر چیز کا استعمال ڈھونڈتے ہونا ...... اور بغیر استعمال والی چیز تمہیں بے مصرف، بے معنی لگتی ہے ...... کیوں؟ تم جاننا چاہتے ہونا ...... کہ ان جیسوں کا استعمال کیا ہے ...... یہ ...... جو تمہاری حقارت، نفرت اور غصہ سے جھے ہیں ...... جو نہ ہوں تو تمہارا وجود نہ ہو ...... ہاں تمہارا وجود ...... جو بس ان کے ہی سہارے ٹکا ہے۔ ان جیسوں کے۔ تم روتے ہو، ہنستے ہو، گندگی کرتے ہو، سامانوں کا بوجھ بڑھاتے ہو، ہر جگہ تم ان کی مدد پر ٹکے ہو۔ یہ نہ ہوں تو تم جیسوں کے کام دھندے رک جائیں۔ ہاں! یہ عورت ان میں سے ہی ایک ہے جس نے سمجھا کہ تم اسی کے گاؤں کے ہو ...... وہ تمہارا کھانا بھی گرماتی تھی اور ضرورت پڑنے پر تمہیں بھی ...... تم حیرت کرو گے اسے اپنا استعمال معلوم تھا۔ استعمال کہ وہ تمہیں خوش کر رہی ہے ...... ایک استعمال اور بھی تھا کہ اس کے بنائے کھانے تمہارے جسم میں جاتے تھے اور اس کے بدن کی گرمی تمہارے اندر کے انٹلیکچوئل کو ذہنی طور پر تندرست رکھتی تھی۔ اس لیے کہ ساری غلاظت اس کے بدن میں انڈیل کر تمہارے سو کالڈ قلم کو سوچنے اور لکھنے کا وقت مل جاتا تھا ......

درشن نے گھور کر میری طرف دیکھا ...... مگر میرے جینیئس فرنڈ ...... تمہارا استعمال کیا ہے۔ تم لکھتے ہو۔ ہے نا؟ زمانے میں سدھار کرتے ہو ...... غریبوں کی لڑائی لڑتے ہو ...... بکتے ہو تم ...... فراڈ ہو تم سب ...... صرف اپنی آتما خوش کرتے ہو تم ...... غریبی کاغذ پر اتارتے ہوئے اچھا لگتا ہے تمہیں۔ لیکن آج تک کبھی کوئی لڑائی نہیں لڑی تم نے اور تم لڑنے کے لائق بھی نہیں ہو ......

اچانک وہ ٹھہرا ٹھنڈی سانس بھری۔ میری آنکھ میں جھانکا ...... سب کچھ جائز ہے ہمارے لیے اس لیے کہ ہم اس عہد کے دانشور ہیں ......

اس نے ایک ٹھہاکا لگایا ...... مارو گولی یار ...... آؤ میرا ہاتھ تھام لو میں نے کہا تھا ...... ہم تم سب ایک دن خودکشی کرلیں گے۔ سچ اپنے سڑے ہوئے جسم سے اتنی سڑن آئے گی کہ ...... آؤ خودکشی کرلیں ...... سمجھو یہ گہرا دریا ہے اور ہم کود رہے ہیں ...... آ ...... آ ...... لو ...... کود گئے ......

اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ آنکھیں بند کیں اور جیسے خیالی دریا میں چھلانگ لگا دی۔ پھر خود ہی ہنسا دھت ...... ہم ڈھنگ سے مر بھی نہیں سکتے ......

احمد شیر رانجھا

قصہ دو (۲) درویش

''وہ روتی تو ہوگی، میری خوش رفتار، بجی بنی ماں'' میں نے جاڑے کی دھوپ سے تپتی تھل کی ریت میں دُور تک بل کھاتی پگڈنڈی کے کنارے لیٹے لیٹے آسمان کی بے پناہ وسعت میں ڈوبتے ہوئے بڑبڑا کر کہا، میرے ساتھ لیٹے بازے فقیر نے ہولے سے دھوپ میں ایک آنکھ کھولی اور بڑے پریم سے بولا'' ناں! تمھاری ماں ان عورتوں میں سے ہے، جن کی روح جناتی ہوتی ہے''۔ ''کیا مطلب'' میں نے اپنے اندر کے لطف میں باہر سے گھلتی دھوپ، ریت اور خاموشی کے مزے میں ڈوبے ڈوبے کہا۔ ''مطلب یہ کہ'' بازا اپنی لمبی چکٹی زلفیں جھٹکتا اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا'' جس طرح پرانی کہانیوں کا جن ہمیشہ پہلے ہنستا اور پھر روتا ہے اسی طرح ہر جناتی روح جب روتی ہے تو اس کے دُور اندر اس کا کوئی حصہ ہنستا بھی ہے''۔ میں ایکدم جاگ سا پڑا تھا، اس نے جلدی سے میری آنکھوں میں دیکھا اور مسکرا کر بولا'' تمھاری ماں تمھاری جدائی پر روتی تو ضرور ہو گی مگر اب اس کے اندر اس کا ایک حصہ ہنستا بھی ہے''۔ ''اچھا مگر کیسے؟'' میں نے اس کی بات کا پورا لطف لینے کے لئے پوری حیرت سے کہا'' ناں میاں حسن یہاں میری بس'' اس نے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے دُور ایک اونٹ کے بچے کو ریت کے ٹبوں میں بے کلی سے دوڑتے اور بلبلاتے ہوئے دیکھ کر کہا'' اس سے آگے اپنے آپ سے پوچھو'' وہ ٹھیک کہتا تھا، میری ماں اس وقت تک میرے بیڈ کے تکیے پر پڑی میری آخری تحریر پڑھ چکی ہوگی، اس کا رونا دھونا ہلکی پھلکی ٹشو بازی تک آ کر اسے اس کی سنگھار میز کے سامنے لے آیا ہوگا، جہاں اس نے ایکدم اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں کے لمبے سرخ ڈوروں کے پار اپنے آپ کو اتنی دیر بعد بڑے غور سے دیکھا ہوگا۔ اور یہی وہ لمحہ ہوگا جب وہ روتے روتے ایکدم ہنس بھی پڑی ہوگی، میری جدائی اور اپنے وجود کی اندھی محبت کے انوکھے مخمصے میں بھلا وہ کب تک پڑی روتی رہتی، اس کی سنگھار میز، مہکی لانگ ڈرائیوز، تتلی ایوننگ پارٹیز اور چلبلی دوستوں نے اسے ہولے ہولے کھینچ کر بالآخر کھل کر ہنسا دیا ہوگا۔ ہاں کبھی کبھار میرے کمرے کے پاس سے گزرتے اور اپنا دن بھر کا میک اپ تھپتھپا کر اتارتے میری جدائی میں وہ رو بھی پڑتی ہوگی، میری وہ جن رانی، ادھ روتی ادھ ہنستی، سدا جوان ماں، وہی جس نے مجھے میرے فلی لوڈڈ کمرے کی گہری چاٹ لگا کر اور میرے پولیو مارے بے حرکت باپ کو اس کی وسیع جاگیروں سے پھسلا کر اسے اس کی فلپینو گورنس کے گالوں کے گہرے بیٹھے ڈمپلز میں سلا کر آزاد مورنی کے پر حاصل کیے تھے پھر اونچے نیلے امبروں میں اُڑتی وہ ہم دونوں کو بھلی بھی تو کتنی لگتی تھی، یہ تو بُرا ہوا اس کتاب کا، اس جرمن درویش ہرمن ہیس کی لکھی ڈیمین کا کہ جس نے مجھے میرے مرصّع مقبرے میں ایکدم سے جگا کر باہر سڑک پر لا پٹخا، ماں کو پتہ بھی نہ چلا کہ میں کب کا اپنے کمرے کے سنہرے تابوت میں، کسی ممیائے ہوئے شہزادے کی خوبصورت لاش کی طرح پڑا چپکے سے آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھا تھا، اور مجھ پر چڑھا اس کی شخصیت کا چکنا سخت خول ہیس صاحب کی سیدھی ٹھوکروں سے کتنی

جلدی ٹوٹ کر پرے جا گرا تھا، مجھے بھی پتہ تب چلا جب میں اپنے کمرے کی گہری نرم کوکھ میں سویا اپنے اندر روشن ہوتے سورج کی اس بے پناہ روشنی میں زور زور سے آنکھیں جھپکتا، چوں...... چوں...... کرتا پیدا ہو گیا تھا، پھر پتہ نہیں کب میں اپنے کمزور لڑکھڑاتے قدموں پر سنبھلتا، گرتا پڑتا حضرت کا نجو سرکار کے اس دربار پر آ پہنچا، آج تھل اندر اس درگاہ پر آئے مجھے پورا ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا مگر مجال ہے جو ایک لمحے کے لئے بھی مجھے اپنا کمرہ یا اپنی ماں یاد آئے ہوں۔ مجھے تو یہاں آتے ہی جس چیز نے پہلے پہل رلایا وہ میری ماں یا میرا کمرہ نہ تھا بلکہ باز ے فقیر کی آنکھیں، اس کی آواز اور اس کی انگلیاں تھیں، ہاں کسی عجیب سے رس میں رسا تھا یہ باز افقیر کہ جسے دیکھتے ہی مجھ سدا کے سہمے کو آپ ہی آپ قرار مل گیا تھا، پھر جب اس نے صوفی شاعری کا نیا نویلہ درد میرے کمپیوٹر مارے دل میں اتارا تو میں اندر سے پگھلے پگھلے موم جیسا ہوتا گیا۔ ہر گھڑی رونے کو تیار، بظاہر وہ اس دربار پر گاتا تھا مگر حقیقت میں وہ اس دربار کی روح تھا، بیٹھا، مسکاتا، جاگتا، رلاتا، اس کی بے چین انگلیاں تھل میں رلتی سسی کی طرح تڑپ تڑپ کر جب اس کے بارمونیم پر بھاگتیں تو میرا دل کرتا میں بھی کوئی گھائل ہرنی بن کر اپنے کسی پنوں کو دور پیاس کے سرابوں میں کلانچیں بھر بھر کر ڈھونڈوں اور مر جاؤں، فرید کی شاعری سے سنچا اس کا گہرا پیا سا گلا میرے اندر کی روہی میں ہُو کتا تو اس میں بُلبھا ناچتا، ہاں! بڑا بھلا سا تھا باز افقیر جو اس پوری رات رویا جب میں نے اسے اپنی کہانی سنائی ''یہ تو میری ہی کہانی ہے'' اس نے اپنی دکھ سے بوجھل موٹی موٹی آنکھیں جھپک کر کہا تھا ''فرق بس اتنا ہے کہ تمھیں تمھاری کتاب ذرا جلدی مل گئی اور تم اپنا اندر بچا کر یہاں آ پہنچے مگر میرا فرید اور میرا بلّھا جب مجھ تک پہنچے تو میں آدھا کھایا جا چکا تھا'' پھر اُس کے تہجد کا وقت ہو گیا تھا اور ہمیں محفل برخاست کرنا پڑی تھی، وہ وضو کے لئے جونہی اٹھا، میں اس کے دوست خانو فقیر کے حجرے میں جا کر سو رہا۔ آج صبح ہی صبح ہم اٹھے تو ایک دوسرے کی طرف خود بخود ہی کھنچ آئے تھے اور اس وقت دربار سے کچھ دور کھجوروں اور ریت کی اس تنہائی میں بیٹھے باتیں کئے جاتے تھے۔ ''رائے شہباز پناہ'' میں نے اس کا پورا نام لے کر ہولے سے اسے پکارا، اس نے لیٹے لیٹے دونوں آنکھیں ایکدم کھول دیں اور گھبرا کر بولا'' ناں میرے دوست اس نام میں بڑا بوجھ ہے مجھے ہمیشہ باز افقیر ہی کہا کرنا''۔ ''میں سوچ رہا ہوں'' میں نے دفعتاً اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا'' کیا ہم دونوں کو ڈھونڈنے وہ نکلیں گے نہیں؟'''' تمھاری تو خیر وہاں بہت ضرورت ہے میاں حسن'' اُس نے اپنے لمبے لمبے پٹوں میں سے چھلکتی سیاہ موٹی آنکھوں سے ہولے سے مسکرا کر کہا'' مگر میری بات اور ہے''۔'' کیوں آپ کی بات کیوں اور ہے'' میں نے اپنے زور زور سے دھڑکتے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔'' میرے گھر کو اب میری ضرورت نہیں رہی، میرا بیٹا جوان ہو چکا، میری جگہ بھر چکا''۔ وہ رکا اور پھر بڑے زور سے اللہ ہو کہہ کر بولا'' میں پانچ دفعہ اپنے گھر کی مالکن وڈ کائی کا بنا قیمتی سے قیمتی پنجرہ توڑ کر بھاگا، سندھ سے ہوتا ہوا ایران کی پہاڑیوں اور افغانی غاروں تک کہاں کہاں نہ چھپتا پھرا مگر ہر بار پکڑا گیا کیونکہ وڈ کائی کا گھر مرد کے بغیر لنڈا تھا، یہاں ہر عورت کا وجود ایک نہ ایک مرد کے بغیر لنڈورہ ہے۔ اس دفعہ سب کو سلاما لیکم کہہ کر سر عام نکلا ہوں اور چار سال سے یہاں بڑے مزے میں پڑا ہوں، کوئی پرواہ ہی نہیں۔'''' کیوں'' میں نے بے صبری سے اچھل کر کہا۔ وہ ہنسا اور پھر بڑے زور سے تھلوچی دوہڑے کا

سا اونچا سُر لگا کر بولا'' کیوں بے گھراچ مرد موجود اے'' وہ رکا اور دور آسمان کی نیلاہٹ میں کہیں گم ہو کر بولا'' پر میاں حسن جو لطف مجھے پہلی بار و!کائی کا گیرا توڑ کر بھاگنے میں آیا اس کی چس آج تک نہیں گئی''۔'' ہاں پہلی دفعہ قید سے نکلنے کا نشہ '' میں نے اپنی پلکوں میں بھرتے آنسو جھٹک کر کہا'' بڑی عجیب شے ہے نہیں اترتا''۔'' ہائے وہ نشہ'' بازے نے زور سے سر مار کر میری طرف درد سے ہنس کر دیکھتے ہوئے کہا'' سوچو یہاں پڑے ہم کتنے مست ہیں، یہ سب اسی نشے ہی کا تو نشہ ہے''۔'' ہاں یہ ٹھیک ہے'' میں نے بڑے ادب سے اس کے قریب ہو کر کہا'' مگر اپنی آزادی کی اس پہلی زندہ گھڑی کا نشہ کیا آپ اپنے پاس ہی رکھیں گے اسے میرے نشے میں نہ ملائیں گے۔'' وہ حیران سا ہو کر کچھ وقت مجھے دیکھتا رہا پھر آگے جھک کر ہولے سے بولا'' شاید انجانے میں تم نے ایک بڑی بات کہہ دی میاں حسن بڑا مزہ آیا، نشہ نشے میں مل کر ہی اصل آگ بنتا ہے، فکر نہ کرو تمھیں سب کچھ ملے گا۔'' پھر وہ رکا اور کچھ سوچ کر بولا'' آج شام میری گانے کی محفل ہے، کل صبح کا لنگر کھا کر ڈلے کی بار کی طرف نکل چلیں گے، خانو اور ہارمونیم بھی ساتھ ہوگا، وہاں پرانے ونوں کی بولتی چپ اور چھاؤں کا ایک اور تیسرا نشہ ہے، وہ بھی لے لیں گے، بات بھی کر لیں گے کیوں ٹھیک؟'' میں نے جونہی اقرار میں سر ہلایا ہم کپڑے جھاڑ کر اٹھ بیٹھے۔

شام دربار پر میرے دوست بازے فقیر کی محفل تھی، لوگ دُور دُور سے جمع تھے، حضرت کے مزار کے اونچے کلس کا لمبوترا سا دودھیا بلب جیسے ہی جگا، بازے کے ہارمونیم نے پہلا لمبا ہوکا بھرا، اس کے بکھرتے لمبے پٹوں، بند پپوٹوں کی بے پرواہی اور دبنگ آواز کی مستی نے دھیرے دھیرے ہر جسم کی خاکی پنجری توڑ کر وہاں موجود روح کی چکوریوں کو چاندنی بھرے آسماں کی طرف اڑا دیا، بڑا لطف مچا، آنسوؤں کے غبار میں ہر طرف درد ہی درد چمکتا تھا، خوشی ہی خوشی، خواجہ فرید کے کلام کی بہت بھیگی بھیگی آگ تھی جس کی تیز رسیلی آنچ پر خانو فقیر پاؤں میں گھنگرو باندھے کسی گھائل خمری کی طرح ہر سُو ناچتا پھرتا تھا، اور میں بلک بلک کر بچوں کی طرح روتا تھا، بڑا لطف تھا، بازے کے آس پاس لوگوں کا مجمع سا لگ گیا، لیکن ملتان کی طرف سے آئی زیوروں سے لدی ایک میٹھی میٹھی جوان عورت نے بڑا سیاپا ڈالا، وہ موسیقی کے جوش سے دمکے بازے کے وجیہہ کبیر بیدوی چہرے سے بندھ سی گئی تھی اور ندیدوں کی طرح ٹکٹکی باندھے اسے بس دیکھے ہی جاتی تھی، وہ تو خیر عورت تھی اس عالم میں میں نے کئی مردوں کو بھی بازے کے چہرے سے بندھے دیکھا، پھر روتے روتے اور ٹشو پہ ٹشو بھگوتے اس عورت کے ملائم دودھیا ہاتھوں نے بازے کو نوٹوں اور آہوں سے لادنا شروع کیا اور حد کر دی، اس کا بس چلتا تو بازے کو نوٹوں میں لپیٹ کر اپنے سیاہ نرم پرس میں چھپا لیتی، مگر بازے نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، وہ نگاہ چاند کی روشن ٹکی پر جمائے اپنی زلفیں بے پرواہی سے جھٹکتا خدا جانے کہاں تھا، وقفہ لینے کے لئے رکا تو اس نے ایک تیز اشارہ کر کے مجھے اپنے پاس بلایا'' سنو پیارے'' اس نے ہارمونیم پر جھکے جھکے میرے کان کے قریب ایک ہانپتی ہوئی سرگوشی کی'' رات اگر یہاں ہی رہے تو یہ عورت کسی نہ کسی طرح مجھے لے ڈوبے گی، یہاں سے ابھی، اسی وقت ڈلے کی بار کی طرف نکل چلنا ہے، تیاری کرو، خانو کو نہ بھولنا۔'' میں تیزی سے واپس پلٹا تو خانو خود بخود میرے پیچھے چلا آیا، ہم نے جلدی جلدی لنگر سے کھانا لے کر ایک پوٹلی میں

باندھا، خانو کے حجرے میں سے میں نے اپنا سلیپنگ بیگ اور خانو نے اپنی روئی بھری گدڑی اٹھائی اور ہم دریا کے بچھواڑے باڑے کی جھگی میں آ کر اس کا انتظار کرنے لگے، کچھ ہی دیر میں باز ابھی آ پہنچا، اسے تھوڑی دیر لگی کیونکہ اس نے خود پر نچھاور تمام روپیہ خود ایک پائی رکھے بغیر متولی دربار کے حوالے کر کے آنا تھا، اس نے اپنا ہارمونیم باندھ کر کندھے سے لٹکا رکھا تھا، خانو نے جیسے ہی باڑے کی گرم گدڑی سمیٹ لی اور چمڑے کی چھاگل پانی سے بھری تو ہم چل پڑے، چھ سات کلومیٹر کی دوری تھی، ہمیں چاندنی رات میں چلتے، ریت کے ٹیلوں اور ون کے قدیم درختوں سے ڈھکی ڈلے کی بار تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ ''لو بھائی جس کی جو مرضی ہے کرے، باتیں صبح ہوں گی'' باز نے وہاں پہنچتے ہی تھکی تھکی آواز میں کہا اور خود ون کے ایک بڑے سے کھو کھلے تنے میں گدڑی اوڑھ کر لیٹ گیا، میں نے اور خانو نے بھی دیر نہ لگائی اور جہاں تھے وہیں پڑ کر سو گئے۔

صبح کی تازہ میٹھی دھوپ نے مجھے جگایا تو خانو رات کا باندھا کھانا گرم کر رہا تھا، باز اہم سے کچھ دور ریت کی تنہائی میں کسی چپ سادھو کی طرح بیٹھا، دھوپ، ہوا اور ون کے سایوں میں گم تھا، میں نے تھوڑے سے نمکین چاول اور کچھ روٹی خانو سے لے کر ناشتہ کیا اور چھاگل سے پانی پی کر باڑے کے پاس آ بیٹھا، وہ مجھے دیکھ کر بڑے زور سے مسکایا ''کیوں کیسا رہا؟'' ''بہت مزیدار'' میں نے جواباً ہنس کر کہا ''مگر سائیں'' میں نے ہنستے ہنستے قدرے شوخی سے کہا ''اس سے پہلے کہ میں اپنی ماں اور آپ اپنی وڈ کائی کا الاپ شروع کرو، مجھے بتاؤ تو آخر یہ وڈ کائی ہے کیا بلا؟'' وہ بڑے زور سے ہنس پڑا لیکن پھر قدرے سنبھل کر بولا ''وڈ کائی وہی ہے جو تمھاری ماں ہے اور یہ دونوں وہ ہیں جو رات محفل میں آئی حسن اور دولت سے لدی عورت تھی، یہ سب نفس مردود کی ماری خود اپنی ہی عاشق جناتی عورتیں ہیں جو کبھی ہنستی کبھی روتی اپنی اپنی سونے رنگی پنجریوں میں کوئی ہم جیسا ہریل طوطا رکھنے کی محتاج ہیں۔'' وہ تازہ تازہ پتوں سے گندھی گھنے ونوں کی دھوپ ملی گولائیوں میں کچھ دیر کھو کر چپ سا ہو گیا تھا، ایکدم بولا ''مگر میں تمھیں بتاتا ہوں کہ اصل وڈ کائی کون تھی اور اس کی قید تنہائی سے بھاگنے کی پہلی پہلی لذت مجھے کیسے ملی۔'' اتنے میں خانو نے ہم سے کچھ پرے بہت دھیمے سُروں میں ہارمونیم چھیڑ دیا تھا اور ریت کے اسرار میں سُر اور میٹھی کسک کی ایک چمکتی دمکتی سرسوتی سی بہہ نکلی تھی، وہ ہم سے بے پرواہ، ہولے ہولے روتا، سسّی کا ریت اور جدائی سے جھلسا نوحہ کیے جاتا تھا، باز اچپ پڑ گیا، موسیقی کا لہریا اسے بہا کر ایک مجھ سے دور لے گیا تھا، پھر جب خانو نے دفعتاً اپنی بانہہ آسمان کی طرف دراز کر کے کسی زخمی کونج کی طرح گرلا کر، سسی نوں ماں متیں دیندی، دھیے چھوڑ بلوچ دی یاری کہا تو باز آپے سے باہر ہو گیا اور کسی مست مور کی طرح ایک دم اٹھ کر ریت کی نرماہٹ میں اپنے لمبے پٹے لہراتا دور تک ناچتا گیا، کچھ دیر بعد جب وہ موسیقی ہی سے قرار پا کر میرے پاس واپس آ بیٹھا تو آنسوؤں میں لتھڑا ہوا تھا، بولا ''یارا یہ یاری ہی نہیں چھوٹتی، میرے باپ والے دین پناہ آف حویلی پناہ کی یاری بھی بڑی پکی تھی مگر کسی انسان کے ساتھ نہیں اپنی جاگیر کے ساتھ، موقعہ ملتے ہی مجھے ذبح کر گیا، ایک دن میرے بھائیوں کو اپنے پاس بٹھا کر بولا ''شہباز کو چھڈو، شہباز آپے اُڈسی'' پھر میری طرف دیکھ کر بڑے چاؤ سے بولا ''ماسی وڈ کائی نے تجھے، او میرے بھولے

فقیر پتر، اپنی اکلوتی اولاد رانی سلطان کے لئے قبول کر ہمیں مل خرید لیا ہے۔'' میرے سب بھائیوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کیونکہ سب جانتے تھے رائے زادی وڈ کائی ہمارے خاندان کی وہ عورت تھی جو خاوند کی بے وقت موت کے بعد دریائے جہلم پر آباد ہمارے علاقے نڈھا مراد سے لے کر دُور دریائے چناب کے علاقے بُرج ملاح تک کی واحد مالک تھی'' اوئے'' میرے والد نے اپنی مشہور عام میٹھی گھگی آواز کچھ مزید گھگی بناتے ہوئے کہا'' وڈ کائی کے گھر کا ٹکہ میرے شہباز کے ماتھے آ سجا ہے، اس بھاگوں والے کو اب ہمارے اونٹ کے پھدوڑ جتنی ہتھاڑی زمینوں سے کیا لینا یہ تو اب دریا جہلم تا چھاں جہاں مرضی اڑتا پھرے۔'' میں جونہی اس کی طرف دیکھ کر پاگلوں کی طرح مسکرایا اور میرے بھائیوں کی نظریں کچھ جھکیں تو میرے والد نے ذرا پرے بیٹھے پٹواری کو اپنے پاس بلوالیا، اور پھر پٹواری کے تیز قلم نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے باپ دادا کے وراثتی حصہ سے محروم کر کے اپنے اصل در سے بے در کر دیا۔ یاد رکھنا میاں حسن وہ میری آنکھوں میں دیکھتا کسی بھوکے باز کی طرح گُرلایا'' زمین کا پیار ہی ہماری دھرتی کا سب سے بڑا پیار ہے، یہاں اکثر باپ اپنی بوڑھی جاگیردار ہڈیاں زمین کے طاقتور رس سے سدا جوان رکھنے کے لئے بیٹوں کو اپنے ہی ہاتھوں زمین میں زندہ درگور کرتے آئے ہیں۔ یہاں انسان نہیں کئی مونہوں والے سانپ، بچھو اور بھگیاڑ رہتے ہیں، ان کو مارنا، جب بھی موقع ملے ان کو مارنا'' وہ یہ کہتے کہتے بچوں کی طرح بلک کر رو پڑا۔ لیکن پھر خود ہی سنبھل کر بولا'' مجھے بھی ڈسا میرے باپ نے اور خوب ڈسا، شاید اسلئے کہ میں اسکی اولاد میں سب سے سیدھا سادا اور انبھول سا تھا تبھی اس نے مجھے یوں وڈ کائی کے ترازو پر بے مول بیچا، خیر، اپنا اصل وراثتی حصہ بخوشی بھائیوں اور باپ کے نام لکھوا کر جب میں خالی ہاتھ وڈ کائی کی حویلی پہنچا تو صرف وڈ کائی کا رہ گیا تھا، اور تو اور میری بیوی بھی میری نہ تھی'' کیوں'' میں نے حیرت سے منہ کھول کر کہا'' ہاں میاں حسن، میری بیوی جب زمینوں، ہنشیوں، ولایتی کاروں اور شہری جائیدادوں کے پار سے مجھ ننگے سر والے لنڈے کے پاس پہنچی تو میری نہیں وڈ کائی کی ہی تھی، وہ اپنی شرمیلی پتلی بانہیں پیارے مجھے اسی وقت اپنے پاس بلواتی جب وڈ کائی کے حکم پر اس کا بچہ جننے کا پروگرام ہوتا، عام حالات میں، میں کون اور وہ کون، تبھی تو میرا حقہ بستر بجائے گھر کی حویلی میں باہر قدیم دارے کے ایک پرانے کمرے میں تھا، جہاں بظاہر میں بڑے آرام سے رہتا تھا، کیونکہ میرے پاس کار بھی تھی، ڈرائیور بھی تھا، بوسکی اور کلف والی پوشاکیں بھی تھیں اور ضرورت کا پیسہ ٹکا بھی، مگر اصل میں تو میرے پاس کچھ بھی نہ تھا اور یہ بات بچہ بچہ جانتا تھا، جو کچھ بھی تھا وڈ کائی کا تھا، میں سارا سارا دن دارے پر پڑا ہیر وارث شاہ، قصے کہانیاں اور تصوف کی کتابیں پڑھتا رہتا یا پھر دارے کی دیوار کے پار گھریلو حویلی میں سے ابھرتی وڈ کائی کی چنگھاڑتی آواز سنا کرتا، اور میاں حسن وہ آواز'' وہ بولتے بولتے رک گیا، مگر پھر میرے قریب ہو کر بولا'' وہ آواز میرے لئے سرکس کے کسی رنگ ماسٹر جیسی آواز تھی جو مجھے اندر سے ڈھا کر چوہا بنا ڈالتی تھی، میں وہ آواز سنتا اور کہیں بھاگ جانا چاہتا، خیر، میرے اس دوران دو بچے پیدا ہوئے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی، لیکن میرے بچے مجھے ہمیشہ دارے میں پڑا ایک مہمان ہی سمجھتے رہے، پھر نانی نے انہیں وہاں سے اٹھا کر ہمیشہ کے لئے لاہور کے ہاسٹلوں کے حوالے کر دیا تو قصہ ہی صاف ہو گیا۔'' دفعتاً ہمارے آس پاس تھل خاموش

سا پڑ گیا تھا کیونکہ خانو اپنے باجے کے پاس ہی بے سدھ پڑ کر سو گیا تھا، بازے نے اسے پکارا تو وہ جھرجھری لے کر ہولے سے اٹھ بیٹھا اور باجا سنبھالتا نیچے ونوں کی گہری چھاؤں کی طرف اتر گیا، ہم دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے ریت میں دھنستے اس سے ذرا پرے ایک گھنے سے ون تلے آلتی پالتی مار کر آ بیٹھے، پھر تازہ تازہ پکتے پیلوؤں کی خوشبو میں خانو نے ہارمونیم پر مالکونس چھیڑ دی، سماں سا بندھ گیا۔ ''قصہ نہ چھیڑیں، بڑا مزہ آ رہا تھا'' میں نے بازے سے کہا ''پر اب مجھے اپنی آزادی کے اس پہلے خاص لمحے میں لے چلنا ہوگا جب ہمارا قیدی رائے شہباز پناہ پنجرہ توڑ کر باز فقیر بنا'' اس کی سوچی سوچی آنکھیں یکا یک بے پناہ چمک سے بھر گئیں۔ مالکونس اس گھڑی عجیب شان اور پریم سے ریت، تنہائی، دھوپ اور چھاؤں کے گہرے سرور میں سے گزر رہی تھی اور ہمارے اندر رچاؤ ہی رچاؤ پھیلتا جا تا تھا، بازا کچھ دیر آنکھیں بند کر کے بڑی مستی سے بیٹھا رہا پھر خود بخود ہی مسکرا کر بولا ''میں وارے میں پڑا جب کبھی کتابوں سے فارغ ہوتا تو اپنے بوڑھے وارے دار فلک مراثی سے اپنے جد امجد رائے خان کے ڈھولے سنتا، ہوتے ہوتے وہ بوڑھا دلچسپ مراثی میرا دوست بن گیا، کبھی کبھی چاندنی راتوں میں وہ اپنے پرانے اکتارے پر لہک لہک کر ہیر سیال یا سسی کی جدائی کا قصہ چھیڑتا تو مجھے بھی رلاتا اور خود بھی روتا، ایک دن عجیب واقعہ ہوا، وارے میں ٹہلتے ٹہلتے وڈ کائی کی بچھڑی ہوئی آواز جو دیوار پار سے ایکدم مجھ پر گری تو میں اچھا بھلا چلتا چلتا ڈھے پڑا، سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا ہوا، بس میری ٹانگیں جواب دے گئیں، بابا فلک مراثی جو میرے ساتھ ساتھ حقہ پکڑے چل رہا تھا خود بڑا حیران ہوا لیکن دانا آدمی تھا اندر کی بات سمجھتا تھا، اسی شام اس نے اپنے لئے بھنگ گھوٹی جب خوب ترنگ میں آ چکا تو میرے پاس تازہ بھکھا حقہ رکھتے ہوئے تقریباً رو کر بولا ''تو یہاں کی رن ہے میرے سردار مرد نہ بنا کر، مردوں کی یہاں ٹانگیں ٹوٹ جایا کرتی ہیں'' میں ہکا بکا ہو کر ابھی اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ بڑے مزے سے جھوم کر بولا ''زنانی بن میرے سردار، اصل زنانی، ڈولے میں بیٹھ کر آیا مرد زنانی ہی ہوتا ہے'' میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی مجھے لگا جیسے کسی نے میرا کلیجہ نکال کر چبا لیا ہو، میں ایک دم ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا، بابا فلک نے مجھے پکڑنا چاہا مگر مجھ میں نئی سی طاقت دیکھ کر ایک طرف ہٹ گیا، اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور وہ تھر تھر کانپ بھی رہا تھا وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی بات کا برا مان گیا ہوں، مگر مجھے تو اس نے انجانے میں جگا ڈالا تھا اور اس وقت میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے اندر پڑے اپنے بدبودار مردے کو حیرت سے تک رہا تھا۔ ''بابا'' میں نے جیسے ہی زور سے کہا تو وہ لڑکھڑا سا پڑا اور اس سے پہلے کہ گھبرا کر میرے پاؤں پکڑ لیتا میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اس کی سخت داڑھی میں حقے کی تیز خوشبو چومتے ہوئے کہا ''بابا نکال مجھے یہاں سے، کر میری مدد'' وہ جہاں تھا وہیں جم گیا، اب میں نے بڑی عاجزی سے اس کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی حالت غیر ہو گئی، بالآخر وہ ایک بڑا سا ڈسکورا بھر کر بولا ''نہ ذلیل کر اپنے اس مسکین میر منگ کو، مجھے حکم کر، جس طرح مرضی ہے مرضوا میرے بوڑھے چم کی جوتیاں، مگر میرے آگے ہاتھ تو نہ باندھ میرے سردار...... آ جا میرے پیچھے'' اور ہم اسی وقت وہاں سے نکل پڑے، گاؤں سے باہر چاندنی میں چپ چھپی واسوں کی پرانی جھگیوں تک پہنچتے ہمیں دیر نہ لگی، بابا سیدھا ایک جھگی میں گھس گیا اور خانو کو لے کر باہر آیا، ہاں یہی خانو'' اس

نے ہارنیم کے پاس آنکھیں بند کر کے مدھم سروں میں ڈوبتے خانو پر ایک میٹھی مسکاتی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔" بابا نے خانو سے کہا کہ میرا سردار تیری طرح فقیر طبیعت آدمی ہے، اس کا دل یہاں نہیں لگتا، اسے لے کر ابھی یہاں سے کہیں دور نکل جا۔" خانو ہم دونوں کو لے کر اپنی جھگی میں آیا بہار، لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں کچھ سامان کے پاس ایک ہارمونیم پڑا تھا، خانو نے جلدی سے ہارمونیم ایک غلاف میں لپیٹ کر کندھے سے لٹکایا، میرے لئے ایک پرانی سی چادر، تہبند اور قمیض صدری کہیں سے نکال لایا، ان چیتھڑوں کو پہن کر میں بابا کے سامنے آیا تو وہ میرا حلیہ دیکھ کر رونے لگا، لیکن میں نے آگے بڑھ کر اس کو زور سے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور بتایا کہ میں ان کپڑوں میں کتنا سکھی ہو چکا تھا، ہم دونوں کھل کر رونا چاہتے تھے، مگر خانو نے اسے میرے پیچھے سے نکالا اور سائیں دے حوالے کہہ کر جھگی سے باہر چھوڑ آیا، پھر خانو اور میں وہاں سے نکل پڑے۔ خانو کے دیئے مٹی مارے کپڑوں میں عجب سی لذت تھی، مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ابھی ابھی پیدا ہوا ہوں کسی تازہ تازہ جنگلی پودے کی طرح، ادھر صبح کی پو پھٹ رہی تھی اور ہم جنگلی جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے، میرے پیروں کو ملی نئی چال میں بڑا ہی پریم تھا جو مجھ سے سنبھالا نہ جاتا تھا، میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چاندنی راتوں میں تمی ناچتی بلوچ پکھی واسنوں کی طرح لہک لہک کر اس کھلے خاموش جنگل میں دُور تک ناچتا چلا جاؤں، ہواؤں کی طرح اونچے درختوں کی ٹہنیوں میں سے گزروں، میں نے اوپر دیکھا تو مجھے لگا جیسے دُور کے بڑے بڑے جنڈوں کے اوپر ابھرتا سورج بھی میرے ہی اندر طلوع ہو رہا ہو۔ اس کی بے پناہ روشنی میں، میں زمین کی مٹی کو چومنا اور کوئی اونچا میٹھا گانا گا لینا چاہتا تھا، مجھے لگتا تھا جیسے سب کچھ میرا اپنا تھا، میں باہر سے ککھوں میں رلتا کوئی پکھی واس سپیرا تھا مگر اندر سے بادشاہ، اپنے وقت کا بادشاہ، خوشبوؤں، رنگوں، آسمانوں، اور زمینوں میں اڑتا طاقتور بادشاہ، مت پوچھ میرے پیارے وہ لمحہ کیا تھا" وہ سانس لینے کو رکا، اُدھر خانو نے زور سے سر مار کر ہارمونیم کو جو اونچے جاگتے سُروں میں کھولا تو میں بھی گھوم کر موسیقی کی مستوار لچک میں یکا یک بہہ پڑا، بازا اور خانو مجھے دیکھتے رہے اور میں خود سے بے خود ہو کر، ونوں کے دور تک پھیلے سایوں میں ناچتا گیا، دور دھوپ کے سرابوں تک، مجھے لگ رہا تھا جیسے خانو کی روح سے لپکتا ہارمونیم پورے کا پورا میرے اندر آ اترا ہو اور میں اس کی قوت سے بکھرتا دور آسمانوں کی سنہری نیلاہٹوں سے جا ملا ہوں، بالآخر پتہ نہیں کب میں ناچتے ناچتے رو پڑا اور پھر سسکیوں میں ٹوٹتا زمین پر گرا تو ہولے سے مسکرا بھی پڑا، میری دکھ ماری زندگی کا سارا اچھلا درد مجھ میں پھٹ کر بہہ نکلا تھا، بازا کسی فکر مند مسیحا کی طرح مجھ پر فوراً ہی جھک گیا، میرے ہر طرف اس کی لمبی، بہتی زلفوں کا آبشار سا آن اترا، اُس ٹھنڈے اندھیرے کے دُور اندر اُس کا مکھ چاند کی طرح روشن تھا، "اور بتاؤ سرکار" میں تڑپا "مجھے اپنے لمحے کے اندر ابھی کچھ اور دُور لے جاؤ، کچھ تو اور پلاؤ" میں روتے روتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بڑبڑایا۔ "نہیں میرے بچے بس" اس نے جلدی سے آنکھیں موند کر ہولے ہولے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اس سے آگے بازا فقیر ہی بازا فقیر ہے اور کچھ بھی نہیں" "تمہارا مطلب ہے نشہ ہی نشہ" میں نے سوئے سوئے مسکرا کر کہا۔ "ہاں نشہ ہی نشہ اور کچھ بھی نہیں صرف بازا۔" اس نے پہلی بار کسی قدر بے رحم تلخی سے کہا اور اپنے بال زور سے جھٹکے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے اس کا پردہ سا ہٹا اور تپتے سورج کا بے

پناہ تانبہ یکا یک میرے اندر باہر بہہ نکلا۔ میرے وجود میں اب ایک نیا کندن کھل اٹھا تھا، ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کا رس بھرا ہیولا دور ریتلے سرابوں میں خانوفقیر کے ہارمونیم پر رو رو کر گھلتا مجھ سے بہت دور جا چکا تھا، ایک کھیل ختم تھا، دوسرا شروع ہونے کو تھا، حقیقت میں آیا تو میری دؤ کائی ایک نئے پنجرے کا دروا کیے میری منتظر تھی، مگر میں تیار تھا، اپنی نئی آگ کے ساتھ!!!

آبِ قدیم کے ساحلوں پر

غیبی زبان کی شاعری کے عہد میں ایک نئے رنگ میں دل کو گرفت میں لینے والی آواز آبِ قدیم کے ساحلوں پر اُبھری ہے۔ اس شاعری میں ساری باتیں نئی ہیں۔ سادگی اور سہولت کے ساتھ جدید ذہنی میلانات کی نشاندہی بھی موجود ہے۔ بلکہ حقیقت اولیٰ کے ساتھ ایک ربط اور روحِ رواں زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ انوار فطرت نے اپنی ذہنی گپھا میں بیٹھ کر شاعری تخلیق کی ہے۔ نئی شاعری اُس کے ذہنی انقلاب کا ایک خاص موضوع ہے۔ اُس نے جدید رجحان سے شاعری کے اسلوب کو تبدیل کیا ہے۔ اور ایک توقع بھی وابستہ کی ہے۔ کہ اُس کی شاعری کی ''نئی بات'' کو سمجھا جائے۔ تاہم انوار فطرت اپنے احساس کو عموماً پوشیدہ رکھتا ہے۔ لیکن شعر کی تخلیق میں وہ تغیر پذیر اور جدت پسند ہے۔ یونانی زبان اور اہل روما کی شاعرانہ غیب رسانی کی طرح انوار فطرت نے اپنے وجود کا احساس مکاشفات کے حوالے سے دلایا ہے۔ وہ باخبر ہے۔ مگر اُس کی دانش ایک ''کوی'' کا تفکر ہے۔ اُس نے شدت احساس کے لیے اپنے وسیع مطالعے کا سہارا لیا ہے۔ اور مفہوم کی بینائی پیدا کی ہے۔ وہ اپنی ذات میں بھکشو ہے۔ اور ازلی بن باسی! اُس نے کھڑاؤں نہیں پہنی مگر بنیاد بننے والے خیالات میں اس نے تنہا نشینی اختیار کی ہے اور اگر کہیں سفر کا آغاز کیا ہے تو کسی ساحل کی تلاش میں نکلا ہے۔ اس سفر میں اُس کی آواز کہیں الہامی، کہیں مناجاتی اور کہیں اسطوری اکتسابی ہے۔ انوار فطرت کی آنکھ غیر مرئی کو دیکھنے کی سکت رکھتی ہے۔ اُس نے ایک موثر زبان میں بھجن تخلیق کیے ہیں اور آفرینش کا آہنگ سننے کے لیے روحوں کو رام کرنے والے اسلوب کی شعری ہئیت بنائی ہے۔ **(ڈاکٹر رشید نثار)**

بشریٰ اعجاز / صوبہ

چوہدری صوبے کی ایمبولینس کوٹ مہربان کی گلیوں کے قریب پہنچی تو اس کی سفید پیشانی پر جلتی بجھتی لال بتی اور "ہٹو بچو" کہتے ہوئے سائرن کی مہیب آواز نے کوٹ کی خاموش گلیوں کو تھرا دیا، بھتے ویلے کی تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں، بیساکھ کی لوسنتی دوپہر میں گلیوں، کوٹھوں، احاطوں اور کھیتوں سے عورتیں، بچے اور مرد، حال حال کرتے یوں ننگے پیر ایمبولینس کے پیچھے بھاگتے جیسے ان کے پاؤں تلے اچانک دھرتی تانبے رنگی ہوگئی ہو، اور آسمان سے دفعتاً آگ کے گولے برسنے لگے ہوں۔ گاؤں کی مرکزی گلی میں پہنچ کر ایمبولینس کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ جس کے پیچھے دھول کے غبار میں بھاگتے ہوئے بچے بھتنوں کی طرح لگ رہے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں آوارہ کتوں کو مارنے کیلئے مٹی کے ڈھیلے تھے، جنہیں وہ گاہے گاہے ساتھ بھاگتے کتوں کو مار رہے تھے، ان کے چہروں پر ایمبولینس کو دیکھ کر ایک نئی سرگرمی ہاتھ آنے کی سرخی دوڑ رہی تھی، جسے مٹی اور پسینے نے سیاہی مائل کر دیا تھا۔ ان کے پیچھے دھول کی دیوار کو چیرتا، کاتا پسینے میں گندھی، میلی کچیلی عورتوں کا غول تھا، جو سینوں پر بری طرح دو ہتڑ مارتے ہوئے چلا رہی تھیں۔ حال نی ساڈا چوہدری، حال نی ساڈا صوبہ!

ایمبولینس دارے کے دروازے پر رکی تو اس کے اندر سے تمتمائے ہوئے چہرے والا چوہدری اسد اللہ عجلت میں اترا، اس نے شعلے برساتی نظروں سے ایمبولینس کے گرد جمع ہو جانے والی بھیڑ کو دیکھا اور قریب کھڑے منشی ظہور سے کڑی آواز میں بولا، ان شادی بے خبری سوانیوں کو چپ کراؤ، جیوندے ابے ہوراں کو بدبختیں یوں رو رہی ہیں جیسے خدانخواستہ...... ؟ ڈھلے، بچکے، ہواڑیں مارتے سینوں پر رکھے کھردرے ہاتھوں کی حرکت اس آواز سے آپ ہی آپ یوں رک گئی، جیسے ان کی چابی کسی نے بند کر دی ہو، غول سرسراتا ہوا یوں چھٹنے لگا، جیسے سردیوں میں کہرے کی دبیز تہہ، دھوپ کے پہلے چابک سے ہی چھٹنے لگتی ہے۔ ڈھلکی ہوئی میلی اوڑھنیاں جو ایمبولینس کے پیچھے دیوانہ وار بھاگنے سے لہرا لہرا کر کندھوں پر جھول رہی تھیں دوبارہ سروں پر ٹھہرنے لگیں، الٹے قدموں پیچھے مڑتے ہوئے اس غول کا رخ اب چوہدری صوبے کی حویلی کی طرف تھا۔ منشی جاتکوں کو یہاں سے بھگاؤ، ابے ہوراں کی ایمبولینس بیٹھک کے سامنے لے جانی ہے۔ کلف لگے سفید بے شکن کھڑکھڑاتے کپڑے، آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ، پیشانی پر شکنیں، رومال سے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے، چوہدری اسد اللہ اس وقت تھوڑا بے چین نظر آتا تھا۔ خانو کدھر ہے؟ جی وہ دھوئیں والے کوٹھے ہیں، چلم پر آگ رکھ رہا ہے۔ بچوں کو بھگا کر ظہور چوہدری اسد اللہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اوئے اس کھوتے دے پتر سے کہو، اب چلم کی جان چھوڑے اور ادھر آئے، ابے ہوراں کی بیٹھک کی صفائی ستھرائی دیکھے، ابھی یہاں آیا گیا شروع ہو جانا ہے۔ اور یہ دارے کا ویہڑہ بھی ذرا لگھہ پتر بنج کر صاف کرے، اور تم ظہورے، ذرا جلدی سے حویلی جاؤ اور چوہدرانی سے کہو، اپنے داج کے سامان کی پیٹی سے اچھا سا بستر نکال کر دے، رنگ رنگ کے لوگوں نے ابے ہوراں کو دیکھنے آنا ہے، ایسا نہ ہو کہ..... باقی بات اس نے سر کے اشارے سے سمجھائی۔ جی اچھا کہتے ہوئے ظہور حویلی کی طرف بھاگا۔ ایمبولینس کے اسٹریچر سے وڈی نوں کے جہیز کے بے داغ ریشمی

بستر پر منتقل ہوتے ہوئے، لاغر چوہدری صوبہ مزید نڈھال ہو گیا، کمرے میں ایئر کولر کا انتظام کرتے، بجلی کے سوئچ بٹن ٹھیک کرواتے، اور غسل خانے کے نل، ٹونٹیاں چالو کرواتے شام پڑ گئی۔ اس اثناء میں شہر سے ضروری دوائیاں لے کر اور ہسپتال کے واجبات ادا کر کے نکا چوہدری رحمت اللہ بھی پہنچ گیا، جب وہ وارے کے احاطے میں داخل ہوا تو عیادت کرنے والوں سے احاطہ یوں لبالب بھرا ہوا تھا، جیسے کبھی اچھے دنوں میں، پھٹی سے گودام بھر جایا کرتا تھا اور وہ کھیلتے ہوئے اس کے اوپر چڑھ کر، گودام کی چھت کی کڑیوں سے لٹک کر جھولے لینے کی کوشش میں بار بار پھٹی کے چھوٹے سے نرم نرم پہاڑ پر گرتا اور اٹھتا تھا۔ احاطے میں، بان سوتر اور نواڑ کی چارپائیاں بے ترتیبی سے آڑی ترچھی پڑی تھیں جن پر بیٹھے ہوئے لوگ چوہدری صوبے کے اچھے دنوں کو یاد کر رہے تھے۔ بجلی کے پنکھوں کے گھرر گھرر اور حقوں کی گڑگڑاہٹ نے ماحول میں سویا ہوا ہنگامہ جگا رکھا تھا۔ ٹھنڈے شربت کے جگ، برف والا پانی اور کھانے کی سینیاں اٹھائے، ملازم چارپائیوں کے درمیان بھاگتے پھرتے تھے، رحمت اللہ کو دیکھتے ہی چارپائیوں پر ہلچل سی مچ گئی، چولیں ہلنے لگیں، پائے کھسکنے لگے، سارے احاطے میں کھپ مچ گئی، نکا چوہدری آ گیا، آ پترا آ، خیر ہووے تیری، شالا چوہدری صوبہ جیوندا رہوے، وے پترا، تیرے ابے نوں رب صحت دیوے، عیادت کے لئے آنے والوں کی آوازیں، کمیوں کے سلام اور کندھے پر ہاتھ پھیرنے والوں کی بھیڑ میں ایئر کنڈیشنڈ کار سے نکل کر سیدھا وارے کے احاطے میں آنے والا، نکا چوہدری پسینے میں ڈوب گیا۔ خیر ہووے چاچا، دعا کرو، ابے ہوراں کے لئے دعا کرو، کہتے ہوئے وہ جلدی جلدی بیٹھک کی طرف بڑھا۔ خانوں، رحمیا، چلتے چلتے اس نے اونچی آواز میں دھوئیں داروں کو آواز دی۔ جی چوہدری جی کہتے مہمانوں کی چارپائیوں کے گرد پروانوں کی طرح چکراتے، خانوں اور رحما لپک کر آگے آئے، اوئے پروہنوں کو روٹی ٹکر بھی کھلایا ہے کہ نرا حقے پانی پر ہی گزارہ ہے۔ سرکار حقہ پانی کیوں، شالا بھرے رہیں بھڑولے چوہدری صوبے خان کے، یہاں بھلا روٹی کی کیا تھوڑ۔ بلا ہلا، کہہ کر مطمئن انداز میں سر ہلاتا رحمت اللہ بیٹھک میں چلا گیا۔ جہاں چوہدری صوبہ خان، سندھی کڑھائی والی سفید لیڈی ہملٹن کی چادر پر کوے کی حالت میں پڑا، اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔ پائنتی کی طرف بخشو نائی زمین پر بیٹھا، ہلکے ہاتھوں سے چوہدری کے پاؤں کی تلیاں مل رہا تھا۔ چوہدری کے چہرے پر بھی بیماری نے نقاہت کی ڈونگھی لکیریں کھینچ دی تھیں، جن سے توریئے کے نسرے ہوئے پھولوں جیسی زردی باہر کو امنڈی پڑتی تھی۔ اس کے سوکھے ہونٹوں کے کناروں سے جھاگ جیسی کوئی سفید سفید چیز باہر نکل رہی تھی، جسے روئی کے پھوہے سے صاف کرتے ہوئے، پھتو مراثی نے، بیٹھک کے دروازے سے نکے چوہدری کو اندر آتے دیکھا، تو سر پر باندھے ہوئے نکی کھوری والے میلے صافے کا پلو، جلدی سے آنکھوں پر رکھ لیا، اوئے پھتیا، کیا حال ہے ابے ہوراں کا۔ جی آپ خود دیکھ لیں۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ چوہدری صوبے کی ادھ کھلی آنکھوں کے کناروں سے ٹھہر ٹھہر کر گرتے ہوئے پانی کے قطروں، کھنچے ہوئے نتھنوں سے سانسوں کا پرشور اخراج اور تیز تیز ہلتے سینے کی بے ترتیب دھڑکنیں دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرتا خاموشی سے رحمت اللہ پلنگ کے قریب رکھے موڑھے سے ٹک گیا۔ بھائی جی کدھر ہیں۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ بولا۔ جی وہ تو جب سے آئے ہیں، پروہنوں نے انھیں ویہل ہی نہیں لگنے دی، اب تو لی

گئے ہیں گھر والوں کو دس پچھن۔ پھٹا چادر کے پلے سے خواہ مخواہ ہی آنکھیں رگڑتے ہوئے بولا۔ اچھا، اچھا تم ایسا کرو بھتے، حویلی جاؤ اور بھائی جی کو یہاں بلا لاؤ، کچھ ضروری صلاح کرنی ہے۔
دو پہر رات گزر چکی تھی۔ دارے کے احاطے میں پرانے پنکھوں کی گھر رگھرر، بے ترتیبی سے بچھی چار پائیوں سے ابھرنے والے خراٹوں کی بے ہنگم آوازوں، چارپائیوں کی چڑ چڑ اور چڑوں چڑوں سے قدرے ہٹ کر، چوہدری صوبے کی بیٹھک سے ملحقہ کمرہ، میٹنگ روم بنا ہوا تھا۔ جہاں چوہدری کی بیماری اور متوقع موت کا ایجنڈا زیر بحث تھا۔ شریکوں میں اونچی ناک کا مسئلہ سب سے زیادہ گھمبیر تھا۔ جس پر زیادہ زور دیا جا رہا تھا۔ اب ہورین تو لگتا ہے اب اپنی کھیڈ مکانے ہی والے ہیں۔ اسد اللہ نے کھنگھار کر گلا صاف کیا اور قدرے آگے کو جھکتا ہوا بولا۔ تم تو جانتے ہو رحمت اللہ، انھوں نے ساری حیاتی شریکوں کو جوتی کی نوک پر رکھا ہے۔ ان کا سر نیواں رکھنے کے لیے الیکشنوں میں حصہ لیا، اور یوں لیا کہ اگلوں کو گھروں سے باہر منہ نکالنے جوگا نہ چھوڑا۔ جی بھانویں ایسے کاموں کیلئے مرلے بھی بیچنے پڑے، رحمت اللہ کی آواز میں بیزاری اور کھلی ناخوشی کا اظہار تھا۔ او جھلیا، آنڈ گوانڈ میں عزت رکھنے کے لیے پارٹی بازی، مقدمے اور لڑائیوں شڑائیوں میں حصہ تو لینا پڑتا ہے، بھلا زمیندارہ کوئی اتنا آسان ہے۔ چھوڑیں بھائی جی، کیا رکھا ہے ایسے کاموں میں، یہ کون سی عقلمندی ہے کہ کھٹی کمائی مقدموں میں لگا دی جائے، ناحق بندے مروائے جائیں اور دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر لیا جائے۔ ایم اے اکنامکس میں ٹاپ کرنے والا چوہدری رحمت اللہ (جسے فارن بینک کی ملازمت محض اس لیے چھوڑ کر گاؤں واپس آنا پڑا تھا کہ اس کی ملازمت سے شریکوں میں باپ دادا کی ناک کٹنے کا خطرہ تھا) تلخی سے بولا۔ اوئیں اوئے رحمت اللہ، تو تو، چار جماعتیں پڑھ کر بالکل ہی زنانی بن گیا ہے۔ پانچ سال ہو گئے تجھے سمجھاتے کہ مرد بن مرد، دیکھ جثالی میں، چار دشمن بجے اور دس کھبے نہ ہوں تو بات نہیں بنتی۔ دیکھ یہی تو مزہ ہے، کسی کی مج نکال لی تو کسی کی رن، کسی کا جھگا بھن لیا تو کسی کے باز و لوتا دیے، اور پھر صلح صفائی کی گل بھی آگے کو تور لی۔ یہی سیانپ ہے، جسے لوگ سیاست کہتے ہیں۔ یاد رکھ تو چوہدری صوبے کا بیٹا ہے۔ وہ چوہدری صوبہ جسے ایک دفعہ گھر کی بیٹھک میں سونے پر، ایک شریک جھرانے ٹوک ماری تو وہ اس کے بعد ساری حیاتی گھر نہیں سویا۔ دارے کی بیٹھک میں ہی عمر گزار دی مگر زن مریدی کا مہانہ لیا۔ تو یہ کوئی اچھی بات تو نہیں تھی بھائی جی، ایم اے پاس کے دماغ میں بغاوت کا کوئی کیڑا شاید باقی بچ گیا تھا جو کبھی کبھی کلبلانے لگتا تھا۔ اماں بیچاری ساری عمر ان کی راہ ہی دیکھتی رہی، مجھے یاد ہے رات کو سوتے وقت چھت کی کڑیاں گننا شروع کرتی تو پھر صبح تک گنتی ہی چلی جاتی، ڈیوے کی لو کبھی مدھم اور کبھی تیز کر کے ساری رات دروازے کی کنڈیاں کھولتی اور بند کرتی رہتی، مگر اب ہورین...... ! ہاں یہ تو ہے، مگر تمہیں یاد ہو گا، کچھ تو اماں وہم کی مریض تھی اور رانج وی شوہدی دکھی روح تھی، او یار، یہ ساری زنانیاں اصل میں دکھی روحیں ہوتی ہیں، ان کی گل چھوڑ۔ پھر پہلو بدل کر بولا اوئے ہم کیا باتیں لے بیٹھے؟ گل یہ ہے کہ ڈاکٹروں نے تو اب ہوراں کا جھٹ پہر ہی بتایا ہے، ساہ تو گنے نہیں جا سکتے۔ مگر تین سال کی لمبی بیماری نے انہیں اندر سے کھوکھلا دیا ہے، اب ان میں کچھ بچا نہیں، ہمیں اپنی تیاری کر لینی چاہیے۔ کیسی تیاری بھائی جی؟ اوئے بھولیا، اتے ہوراں کی تور کی تیاری، اور کس کی؟ چوہدری صوبہ جتنا بڑا

تھا اتنی ہی بڑی اس کی پھوہڑی ہونی چاہئے۔ بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے، چوہدری رحمت اللہ کی آنکھوں میں بار بار نکی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ جس کی شادی، پچھلے تین برس سے اپنے ہوراں کی بیماری کے باعث ملتوی ہوتے ہوئے، اس ہاڑی میں ہونا طے پائی تھی، اور اب بیساکھ میں اپنے ہوریں، لگتا ہے، بے چاری کو پھر سال پڑ جائے گا۔ چوہدری رحمت اللہ نے تاسف سے سوچا۔ کیا بات ہے رحمت اللہ کن سوچوں میں پڑ گئے ہو۔ کچھ نہیں بھائی جی مجھے دراصل نکی کا خیال آ گیا تھا۔ او چھڈ یار، یہ بھی کوئی وقت ہے ایسے پُٹھے خیالوں کا، چوہدری اسد اللہ بیزار ہو گیا۔ او جیوندے جی، خوشی کے کاموں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے، ویسے بھی دھی دھیَن اور مج گاں کا کیا ہے، ایک کلے سے کھلی تو دوجے پہ بندھ گئی، ایک کلے سے دوسرے کلے تک کا یہ سفر، آج نہیں تو کل نکی بھی طے کر ہی لے گی، ابھی تم اس مسئلے پر کچھ مت سوچو۔

وہ ساری رات شمشاد نوں نے متوقع مہمانوں کی آمد کی تیاریوں، حویلی کے کونے کھدروں کی صفائی ستھرائی، برتن بھانڈے سنبھالنے اور کھیس، چادریں اکٹھا کر کے رکھنے میں گزار دی۔ اور نکی نے حویلی کے ویہڑے اور دروازے کے چکر کاٹنے اور بھائیوں کو بار بار اپنے ہوراں کو دیکھنے کا پیغام پہنچانے میں کاٹ دی۔ مگر اسے دارے میں جانے کی اجازت نہ ملی، اس اثناء میں دونوں بڑی بیٹیوں کو بھی چوہدری صوبے کی نازک حالت کی اطلاع کر دی گئی اور سحری ویلے وہ بھی روتی پیٹتی پہنچ گئیں۔ حویلی کے طول وعرض کی خاموشی میں ان کے آنے سے شور کا شگاف پڑ گیا۔ سرگوشیوں نے آوازوں اور آوازوں نے نالوں کی شکل اختیار کر لی۔ کُوتی دوپہر میں، چوہدری صوبے کی ایمبولینس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتی اور سینے پر دوہتڑ مارتی، کوٹ مہربان کی بیلی، پسینے کی ہواڑیں دیتی عورتوں کا غول، جن کی چابی، چوہدری اسد اللہ کی گھر کی نے بند کر دی تھی، اس وقت کسی نادیدہ ہاتھ نے ان کی آنسو بنانے اور نالے کرنے کی مشین ایک دم سے چالو کر دی اور پھر صبح کاذب کے وقت حویلی کا ویہڑہ تھا، اور لرزتی، گونجتی، سسکارتی آوازوں کا مینہہ تھا جو بنا کسی بندش مسلسل برس رہا تھا۔ نکی بہنوں کے کلیجے سے لگی تھی، اور بہنیں اسے سینے سے بھینچے، دارے میں بیٹھے بھائیوں کو آنسوؤں اور بینوں کے ذریعے بے نقط سنا رہی تھیں، جو زندگی کی آخری سانسیں گنتے باپ کو دارے میں رکھ کر ان کے صبر کا امتحان لے رہے تھے۔ نی کوئی ہے، جوان جیون جوگوں کو سمجھائے کہ ہمیں اپنے چوہدری سے ملنے دیں، بڑی نے کلیجے سے لگی نکی کے سر پر بڑی سی پچک کر کے بوسہ لیا، اور اندیکھے درد سے کراہتی ہوئی نجانے کس سے مخاطب ہوئی، نی شالا ایسے امتحان سے کوئی دھی نہ گزرے، باپ حیاتی اور موت کے درمیان پڑا ہو اور دھنیاں تتیاں ....، حویلی کے ویہڑے میں بین کی گرداڑی اور سسکیوں اور ہچکیوں کا غبار ہر سو پھیل گیا۔ جس میں وڈی، نکی اور منجھلی کی آوازیں ابھرنے اور ڈوبنے لگیں۔ شمشاد نوں نے نظریہ ضرورت کے تحت، اراں پراں رہنے کی پالیسی ترک کی اور لپک کر نکی کو وڈی کے کلاوے سے گھسیٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا، دو منٹ اونچا اونچا رونے کے بعد، بھیگی ہوئی آواز میں بولی، میں صدقے، میں قربان، اللہ بھانویں، تُو نہ رو، روئیں تیرے دشمن، میں ابھی تیرے بھائیے کو پیغام بھیجتی ہوں، دارے میں پردہ کروائیں یا پھر چاچے ہوراں کی منجھی گھر لے آئیں۔ شاباشے، جیوندی رہوے ساڈی چوہدرانی، غول میں سے بڈھی حیاتاں نے قدرے اوپر کو اچک کر، وڈی نوں کے فیصلے

پر سر دُھنتے ہوئے اسے خوشامدانہ داد دی۔ جس کا، خود پر ہر حالت میں، حیرت انگیز طور پر مکمل کنٹرول کی صلاحیت رکھنے والی وڈی نوں نے بظاہر کوئی اثر نہ لیا، اور بدستور اسی غم انگیز انداز میں، نکی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے نما نما روتی رہی۔ وڈی نوں کے مکر اور دکھاوے پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے نکی کسمسائی اور چادر کی بکل مارتے ہوئے، وہاں سے ہٹ کر منجھلی کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

دن ابھی کنی نکال رہا تھا، جب چوہدری صوبے کی تلیاں ملتے ہوئے بخشو نائی کے سیاہ کھردرے ہاتھوں نے اس کے سانسوں کے پرشور اخراج، سینے کے ہچکولے کھاتی کیفیت اور وجود سے اٹھتی تیز بخار کی حدت کو یکدم مدھم ہوتے محسوس کیا۔ روئی کے پھاہے سے پیشانی کا پسینہ صاف کرتے ہوئے، پھتا مراثی بھی لحہ بھر کو رکا، اور پھر خاموشی سے اٹھ کر بغل والے کمرے کی طرف بڑھا، جہاں دونوں بھائی کمر سیدھی کرنے کی غرض سے آدھی رات کے گئے ہوئے تھے، کویلے ویلے چوہدریوں کی آنکھ لگ گئی ہے۔ پھتے نے زور سے دروازہ بجاتے ہوئے سوچا۔

چوہدری کی "ٹور" کے وقت کمر سے ڈوپٹے باندھ کر، سوکھی اور ڈھلکی ہوئی چھاتیوں پر، سخت محنت کش ہاتھوں کے دوہتڑ بے دردی سے مارتی، کمی عورتوں کے ساتھ دور نزدیک کی چوہدرانیاں بھی بھاجی ڈالنے کے لیے کھڑی تھیں، ان کے ہاتھ سست روی سے سینوں پر حرکت کر رہے تھے۔ حال نی ساڈا چوہدری، حال نی ساڈا صوبہ، کمی عورتوں کا الاپ کورس کی شکل میں جاری تھا۔ نکی اپنے ہوراں کی منجھی کے پائے سے سر پٹخ رہی تھی۔ وڈی اور منجھلی تڑپ تڑپ کر نکی کو اپنے قریب گھسیٹ رہی تھیں اور آواز بلند ابے اور اماں کے اچھے وقتوں کو آواز دے رہی تھیں۔ شمشاد نوں پائنتی کی طرف بیٹھی، رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ جنازے کا وقت ہو رہا ہے، کڑیوں کے کہواب منجھی اٹھانے دیں، حویلی کے دروازے کے سامنے لگی بھیڑ میں سے سفید براق کپڑوں میں ملبوس برادری کے ایک ذمہ دار سے بزرگ نے دونوں بھائیوں سے کہا۔ رحمت اللہ اندر گیا تو اسے دیکھ کر، روتی ہوئی عورتوں کے پنڈال میں واویلے کی ایک نئی لہر جاگی، جس نے وہاں موجود ہر ذی نفس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رحمت اللہ بمشکل اس لہر کو کاٹتا میت کی چارپائی تک پہنچا، نیچے جھک کر اس نے چارپائی کو کندھا دیا، سارے شریک بھرا لپکے، اور انہوں نے کندھوں پر چارپائی کا بوجھ اٹھا لیا۔ نکی پچھاڑ کھا کر پیچھے کو گری، رحمت اللہ چارپائی کے ساتھ ہچکولے کھاتا ڈیوڑھی سے باہر نکلا، نکی کے خیال نے ایک دفعہ پھر اس کی آنکھوں سے دل تک کے راستے پر کانٹے بچھا دیئے تھے۔

نی چوہدرانیو، بڈھی حیاتاں نے عصر کے بعد ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے دونوں سوکھے ہوئے بازو اوپر لہرائے اور چلا کر بولی، سن لو، ساڈے چوہدری کے جنازے کی صفیں، جنازہ گاہ سے باہر، دو کلے زمین تک پھیلی ہوئی تھیں، نی اتنی خدائی تھی جس کا شمار مشکل ہے، میں ایک صدی کی ہونے والی ہوں، میں نے اپنی حیاتی میں اتنا بڑا جنازہ نہیں دیکھا، ساڈا چوہدری تو پاکستان کا صوبہ تھا، صوبہ، نی تتئیاں او، یہ کوئی چپ کر کے بیٹھنے کا ویلا ہے۔ تہاڈا ساہ کیوں سوکھ گیا ہے، جیب کیوں تالو سے لگ گئی ہے، نی صوبے کو روؤ، اپنے چوہدری کو روؤ، اتنا جتنا نہیں میں پانی ہے۔ یہ کہتے ہوئے، بڈھی حیاتاں نے جوشِ جذبات سے لرزتے ہوئے، اپنے سوکھے

ہوئے لکڑی بازو بمشکل ہلتے ہوئے سر پر جمائے، اور لرزتی ہوئی آواز میں بین کرنے لگی۔ اس کی دیکھا دیکھی، پسینے، پت اور جگ راتے سے ہف تف کے بیٹھی ہوئی دوسری کئی عورتیں بھی اٹھیں اور پھر بینوں کے شور نے دور تک فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

صوبہ وے، پاکستان دا صوبہ، ایموں مراثن کی پاٹ دار آواز کا انار چھوٹا، اور پھوہڑی کی رنگین دریوں، سرخ قالینوں اور چٹائیوں پر بیٹھی قل کے ختم کے خشک میوے، کٹا ہوا موسمی فروٹ تنجن کی گرما گرم پلیٹیں پکڑ کر، بڑی بڑی بُرکیاں تیزی سے منہ میں ڈالتی عورتیں، قدرے ست پڑیں، موڑھوں، گدیوں اور تکیوں پر پسر کر بیٹھی، ایک دوسری سے کان اور منہ جوڑے غیبتوں کے مینہہ برساتی، پُرسے کے لئے آنے والیاں لمحہ بھر کو ٹھٹکیں، انہوں نے منہ پر ٹوپرے کی میلی چادر کا پلا ڈال کر اونچی آواز میں بین کرتی ایموں کو دیکھا۔

نیں میں نا ہلیاں چڑھ گوکاں/صوبہ وے/ دھیاں شوہدیاں دی دلی لٹی

حال نی، وڈی کے گلے سے کوک نکلی اور اس نے بری طرح سے اپنی رانوں پر دوہتڑ مارتے ہوئے جھوم جھوم کر اونچی آواز میں بین کرتی ایموں کی طرف تڑپ کر دیکھا...... ایموں کے دلگداز بینوں نے، پھوہڑی پر گونجتی ساری آوازوں کو خاموش کرا دیا، قدرے پھیل کر بیٹھی عورتیں سنبھلیں، چارو ناچار انہوں نے چادریں درست کیں، گرما گرم باتوں کا سلسلہ موقوف کیا اور بددلی سے پلو آنکھوں پر رکھ لیے، ٹشو پیپروں اور رومالوں کی نزاکتوں سے بے پرواہی کا مظاہرہ، ناک کی شڑروں شڑروں سے شروع ہوا اور نتیجتاً لیس دار رطوبت نے دریوں قالینوں پر گلکاری شروع کر دی، جس پر مکھیاں آزادانہ بھنبھنانے لگیں، بھرپور گرمی، پسینے کی بساندھ، کھانے پینے کی اشیاء سے اٹھتی مخصوص قسم کی بوجھل مہک، جس نے دوسری مختلف ہواڑوں سے مل کر ماحول کو کثافت کے بدبودار غبار سے بھر دیا تھا، اس سے وہاں موجود بھی ذی نفس گو بری طرح متاثر ہو رہے تھے، مگر چوہدری صوبے کو روتی ایموں مراثن کی کھن کھن نکلتی، صاف ستھری آواز، الفاظ میں درد کی گہری آمیزش، ہچکیوں، سسکیوں اور آنسوؤں کی کمزوری سے مبرا لیکن سوز سے پوری طرح لتھڑے ہوئے بینوں نے ماحول کو مٹھی میں لے لیا۔

وے صوبہ، روندیاں پیاں گلیاں نے

دھیاں آ لیا

دھیاں نوں نند تے دلاسے آ لیا

ناں لائے سینے آ لیا

وڈی کراتی ہوئی سینے پر ہاتھ رکھ کر دہری ہو گئی اور منجھلی نے نڈھال نکی کو جھپٹ کر اپنے کلاوے میں لے لیا، جو بنا پتوار کی کشتی کی مانند، دکھ کے کھلے سمندروں میں اکیلی ڈول رہی تھی، ہائے نی، میری کلی رہ گئی نی، بھین صدقے، میں تیرا کیا بناؤں۔ رنگلی پیڑھی پر بیٹھ کر بل بل کر روتی شمشاد ڈوں نے آنکھوں سے پلو ہٹا کر، روتی ہوئی ایموں مراثن کو قہر بھری نظروں سے دیکھا اور با آواز بلند کراہتی ہوئی اٹھی، وکھی میں پیڑ اٹھی ہے، ہائے کوئی دوائی کھالوں......!

ایموں جیسی اس سارے علاقے میں اور کوئی نہیں بڑا سوہنا روتی ہے۔ اسی لیے تو دور دور سے لوگ پھوہڑیوں پر

اسے بلاتے ہیں، بینوں کا سیشن ختم ہوجانے پر باتوں کا آغاز ایموں کی ستائش سے ہوا۔ چوہدرانیوں، سیانے کہتے ہیں، کو بجا رونے سے اچھا ہے بندہ نہ روئے، اور میں کہتی ہوں، جے بندہ روئے تو انج روئے جیسے ایموں روتی ہے۔ پوپلے منہ میں حقے کی نے گھسیڑتے ہوئے بڈھی حیا تاں منمنائی۔ منہ سے ٹوپرے کی میلی چادر کا پلو ہٹا کر خشک آنکھوں کو زور زور سے ملتی، گردن اور چہرے پر دھاروں دھار بہتے پسینے کو چادر سے پونچھتی، تہمند کی ڈبیں، خواہ مخواہ کھول کر دوبارہ باندھتی، ایموں وہاں سے اٹھ کر شمشادنوں کے کمرے کی طرف بڑھی .....
نی تینوں کتے کھان، کمین ذاتے، کیا تجھے اس لیے رونے کے لیے بٹھایا تھا کہ تم دھنیوں کے قصیدے پڑھو، کیا دیتی ہیں وہ تمہیں، ذرا مجھے بھی تو پتہ چلے، حرام خورے، رعیت تم ہماری ہو، اور مالک ان پھاپھا کٹنیوں کو بنا رکھا ہے تم نے، جنہوں نے مرنے والے کو ہمیشہ پتروں سے دور رکھا۔ صرف اس واسطے کہ پیکے گھر ان کی بلے بلے ہوتی رہے، کھان پین بنا رہے، بھرا بھر جائی تو ساری عمر متی کے باوے بنے ہٹ ہٹ تماشہ دیکھتے رہے، نہ بولنے کا اذن ملا اور نہ کچھ کرنے کا اختیار نصیب ہوا۔ اب مجھے سمجھ نہیں آتی، بڈھے پیو کو اتنا رونے پیٹنے کی ضرورت کیا ہے۔ تین سال سے منجھی پر پڑا کون سا جی رہا تھا وہ، شکر کریں کہ نجات ہوئی۔ شمشادنوں نے اٹھارہ سالہ زہر کی جمع شدہ پوٹلی سے پہلی پچکاری یوں بھر کے پھینکی کہ آس پاس کی پوری فضا زہریلی ہوگئی۔
ایموں نے ٹوپرے کی میلی چادر کا گولہ سا بنا کر سر پر رکھتے ہوئے، بدلے ہوئے راج پاٹ کا نظارہ کھلی آنکھوں سے کیا اور اس کی موقع شناس حس نے لپک کر شمشاد کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ایموں گریبنی سے بڑی بھل ہو گئی، چوہدرانی جی، ایک بار معاف کر دیں، اس کتی جیب پر اس کے بعد اگر کڑیوں کا نام بھی آیا، تو جو مرضی آئے وہ سزا دے لیں، نی ست خصمیئے، ڈھول کی طرح دھنیاں دھنیاں کھڑکتے ہوئے تجھے چوہدری کی نوں نظر نہ آئی، جس نے ...ں سے بڑھ کر اس کی خدمت کی۔ جی آ، جی آ کرتے ہوئے پچھلے تین برس سے وہتے اور بخشو نائی کے سپرد، دارے کی بیٹھک میں مستقل رہنے والے مرحوم چوہدری صوبے کی شکل ایموں کی نظروں میں گھوم گئی۔ جن کی سٹھیں تم پڑھتی ہو، اللہ ان کے شر سے ہر ایک کو بچائے، توبہ توبہ، وڈی نوں نے نفرت سے کھڑکی کی جالی سے پھوہڑی پر بیٹھی نندوں کو دیکھا اور ایموں کی طرف پھر متوجہ ہوئی، نی سر سڑیئے، اور تو اور تجھے تو چوہدری کے منگے پوتے کا بھی خیال نہ آیا جس کے بغیر وہ ساہ بھی نہیں لیتا تھا۔ ماں صدقے جو ہوسٹل میں گھر آنے کے لیے کتنا بے چین ہے مگر بھیڑے امتحانوں نے مجبور کر رکھا ہے۔ گو شمشادنوں کے ماتھے کی تیوری، ایموں کی معافی اور اسے دل کھول کر لتاڑنے سے قدرے مدھم پڑ گئی تھی، مگر احتیاطی تدبیر کے طور پر کمی کو جتی کے نیچے دبا کر رکھنا ضروری تھا، جس کا جاہل ایموں کو بھی اندازہ تھا، اسی لیے اس نے پرھوں کی جوتی کے نیچے صدیوں سے مسلی اور کچلی ہوئی کمی کی ذات کو بڑے حوصلے سے اٹھا کر سر متھے پر رکھا اور چوہدرانی کو سلام کرتی کمرے سے باہر نکل گئی.....!
شکر ہے، اللہ نے آج کا دن عزت سے نپایا رحمت اللہ، میرے دل کو بڑا دھڑکا لگا ہوا تھا قل کے ختم اور کھانے میں اگر کوئی کسر رہ جاتی تو بڑی لہائی کی بات تھی۔ شریک تو منہ جوڑے بیٹھے تھے، انہوں نے کھانے پینے کی چیزیں اجاڑنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، پر میں نے بھی سوچ رکھا تھا، چاہے ایک کی جگہ دس لگ جائیں، کسی

کو گل کرنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ اور تم نے خلقت دیکھی، رحمت اللہ! جی بھائی جی، ذہنی غیر حاضری کی کسی کیفیت میں رحمت اللہ کے ہونٹ ہلے۔ لگتا تھا، آدھا پاکستان اٹھ کر کوٹ مہربان آ گیا ہو، کئی لوگوں کو تو میں جانتا بھی نہیں تھا۔ ابے ہوراں کے کتنی کتنی دور سانجھے تھے، یہ تو آج پتہ چلا۔ جی بھائی جی، رحمت اللہ پھر اسی کیفیت میں بولا جس پر اپنی دھن میں اسد اللہ نے غور نہ کیا۔ اب بس یہ دعا کرو، کہ ابے ہوراں کی جمعرات بھی اسی شان سے ہو جائے، جس طرح قل ہوا ہے۔ پھر دیکھنا، چوہدری صوبے کے بعد کھیڈ مک جانے کی بات کرنے والے شریکوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ مونچھوں کو بل دیتے ہوئے چوہدری اسد اللہ نے گم سم بیٹھے رحمت اللہ کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا، اور نکے ویر، (کبھی کبھی لہر میں آ کر وہ اسے اس طرح پکارتا تھا) شدت جذبات سے اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ اس کے بعد الیکشنوں کی تیاری ہے۔ قومی اسمبلی کی سیٹ سے نیچے گل نہیں بنتی۔ جی ہ..... ای...... ای...... گم سم بیٹھا رحمت اللہ اس بات پر کسی فوری اثر کے تحت اٹھ کر کھڑا ہو گیا، مگر بھائی جی نکی! اویار ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتی، تم وقت بے وقت نکی کو درمیان میں کیوں لے آتے ہو۔ اسد اللہ ایکدم سے بدمزہ ہو گیا۔ بھائی جی میں نہیں لے آتا، وہ ہمارے درمیان ہے اور ہماری ذمہ داری ہے۔ اوہ ذمہ داری ہے تو میں کوئی اس سے انکاری ہوں۔ اسد اللہ بھڑک اٹھا، مگر اتنا تو تمہیں بھی معلوم ہے، ہم مٹی پٹ کے روٹی کھانے والے لوگ ہیں، کوئی بزنس مین تو ہیں نہیں، اب خود ہی سوچو پچھلے تین سال تو ابے ہوراں کی بیماری میں گزر گئے، ہسپتالوں کے خرچے، دوائیاں اور آیا گیا، میں نے کس طرح نبھایا یہ میں ہی جانتا ہوں، اس کے بعد، اب ان کی پھوہڑی اور پھر الیکشن، ان تمام کاموں کے بعد ہم میں نکی کی شادی کی گنجائش کہاں ہو گی۔ مجھے تو لگتا ہے، اب سال دو سال کیلئے ہمیں یہ شادی ٹالنی پڑے گی۔ انج بھی یار ابھی وہ اتنی سی تو ہے، اور پھر ابے ہوراں کے صدمے سے سنبھلنے میں بھی تو وقت لے گی۔ بھائی جی شاید آپ بھول رہے ہیں، نکی اب اتنی سی نہیں، پورے چوبیس برس کی ہو گئی ہے، اگر مزید دو سال...... رحمت اللہ کے دل میں چھپی ہوئی پھانس زبان پر کانٹوں کی طرح اگ آئی۔ او خیر ہے رحمت اللہ، فضل ہمارے ماے کا پتر ہے، ہمیں نکی کی عمر کا طعنہ دینے نہیں آئے گا۔ طعنہ دینے تو نہیں آئے گا بھائی جی، مگر یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان دنوں وہ......، او یار، اسد اللہ کی مونچھوں کی نوکیں اپنے آپ اوپر اٹھ گئیں اور پھبتی کے انداز میں ہونٹ پھیل گئے، اب جٹوں کے پتر، مٹیوں میں بیٹھنے سے تو رہے، یاد رکھو کنجر کھڈانے سے زمیندار کی پگ نیویں نہیں ہوتی، اگر ایسا ہوا ہوتا تو ہمارے سارے وڈکے اس کام سے کوسوں دور رہتے، نکی کی شادی فضل سے ہی ہو گی اور اپنے وقت پر ہو گی، تمہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

حویلی کے ویہڑے میں آدھی رات کو صرف زرد روشنی والا ایک بلب اونگھتا تھا۔ پرانے پیڈسٹل فین زیادہ استعمال اور مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ہوا کم اور شور زیادہ بپا کرنے کے باوجود ویہڑے میں بچھی چارپائیوں کی بے ترتیب قطاروں کے سروں پر رکھے چل رہے تھے۔ ہوا کی بجائے بے ہنگم شور پیدا کرنے کے باوجود، پنکھا ہونے کی نفسیاتی آسودگی کے تحت، چارپائیوں پر زندگی، گرمی دانوں، مچھروں اور پسینے کے باوجود نیند میں گم تھی۔ مگر چوہدری اسد اللہ زندگی کی شطرنج پر اپنی مرضی کی بازی چلنے کیلئے جاگ رہا تھا۔ مہروں کی

ترتیب اور بازی جیتنے کی حکمت عملی تیار کرتے ہوئے بھڑکی ہوئی شمشاد کو سمجھاتے ہوئے اس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔ شمو یہ ویلا ہوش سے کام لینے کا ہے، جوش سے نہیں، یہ مت بھل کہ ابھی وڈے چوہدری کی زمین کی ونڈ نہیں ہوئی، اوجھلیئے، ہمیں اس ونڈ کو اپنی مرضی مطابق کرنے کیلئے جلد بازی میں ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی، جس کا ہمیں نقصان پہنچے، قانونی طور پر کڑیاں ابے ہوراں کی جائیداد کی حصہ دار ہیں، اس موقع پر اگر وہ اکڑ گئیں تو بڑی مشکل ہوگی اور مجھے ذرا کاغذ پتر سیدھے کر لینے دے، پھر دیکھتے ہیں، رنگی کے کتنے رنگ ہیں۔ رنگی کے کتنے رنگ ہیں، نکی نے مختلف سانسوں اور خراٹوں سے بوجھل فضا میں بمشکل سانس لیتے ہوئے کمرے کی واحد کھڑکی سے باہر جھانکا۔ دارے کی بیٹھک اور بیٹھک سے قبرستان تک، زمین کی تیز اور بے رحم گردش میں آسمان نے کتنے رنگ بدلے، موت، حیاتی اور وچھوڑے کا ویراگ سہتے سہتے جان کیسے کیسے سوختہ ہوئی، نہ اماں کو خبر ہے، نہ ابے ہوریں جانتے ہیں اور نہ ہی...... اس نے سینے سے اٹھتی درد کی تیز لہر کو دبا کر تھکی ہوئی سرخ آنکھوں سے، کرتل کی چارپائیوں پر بے سدھ سوئی بہنوں کی طرف دیکھا، یہ بھی گھر، بچوں اور خاوندوں کی دنیا میں لوٹ جائیں گی...... اور، ویلے یاد کریسن ڈھولے ٹر جاناں...... ''نکی بچو، ہیرے کی قدر صراف ہی جانیں۔ بے قدروں کے وس پڑا تو رُڑھ گیا، اماں کی آواز رات کی تنہائی اور تاریکی میں بہت دور سے آئی، مینوں پتہ ہے نکی، میرے بعد تیرے ابے ہوریں تیریاں نکلیاں نکھیاں سنیں گے اور اس کے بعد اماں نے ہوا میں مایوسی سے ہاتھ لہرائے، اور اس کی آواز نحیف سے نحیف تر ہوتی گئی۔ اس کے بعد نکی بچو، کوئی نہیں، اماں کا سرسوں رنگا چہرہ سفید اور لہجہ مدھم ہوگیا۔ اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیے اور کروٹ بدلتے ہوئے بمشکل بولی، ڈاہڈے اگے کیہہ زور...... ''اماں، اماں، نکی کو خوف، دکھ اور اداسی کا کانبا چڑھا اور وہ تڑپ کر اماں کے ساتھ چمٹ گئی۔ مجھے چھوڑ کر نہ جانا اماں، تجھے خدا کا واسطہ، میں تیری نکی دھی ہوں، مجھے تیرے بغیر رہنا نہیں آتا...... ''بچو، رہنا تو مجھے بھی نہیں آتا پر کیا کریں اماں کے خشک ہونٹوں کی تریڑیں پھوٹنے لگیں، اور وہ نڈھال ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی، پھر اماں کچھ نہ بولی، مرتے دم تک کچھ نہ بولی......'' موت اور حیاتی کے درمیانی فلسفے کی شکار، چوہدری صوبے کی نکی دھی نے وقت کے غلاف میں لپٹی کچھ مٹی مٹی یادیں کھرے بان کی چڑ چڑ کرتی چارپائی پر کروٹیں بدلتے ہوئے اپنے آس پاس سرسراتی محسوس کیں اور اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں، جاگنے سے سو جانے کی کوشش اچھی تھی، شاید نیند آ جائے۔

ایموں تے چوہدری صوبے کی پھوہڑی پر رونے کا ڈھنگ کیا بدلا، شمشاد نوں کے سارے گلے دور کر دیئے، دونوں بھائیوں کی مدح خوانی کرتے کرتے، شمشاد جیسی بہو دنیا میں ہر کسی کو ملے پر، بینوں کی تان توڑتے ہوئے وہ ہانپ جاتی، مگر اس کی زبان پر بھولے سے بھی چوہدری کی دختران کا ذکر نہ آتا، ویسے بھی ان کے ذکر کی بری تاثیر سے بچنے کے لیے اور انہیں قانونی طور پر وراثت کے خانوں سے صاف کرنے کی غرض سے، ان دنوں اسد اللہ، کھیوٹ، خسرے نمبر، انتقال اور پٹوار کی اصطلاحوں میں بری طرح غرق تھا۔ جمعرات سے پہلے کاغذ پتر سیدھے کر لینے کی غرض سے اس کے رات دن دارے کی بیٹھک کے بغلی کمرے میں گزر رہے تھے۔ جہاں پچھلے کاغذوں پر لکھی عبارتوں کو پڑھنے اور ان سے حسب مرضی نتائج اخذ کر کے رجسٹروں میں اندراج

کرنے والے تمام گھاگ اور شاطر دماغ جمع تھے۔ جن کی خاطر داری کو چوہدری اسد اللہ نے خصوصی انتظام کر رکھا تھا۔ اور یہ خصوصی انتظام کا ہی کمال تھا کہ انہوں نے وقتِ مقررہ سے ایک دن قبل تمام کام مکمل کرا لیا۔ اب صرف کاغذات پر مرحوم چوہدری کی دختران کے دستخط ہونا باقی تھے، اور اس کے بعد...... اسد اللہ کی آواز جوشِ جذبات سے پھٹنے لگی۔ نکمیا، واہی کا کام تم سنبھالنا اور تیرا وڈا ابھرا، سیاست کی سوجھ بوجھ لے گا، کوئی سیانپ کی باتیں سیکھے گا۔ بس ذرا الیکشن کا اعلان ہو جائے۔ الیکشن تو اپنے وقت پر ہوتے رہیں گے بھائی جی، فی الوقت اس کے علاوہ بھی کچھ ضروری معاملات ہیں، جن پر آپ سے بات کرنی ہے، رحمت اللہ کسی اور ہی کیفیت میں تھا۔ او یار، میں نے بڑی مشکل سے تو ضروری معاملات کو نمٹایا ہے، اب یہ کون سے نکل آئے ہیں اس ویلے، اسد اللہ کی بشاشت پر بیزاری کا تاثر غالب آنے لگا۔ بھائی جی، بات دراصل یہ ہے کہ کچھ گھریلو مسئلے، ہماری فوری توجہ مانگتے ہیں، ہمیں ان پر...... او نکمیا، کیا ہو گیا ہے تجھے، اسد اللہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی، ہزار دفعہ کہا ہے، چنگے موقعے پر موڈ کو غرق کرنے والی باتیں نہ کیا کرو، اور پھر ان گھریلو مسئلوں کو اتنی اہمیت دینے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ مگر تمہیں تو ہر وقت اماں بننے کی مصیبت پڑی ہوتی ہے، وہ بیچاری بھی ایسی ہی تھی، خوشی کے وقت بھی خوش نہ ہوتی تھی، غمگینی کے ساتھ کچھ زیادہ ہی جوڑ پیار تھا، خود بھی دکھی رہتی تھی اور دوسروں کو بھی خوامخواہ دکھی رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں اماں نہیں بن رہا بھائی جی، اور سارے معاملے خود بخود ٹھیک بھی نہیں ہوا کرتے۔ مثلاً یہ معاملہ، جس کا شاید آپ کو علم ہی نہیں کہ فضل نے علیا مزارعے کی لڑکی نکال لی ہے اور وہ ان دنوں مفرور ہے...... ہاہاہا...... اسد اللہ کا زوردار قہقہہ کمرے کی چھت سے ٹکرا کر دیواروں میں دیر تک گردش کرتا رہا۔ اچھا تو یہ وہ ضروری معاملہ تھا، جس کے لیے تم پریشان تھے، ہنسی کو بمشکل روکتے ہوئے اسد اللہ بولا۔ او بھولیا میں بے خبر نہیں ہوں، مجھے تمام چیزوں کا اچھی طرح علم ہے مگر بات یہ ہے کہ فضل علیا کی لڑکی نکالے یا ولیا کی، کسی کا جھگا بھن لے یا بندہ مار دے ہمیں کیا، یہ تو جوانی کے شغل ہیں، اب چوہدریوں کے پتر یہ بھی نہ کریں تو پھر کیا کریں، کنک کا زور فارغ بیٹھ کر تو نکلنے سے رہا۔ مگر زور نکالنے کا یہ طریقہ بھی تو ٹھیک نہیں، مجھے تو نکی کی فکر ہے، فضل کی حرکتیں...... رحمت اللہ کی دبی ہوئی آواز تشویش سے بھری ہوئی تھی۔ او نکی کی فکر چھوڑ رحمت اللہ، وڈی اور منجھلی کی فکر کر، اگر انہوں نے کاغذوں پر دستخط نہ کیے تو کیا ہو گا، یہ سوچ، چوہدری صوبے کی زمینوں کی ونڈ، میرے لیے تو زندگی موت کا مسئلہ ہے، مگر تم......؟ مگر میں، بھائی کے سامنے بیٹھے ہوئے رحمت اللہ پر انکشاف کی صدیاں بیت گئیں۔ مگر میں؟ اس نے گریبان کو ٹٹولا، ذہن کی زنبیل کو بار بار کھنگالا، پہلو پر توجہ کی نظر کی، وجود کے لوں لوں میں گردش کرتے سوال کو، روح کی تہوں میں اتارتے ہوئے، وہ قدرے حیران بھی تھا، اور پریشان بھی، خود کو اجنبیوں کی طرح دیکھنے کے اس عمل سے گزرتے ہوئے وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔

اگلے روز چوہدری صوبے کی جمعرات کے شاندار انتظامات کے باوجود اسد اللہ کے چہرے پر اطمینان نہیں تھا، اس بے اطمینانی کی وجہ شریکوں کے آپس میں جڑے ہوئے کان اور دبی دبی سرگوشیاں نہیں تھیں، نہ ہی اس کی وجہ رحمت اللہ کا بتائے بغیر شہر چلے جانا تھا، اس بے اطمینانی کی وجہ تو وہ دھچکا تھا، جو وڈی اور منجھلی کے علی الصبح چلے

جانے کی خبر سے اسے پہنچا تھا اور جس نے اسے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ حویلی میں پھوہڑی کی رسم اپنے اختتام پر تھی۔ سین میں شمشاد نون کا کردار سب سے زیادہ جاندار اور متحرک نظر آتا تھا۔ جس کے بائیں پہلو میں بیٹھی ہوئی نکی بمشکل دُور سے دیکھنے پر نقطے کی طرح نظر آتی تھی۔ رنگدار دری پر نویرے کی بدبودار چادر کا پلو مسلسل حرکت میں تھا، اور ایموں مراثن کی پاٹ دار آواز حویلی کے چار طرف نقارے کی طرح بج رہی تھی۔

صوبہ وے پاکستان دا صوبہ!!!

عرانچی سو گیا ہے

نصیر احمد ناصر ستر (۷۰) کی دہائی میں جدید نظم کے ایک تازہ فکر شاعر کی حیثیت میں نمایاں ہو چکے تھے۔ اُن دنوں ان کی نظمیں ''اوراق'' کے لیے آتیں تو میں اشاعت سے پہلے ان سے لطف اندوز ہوتا اور پھر وزیر آغا صاحب سے ان نظموں کی تازگی اور نئی ڈکشن پر بحث کرتا۔ اس وقت تک جدید نظم میں ن۔م۔راشد، میراجی، فیض، مجید امجد، اختر الایمان اور وزیر آغا کی ڈکشن اپنا سکہ رائج کر چکی تھی۔ لیکن نصیر احمد ناصر کو ایسے شعراء میں شمار کیا جاسکتا ہے جنھوں نے اپنا ڈکشن خود تراشا تھا اور وہ اپنے سینئر شعراء سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ ان کی نظموں میں مجھے یہ زاویہ منفرد نظر آیا کہ وہ افقی سفر میں ایف سولہ طیارے کی طرح متحرک ہوتے لیکن ان کی نظم کے مفاہیم عمودی سفر تیز رفتاری سے طے کرنے لگتے تھے۔ نصیر احمد ناصر کی نظموں کے انگریزی تراجم نے مغرب میں مقبولیت حاصل کی ہے۔ چنانچہ سانڈرا فاؤلر نے لکھا ہے کہ ان کے امیجز میں قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور یہ نہ صرف دائمی اقدار کی نمائندہ ہیں بلکہ ان میں روح بھی موجود ہے۔ زیرِ نظر نصیر احمد ناصر کی نئی کتاب ''عرانچی سو گیا ہے'' کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ کتاب کے آغاز میں نصیر احمد ناصر نے ایک بات بڑے پتے کی کہی ہے کہ ''آج کی اردو نظم تاریخِ ادب کی نو آبادی اور نقادوں کی قلمرو سے باہر نکل کر شعر و ادب کے گلوب میں خطِ آزادی تحریر کر رہی ہے۔'' اسی قول کے تناظر میں یہ کہنا مناسب ہے کہ ''عرانچی سو گیا ہے'' میں نصیر احمد ناصر نے اپنی تخلیقی آزادی کا اعلان نظموں میں کیا ہے تو ان کا روئے سخن کسی مخصوص خطے کے قاری کی طرف نہیں بلکہ وہ پوری دنیا کے آدم زادوں اور زمین نژادوں سے مخاطب ہیں اور اس منظر نامے کو ہمارے سامنے لا رہے ہیں جو بقول وزیر آغا کھڑکیوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ یہ خوبصورت کتاب پڑھنے میں مزا آتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے جو سوچ بیدار ہوتی ہے مجھے وہ زیادہ اہم نظر آتی ہے کیونکہ اس میں جدیدیت کے بیشتر زاویے موجود ہیں۔

(ڈاکٹر انور سدید، ''نوائے وقت'' لاہور، ۱۲ مئی ۲۰۰۲ سے مقتبس)

محمد الیاس

چوہدری

بعض لوگ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ اس ناکردہ گناہ پر نادم سے ہوئے رہتے ہیں۔ ایلزبتھ کا گھرانا بھی جرم غریبی پر شرمندہ شرمندہ رہا کرتا۔ گویا کسی پہلے جنم وہ چھوٹی سی ریاست کے حاکم ہوا کرتے تھے لیکن موجودہ زندگی میں لوگوں کی نجاستیں دھو کر دو وقت کی روٹی کمانے پر مجبور ہو گئے ہوں۔ ایلزبتھ کی ماں قصبے کے کئی گھروں میں یہ کام کرتی تھی۔ قصبہ بھی ایسا جسے سکندر اعظم نے پہلی جھونک میں تباہ تو کر دیا لیکن دم واپسی اسے از سر نو تعمیر کرنے کے بارے میں نہ سوچا اور یہ دوبارہ آباد ہوا تو بڑا بے ترتیب اور ٹیڑھا میڑھا۔ شاید اسی فاتح کا کوئی افسر یہاں بس گیا تھا، جس کی آخری اولاد ایلزبتھ تھی۔

دنیا میں ہر آنے والا بچہ اپنے والدین کے حضور نئی طرح کے سپنوں کا گلدستہ پیش کرتا ہے۔ شاید اسی لیے بیٹی نے جنم لیا تو خداوند کا نام لے کر اسے ایک بہت بڑے ملک کی ملکہ سے موسوم کر دیا۔ بچی ذرا بڑی ہوئی تو دل کے نہاں خانوں میں کروٹیں لیتے سہانے خواب کی تعبیر پانے کی نیت سے اسے سکول میں داخلہ دلا دیا تاکہ پڑھ لکھ کر کسی بہت بڑے ملک کی نہ سہی، چھوٹی سی ریاست کی ملکہ ہی بن جائے۔

اللہ بادشاہ بھی سخی اور بے پرواہ ہے۔ جب نوازنے پر آتا ہے تو دریا بہا دیتا ہے۔ ایلزبتھ کو ایسا حسن عطا کر دیا کہ قصبے میں فتنہ بپا ہو گیا۔ ایک نظر دیکھنے سے یوں گمان گزرتا کہ کوئی یونانی شہزادی قتل ہو جانے کے خوف سے بیابانوں میں بھٹکتی رہی اور روپوشی کے عرصہ میں ذرا سنولا گئی ہو۔ لیکن جان بچانے کے لیے اب مفلسی کا بھیس بدل کر قصبے کے مضافات میں چوہدریوں کی زمینوں پر ایک کچے کوٹھے میں مقیم ہو گئی ہو۔ ہر قصبے کے مضافات میں زمینیں چوہدریوں، ملکوں اور خانوں کی ملکیت ہوتی ہیں۔ ایسے ہی چوہدریوں کے ایک گھرانے کا بیٹا سمیع اللہ آٹھویں جماعت تک ایلزبتھ کے ساتھ پڑھا تھا۔

سمیع اللہ ذات کا سیال تھا اور عرف عام میں سمی کہلاتا۔ اس کے ڈیرے پر محفلیں جما کرتیں۔ بانسری کی مدھر تانیں سنائی دیا کرتیں۔ تفسیر یوسف، سیف الملوک اور ہیر وارث شاہ بڑے اہتمام سے گائی جایا کرتی۔ سمی چوہدری کے من کی دنیا میں افق تا افق رومان پرور ہوا اٹھکیلیاں کیا کرتی۔ شاید یہ صوفی شعراء کے کلام کا فیض تھا کہ سمی کے مزاج کو عاشقانہ رنگ میں تو پوری طرح رنگ دیا لیکن کسی آلائش سے داغدار نہیں ہونے دیا۔

جن معاشروں کے پاس کوئی حقیقی وجہ افتخار نہ رہے، ان کے افراد اپنی بے مقصد زندگیوں کو معنویت سے سرفراز کرنے کے لیے کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی بجائے عصبیتوں کے بلند و بالا اور تاریک قلعے تعمیر کرتے ہیں اور از خود ان میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان قلعوں میں لسانی، نسلی اور مذہبی نفرتوں کے عفریت پروان چڑھنے لگتے ہیں۔ ہر قلعہ بند گروہ غضب ناک غنیم کی طرح مخالف پر عصبیت کے زہر میں بجھے

تیروں کی بارش کرتا ہے۔ ایسی بستیوں کے مکین روحانی طور پر مرجاتے ہیں اور اُن قبرستانوں کا منظر پیش کرتے ہیں جن کی مسمار قبروں کے تابوتوں میں سے خون آشام ڈریکولے بیدار ہوتے ہیں اور محبتوں کی رگ رگ سے لہو نچوڑ کر پی لیتے ہیں۔ انجام کاران مردہ بستیوں میں انسانی عظمت کے بچے کھچے نشان بھی منہدم ہوجاتے ہیں اور کوئی پورس بھی زندہ نہیں بچتا کہ جسے باہر کی کسی مقدونیہ سے آیا ہوا فاتح صرف ایک جملے پر خوش ہوکر چھینی ہوئی متاع بھیک میں لوٹا دے۔

تعصب کی آگ میں خوش نما جذبوں کے سبزہ زار اور گل وگلزار جُھلس جایا کرتے ہیں اور نفرتوں کے موسم میں حسد اور بُغض کی بدنما فصل ہی اُگتی ہے۔ سمی کے گھر والوں کے پاس سوائے چوہدراہٹ کے کچھ باقی نہیں بچا تھا اور چوہدراہٹ بھی ڈیرے تک سمٹ کر رہ گئی۔ سب کچھ دشمنیوں کی نذر ہو چکا تو ان کے لیے سر اٹھا کر چلنا محال ہو گیا اور ایک وہ لمحہ بھی آیا کہ کسی ساہوکار نے اعلیٰ حسب نسب کو گروی رکھنے کی حامی نہ بھری۔ سمی نے کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور رزق کی تلاش میں اپنے ہی وطن میں پردیسی ہو گیا۔

ایلزبتھ کے پاس عہد و پیمان کے علاوہ کچھ نشانیاں بھی بچی رہ گئی تھیں، جن میں سے محبوب کے پھونکے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے، سر کے بال اور تراشے ہوئے ناخن زیادہ اہم تھے۔ وہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ ہم دم زمین کے کسی ٹکڑے پر قدم جمالے تو اسے اپنے پاس بلالے گا۔ وہ میٹرک پاس کر چکی تھی لیکن کوئی شہزادہ اس کے والدین کے حضور عرضداشت پیش کرنے حاضر نہ ہوا تو کٹیا میں جلتا آرزوؤں کا چراغ بجھنے لگا۔ تاہم الزبتھ کے دل کی مقدونیہ ابھی آباد تھی اور اسے یقین تھا کہ اس سُونے شہر کی گلیوں کو سکندر اپنے دم قدم سے آباد کرے گا تو ہر سُو جشن کا سا سماں ہوگا اور آسمانوں میں بھی چراغاں ہو جائے گا۔

رزق کی تلاش سمی کو ایسے مقام پر لے آئی جہاں ایک غیر ملکی کمپنی زیرِ زمین تیل کے خزانے کھوجنے کے لیے Drilling کر رہی تھی۔ سائٹ پر موجود سب سے اہم شخصیت مسٹر فُروشا کی تھی جو رِگ (Rig) انجینئر تھا۔ سبز آنکھوں والا اَن تھک اور انتہائی مضبوط جسم والا تیس بتیس سالہ خوش باش امریکن۔ وہ اکثر مسکراتا ہوا دکھائی دیتا۔ پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتا۔ سمی حیرت زدہ تھا کہ مسٹر فُروشا صرف چھ گھنٹے میں جتنا معاوضہ لیتا ہے، اتنا تو یہاں کا ڈپٹی کمشنر ضلع بھر کی حکمرانی کر کے مہینے بعد بھی سرکاری خزانے سے وصول نہیں کر سکتا۔ اسلام آباد میں کمپنی نے ہیڈ آفس کے قریب مسٹر فُروشا کو محل نما کوٹھی لے کر دے رکھی تھی اور سفر کے لیے ہیلی کاپٹر ملا ہوا تھا۔ سائٹ پر بھی دیگر تعمیرات کے علاوہ اس کے لیے رہائش گاہ تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ میٹنگ کے سلسلے میں ہیڈ آفس ہیلی کاپٹر سے جاتا تو جلد ہی واپس لوٹ آتا۔ وہ جینز پہنے ہاتھوں سے سر کو سہارا دیئے کھلے آسمان تلے ریت پر لیٹ جایا کرتا۔

مسٹر فُروشا کو اردو اور مقامی زبان کے الفاظ بولنے اور سمجھنے کا بہت شوق تھا۔ سمی کا انٹرویو کرتے ہوئے اس نے اس کے نام کے لاحقہ ''چوہدری'' میں زیادہ دلچسپی لی۔ سمی نے وضاحت کی کہ وہ ایک باعزت لینڈ لارڈ فیملی کا چشم و چراغ ہے اور ''چوہدری'' اس کا خاندانی ٹائیٹل ہے۔ گو زمینیں باقی نہیں رہیں لیکن ٹائیٹل بدستور قائم و دائم ہے۔ مسٹر فُروشا نے ایک بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ اُس کا والد بھی امریکہ میں بہت

بڑے فارم کا مالک ہے لہٰذا وہ بھی اس حوالے سے چوہدری ہوا۔ ''فروشا چودری۔ We both are Chodaries.

ڈرلنگ سائیٹ پر زندگی ابھی خیموں میں بسر ہو رہی تھی۔ مسٹر فروشا صبح اُٹھ کر نیکر پہنے، بیلچہ کندھے پر رکھے سیٹیاں بجاتا ہوا دور نکل جاتا۔ وہ عجب شخص تھا۔ ممی سوچتا کہ اس سرزمین پر آباد کروڑوں لوگوں میں سے کسی نے ایسا تکلف کرنے کا کبھی سوچا بھی نہ ہوگا، جس قدر مسٹر فروشا تردد کیا کرتا۔ وہ خیمہ بستی سے دور نکل جاتا۔ بیلچے سے زمین میں چھوٹا سا گڑھا کھودتا اور بطور سنڈاس استعمال کرنے کے بعد مٹی سے پاٹ دیا کرتا۔ ممی کو بھی اُس نے ہدایات دے رکھی تھیں کہ جرمن شیفرڈ جوڑا تقریباً نصف کلومیٹر کی دوری مکمل کر لے تو فوراً ایک ڈیڑھ فٹ گہرے دو الگ الگ گڑھے کھودے۔ ممی جوں ہی بیلچہ چلا کر پیچھے ہٹتا تو جرمن شیفرڈ جوڑا اپنے مالک کی تقلید کرتے ہوئے فراغت پالیتا۔ بعد میں ممی یہ گڑھے مٹی سے پاٹ دیتا۔

ممی کی برادری میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چوہدریوں کا بیٹا کسی گورے کی نجی خدمات پر مامور ہے جس میں اس کا اولین فرض جرمن شیفرڈ جوڑے کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ دور دراز شہروں کی خاک چھان کر کہیں کلرکی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ یہاں اسے کمپنی کی طرف سے جتنی تنخواہ مل رہی تھی وہ چار سرکاری کلرکوں کی مجموعی ماہانہ آمدنی سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ اسی لیے اس نے سب باتیں تو گھر میں نہیں بتا رکھی تھیں لیکن ماں کو اس قدر آگاہی ضرور تھی کہ بیٹا کوئی ایسا کام نہیں کر رہا جو چوہدریوں کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ تاہم یہ امر اطمینان بخش تھا کہ بیٹے کے کام کی نوعیت جیسی بھی ہے وہ برادری اور قصبے والوں کے علم میں نہیں اور اگر چوہدراہٹ کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لگی روزی کو لات ماردی جائے تو نوبت کشکول پکڑنے تک پہنچ سکتی ہے۔

ادھر ایلزبتھ تصور کیے بیٹھی تھی کہ اُن موسموں کی مہک ہر سُو رچ بس گئی ہے جس میں وعدے ایفا ہوا کرتے ہیں۔ عشق اور مُشک چُھپا نہیں کرتی۔ ماں نے بیٹے کو نصیحت کی کہ پگڈنڈی کی راہ ترک کرنے سے دامن جھاڑ جھنکاڑ میں اُلجھ کر تار تار ہو سکتا ہے اور حشرات الارض سے گزند نہ بھی پہنچے تو پاؤں کیچڑ میں پڑنے کا احتمال رہتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پاؤں دھو کر لباس بدل لینا اور تب بستی کی گلیوں کا رخ کرنا۔ ممی نے موقع غنیمت جان کر دل کا مقدمہ ممتا کی عدالت میں پیش کر دیا لیکن ابتدائی سماعت پر ہی خارج کر دیا گیا۔ اعلیٰ نسب اور مذہب کی دفعات لاگو ہوئیں اور آئندہ محتاط رہنے کے لیے سخت تنبیہ کر دی گئی۔ حالانکہ مسلمان ہونے میں اس گھرانے کو کوئی خاص تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جب یہ پیدا ہوئے تو کان میں آذان دے دی گئی اور مرنے والوں کی نمازِ جنازہ ادا کر دی جاتی۔ اس کے علاوہ کچھ رسومات بصورت عید شب برات منائی جاتی تھیں۔ تاہم جب مفاد پر زد پڑتی تو اسلام کو ڈھال کے طور پر ضرور استعمال میں لایا جاتا۔ بیٹا تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے نظرِ ثانی کے لیے اپیل داخل کر دی اور اسلامی اصولوں کے تحت اپنے مقدمے کی پیروی کی۔ جب یہ ثابت کر دیا کہ مسلم گھرانے میں اہلِ کتاب کی آمد پر کوئی قدغن نہیں تو مقدمہ اس دلیل پر خارج ہو گیا کہ اسلام اگر مانع نہیں تو خاندانی وقار اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ''چوہڑی'' ایک چوہدرانی کی بہو بنے۔

دراصل فاضل عدالت نے نسلی عصبیت پر مبنی جو فیصلہ صادر فرمایا تھا، اس کے پسِ پردہ کچھ اور عزائم تھے۔ جوان بیٹے کی صورت میں بہت سے خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کی تدبیر بن رہی تھی۔ عہدِ رفتہ کی عظمت لوٹنے کے امکانات تھے۔ ڈیرے کی حدود سے کچھ آگے تک چوہدراہٹ وسعت پذیر ہو سکتی تھی۔ گویا شاہی قلعے میں مقید قلم رو آزاد ہونے کے آثار نمایاں تھے۔

ایلزبتھ کے دل میں ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی صورت محبت کا بھرم رہ جائے۔ اس نے تو سمی سے ایسے دور میں بھی کبھی ترکِ محبت کا نہ سوچا جب وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح بے رحم ہواؤں کے تھپیڑوں کی زد پہ تھا۔ جذبے توانا ہوں تو فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ شام گہری ہونے کو تھی کہ ایلزبتھ تقریباً دو سو میل کی مسافت طے کر کے ڈرلنگ سائیٹ سے قریبی بستی ''ڈھوک سیال'' کے سٹاپ پر لاری سے اتری تو ارد گرد نگاہ دوڑا کر کچھ سوچتی رہی۔ تب ایک فیصلے پر پہنچ گئی اور مسجد کے پہلو میں مولوی رب نواز سیالوی کے گھر میں داخل ہو گئی۔ اہلِ خانہ گھر آئی مہمان کی آؤ بھگت سے فارغ ہو چکے تو ایلزبتھ نے بلا جھجک کہا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے اور بالغ بھی۔ اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنے کا عزم رکھتی ہے۔

اگلے روز نمازِ جمعہ کے بعد مولوی صاحب نے بستی کی بہت سی خواتین اور بزرگوں کی موجودگی میں ایلزبتھ کو چادر اوڑھائی، کلمے پڑھائے، سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے اپنی بیٹی قرار دیا اور اتفاق رائے سے کنیز فاطمہ نام رکھا۔ اردگرد کی بستیوں سے خواتین کئی روز تک طرح طرح کے تحائف کے ساتھ کنیز فاطمہ سے ملنے آتی رہیں۔ سائیٹ پر بھی یہ خبر پہلے ہی روز ہر ملکی اور غیر ملکی فرد تک پہنچ چکی تھی۔ سمی کی ہستی اندر سے تہ و بالا ہو گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماضی کی ایلزبتھ جو کم سنی سے ہی اس کی چاہت رہی تھی اور نوجوانی میں محبت بن کر دل میں سمائی رہی، اپنے عشق میں اس قدر ثابت قدم رہے گی۔ اپنا سب کچھ نچھاور کر دے گی اور ماضی پر خطِ تنسیخ کھینچ کر عشق کا نیا عہد نامہ تحریر کرے گی۔

سمی اور کنیز فاطمہ کا نکاح ہوا تو کمپنی کے بیشتر ملازمین نے نو بیاہتا جوڑے کو خوب تحائف دیئے۔ مسٹر فُروشا نے حسبِ عادت زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لفافہ سمی کو تھمایا اور کہا ''فرام چودری فُروشا ٹو چودری سامی اللہ، دی ہز بینڈ آف این ایلی گینٹ لیڈی''۔

دو ماہ بعد سمی کو ماں کا خط ملا، جس کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔ ''اس خط کو تار سمجھو، بیٹھے ہوئے ہو تو اٹھ کھڑے ہو اور کھڑے ہو تو چل پڑو۔ اُڑ کر گھر پہنچو۔ اگر دیر کر دو تو میرا مرا ہوا منہ دیکھو''۔ کنیز فاطمہ نے سمی کو رخصت کرتے ہوئے اتنا کہا کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی سنتے آئے ہیں کہ جٹ چوہدری سے بڑا راٹھ کوئی نہیں ہوتا۔ قول دے کر نبھانا جانتا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اصل اور نقل کیا ہے۔ کون کتنا سچا ہے۔ پیٹھ کون دکھاتا ہے۔

سمی گھر پہنچا تو کہرام مچ گیا۔ ماں اور بہنوں نے باقاعدہ سینہ کوبی کرتے ہوئے بین کیے کہ وہ لٹ گئے۔ پہلے تقدیر نے ٹھوکریں ماریں اور اب بیٹا ذلت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے۔ سارے خواب چکنا چور کر ڈالے۔ چوہدری خانوادے کی ناک کاٹ ڈالی۔ کمی کمینوں سے بھی بدتر گھرانے کی لڑکی کو بہو بنا دیا۔ سمی

نے دہائی دی کہ اُس نے عورت ہوتے ہوئے بھی لاج نبھائی اور میں مرد ہو کر پیچھے ہٹوں، کیا یہی مردانگی ہے؟ اور پھر جس پیشے کی بنا پر اتنی نفرت...... وہی کام اب قدرت ان کے راتھ بیٹے سے کروا رہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں انسانوں کی بجائے اپنے امریکی آقا کے کتوں کا فضلہ ٹھکانے لگاتا ہوں اور کنیز فاطمہ کی ماں بھی روزی کمانے کے لیے ایسا ہی کرتی رہی۔

چوہدرانی تضحیک برداشت نہ کر سکی۔ گو وہ بیٹے کے کام کی نوعیت کو کچھ نہ کچھ سمجھتی تھی لیکن اس ذلت اور دکھ کو سربستہ راز کی طرح سینے میں چھپائے رکھنا چاہتی تھی۔ واشگاف الفاظ میں تلخ حقیقت سنی تو وحشت اچھلنے لگی۔ آناً فاناً مٹی کا تیل اپنے اوپر انڈیل لیا اور دونوں جوان بیٹیوں کو بھی تر کر ڈالا۔ ماچس کی تیلی جلانے لگی تو بیٹے نے آگے بڑھ کر باہوں میں جکڑ لیا۔

نہ جانے اس مٹی میں کیا تاثیر ہے کہ اس کے بیٹے کسی اور سے ایفائے عہد کریں یا نہ کریں، ماؤں سے بے وفائی نہیں کرتے۔ تریاہٹ پر بھی قربان ہو جاتے ہیں۔ چوہدری سمیع اللہ تو ڈھوک سیال کبھی نہ گیا لیکن مولوی صاحب کو باقاعدہ رجسٹریاں وصول ہوتی گئیں اور کنیز فاطمہ کو قانونی طریقے سے طلاق ہو گئی۔ ممی ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ بجھے ہوئے چراغ کی مانند اس میں کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ مفلوج ذہن اور بدن کے ساتھ گھر پڑا رہتا۔ پانچ چھ ماہ کا عرصہ اسی طرح بیت گیا۔ گھر میں کچھ نہیں بچا تھا جسے بیچ کر گزر بسر کی جا سکتی۔ صدقہ خیرات کے لیے ہاتھ نہیں اٹھتا تھا۔ تاہم فاقہ کشی کا مرحلہ آ جاتا تب در پردہ کہیں سے کوئی مدد پہنچتی۔

بعض روحیں اپنی ذات میں بڑی سچی اور کھری ہوتی ہیں۔ عشق کے اپنے ہزار رنگ ہیں۔ یہ تہہ در تہہ کھلتا چلا جاتا ہے تو نئے نئے در وا ہونے لگتے ہیں۔ کنیز فاطمہ پر ممی کی جانب کھلنے والا ایک روزن کیا بند ہوا، بہت سی چاہتوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ وہ عشق کی اگلی منزلوں کی جانب گامزن رہی۔ اس کی ہستی کی ہر پرت میں پختگی سما گئی۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ذرا نہیں لڑکھڑائی۔ ہر آنے والے لمحے میں اپنے روحانی والدین اور بہن بھائیوں سے محبت سوا ہوتی گئی۔ تصوف کے بڑے گہرے راز منکشف ہوئے تو دل کو قرار آ گیا اور نہاں خانے میں ہر سُو ہوائے بسیط چلنے لگی۔ مولوی صاحب نے اس کے اصل والدین سے رابطہ رکھا اور بیٹی سے اس انداز میں ملاقات کروائی کہ سارے گلے شکوے آنسوؤں کے پہلے ہی ریلے میں بہہ گئے تو دل آئینے کے طرح شفاف ہو گئے۔

مسٹر فروشا کو جس طرح سے ذہن نشین کرایا گیا، وہ ان ہدایات کی روشنی میں دو مقامی ساتھیوں کے ہمراہ عین روایت کے مطابق مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور فطری خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اُسے فرزندی میں قبول کیا جائے۔ اُسے یہ علم ہو چکا تھا کہ ماضی کی ایلزبتھ عشق کے جس سفر پر گامزن ہے، کسی اگلی منزل پر پڑاؤ تو کر سکتی ہے، واپس لوٹ آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن کیا خبر؟ امریکہ میں بھی کہیں کوئی تخت ہزارہ ہو، جہاں کا رانجھا محض بانسری پر سُر الاپنے کی بجائے برگ انجینئر کا روپ اپنا کر ڈھوک سیال آن پہنچا ہو اور گرو بال ناتھ کا چیلا بننے پر مولوی رب نواز کے روبرو اسلام قبول کرنے کو ترجیح دی ہو۔

شمع خالد

صورت گر

صبح کا اخبار سامنے رکھے شاہد بے حد مسرور تھا۔ تمام اخبارات میں اس کی شخصیت اور فن کے چرچے تھے۔ اس کی پینٹنگز کو ایسا شاہکار تسلیم کیا گیا تھا جو ملک، قوم اور ثقافت کا گراں قدر سرمایہ تھیں۔ تنقید نگاروں نے اس کے بارے میں مختلف پہلوؤں پر مضمون لکھے تھے۔ ایک مضمون میں اسے آج کا ''پکاسو'' قرار دیا گیا تھا۔ یہ خطاب دینے والا کوئی معمولی انسان نہ تھا۔ وہ ایسا ناقد تھا جسے رنگوں کی دنیا میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ اس کا کہا خطاب بن جایا کرتا تھا۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتا ہے۔

''کائنات سات رنگوں کا پرتو ہے۔ اور ان دھنک رنگوں نے دنیا کو اپنے اندر مقید کر لیا ہے۔ جس نے رنگوں کی زبان سمجھ لی۔ ان کے اندر چھپے جذبات کو پہچان لیا۔ وہی مصور ہے کہ یہ رنگ اظہار چاہتے ہیں۔ وہ شخص ان رنگوں میں ڈوب گیا۔ انھیں پہچان کر برتنا سیکھ گیا۔ وہ رابرٹ ہنری، ولیم ڈین سے بھی اوپر کا درجہ رکھتا ہے۔ اور میں شاہد کو پوری فنی سچائی کے ساتھ پکاسو کا ہم پلہ سمجھتا ہوں۔''

دوسرے تنقید نگار نے لکھا تھا کہ رنگوں کی زبان اللہ کی زبان ہے۔ کائنات کے بھید آشکار کرنے کے لئے قدرت نے رنگوں کو ہی چنا ہے۔ چرند پرند، زمین آسمان، پھول پودے، حشرات اور جانور اور خود انسان ...... جس چیز کو اٹھا کر دیکھیے زبان سے اللہ ''المصور'' ہی نکلتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز میں اللہ نے رنگوں کا حسین امتزاج یوں نمایاں کیا ہے۔ کہ دیکھنے والی آنکھ سراہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پھول کی ننھی سی پنکھڑی ہو۔ یا تتلی کا پَر یا ناچتے مور کا پنکھ۔ پھن پھیلائے سانپ کی کینچلی ہر جگہ بکھرے رنگ صناعی قدرت کا نمونہ ہیں۔ جب کوئی انسان ان رنگوں کو جان کر، پہچان کر برتتا ہے۔ تو وہ اللہ کا نائب، اللہ کا ولی بن جاتا ہے۔ وہ ان رنگوں کے ذریعہ قدرت سے ہم کلام ہونے کا فن جان جاتا ہے۔ اور میں شاہد کو مبارک باد دیتا ہوں کہ وہ اس الکھ نگری میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

شاہد اپنے بارے میں اتنا کچھ پڑھ کر جھوم اٹھا۔ یہ نہیں کہ اسے آج سے پہلے سراہا نہیں گیا تھا۔ مہینے میں ایک آدھ انٹرویو ایک آدھ تبصرہ چھپتا ہی رہتا تھا۔ پر آج چھپنے والے تمام مضامین، تمام تبصرے اس کی زندگی کے لئے ایک اہم موڑ، ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس نے فن کی دنیا میں جب قدم رکھا تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ یہ سب کیوں اور کس لئے کر رہا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ اپنے سکول کی مصوری کی کلاس میں کاپی میں جانوروں، پودوں، کارٹون میں پنسل سے رنگ بھر کر ٹیچر کے پاس لے کر جاتا۔ تو ٹیچر اس سے پوچھتی یہ رنگ تم نے خود بھرے ہیں یا کسی نے بھر کر دیئے ہیں۔ جب وہ اپنی معصوم گول گول، آنکھیں گھما کر کہتا نو میڈم مَیں نے خود رنگ بھرے ہیں۔ تو کبھی کبھار میڈم کہتی اچھا تو میرے سامنے رنگ بھر کر دکھاؤ۔ جب وہ رنگ بھر کر دکھاتا تو میڈم اس کے موٹے ہاتھوں کو پکڑ کر دیکھتی رہتی اور کبھی اس کے موٹے موٹے پھولے

گالوں پر سٹار بناتے ہوئے کہتی تم آرٹسٹ بنو گے۔

گھر جا کر وہ کبھی میڈم کا بنایا ہوا سٹار اور کبھی گال پہ بکھری لپ اسٹک کا رنگ لیے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا اور ماں سے پوچھتا اماں یہ آرٹسٹ کیسے ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی چہرے پر بکھرے رنگوں پہ غور کرنے کی کوشش کرتا۔

سکول کے ہوم ورک کے بعد وہ ذہن میں بکھرے رنگوں کو قابو کرنے کے لئے کاغذ پر اتارتا رہتا۔ گھر میں اس کی بنائی ہر لکیر کو سراہا جاتا۔ ماں اس کے بنے ہوئے ہر کاغذ کو کبھی فریم کروا کے اور کبھی ٹیپ کے ساتھ اس کے کمرے میں چسپاں کرتی رہتی۔ گھر میں آنے والے مہمان سے اس کا تعارف بعد میں کروایا جاتا، اس کی بنائی تصاویر پہلے پیش کی جاتیں۔ ماں ہر مہینے گھر کے سودے کے ساتھ اس کے لئے رنگ کاغذ اور ایزل ضرور خرید کر لاتی۔ باپ دنیا بھر سے اس کے لئے پینٹنگ کے حوالے سے چھپنے والا مواد اکٹھا کرتا رہتا۔

ماں اور باپ بڑے فخر سے اپنے مصور بیٹے کا تعارف کرواتے۔ پہلا انٹرویو ماں کی کوششوں سے ہی چھپا تھا۔ بچوں کے پروگرام سے ٹی وی اور ریڈیو پر اسے ننھا مصور کہہ کر متعارف کروایا جاتا۔ یوں وہ سکول میں تعلیم کے ساتھ ساتھ رنگوں میں ڈوبتا گیا۔ دادا دادی اکثر کہتے کہ بچے کو سائنس یا انجینئرنگ کے شعبہ میں جانا چاہیے۔ موجودہ صدی کمپیوٹر کی صدی ہے۔ تو ماں غصے سے ساس کو جواب دیتی۔ ہمارے ہاں یہی تو تکلیف دہ بات ہے۔ کہ ہم بچے سے اس کا قدرتی ہنر چھین کر اپنے بنائے پیمانے میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچے کی شخصیت مسخ کر دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ماں اپنے ماضی میں گم ہو جاتی۔ جب وہ بھی رنگوں میں جذب ہونا چاہتی تھی۔ پر ماں باپ نے میڈیکل پڑھا کر ہی دم لیا۔

وہ اکثر گلہ کرتی میرے ماں باپ مجھے مجبور نہ کرتے تو میں بھی فن کی دنیا میں موجود رہتی۔ جو مقام، جو تخلیق کی لذت رنگوں کے اظہار کی خوشی میں مجھے نہیں ملی اس سے اپنے بچے کو محروم نہیں رکھ سکتی۔ وہ میرے ادھورے ٹوٹے بکھرے خوابوں خواہشوں میں تکمیل کا رنگ بھر رہا ہے۔ تو کسی کو کیا تکلیف ہے۔ لوگ کیوں جلتے ہیں۔ بیوی کو یوں پریشان دیکھ کر شوہر حوصلہ بڑھاتا۔ ہمارا شاہد وہی کرے گا جو تم یا شاہد چاہے گا۔ میں یہ رنگ کسی کو چرانے نہیں دوں گا۔ اگر میرے بیٹے میں ٹیلنٹ ہوا تو یہ فن کی دنیا کا تاج ضرور پہنے گا۔ یہ میرا تم دونوں سے وعدہ ہے۔

سکول، او لیول، اے لیول سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ کالج گیا۔ تو ایک عام طالب علم نہیں تھا۔ بلکہ شہرت کی دیوی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ کالج پہنچنے تک اس کی شہرت ملک کے اندر پھیل چکی تھی۔ اور وہ بہت سارے انعامات جیت چکا تھا۔ NCA میں داخلے کے بعد وہ رنگوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ صبح کی شفق کو کینوس پر اتارنے کے لئے وہ کتنی صبحیں کبھی دریا کے کنارے، کبھی پہاڑوں کے نیچے اور کبھی وادیوں میں بھٹکتا رہتا۔ صحرا کی چاندنی، سمندر کا مدّ و جزر، پہاڑوں کی چوٹیوں پر اترتی شام۔ سب ہی اس کی تصاویر کے موضوعات تھے۔

کالج کی طرف سے تین مصوروں کی تصاویر کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ جانے باپ اور ماں کی پی آر کا اعجاز تھا۔ یا اس کے فن کی گہرائی۔۔۔ لوگوں نے اس کے کام میں زیادہ دلچسپی لی۔

جانے یہ رنگوں کا اعجاز تھا یا اس کی شخصیت کا، رافعہ ہر اس جگہ نظر آتی۔ جہاں شاہد کی تصاویر کی نمائش کا اہتمام ہوتا۔ جس شہر میں بھی نمائش ہوتی۔ شاہد اس مانوس چہرے کو تلاش کرتا۔ والدہ ایک سیمینار کے سلسلے میں بیرون ملک گئیں۔ تو وہاں آرٹ گیلریوں میں گھوم پھر کر انھوں نے شاہد کی تصاویر کی نمائش کا اہتمام کرواڈالا۔ شاہد ذہنی طور پر اتنے بڑے Exposure کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ ابھی اپنے آپ کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کروانے کے حق میں نہ تھا۔

آرٹ کی دنیا میں جرمنی کو ایک خاص مقام مل رہا تھا۔ تمام دنیا کے آرٹسٹ آرٹ کے نئے روپے کے لئے جرمنی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آرٹسٹ اٹلی روم کی طرح جرمنی کو بھی آرٹ کا گہوارا مان رہے تھے۔ اور شاہد کے لئے یہی بات پریشان کن تھی۔ کیا اتنے بڑے بڑے آرٹسٹوں میں وہ اپنے آپ کو منوا لے گا۔ اپنے احساس کمتری کو کم کرنے کے لئے وہ روزانہ ان مضامین کو پڑھتا جو اس کے بارے میں لکھے گئے تھے۔ اس کے برش کی ہر سٹروک پر لکیر کو رنگوں کی سمفنی کہا گیا تھا۔ وہ جو ہلکے نیلے نارنجی رنگا کا نچ تھا۔ اُسے نفسیات میں اس کی شخصیت میں چھپی عالمگیر محبت کا نام دیا گیا تھا۔

جرمنی ایئر پورٹ پر رافعہ کو خوش آمدید کہنے والوں میں پا کر شاہد کو ایک خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر وہ پوچھنے لگا۔ آپ کہیں میرے کسی خواب، کسی خیال کا عکس تو نہیں جسے میں اپنی خواہش کے مطابق ہر جگہ تراش لیتا ہوں۔ جلترنگ سی ہنسی ہنستے ہوئے اس نے گلدستہ پیش کرتے ہوئے کہا ''تو میں بھی آپ کی مرکز نگاہ ہوں۔'' شاہد نے دھیمے لہجے میں کہا ''میں چاہتا تھا کہ آپ موجود ہیں۔ جانے آپ کون ہیں۔ لیکن میں آپ کو اپنی کامیابی کی دلیل ہی سمجھتا ہوں۔''

ہوٹل میں جب وہ اپنے کمرے میں سامان رکھ رہا تھا تو باتھ روم سے رافعہ برآمد ہوئی۔ شاہد کے لئے اس کی موجودگی حیران کن تھی۔ وہ کہنے لگا آپ میری ہم زاد ہیں یا سایہ۔۔۔ تو رافعہ نے آگے بڑھ کر گلے لگتے ہوئے کہا، میں تمھاری محبت، تمھاری زندگی، تمھاری کامیابی کی دلیل ہوں۔ میں تمھارے وجود، تمھارے رنگوں میں ڈوب جانا چاہتی ہوں۔ تو آؤ وطن واپس چلتے ہیں۔ میں نمائش کینسل کروا دیتا ہوں۔ رافعہ نے برا مناتے ہوئے کہا۔ آپ تو مجھے اپنی نمائش کی کامیابی کی دلیل سمجھتے ہیں۔ پھر ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ ہم نمائش کی کامیابی کے بعد شادی کریں گے۔ آپ میری نمائش کے لئے اتنی پُر امید ہیں۔ رافعہ نے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو چومتے ہوئے کہا۔ ان انگلیوں میں آنے والے برش، ان کو چھو کر گزرنے والے رنگوں نے مجھے جینے اور آپ کو پانے کا حوصلہ دیا ہے۔ پھر آپ کیسے ناکام ہو سکتے ہیں۔

نمائش کے اختتام پر شاہد کے لئے شہرت کے دروازے کھل گئے۔ رافعہ نے اس کی پبلسٹی کا چارج سنبھال لیا تھا۔ کس رسالے، کس ٹی وی چینل کو کب انٹرویو کا ٹائم دینا ہے۔ یہ سب رافعہ نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ شاہد اکثر سوچتا میری ماں اور رافعہ یونان کی دیوی میوزا (Musae) تو نہیں جو میرے تخلیقی فن کو نکھارنے، اُسے جلا دینے کے لئے دنیا میں آنکلی ہیں۔ میوزز جس شخص کو بھی چاہتی ہیں۔ اس کی زندگی میں سکھ کے رنگ بھر دیتی ہیں۔ پہلے ماں نے مجھے خوشیاں اور اعتماد دیا اور اب رافعہ میرے لئے خوشیوں کا پیغام بن کر آئی ہے۔

نارنجی رنگ اس کی شناخت بنتا جا رہا تھا۔ رافعہ نے ایک جگہ لکھا تھا کہ نارنجی رنگ شفق کا رنگ، امید کا رنگ ہے۔ یہ سورج کی پہلی کرن کی طرح روشنی پھیلاتا ہے۔ جرمنی میں اسے مصورِ امید کا ٹائٹل دیا گیا۔ جرمنی کے اخبارات میں اس کے تعارف کے ساتھ لکھا تھا۔ مصوری تو لفظ کے وجود میں آنے سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ انسان کی سوچ اور شعور سے بھی بہت پہلے رابطے کے لئے انسان نے مصوری کو ہی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اپنی سوچ کو شکل دی۔ بڑی بڑی چٹانوں، غاروں میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے پتھر کو تراشنا شروع کیا۔ جس سے قوتِ متخیلہ وجود میں آئی۔ مختلف جانوروں اور پرندوں کو فریم آف ریفرنس کے لئے استعمال کیا۔ انسان نے شروع سے ہی اپنے دوست اور دشمن کے لئے انھیں پرندوں کو سمبل بنایا۔ چڑیا، کبوتر جیسے بے ضرر پرندے دوست ٹھہرے اور سانپ کو دشمن کی شکل میں متعارف کروایا گیا۔ مضمون کی تمہید پڑھتے ہوئے رافعہ، شاہد سے پوچھنے لگی۔ شاہد آپ نے بھی ایسی بہت سی تشبیہات تراشی ہوں گی۔

شاہد کہنے لگا۔ ہاں شعور کی دنیا میں آنے سے پہلے انسان کے اندر سے صرف مصوری کے سوتے پھوٹے تھے۔ انسان نے اس رنگ و بو کی دنیا سے ہی رنگ اور حسن کو کشید کیا۔ رافعہ نے اسی مضمون کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ہاں شاہد مصری، یونانی، رومی ہر تہذیب نے اپنے اپنے انداز سے مصوری کی زبان کو ہی اپنایا۔

رافعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حضور میں شادی کی رات آپ سے جو تحفہ وصول کرنا چاہوں گی، وہ میری تصویر، میرا پورٹریٹ ہونا چاہیے۔ شاہد نے محبت بھری نظروں سے رافعہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ تم جانتی ہو میرے رنگوں کو جذبوں کی زبان تم نے دی ہے۔ تم سے پہلے میں صرف چاند، دریا، پہاڑ، صحرا، ندی نالے بنایا کرتا تھا۔ تمھیں ملنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ جذبوں، محبتوں کے اپنے رنگ ہوتے ہیں۔ جب تمھیں پہلی بار دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ جب بھی ایزل پر برش کا سٹروک لگانے لگتا تم میرے سامنے آ کھڑی ہوتیں۔ میری ہر تصویر میں تمھارا ہی پرتو، تمھارا ہی عکس، تمھاری ہی آنکھوں کی گہرائی، تمھارے ہی ہونٹوں میں چھپی مسکراہٹ ہی تو میری تصویروں کا حاصل ہے۔

رافعہ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو جناب ان سب چیزوں کو یکجا کر کے میری پورٹریٹ بنا ہی دیجئے۔ تو شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں شادی کی رات یہ تحفہ نہ دے سکا۔ مگر کل سے تم میری محبوبہ یا بیوی بن کر نہیں بلکہ ماڈل بن کر آنا۔ میں تمھارے حسن کو ایزل میں سمونے کی کوشش کروں گا۔ کل ٹھیک گیارہ بجے میں تمھارا انتظار کروں گا۔ رات بھر رافعہ کو نیند نہ آ سکی۔ وہ بار بار سوچتی شاہد مجھے کیسے پینٹ کریں گے۔ حسن تو دیکھنے والے کی آنکھ اور مصور کے رنگوں میں چھپا ہوتا ہے۔ جانے وہ کب اور کیسے مجھے Capture کرتے ہیں۔

صبح اٹھ کر رافعہ خاصے اہتمام سے تیار ہوئی۔ گھنٹہ بھر ہربل باتھ لینے کے لئے ٹب میں لیٹی رہی۔ تاکہ چہرے پر تازگی اور اندر کا حسن نمایاں ہو سکے۔ فیشل تھریڈنگ کی تکلیف دہ آزمائش کے بعد وارڈ روب کے پاس گھنٹوں کھڑے رہنے کے بعد گلابی رنگ کا پھولوں والا سوٹ منتخب کیا۔ کہ گلابی رنگ محبتوں اور چاہتوں

کا رنگ ہے۔ وہ گلابی رنگ کے ٹاپس کانوں میں پہنتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ جانے یہ تصویر مجھے بھی مونالیزا کی طرح شہرت دوام عطا کر جائے۔ جانے وہ لمحہ وارد ہو جائے جو کسی بھی مصور سے شاہکار تخلیق کروالیتا ہے۔ ہاتھوں میں پکڑا برش اس انداز سے حرکت کرتا ہے کہ کائنات کی وسعتوں میں چھپے حقائق خود بخود وا ہونے لگتے ہیں۔ وہ لمحہ موجود مصور کی آنکھوں سے نکلنے والی شعاعیں سامنے ماڈل کے جسم کے یوں آر پار ہوتی ہیں کہ اس کے اندر چھپا حسن چاروں اور بکھر جاتا ہے۔ وہ لمحے امر بن کر ایزل میں مقید ہو جاتے ہیں۔ ایسا فن پارہ تخلیق ہوتا ہے۔ جس کے لئے صدیاں اپنی بند قبائیں کھول دیتی ہیں۔ اور وقت ان تصاویر میں آکر زندہ جاوید ہو جاتا ہے، ٹھہر جاتا ہے اور ان کے شاہکار ہونے کی گواہی بن جاتا ہے۔

رافعہ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے سٹوڈیوز کی کرسی پر ایک ہی پوز میں گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ شاہد خاموشی سے رنگوں میں برش کو ڈبو ڈبو کر ایزل پر پھیلاتا رہتا۔ اپنی انگلیاں رنگوں میں بھگو کر ایزل پر جھکا رہتا۔

آخر تصویر مکمل ہو گئی۔ دونوں اتنے تھک چکے تھے کہ روشنی آف کر کے اپنے بیڈ روم میں چلے آئے۔ وہ رات دونوں کے لئے بے حد اہم تھی۔ مدتوں سے جسم پر چھائی تھکن کی برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں ڈوبتے چلے گئے۔

رافعہ نے ایک دن پہلے ہی اخبارات اور ٹی وی چینلز کے کیمرہ مینوں کو مدعو کر لیا تھا۔ تاکہ وہ سب اس شاہکار کو اکٹھے دیکھ سکیں۔ صبح ناشتے کے بعد جب شاہد اور رافعہ سٹوڈیوز میں پہنچے تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد تصویر دیکھنے کے لئے جمع تھی۔ سٹوڈیوز کے سیکرٹری نے تصویر کے اوپر مرکری بلب اس انداز میں فٹ کئے تھے کہ تصویر کی ایک ایک لکیر زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو سکے۔

تصویر کے سامنے پہنچ کر شاہد خوفزدہ ہو گیا اور رافعہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ تصویر میں جسم رافعہ کا ہی تھا۔ لیکن چہرہ ماں کا پینٹ کیا گیا تھا۔

رخشندہ نوید .... غزل

روبرو اک اونچا در تھا، تجھ کو کیا تھا
مجھ کو رسوائی کا ڈر تھا، تجھ کو کیا تھا

مجھ کو تیرے غم کی آندھی لے اُڑی تھی
آنکھ تر تھی، چہرہ تر تھا، تجھ کو کیا تھا

میں محبت کو عبادت کر رہی تھی
اور تری آنکھوں میں شر تھا، تجھ کو کیا تھا

میں نے رخشندہ تجھے پھر اُڑتے دیکھا
شاخ پر اک ٹوٹا پَر تھا، تجھ کو کیا تھا

احمد صغیر صدیقی / شناخت

کچھ لوگ میرے اردگرد جمع ہیں۔ اور میں بازار میں پان کی ایک دوکان کی سائڈ میں خالی جگہ پر اکڑوں بیٹھا ہوا ہوں۔ اپنا سر گھٹنوں میں دیے۔ میرا ہمسایہ اسی بھیڑ کے آگے کھڑا ہے۔ مجمع سے آوازیں ابھر رہی ہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ دراصل کچھ اور آوازیں ہیں جو میرے کانوں میں گونج رہی ہیں اور یہ اونچی ہیں۔ اسی لیے بھیڑ میں ابھرتی صدائیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔ جو پہلی آواز میں نے کچھ دیر پہلے سنی تھی فی الحال وہی سب سے بلند ہے......

میں ویگن سے اتر رہا تھا۔ کچھ جلدی میں تھا۔ ویگن کی رفتار سست ہو چلی تھی۔ پائیدان کے پاس ایک بڑے میاں کھڑے تھے۔ راستہ روکے ہوئے۔ میں نے انھیں ہاتھ سے ایک طرف ہٹایا دروازے پر پہنچا اور نیچے کود پڑا۔

''اے۔ اے۔ گدھا کہیں کا۔'' مجھے بڑے میاں کی آواز سنائی دی۔ ''منہ دوسری طرف کر کے اتر رہا ہے۔ گرے گا منہ ٹوٹ جائے گا۔ گدھا۔''

مگر گدھا تو چھلانگ لگا چکا تھا۔

میرا منہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا تھا۔ اس خوشی میں میں نے آواز بلند کی ...... ''ڈھینچوں ڈھینچوں'' اسی لمحے کسی نے میرا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

پہلی آواز جو بڑے میاں کی تھی غائب ہوگئی۔

دوسری آواز نے اس کی جگہ لے لی۔

''میرے بلبل...... یہ بازار ہے املی کا پیڑ نہیں۔ یہ میرے کان میں کیوں کوک رہے ہو؟''

مجھے احساس ہوا کہ میرے منہ سے ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز کے بجائے کچھ اور ہی آوازیں نکل رہی ہیں۔ شاید میں کچھ گا رہا تھا۔ کوئی بے سرا راگ۔

''میرے بلبل۔'' تو گویا میں گدھا نہیں تھا بلبل تھا۔ خوب۔ گدھے کے بجائے بلبل ہونا ایک بہتر صورت تھی۔

میں نے اپنا بازو چھڑایا۔ اور نکل بھاگنے کی کوشش کی۔

یہ اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔

تیسری آواز نے دوسری آواز کو دبا دیا۔

''دیکھتا نہیں۔ کتا کہیں کا۔'' ایک سریلی چیخ مجھے سنائی دی۔

میں عجلت میں کسی گزرتی خاتون سے ٹکرا گیا تھا۔ اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں بلبل سے کتا بن گیا تھا۔

یہ تبدیلی حیرت ناک تھی۔ میں تصدیق کے لئے منہ سے آواز نکالی۔

''بھوں بھوں۔''

مجھے لگا کہ واقعی میری آواز کتے کی آواز ہی جیسی تھی۔

یہ کوئی اچھی صورت حال نہ تھی۔
بلبل سے کتا بن جانا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ گھر میں اس پہ غور نہیں کر سکا کیونکہ اس دوران جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔
ایک چوتھی آواز ابھری تھی۔
دراصل کتے کا پیر عجلت میں سڑک پر پھیلے پانی میں پڑ گیا تھا۔
''یہ کیا کر دیا...... میرے سارے کپڑے خراب کر دیے۔'' کسی نے ایک زور کا دھکا مجھے دیا۔ میں نے بھونکنے کی کوشش کی تو ایک غراتی آواز چیخی۔
''ذلیل چوہا...... گالی دے رہا ہے مجھے۔''
مجھے احساس ہوا کہ بھوں بھوں کی جگہ میرے منہ سے جو آوازیں نکل رہی ہیں وہ کسی چوہے کی چچیاہٹوں جیسی ہیں۔ ''چچ...... چچ۔ چوں......''
''چوہا''۔
یعنی میں چوہے میں بدل گیا تھا۔
میں گدھا نہیں رہا تھا۔ بلبل نہیں تھا۔ کتا بھی نہیں تھا۔ بلکہ ایک چوہا بن گیا تھا۔
''میرے اللہ'' میں کراہا...... ''میں تو ایک آدمی تھا۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ یہ میں کس طرح گھڑی گھڑی بدل رہا ہوں؟'' میں نے وحشت سے اپنا منہ گھٹنوں میں چھپا لیا......
مجھے اب اپنے ہمسائے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
وہ میرے اردگرد جمع لوگوں سے کہہ رہا ہے۔
''بھئی آپ لوگ جائیں اپنا کام کریں۔ یہ میرا ہمسایہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کبھی کبھی اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ اس پر شاید کوئی دورہ پڑ گیا ہے۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں......''

راکب راجا............غزل

چھوڑا سفر تو کوئی چُرا لے گا راستا | چلتے رہے تو ڈھول بنا لے گا راستا
دو گام رہ گئے ہیں تُو ہمت سے کام لے | ہارے گا حوصلہ تو بڑھا لے گا راستا
چلنا ہے احتیاط سے سینۂ راہ پر | بارش ہوئی ہے سنگ نکالے گا راستا
یوں ہی اگر پہاڑ کو وہ کھودتا رہا | اِک دن مجھے یقین ہے بنا لے گا راستا
میں جادۂ جنون ہوں رستے کے ساتھ ساتھ | اِک دن مجھے بھی خود میں سما لے گا راستا
راکب سفر میں خود جو پڑو گے تو دیکھنا | رستے سے کتنے رستے نکالے گا راستا

محمد حامد سراج

زمین زاد

سائنس دان انسان کو مریخ پر اتارنے کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔
کانفرنس میں پورے کرہ ارض کے سائنس دانوں اور مذہبی سکالرز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ کانفرنس کئی ماہ سے جاری تھی اور سائنس دانوں نے ہی حتمی فیصلہ کرنا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک نے پہلی بار ترقی پذیر ممالک کو نمائندگی کا موقع دیا تھا۔ کروڑوں میل کی دوری پر بسیط و عریض کائنات میں مریخ کا سفر برسوں پر محیط تھا۔ سائنس دان ایک طویل عرصے تک اس تحقیق میں سر کھپاتے رہے کہ ہم صرف مریخ سے لی گئی تصاویر کے مفروضے پر انسان کو مریخ پر اتارنے کا سوچ رہے ہیں اگر وہاں پر ہوا، پانی اور سورج کی روشنی نہ ہوئی تو اپالو کو اپنے مدار میں لوٹنے کے لیے چار سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے جب اپالو واپس اپنے مدار میں دوبارہ داخل ہو تو وہاں اتارے گئے انسان کہیں گپھاؤں میں گم ہو چکے ہوں۔ مریخ زمین سے کئی گنا بڑا ہے۔ ابھی تک ہم زمین کے دفینے پوری طرح نہیں کھوج سکے۔ آئے دن ماہرین آثار قدیمہ تحقیق کی دنیا میں کوئی نہ کوئی نیا شہر سامنے لا کھڑا کرتے ہیں اور پھر تخمینے اندازے پر اس کی عمر مقرر کرتے ہیں۔ چند سال پہلے National Geographic Society نے گھنے جنگلوں میں سے پورا شہر برآمد کر ڈالا۔ اہرام مصر کے دفینے ابھی پوری طرح دریافت نہیں ہوئے۔ فراعینِ مصر کی حنوط شدہ لاشوں کے ساتھ مدفون خزینوں کی خبریں آئے دن دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالتی رہتی ہیں پاکستان میں موہن جوداڑو اور ہڑپہ کی دریافتوں کو آخری دریافت نہیں کہا جا سکتا۔ تو پھر مریخ پر اتارے گئے انسان کو کون تلاش کرے گا۔۔۔؟ سائنس دانوں کو یہ خدشہ بھی تھا کہ مریخ پر وقت کا پیمانہ یکسر مختلف ہوا تو کیا ہوگا۔۔۔۔؟ ممکن ہے زمین سے بھیجا جانے والا انسان وہاں پانچ سو سال یا اس سے بھی زیادہ زندہ رہے۔ تو انسانی زندگی کے ارتقا کے لے ایسا آکسیجن سلنڈر تیار کیا جانا چاہیے جو اس کی بقا اور سانسوں کے تسلسل کے لیے کم از کم ایک ہزار سال کافی ہو۔ ماہرین کی رائے یہ بھی تھی کہ قدیم ادوار میں انسان کی عمر ہزار سال بھی رہی ہے اس لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر آکسیجن سلنڈر کی Capacity کم از کم پانچ ہزار سال ہونی چاہئے۔ تا کہ مریخ اور زمین کے درمیان ہزاروں سال تک رابطہ رہ سکے۔ اپالو میں ایک ایسا جدید سسٹم بھی فٹ کیا جا رہا تھا۔ زمین اور مریخ کے درمیان انسانی رابطہ منقطع نہ ہونے پائے۔ پورے کرہ ارض کے مذہبی سکالرز اور سائنس دانوں کو مدعو کیا گیا تھا تا کہ اپالو اجتماعی رضامندی سے بھیجا جائے اور اس پر کوئی ایک ملک اپنا حق نہ جتا سکے۔ مذہبی سکالرز کا کہنا تھا کہ مریخ پر بھیجے جانے والے انسانوں کو تمام مذہبی کتابیں ساتھ دی جائیں۔ قرآن، انجیل برناباس کا جدید ترین نسخہ جو ترکی کے پہاڑوں کی ایک غار میں سے دریافت ہوا، گرنتھ، ہندومت کی تعلیمات کے مخطوطے۔۔۔ لیکن سائنس دانوں نے اس فیصلے کے خلاف ووٹ ڈالا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہم مریخ پر صرف ایک جوڑا اتار رہے ہیں۔ Male اور

Female ۔ جن کے درمیان میاں اور بیوی کا رشتہ ہے۔ نسل انسانی کی بقا کے لیے ساتھ ہزاروں آکسیجن سلنڈر بھیجنے کی بھی تجویز تھی۔ تاکہ وہاں نومولود بچے کسی مشکل کا شکار نہ ہوں۔ خوراک کا بہت اعلیٰ نظام ترتیب دیا گیا تھا۔ خوراک کا ایک کپسول ایک سال تک کھانے پینے سے بے نیاز کرنے کو کافی تھا اور کپسولز کی تعداد ملین میں تھی۔ بھیجے جانے والے انسانی جوڑے کا DNA کے ذریعے مکمل طبی معائنہ کیا گیا۔ طبعی عمر میں انہیں کسی بیماری کا خدشہ نہیں تھا۔

کانفرنس جاری تھی۔ مندوبین اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ موضوع بحث یہ تھا کہ ساری باتیں اور فیصلے درست لیکن مریخ پر بھیجے جانے والے انسان کو مذہب سے دور ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا تھا کہ زمین پر فساد کی جڑ مذہب ہی ہے۔ خوفناک جنگیں، ہتھیاروں کی دوڑ، تیر سے میزائل تک، منجنیق سے توپ اور ٹینک تک اور آگ کے گولوں سے ایٹم تک تباہی کے جتنے بھی ہتھیار ہیں وہ مذہبی منافرت کی بنیاد پر ہی ایجاد ہوئے ہیں۔ امن قائم کرنے کی آڑ میں اپنے مفادات کی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ مذہبی سکالرز نے پرزور اور مدلل طریقے سے سائنس دانوں کی اس رائے کو رد کرتے ہوئے کہا کہ انسانیت کو رہنمائی صرف مذہب نے عطا کی ہے۔ ان کا کہنا تھا اس حیوانِ ناطق کو انبیاء و رسل نے انسانیت کا درس نہ دیا ہوتا تو اس کے سفلی جذبات اسے حیوانوں سے بدتر بنا دیتے۔ اور آج بھی جن انسانوں کا باطن تاریک ہے وہ پوری انسانیت کو جنگ کی ہولناک تاریکیوں میں دھکیل دیتے ہیں اس لئے مریخ پر اترنے والا انسان اگر مذہب سے بیگانہ رہا تو اس کے لئے وہاں زندگی عذاب ہو جائے گی۔ اس کے جذبات، احساسات اور ذہن میں پنپنے والے سوالوں کو رہنمائی کہاں سے ملے گی۔۔۔؟ اسے مذہبی کتابوں سمیت بھیجا جائے۔ ان کتابوں میں سے وہ کس کتاب سے زیادہ رہنمائی حاصل کرتا ہے یہ فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن سائنس دانوں کی سوئی اسی نقطے پر اٹکی ہوئی تھی کہ انسان کو مذہب سے دور ہی رکھا جائے۔

ساری تیاریاں مکمل تھیں۔ بس یہی آخری فیصلہ ہونا باقی تھا۔ خوراک کے کپسول کا آخری بار پھر تجزیہ کیا گیا۔ آکسیجن سلنڈر، اور دیگر مشینی سامان کا آخری Computerize چیک اپ کیا گیا...... آخری روز مذہبی سکالرز واک آؤٹ کر گئے۔ ان کا موقف تھا کہ ہماری بات کو بے وزن ہی رکھنا تھا تو ہمیں مدعو کس لیے کیا گیا تھا۔ سائنس دان پھر سر جوڑ کر بیٹھے اور فیصلہ کیا کہ اتنے عظیم الشان منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مذہبی سکالرز کی بات مان لی جائے اور مختلف مذاہب کی CDs اور HardDiscs کو ساتھ جانے دیا جائے۔

جس روز اپالو نے زمین کے مدار سے نکل کر کائنات کی وسعتوں کو کھوجنا تھا، اس روز پورے کرۂ ارض کے انسان ٹیلیویژن اور انٹرنیٹ پر بیٹھے کارروائی دیکھ رہے تھے۔ اپالو خلا کی پہنائیوں کو چیرتا اپنی منزل کی طرف دوڑ رہا تھا اور اربوں انسانوں نے یہ انتظار کھینچا تھا کہ مریخ پر زندگی کے آثار ہیں بھی کہ نہیں......؟ زمین پر زندگی اپنے معمول پر رواں ہوگئی۔ کس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اپالو کی واپسی کا انتظار کھینچتا۔ البتہ سائنس دان اپنی دنیا اور اپنے کام میں انتہائی مگن تھے۔ دو سال بعد جب اپالو مریخ کے مدار میں داخل ہوا تو دونوں

میاں بیوی کے دل زور سے دھڑکے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہے تھے جہاں ان کا کوئی اپنا نہیں تھا۔ وہ بالکل تنہا تھے۔ انہیں یہ بھی تو معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے جیسے انسانوں میں زندہ لوٹ بھی سکیں گے یا نہیں......؟ وہ نئی دنیا اور وقت کے نئے پیمانوں میں قدم رکھ رہے تھے۔ انہیں تنہائی کے جان لیوا عذاب کا بھی سامنا تھا اور نئی دریافتوں کی دھن بھی تھی۔ ان کا سائنس روم اپالو سے کٹ کر الگ ہوا تو انہوں نے اپالو کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ آخری زمینی رابطہ...... اپالو...... وہ بھی گیا۔!

سائنس روم کہاں جا اترا......؟ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہر طرف گھور اندھیرا تھا۔ انہوں نے زمین پر پیغام بھیجا کہ مریخ پر گھپ اندھیرا ہے۔ جانے اس کرے کا کوئی سورج ہے بھی کہ نہیں۔ جب تلک روشنی نہ ہو کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہم اپنے کمرے میں بند ہیں اور روشنی کا انتظار کر رہے ہیں۔

لیکن سرچ لائیٹ کے ذریعے یہ تو بتائیں کہ جگہ کیسی ہے......؟ صحرا ہیں یا پہاڑی سلسلے......؟

ہم اس وقت ایک لق و دق صحرا میں ہیں۔

کئی ماہ گزر گئے دونوں میاں بیوی اوب گئے۔ وہ انسانی چہروں اور زمین کے نظاروں کے لیے بے تاب ہونے لگے لیکن کچھ بھی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ آواز، چہکار اور نہ ہی کوئی منزل۔۔۔! ان کے ہاں پہلے بچے کی ولادت پر ان کی زندگی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بچے کی شکل میں وہ تنہائی کا عذاب بھول گئے۔ CDs اور انٹرنیٹ پر وہ پہروں مختلف النوع موضوعات کی Web Sites کھول کر اپنی تنہائی کم کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کا کوئی غمگسار اور دمساز تو تھا نہیں کبھی کبھی لایعنی اور بے معنی گفتگو کرتے ہوئے وہ بے ساختہ ہنس پڑتے۔ اور کبھی اداسی ان کو گھیر لیتی۔

ایک دن اس کی بیوی نے کمپیوٹر سکرین سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا...... ایک بات کہوں......؟

کہو......!

جس روز ہم مریخ کی سیر کو نکلیں گے نا......! تو میں پتھروں پر ایک تحریر کندہ کروں گی کہ ہم انسان ہیں۔

کیا مطلب ہے تمہارا......؟

میں یہ تحریر رقم کروں گی کہ ہم انسان ہیں اور...... اور...... ہم کرۂ ارض سے آئے ہیں تاکہ ہماری Next Generation خود کو بندر اور چمپنزی کی اولاد نہ سمجھتی رہے۔

تم سائنس دان ہو کر ذہن میں ایسی سوچ کو جنم دے رہی ہو، جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔

دلیل ہے......!

کیا......؟

وہ بے ساختہ ہنسی...... میرے والدین انسان تھے۔ میرے والدین کے والدین بھی انسان تھے۔ مذہبی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچتی ہے کہ ہم کئی ہزار سال سے انسان ہی ہیں تو پھر اس بات کو مان لینے میں کون سی بات مانع ہے۔ جیسے ہم زمین سے مریخ آ ترے ہیں اسی طرح ہمارے Fore Fathers کسی اور جہان سے زمین پر اترے ہوں گے۔ جیسے ہم سے یہ نسل انسانی چل نکلی ہے ویسے ہی ان کی نسل کا ارتقاء

شروع ہو گیا ہو گا...... وہ اپنے بچے کو دیکھ کر مسکرائی۔
تم Religeous ہوتی جا رہی ہو۔ سائنس دانوں کی سوچ درست تھی کہ مذہبی کتابیں ساتھ نہیں ہونی چاہئیں۔ تم جو بھی کہو...... میں تو آنے والی نسلوں کے نام یہ پیغام چھوڑ جاؤں گی کہ تم انسان کی اولاد ہو۔ واقعی انسان اس کائنات کی بہترین Creation ہے۔ بے کیف زندگی...... مکمل مشینی...... ان کو وقت کا پیمانہ بھی معلوم نہیں تھا...... سونے جاگنے کے اوقات بے ترتیب تھے۔

ایک دن ان کی پریشانی اس وقت انتہا پر پہنچ گئی جب اچانک ان کا رابطہ زمین سے منقطع ہو گیا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں...... وہ کبھی ایک دوسرے اور کبھی اپنے معصوم بچے کو دیکھتے۔ وہ پہروں سر کھپاتے رہے۔ Internet کو متعدد بار Reconnect کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود...... خوف سے خون ان کی رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ زمین سے رابطہ بحال نہ ہوا تو ہمارا مستقبل کیا ہو گا......؟ اگر موت نے آ لیا تو اس بچے کا کیا ہو گا......؟ کیا یہ سسک کر جان دے دے گا......؟ ان کی سوچیں الجھ گئیں۔ ان کے پاس تو فرار کا راستہ بھی نہیں تھا۔ مریخ بارونق کرہ تو تھا نہیں...... جنگل ہوتے، پہاڑ ندی نالے، جھرنے تو جینے کا سامان کر لیتے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ کوئی ایک ہستی ہے جس نے کرۂ ارض پر بلا تفریق رنگ و نسل و مذہب انسانوں سے لے کر چرند، پرند، حیوان، حشرات الارض بلکہ ہر ذی روح کی زندگی کا پورا پورا سامان کیا۔ زمین سب کے لیے...... سورج، چاند، ستارے، پانی، ہوا...... اور بارشوں پر سب کا برابر حق...... سب بلا معاوضہ مستفیض ہوتے ہیں۔
وہ واقعی رب العالمین ہے...... عورت کے منہ سے بے ساختہ نکلا
کون......؟
اللہ...... وہی اللہ...... جس نے صرف کرۂ ارض انسانوں اور جانداروں کے رہنے کے لیے بنایا۔ ہم بے کار کے سفر پر نکلے ہیں۔ کسی بھی کرے پر ہمیں کچھ بھی نہیں ملے گا......!
یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور تم جانے کیا اوٹ پٹانگ سوچ رہی ہو۔
میں یہی سوچ رہی ہوں کہ ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔ ابھی ہمارا ایک بچہ ہے...... اگر بہت سے بچے ہوں تو رونق بڑھ جائے گی۔ یہاں کون سا آبادی کے گنجان ہونے کا خطرہ ہے؟ یا خوراک کے مسائل ہیں لیکن جب وہ جوان ہوں گے تو ان کا مستقبل کیا ہو گا......؟ تعلیم...... شادی......؟ شادی تو نہیں ہو سکتی۔ وہ سب بہن بھائی ہوں گے۔
انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
ابھی وقت تو آئے۔ بچے جوان ہوں گے تو مذہبی کتابوں سے رہنمائی لے لیں گے
ابھی تو ہم نے مریخ کی سیر کرنی ہے۔ اس کمرے سے نکلنا ہے۔ بچے جوان ہوں۔ وہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ہمارے باہر نکلنے کے سسٹم کو کنٹرول کریں پھر کہیں جا کر مریخ کے اسرار کھلیں گے......! اس کے خاوند نے اسے تسلی دی۔

وہی کرہ ءارض اچھا تھا...... ہوا، پانی، انسان، جانور، محبتیں نفرتیں، جھگڑے، خوشیاں، رونقیں میلے بہاریں......

یہ جو اس بسیط و عریض کائنات میں اربوں کہکشائیں بکھری ہیں ہم ان کو اپنی مختصر عمر ساٹھ ستر سال کے پیمانے میں نہیں کھوج سکتے...... ناممکن...... ہمیں بس زمین پر ہی رہنا چاہیے۔

ان کے ہاں کئی بچوں کی ولادت ہوئی۔ وہ سن شعور کو پہنچے۔ ان کی کل کائنات بس یہی کمرہ تھا۔

اب ان سے اہم کام لینا باقی تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ والدین جب ان کو یہ بتاتے کہ ہم ایک ایسے کرے سے آئے ہیں جہاں آکسیجن سلنڈروں کی بجائے فضا میں موجود ہوتی ہے۔ ہاں پہاڑ ہیں ۔۔۔ پانی، سبزہ، جنگل، چرند پرند اور ہمارے جیسے اربوں انسان، مختلف نسلیں، بلند و بالا عمارات، کاریں، ٹرینیں اور ہوائی جہاز، انواع و اقسام کے کھانے، اور جدا جدا ذائقہ رکھنے والے سینکڑوں پھل، میوے،...... بس کیا پوچھتے ہو...... زمین رنگ و نور سے بھری ہوئی ہے...... تو تحیر زدہ بچے ایک دوسرے سے پوچھتے...... یہ کس جہان کی باتیں اور قصے ہیں......؟

کیا وہاں انسان ایک کمرے میں نہیں رہتے......؟ ان کی آنکھوں میں سوال تیرتے۔

نہیں......! وہ جہاں جانا چاہیں جا سکتے ہیں پیدل، گاڑیوں پر، ہوائی جہازوں اور سمندری جہازوں کے ذریعے۔ اور وہ مزے دار ذائقوں والے کھانے کھاتے ہیں۔ سبزیاں، گوشت، دالیں، کیک، پیسٹریاں بسکٹ اور ساتھ رنگارنگ مشروبات بھی......!

اچھا!!!...... بچے حیران ہو کر پوچھتے...... تو کیا وہ وہاں سال میں اپنی خوراک کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک کیپسول نہیں لیتے۔

جب انہوں نے National Geographic کی CD's کی مدد سے دنیا کے مختلف ممالک کی ڈاکومنٹریز دیکھیں۔ حیرت انگیز مناظر، انسان اور ان کی طرز رہائش، رسم و رواج، رنگارنگ کھیل اور تفریحی سلسلے دیکھے تو تحیر سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ہمارے والدین جنت سے نکل آئے ہیں۔ لیکن آخر کیوں......؟

وہ جنت سے کیوں نکلے یا نکالے گئے۔۔۔؟ ان کا قصور کیا تھا......؟ ہم بھی وہیں پر پیدا ہوتے، وہیں رہتے تو کتنا مزہ رہتا......! جانے ہم وہاں کبھی جا بھی سکیں گے یا نہیں۔ مما...... یہ جگہ رہنے کے لیے نہیں ہے۔ ہم جنت میں واپس کب پہنچیں گے......؟

دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا......۔

اب مذاہب کو مان لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔ Specially اسلام کو...... میں نے قرآن کا Deeply مطالعہ کیا ہے۔ اب تو مریخ پر ہونے کی وجہ سے ہم عین الیقین کی سرحد پر کھڑے ہیں۔ یہ مریخ ہے۔ اور جہاں سے ہم آئے ہیں وہ ارضی جنت۔ بچوں کے لیے یہ دریا، ندی نالے، سرسبز وادیاں، بلند و بالا عمارات، انواع و اقسام کے کھانے اور مشروبات، ہم جنس...... ہم Documentries کے ذریعے انہیں ان ذائقوں سے آشنا تو نہیں کر سکتے۔ جس طرح زمینی جنت ایک زندہ حقیقت ہے بالکل ایسے ہی مرنے کے بعد ایک اور عالم

ہے اور وہ بہت خوبصورت ہے...... اس کی بیوی نے خاوند کو قائل کرنے کی کوشش کی

ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔ چند روز پہلے میں نے اپنے بچوں کی زبانی بھی سنا۔ وہ آپس میں تبادلہء خیال کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ زمین پر وہ سب کچھ موجود ہو جس کی خبر ہمارے والدین ہمیں دے رہے ہیں۔ سمندر، دریا، رنگ برنگے پرندے اور ان کی چہکار، انواع و اقسام کے کھانے اور مشروبات، ہمارے جیسے اربوں انسان، اور پھر آکسیجن سلنڈر کے بغیر زندہ رہنا......؟

ہمارے والدین جھوٹ تو نہیں بولتے نا......۔ !وہ زمین سے آئے ہیں والدین کی بات جھٹلانی نہیں چاہیے۔

میرا تو یقین ہے کہ زمین ہے اور ایک دن ہم وہاں پہنچ جائیں گے اور مزے لوٹیں گے۔

جب بچوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی سائنسی علوم کے ماہر ہو گئے تو میاں بیوی نے اپنے مخصوص لباس اور سسٹم کے ذریعے سائنس روم سے نکل کر مریخ کی سیر کا پروگرام بنایا Control System پر بٹھا کر انہیں ہر بات اور آپریشن سسٹم سمجھا دیا۔ تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ پہلے روز وہ اپنے مخصوص خلائی لباس میں تھوڑی دور تک گئے اور لوٹ آئے۔ اپنا تحقیقی سفر جاری رکھتے ہوئے انہوں نے پورا مریخ گھوم کر دیکھ لیا۔ بنجر پہاڑوں اور صحراؤں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انہیں عمیق اور خوفناک غار بھی دیکھنے کو ملے۔ ان میں اترنا موت کو دعوت دینا تھا۔ جن تصویروں کو دیکھ کر سائنس دان اندازے اور تخمینے لگا رہے تھے کہ یہاں پانی ہے وہ یہی عمیق اور اندھے غار تھے۔ سائنسی ترقی میں وہ اتنے آگے نکل گئے کہ انہوں نے دوسری کہکشاؤں کو سر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں رفتار کے پیمانے بدل گئے تھے۔ وہ جس سیارے پر بھی جا اترتے وہ لق و دق صحراؤں اور خشک بنجر پہاڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ حیران تھے کہ ان اربوں ستاروں اور کہکشاؤں کو کس نے تھام رکھا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے ٹکراتے کیوں نہیں......؟ اسی بات پر ایک روز بحث جاری تھی۔

مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن میں اس بات کا جواب موجود ہے......۔ عورت نے یقین سے کہا

کیا لکھا ہے اس کتاب میں......؟

اس نے کمپیوٹر میں قرآن کی CD ڈالی۔ اسے Open کیا۔ بائیں جانب ایک سو چودہ سورتوں کی فہرست تھی۔ اس نے Al-Yaseen پر کلک کیا پھر آیت تلاش کی...... یہ دیکھو......!

''اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے۔ کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔ اور اس وقت ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن سے پہلے آ سکتی ہے اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں''۔

Amazing...... واقعی حیران کن کتاب ہے۔ اس کا خاوند تحیر میں ڈوبا قرآنی آیت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

ابھی ٹھہرو...... اگلی آیت دیکھو

''اور ایک نشانی ان کے لیے یہ ہے ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لئے ویسی ہی اور

چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں''
اوہ...... میرے خدا...... اللہ کہتا ہے کہ ہم نے ویسی اور چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سائنسی ترقی کار سے جہاز اور اپالو تک جو ہماری سواریاں ہیں ان کا اصل خالق اللہ ہے...... حیرت انگیز کتاب ہے یہ......!
اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اربوں کہکشاؤں میں مغز ماری فضول ہے۔ ہوا پانی اور دوسری مخلوق کا کہیں وجود نہیں ہوگا۔ ہمیں زمین پر ہی رہنا چاہئے اور اسی کو سنوارنا چاہئے۔
بالکل بلکہ میں تو مذہبی کتابوں اور حدیث کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جس طرح ایٹم ایک ذرہ ہے اور پوری دنیا کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے ایسے ہی قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو پوری دنیا کو سنوار سکتی ہے۔ میں نے اس کا مکمل مطالعہ کیا ہے یہ زمین پر انسان کو اس کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اس کی رہنمائی میں زندگی گزاری جائے تو انسان دونوں جہانوں میں ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتا ہے۔
اگر کبھی زمین سے رابطہ ہو گیا اور ہم واپس اپنی دنیا میں پہنچ گئے تو تمہاری اس Fundamentalist Theory کو کون قبول کرے گا؟
بھلے سے کوئی نہ کرے...... میں سچ جان گئی ہوں...... آؤ میں تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔ اس نے سورت Al-Bani Israeel پر کلک کیا...... دیکھ رہے ہو...... نا!
''وہ ذات پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گردا گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا۔ تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''
لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر محمد ﷺ بغیر اپالو کے آسمانوں پر کیسے پہنچ گئے......؟ وہ عہد تو ترقی یافتہ نہیں تھا...... اس کے خاوند نے پوچھا
وہ عہد اس Universe کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ عہد تھا۔ محمد ﷺ کا واقعہ معراج ایک ایسی Universal سچائی ہے جسے جھٹلانا ناممکن ہے۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں دیکھو اپالو Material ہے...... ہے نا......! اس میں انرجی Atomic Fuel ہے۔ اسی انرجی سے یہ لاکھوں میل کی مسافت طے کرتا ہے۔ یہ فیول نہ ہو تو بے جان مادہ زمین پر ہی پڑا رہے...... اسی طرح مسلمانوں کے پیغمبر محمد ﷺ کے باطن میں اللہ نے روحانی توانائی رکھ دی تھی۔ انتہائی Powerful اگر Atomic Fuel سے یہ مادہ، یہ اپالو اڑ سکتا ہے، لاکھوں میل کی مسافت طے کر سکتا ہے تو روحانی Fuel سے جسم جو ایک مادہ ہے کیوں نہیں اڑ سکتا...... وہ یقیناً آسمانوں پر گئے تھے......!
چلو تمہاری بات مان بھی لی جائے...... لیکن سوال یہ ہے کہ ہم Friction کو نظر انداز نہیں کر سکتے...... اس کے شوہر نے سوال کیا
اسے بھی سائنس ثابت کر چکی ہے......

ہے؟

آئن سٹائن کی تھیوری ہے کہ اگر مادہ روشنی کی رفتار سے سفر کرے تو روشنی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

گفتگو میں ان کے استغراق کا یہ عالم تھا کہ انہیں گرد و پیش کی خبر ہی نہیں تھی۔ بچوں کی چیخوں پر وہ ایک دم چونکے......بچوں کے چہرے خوشی سے گلنار ہو رہے تھے

زمین سے رابطہ بحال ہو گیا......خوشی سے سب کی آوازیں کانپ رہی تھیں

ہیلو......ہیلو............آواز صاف اور واضح تھی۔

ہم زمین سے بول رہے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ لوگ آج سے پچاس ہزار سال پہلے مریخ کے مدار میں داخل ہوئے تھے............!

کیا کہا......؟ پچاس ہزار سال......! ہمیں تو بمشکل پچاس سال ہوئے ہوں گے

وہاں وقت کا پیمانہ اور ہوگا......سائنس دانوں اور حکومتوں کے متفقہ فیصلے کے مطابق صدیوں سے اپالو باقاعدگی سے مریخ کے سفر پر روانہ کیا جا رہا ہے۔ اسی آس پر کہ شاید کبھی انہونی ہو جائے اور آپ سے رابطہ ہو جائے۔ اپالو مریخ کے مدار میں داخل ہونے والا ہے۔ آپ کا سائنس روم خود بخود اس کے ساتھ منسلک ہو جائے گا۔

وہ جب زمین پر اترے............ہزاروں نسلیں گزر چکی تھیں۔

وہ عظیم الشان استقبال کے باوجود بالکل اجنبی تھے۔

وہ کس سے گلے ملتے۔ کون ان سے مل کے خوش ہوتا......کون ان کی تنہائی کا دکھ بانٹتا۔ ان گنت چہروں کے درمیان ان کا کوئی بھی اپنا نہیں تھا......!

وہ اربوں انسانوں کے درمیان پھر تنہا ہو گئے............!

سحر علی............غزل

محبت میں اسے کیا چاہیے تھا   نیا ہر پل تماشا چاہیے تھا
ہرے دُکھ کو دلاسا چاہیے تھا   کوئی مونس پرانا چاہیے تھا
کیا امروز کی لہروں نے زنجیر   مجھے احساسِ فردا چاہیے تھا
سمندر ہی سمندر موجزن تھے   جہاں پیاسوں کو دریا چاہیے تھا
کہوں کیا شہر درد آگیں کی رُوداد   مسیحا کو مسیحا چاہیے تھا
ابھی سے کیوں تمنا ہار بیٹھی   اسے کچھ دن تڑپنا چاہیے تھا

ثمینہ افتخار اعوان / پسِ آئینہ

ملک محض چیلنج بن کر ہی اس کے جیون میں نہ آیا تھا وہ تو اُس کے دردل پہ آن کھڑا ہوا تھا اور اِس زور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا مانو اپنی جاگیر ہے اور وہ بھی کچھ ایسا ہی سمجھ بیٹھی جبھی تو ملک کو دروازہ توڑنے کی ضرورت نہ پڑی اس سے پہلے ہی دراس کے لئے وا ہو گیا۔

مگر اب ضرورت تھی ملک کو بٹھائے رکھنے کی وہ ملک جو مشکل سے ہاتھ آتا تھا حالانکہ حسن خود اس کی بہت بڑی کمزوری تھا مگر کسی میں یہ طاقت نہ تھی کہ اُس کا دامن پکڑ کر پکڑے ہی رکھے۔ وہ دامن جھٹکتا نہ تھا نرمی سے چھڑا لیا کرتا تھا۔

''عورت کو دامن پکڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

وہ ہنسا کرتی تھی۔

''دامن تو خود اُس کے ہاتھ میں آ جایا کرتے ہیں''

یہ اس کا دعویٰ تھا۔

اور اُس نے یہ دعویٰ سچ کر دکھایا اس لئے کہ حالات نے اُسے مرد کی رگ رگ سے آشنا کر دیا تھا اور اس آشنائی کے ساتھ جب محبتیں بھی در آئیں تو سونے پہ سہاگہ ہو گیا۔ یہ تو بہت بعد میں اُس پہ کھلا کہ مضبوط قد کاٹھ کا ملک اندر سے بہت معصوم ہے مگر یہ جاننے کے لئے اس کے بہت اندر اترنا پڑتا تھا جب کہ باہر سنگلاخ چٹانیں اور خاردار تاریں ہی بہت بڑا ڈراوا بن جاتی تھیں۔

وہ معصوم ہی نہیں زور آور بھی تھا جبھی تو ساری دنیا کے سامنے اور اپنی عورت کے بھی جان لینے کے باوجود سینہ ٹھونک کر اس کا ساتھ نبھاتا رہا اور وہ اصلی عورت تھی کہ مرد کی اس مردانگی پہ کچھ یوں ریجھی نہ معاشرتی تحفظ چاہا اور نہ ہی اُس کے حوالے سے کوئی سماجی مقام رہا نہ جب تو اُسے وہ جانتی ہی کب تھی۔ یوں بھی جب اپنا آپ ہی ہر سمت نظر آتا ہو تو پھر دکھائی نہ دینے والے کا کھوج کہاں ضروری رہتا ہے۔ اور کسی کی نگاہوں میں آنے کے بعد دوسروں کی اُٹھتی نظروں کی پروا رہتی کسے ہے؟

اور پھر ملک کی نگاہیں!

جو اگر اُٹھتیں تو نہاں خانہء دل تک جا اترتیں۔ پتھروں کو پگھلانے والی نگاہیں موم ہوتے ہوئے دل پہ اُٹھیں تو گرم گرم سیال رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ وہ سراپا موم بنی ملک کی رضا کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی۔

گویا ایک بھرپور مست ندی گہرے سمندر میں اتر رہی تھی بظاہر سمندر کو سیراب کرنے اور یہ بھی سچ ہے کہ سمندر بھی محض ندی ہی کا طالب بن گیا۔ اس نے بھی پھر دریاؤں کی منہ زور لہریں دیکھیں نہ آسمان پہ چھائی گہری گھٹائیں اس کے لئے وہ ندی ہی کافی ہو گئی اور اس احساس نے ندی کی لہر لہر کو سرشار کر دیا یوں کہ وہ بوند بوند سمندر میں اُترتی چلی گئی۔

چاند پہ بیٹھی بڑھیا چرخا کاتتی رہی، کاتتی رہی یہاں تک کہ اُس دفعہ بھی اُس کی پاس برسوں کی پونیاں جمع ہو گئیں۔ مگر وہ تو بڑھیا کو جانتی ہی نہیں تھی۔ بھلا جوانی کا بڑھاپے سے کیسا تعارف! پھر چاند کی مسحور کن چاندنی میں جب وجود کا ایک ایک ساز لے دے رہا ہو، ساز و آہنگ سے جدا ہو کر بڑھیا کی پونیوں اور برسوں کا حساب کون رکھتا۔

وہ فاتح تھی اور فاتح کی طرح جی رہی تھی۔ گزرتا وقت اُس کے قدموں تلے تھا۔ وہ عورت تھی اور اپنا عورت ہونا منوا چکی تھی۔

وہ بھری محفلوں میں برملا کہا کرتی تھی۔

''وہ مرد ہی کیا جو مان جائے اور وہ عورت نہیں جو منوا نہ پائے۔''

اُس کے اس مقولے پر جب خواتین آسے حیرت و رشک سے دیکھتیں تو اُس کی گردن کا خم غائب ہونے لگتا اور سینہ کمر سے فاصلے بڑھانے لگتا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ چاند پہ بیٹھی بڑھیا بھی اُسے پہچاننے لگی اور گویا اُس کی اجازت سے پونیاں کاتنے لگی۔ جیسے اب اُس کی رضا پہ منحصر تھا کہ کب، کتنے برسوں کا انبار لگایا جائے؟ جبھی تو اُس نے اپنے طور چرخے کے پہیے پہ ہاتھ دھرا ہوا تھا۔ جتنے پل چاہے تھام لئے اور جس لمحے چاہا رفتار تیز کر دی۔

مگر!

پھر یکا یک جیسے بڑھیا نے چرخا کاتنے سے انکار کر دیا۔ پہیہ تھم گیا۔ کائنات کی نبضیں رُک گئیں۔ صدیاں بیت گئیں۔ مگر پل نہ گزرا۔

وہ جو سب کچھ لٹا کر اپنے طور چاند پہ قدم جمائے کھڑی تھی۔ اُسے آج یکا یک بڑھیا نے چاند سے دھکا دیدیا تھا اور اب اندر باہر ایک سناٹا تھا۔ مہیب خاموشی، جیسے ویرانے میں اماوس کی رات۔ زندگی کی تمام تر سانسیں جو اپنے طور اس نے دان کی تھیں۔ لُوٹ لی گئی لگتی تھیں۔ وہ جذبے جو امانتیں سمجھے تھے خیانتیں لگ رہے تھے۔ دل میں آتش فشاں ٹھنڈے ہو چکے تھے اور اب گہرے تاریک غاروں کے ٹھنڈے دہانے عفریتوں کی طرح منہ کھولے کھڑے تھے۔

اور وہ جو کڑی منزل بنی بیٹھی تھی خود گم کردہ منزل کی سرائے نکلی۔

بظاہر ہوا کچھ بھی نہیں تھا۔ محض ایک چھوٹا سا مذاق تھا۔ دونوں خوشگوار موڈ میں بیٹھے تھے اور وہ ملک کو چھیڑ رہی تھی۔

''مرد خواہ کچھ بھی ہو۔ بیوی باوفا چاہتا ہے۔''

''مگر مرد کی بے وفائی کا سبب بھی جانتی ہو؟''

ملک نے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''فطرت، سرشت''۔ وہ ہنسی۔

''اوں ہوں! مرد عورت چاہتا ہے......''

''پاک دامن و باکردار۔'' وہ بیچ میں بول پڑی۔
''بشرطیکہ وہ اپنی یہ پاکدامنی و بلند کرداری اپنے مرد پہ روا نہ رکھے۔''
''کیا مطلب؟''
وہ جیسے سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھی تھی۔
''مرد کو بیوی کے روپ میں عورت چاہیے، عورت۔''
ملک کے لبوں پہ خفیف مسکراہٹ اور آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔
''شرم وحیا کی پٹاری۔''
وہ پھر شرارت سے بول اُٹھی۔
''مگر یہ بند پٹاری دوسروں کے لئے ہو۔ اپنے مرد پہ وہ بند نہ رہے۔''
''خود بھلے دوسروں کی پٹاریوں میں جھانکتا پھرے۔'' اُس نے چھیڑا۔
''یہ دوسروں کی پٹاریوں پہ ہے کہ وہ کس حد تک کھلتی ہیں۔''
ملک نے جاندار مسکراہٹ کے ساتھ مضبوط لہجے میں کہا۔
''مگر اُس کی پٹاری بند رہے، ہوں!'' وہ ہنسی۔
''ہاں مگر دوسروں پہ۔'' ملک سنجیدہ تھا۔
''آ گئے ناراہ پر۔'' وہ کھلکھلا اُٹھی۔
مگر اچانک...... جا و مقام بدل گئے۔ وہ حیرت سے ساکت وصامت کھڑی تھی۔ ملک کی زبان نے عجیب سا سچ اُگل دیا تھا۔
''راہ سے بھٹکنے کا سبب ہی یہی تھا۔''

اصغر داد رس............ ہائیکوز

جو بھی ہے مایوس
وہ خود اپنا ہی قاتل
ہوتا ہے محسوس

☆

قرطاسِ صحرا
آندھی کی زد پر آ کر
دریا آ پہنچا

دُنیا مایا جال
اس کے رنگ و آہنگ پر
مٹتے ہیں کنگال

☆

مایا ہے پنہاں
آئینہ خانے سے دُور
سُورج آویزاں

ظفر کاظمی / صُورت بے صُورت......!

''کیا وہ اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے؟''

''ہم سب اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں؟؟''

''نہیں!''

اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی...... کمرے میں لگے کلاک کی ٹِک ٹِک ......، ٹِک ٹِک ......، ٹِک ٹِک اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگی۔

اکھڑی اکھڑی بے ربط سانسوں کی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

''نہیں، یہ نہیں ہو سکتا!''

''لیکن ...... مالتھس ......، ہاں مالتھس!'' اس نے اپنے ذہن پر زور دیا، 'یہی نام تھا۔'

ترقی پزیر ممالک ......، آبادی میں مسلسل اضافہ ......، محدود وسائل ......، ناگہانی قدرتی آفات اور اموات ......، کرپشن ......، کرپشن ......، کرپشن ......

یکدم اس کو محسوس ہوا کہ اس کے منہ سے رال ایک لکیر کی صورت میں بہتی ہوئی گردن تک آ پہنچی ہے۔ اس کو کوفت محسوس ہوئی۔ ''اوہ ......، یہ کمبخت مکھیاں!'' اس نے کوشش کی کہ اپنے ہاتھ سے ان مکھیوں کو اڑا دے مگر بے بسی ......، مکمل بے بسی تھی۔

اس نے چیخنا چاہا۔ اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا اور پھر وہی کلاک کی ٹِک ٹِک ......، ٹِک ٹِک ......، ٹِک ٹِک ......، الجھے ہوئے بے ربط تنفس کی آوازیں!

......، اور اس کی سوچ پھر اسی ایک نقطے پر مرتکز ہو گئی۔

''کیا وہ اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے؟''

''کیا ہم سب اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں؟؟''

''نہیں ......، یہ سب کچھ اتنی جلدی نہیں ہو سکتا!''

''ہاں ......، لیکن صورتِ حال ایسی ہی ہے!''

''تجزیہ غلط نہیں ہو سکتا ......، تجزیہ نگاری ایک باقاعدہ سائنس ہے!''

کتھارسس ......، کرپشن ......، ڈیزاسٹر ......، مالتھس تھیوری جیسے الفاظ اس کے ذہن میں گڈ مڈ ہونے لگے۔ نیلی، پیلی اور نارنجی روشنیوں کے بے شمار گولوں نے دائروں کی صورت میں تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ایک عفریت کا روپ دھار لیا۔

مکھیاں اب اس کے منہ میں اندر تک گھسنے لگی تھیں۔ اس نے اپنی بے پناہ مضبوط قوتِ ارادی سے اپنے ہاتھ اوپر اٹھانے کی کوشش کی لیکن یک لخت اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگ کے نچلے حصے کا گوشت کسی تیز دھار آلے سے کھرچا جا رہا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ گوشت خور چیونٹیاں مصروفِ عمل ہو چکی ہیں۔ یہ سب کچھ

ناقابلِ برداشت تھا لیکن بے بسی، مکمل بے بسی، وہی کلاک کی ٹِک ٹِک ......، ٹِک ٹِک ......، ٹِک ٹِک ......، بہت سے لوگوں کے بے ربط سانسوں کی بے ہنگم آوازیں ......، اب وہ ان کا بھی عادی ہو چلا تھا۔ پھر کہیں سے ایک نامعلوم سا نارنجی نقطہ بڑھتے بڑھتے اس کی طرف آنے لگا ......، ''مالتھس ......، اس کی تھیوری کام کر رہی ہے! بہت عجیب تھیوری تھی ......، لیکن ایسا صرف ترقی پزیر ممالک میں ہی کیوں ہوتا ہے؟'' اس کے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر ایک فلم سی چل پڑی۔ شاید کوئی ڈاکومینٹری تھی۔

ہیلی کاپٹر نیچے اتر رہا تھا اور ننگ دھڑنگے بھوکے، کمزور، لاغر انسانوں کا غول جس میں بچے، بوڑھے، عورتیں سبھی شامل تھے، ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کچھ اور نیچے آ گیا تھا۔ اب اس کے پائلٹ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اس کے بال براؤن اور رنگت سفید تھی۔ شکل وصورت سے گورا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی زبان میں زور سے کچھ چیخا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ لوگوں کو پیچھے ہٹنے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن ہیلی کاپٹر کو نیچے اتارنے کی جگہ نہ مل سکی۔ ہیلی کاپٹر اوپر اٹھا۔ اس نے فضا میں ایک چکر لگایا۔ بھوکے فاقہ زدہ انسانوں کی آنکھوں میں مایوسی کے سائے بھرنے لگے۔

وہ ایک ناشتے پر مدعو تھا۔ میزبان نے ریموٹ کنٹرول سے چینل تبدیل کر دیا اور غیر سنجیدہ، غیر رسمی لیکن کچھ کاروباری اور کچھ دفتری جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ وہ اپنے حصے کا ناشتہ ختم کر رہا تھا کہ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا، ''اوپر سے گرتی ہوئی چیزوں کو کیچ کرنے کی پریکٹس شروع کر دو!'' ناشتے کی میز پر موجود تمام افراد ایک دم چونکے۔ انہوں نے حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ میزبان نے فوراً اس عجیب صورتحال کو ہینڈل کرنے کی کوشش کی اور مہمانوں سے اس کا تعارف کروانے لگا لیکن وہ ماحول سے بے نیاز چیخنے کے انداز میں بولا، ''جب اکانومی collapse ہوتی ہے تو یہی کچھ ہوتا ہے!'' اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میزبان نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے پھر ریموٹ کا سہارا لیتے ہوئے ٹی وی چینل بدلا۔ وہ چینل پہ چینل بدلتا چلا گیا لیکن سارے چینل ایک ہی منظر دکھا رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر اوپر سے خوراک کے پیکٹ گرا رہا تھا اور فاقہ زدہ لوگ ان کو پکڑنے کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔

وہ پھر بولا، "Survival of the Fittest!"

درد کی ایک شدید ٹیس یک لخت اس کی ریڑھ کی ہڈی سے اٹھی اور اس کے اوپری حصے کی طرف بڑھی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ پھر ٹوٹ گیا ......، اور پھر وہی کلاک کی ٹِک ٹِک ......، ٹِک ٹِک ......، ٹِک ٹِک ......، بے ہنگم بے ربط سانسوں کی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکرانے لگیں۔ کوریڈور میں بوٹوں کی آوازیں ......، یک لخت دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا ......، شیشے والا دروازہ دیوار سے ٹکرایا ......، ایک چھناکا ہوا ......، اور آواز آئی،

''ان سب کو اٹھا کر ٹرک میں ڈال دو!'' ......، ایک ہلکی سی سرگوشی ......، ''پہلے ان سب کی جیبیں ٹٹول لو!''

ایک سایہ اسے اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوا ......، ''یہ زندہ ہے ......، اس کی نبض چل رہی ہے!''

''اس کے منہ پر سے مکھیاں اڑا دو ......، چادر اس کے سر تک کھینچ دو!''

ٹرک سٹارٹ ہونے کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی۔ کلاک کی ٹِک ٹِک کی آواز ختم ہو چکی تھی ......، لیکن پھر

وہی سوال ''کیا وہ اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے؟''
''ہم سب اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں؟؟''
پھر جانے اس میں کہاں سے طاقت آئی۔
ایک بجلی کوندی اور وہ زور سے چیخا، ''کرپشن کے نتیجے میں ڈیزاسٹر ہوتا ہے ڈیویلپمنٹ نہیں!''
ٹرک کے ٹائر چیختے چلے گئے اور ٹرک ایک جھٹکے سے رک گیا۔ بوٹوں کی آوازیں...... ''اسے اٹھا کر ٹرک سے باہر پھینک دو!'' کوئی بولا۔
وہ بڑبڑایا، ''مالتھس تھیوری......، ترقی پزیر ممالک......، غربت......، بھوک......، کرپشن......، ناگہانی قدرتی آفات......، اموات......، خوفناک تباہی......،
اس کی بڑبڑاہٹ بازگشت بن گئی۔
''ہم سب اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں؟''
مکمل خاموشی......!!

شمشاد احمد / روشنی

اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا...... خودکشی
جیب خالی ہونے کی وجہ سے وہ پیدل ہی چل پڑا
اس کے اردگرد زندگی معمول کے مطابق بھاگ دوڑ رہی تھی
وہ اپنی ذات کے قلعہ میں ہر شئے سے بے خبر چلتا چلا جا رہا تھا
وہ پل کے عین بیچ رک گیا...... نیچے پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا
''میری محبت!'' وہ کراہا
سورج دور ابھی افق پر تیر رہا تھا
''تھوڑا اور انتظار......''
اس نے آنکھیں بند کر لیں
اچانک اس کی سانس رکنے لگی...... ہوا کی جگہ گدلا، ریتلا پانی اس کے پھیپھڑوں میں بھرنے لگا
وہ بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا
پھر اس نے ایک مطمئن گھٹی چیخ ماری اور آنکھیں کھول دیں
وہ تھر تھر کانپ رہا تھا
اس نے سوچا کہ اگر خودکشی کرنا ہے تو پہلے اسے تیرنا سیکھنا ہوگا!

نصیر صدیقی / گمشدہ گیت

ایک صدائے غیبی سنائی دی۔ ''پیار بانٹتے چلو، اس جہاں میں۔'' اس صدا نے مزید صداؤں کو جنم دیا۔
آدمی: ''ہے کمی بہت''
بوڑھا: (کھانستے ہوئے) ''ہے کمی بہت میرے بچو!''
نومولود بچہ: (بولنے کی کوشش کرتے ہوئے) ''ہے تمی بہت''
آنے والا بچہ: ''......؟'' ''میں بول نہیں سکتا لیکن کچھ ''کمی'' یقیناً محسوس کرتا ہوں'' (یہ ضرور کسی نے کہا ہوگا)

اس دھرتی کے لوگ اس ''صدا'' پر کان نہ دھرنے کی پاداش میں مسلسل بے چینی اور بے بسی کی زد میں آچکے ہیں۔ دھرتی کے سدابہار ماضی کے گیت گم ہو چکے ہیں۔ دھرتی نے ایک بار اپنے ہی سینے پر کھڑے ہو کر سب کو پکارا اور التجا کی کہ اس کے گمشدہ گیتوں کو ڈھونڈا جائے لیکن کسی نے بھی دھرتی کی نہیں سنی۔ لہٰذا اب دھرتی نے خاموش رہ کر ایسا انتقام لینے کا سوچا کہ اس کے لوگ اوروں کے لئے سبق آموز مثال اور عبرت کا نشان بن جائیں۔ دھرتی کو اپنی معذوری اور گونگے پن کا شدت سے احساس تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ ''تاریخ'' جیسے ہتھیار کی مدد سے انتقام لے سکتی ہے اور اس ہتھیار سے اب تک کوئی بچ نہیں سکا ہے۔ یہ ہتھیار بہت ہی کارآمد ہے اور اس کا استعمال ایسے لوگوں پر کیا جاتا ہے جو اپنے وطن، قوم، اپنی دھرتی اور وقت کی صدا کو نہیں سنتے اور اس دھرتی کے لوگ یہ جرم کر چکے تھے۔

دھرتی نے اپنے عظیم انتقام کے پہلے مرحلے میں ان بے حس اور بے ضمیر لوگوں کو، جو اس کے نرم و گداز سینے سے چمٹے ہوئے تھے، ستانے، جسے جگانا بھی کہا جاسکتا تھا، کا عمل شروع کیا اور اپنا ہی پانی کھارا کر دیا اور تیزی سے پیا جس سے کھیت کھلیان ویران ہونے لگے۔

اب تاریخ کا ہتھیار آزمانے کا عمل شروع ہونے کو ہے۔ ساری تیاریاں دھرتی نے اپنی نگرانی میں زور و شور سے کی ہیں۔ البتہ دھرتی نے ہاتھ بٹانے کے لئے بہت سی اور طاقتوں کو بھی دعوت دی تھی۔ اس مدد میں اگر ایک طرف فرد کی ''خود غرضی'' آئی ہوئی تھی۔ تو اس کے شانہ بشانہ ''انا پرستی، ضد اور ہٹ دھرمی'' یعنی تینوں بہنیں بھی آئی تھیں۔

دھرتی نے تو سارا انتظام کر رکھا تھا۔ یقیناً اس کارِ عظیم میں انسانیت کے ناطے نیک کام کرنے والوں کا مذاق اڑانے کی ''مسکراہٹ''، نفرت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کا ''فن''، اپنا فرض دوسروں پر تھوپنے کا غیر ذمہ دارانہ ''عمل'' اور ظلم سہنے کی ''پرانی عادت'' بھی بڑھ چڑھ کر دھرتی کی مدد کرتے رہے۔ ان سب کی آمیزش نے وقت کی ''تیز رفتاری'' اور ایک دوسرے کی طرف صرف منہ دیکھنے کی ''روش'' کی مدد سے آخر کار وہ ہتھیار ایجاد کر کے ان بے حس، بے ضمیر اور پرانی تاریخوں سے سبق نہ سیکھنے والوں کے سینے میں گھونپ دیا۔ اس ضرب سے وہ لوگ بھی تاریخ کے سبق آموز ورق بن گئے۔ اور ''حال'' میں گم شدہ ہو گئے۔ بالکل دھرتی کے سدابہار ماضی کے گیتوں کی طرح۔ سب کچھ ختم ہو گیا صرف ''دھرتی'' رہ گئی۔

وزیر آغا

جی مانے تو چپکے سے

ان میری بھیگی آنکھوں میں تم رہنا سیکھو
کن ۔ بے آب جہانوں میں تم
سرگرداں ہو
پانی کی اک بوند کی خاطر
صحراؤں کو چھان رہے ہو
کہاں ملے گی تم کو وہ اک بوند
جسے سورج نے پل میں
جھپٹ لیا تھا
خاک کیا تھا
لہو کی بوند اگر ہوتی وہ
اُڑ جاتی پر اپنا سرخ نشان
زمیں پر چھوڑ کے جاتی
پانی کی ہر بوند تو بس
اڑنے کے لیے
یاں آتی ہے
تم اس کا نشان کہاں ڈھونڈو گے
جی مانے تو چپکے سے
بس میری بھیگی آنکھوں میں اک بار
لپک کر آ جاؤ
پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے!!

کبھی کبھی جب......

کبھی کبھی جب بادل اوڑھے
ٹھنڈی ٹھار ہوا آتی ہے
اور میں کمبل اون کی بھاری تہہ
کے نیچے دب جاتا ہوں
اپنے بدن کی گرم گپھا میں
گم ہوتا ہوں
مجھ کو، اپنے اندر
ایک ہجوم دکھائی دیتا ہے
بے چہرہ پرکھوں کا ایک ہجوم
جو بل کھاتا، لہراتا، کتنے
رنگ بدلتا پھرتا ہے
......ایک عجیب سا
کثرت اور تفریق کا منظر
جیسے چاروں جانب
دھوں والی دھند بچھی ہو!
تب اس دھند کے کینوس پر
اک چہرہ
جو صدہا چہروں کا
ایک عجیب مرکب ہے
آنکھیں پھاڑے
مجھ کو تکنے لگتا ہے
جیسے میرے چہرے کی ہر دھجی میں
اپنا چہرہ ڈھونڈ رہا ہو!!!

وزیر آغا

اَپ اینڈ ڈاؤن

فلک سے سیڑھیاں اتری ہوئی ہیں
زمیں سے آسماں کو جانے والے
منتظر بیٹھے ہیں
کب آواز آئے
اور وہ اپنے مقدر میں لکھی
سیڑھی پہ جھپٹیں
آسماں کی سمت اوپر کو اٹھیں
اوپر ہی اوپر
ان گنت پردے ہٹاتے
دُوریوں تک جھولتے جائیں!

سنو، ان جانے والوں کی
اڑانوں میں ابھی کچھ دیر باقی ہے
تو آؤ اُن سے کہتے ہیں:
تم اپنے من کے سونے پن کے اندر
جھانک کر دیکھو
عجب کیا ہے تمہیں
صدیوں پُرانی سیڑھیاں تیار مل جائیں
جو بل کھاتی
سیہ پاتال کے اندر ہی اندر
میخ سی بن کر اترتی ہیں
سیہ پاتال...... جس کے پار کی ریکھا
کسی نے آج تک دیکھی نہیں ہے!!

فراق

کیا ہوئے
وہ سُرمئی ایام جب
تُو ہی تُو تھا ہر طرف
میں بھی تھا...... لیکن کہاں
جیسے کوئی خم
گلابی پیرہن کی قوس کا
جیسے سلوٹ ابر کی
آکاش کے گُنبد پہ
اک زخمی کبوتر کی طرح!

یاد کر
وہ سُرمئی ایام جب
پیرہن، چادر کی صورت تن گیا
ابر، پانی میں ڈھلا
پھر اوک سے آکاش کی
نیچے گرا
اور جُدائی
میرے تیرے درمیاں
تلوار بن کر آ گئی!!

گلزار

کالی کائنات کی ہانڈی کب تک ابلے گی!!

لامحدود خلا...... ہی خلا......

بے انت سمے......

اور آگ ہی آگ...... دھواں ہی دھواں

اور گیسیں ساری کائنات میں

پل پل نووا (Nova) پھوٹ رہے تھے

سورج اور سیارے چھٹک کر

اربوں کھربوں میلوں تک چنگاریوں جیسے اڑتے تھے

نئی نئی دنیائیں مرتب ہونے لگی تھیں

کال کی مائی......

کائنات میں دُور دراز کی ایک نواحی گیلیکسی کے

گول سے اک سیارے پر

یہ کہہ کر اس کو چھوڑ آئی،

بے صبرا ہے یہ...... اپنے آپ ہی پل جائے گا!!

(۲)

سارا آنگن دھواں دھواں تھا

ماں چولہے پر بیٹھی کب سے گیلی لکڑی پھونک رہی تھی

آگ جلے تو...... توا چڑھائے

جب تک یہ بے صبرا بچہ......

دھوئیں کا آنچل کھینچ کے سر پہ آسمان کو تان رہا تھا

زرد افق کی چوٹی پکڑے

نیل سمندر باندھ رہا تھا......

کال کی مائی......

سوکھے تنکے توڑ توڑ کے، بالن کی وتھیوں میں رکھتی جاتی تھی

چھولھے میں جب آگ کا پیڑ اگے گا

تب روٹی اترے گی!

(۳)

ماں چولہے پر بیٹھی تھی

اور جہاں تک روٹی پھولے

یہ بے صبرا بچہ بیٹھا......

تھالی اوندھی سیدھی کر کے

رات اور دن، اور دن اور رات ہے،

کھیل رہا تھا

کال نے دیکھا......

ٹوٹ نہ جائے کانسی کا آکاش کہیں سے

جھڑ ناں جائیں چاول تارے

چاند کٹوری رکھ دی اس کی تھالی میں!!

(۴)

ماں چولہے پر ہانڈی رکھ کے بیٹھی تھی

کچے دانے گل جائیں اور......

ایک ابالا آ جائے......

یہ بے صبرا بچہ بیٹھا......

انگلی رکھ کے گول کٹوری کے اندر

گول گول تھالی پر تیز گھماتا تھا

کال کو ڈر ہے......

سولر سسٹم سے کوئی سیارہ اڑ کر

چولہے میں ناں آن گرے!

اف یہ کالی کائنات کی ہانڈی کب تک ابلے گی!!

گلزار

ایک ہی چہرہ......

''ڈارک روم'' کی ریڈ لائٹ میں
''سلور نائٹریٹ'' میں جب اپنی
نظموں کو کھنگالتا ہوں میں
ایک ہی چہرہ کیوں ان میں ہر بار اگھڑتا ہے؟
خوف ہراس، اور ابلی ابلی دو حیران سی آنکھیں
پیشانی پر نس ہے ایک، ضیا کے ساتھ ابھر آتی ہے
روہانسے الفاظ لبوں پر
ہونٹ کھلے سے، آدھی بات کہی اور آدھی رکی رکی سی
ورد سے ''رو دوں...... یا...... ہنس دوں'' کی حالت میں
آنکھیں ڈب ڈب کرتی ہیں......
سب نظموں میں تیرا ذکر نہیں ہے پھر بھی
ایک ہی چہرہ کیوں ان میں ہر بار اگھڑ کر آتا ہے؟

روز کسی فٹ پاتھ پہ......

روز کسی فٹ پاتھ پہ رات کو
چاک سے لاش کا خاکہ کھینچ کے
اروند اس میں سو جاتا تھا
روز صبح پھر اٹھ کر ہنستا تھا، کہتا تھا:
کل پھر اپنی لاش سے باہر
آن گرا میں کروٹ لے کر
آج کا دن پھر جینا ہوگا!
جب سے اس کو morgue میں
لے جا کر رکھا ہے
خاکے سب فٹ پاتھ پہ کروٹ لیتے ہیں

سورج کاٹ کے لانا ہوگا

دن کا ایندھن کاٹ کاٹ کر کلہاڑی سے
رات کا ایندھن جمع کیا ہے!
سیلی لکڑی، کڑوے دھوئیں سے
چولہے کی کچھ سانس چلی ہے!
پیٹ پہ رکھی چاند کی چکی
ساری رات میں پیسوں گا
ساری رات اڑے گا پھر آکاش پہ چورا
صبح پھر جنگل میں جا کر
سورج کاٹ کے لانا ہوگا!

تین ہی بلین سال بچے ہیں

آٹھ ہی بلین عمر زمیں کی ہوگی شاید
ایسا ہی اندازہ ہے کچھ سائنس کا
چار اعشاریہ چھ بلین سالوں کی عمر تو بیت چکی ہے
کتنی دیر لگا دی تم نے آنے میں!
اور اب مل کر
کس دنیا کی دنیا داری سوچ رہی ہو
کس مذہب، ذات اور پات کی فکر لگی ہے؟
آؤ چلیں اب......
تین ہی بلین سال بچے ہیں!!

ستیہ پال آنند / ساری باتیں سوچ چکو تو......

سوچو
سوچو
سوچو، اپنے جیون کے بارے میں سوچو
کیا کچھ کھویا، کیا کچھ اب بھی
باندھ کے کھیسے میں رکھا ہے
حال نے ماضی کے قرضوں کا کتنا کچھ بھگتان کیا ہے
کتنی پونجی مستقبل کی مٹھی میں اب بھی باقی ہے
سوچو
سوچو!

ماں تھی
وہ بھی واہگرو کے چرنوں میں جا کر آرام سے ایسے بیٹھی
پیچھے کیا تھا، بھول گئی سب
بابو جی تھے
چلے گئے ماں سے بھی پہلے
جیسے کوئی دیو پرش انسان کے چولے میں دھرتی پر
کچھ دن رہنے کو آیا ہو

بچپن، کھیل کھلنڈرا بچپن
بہنوں، بھائیوں، یاروں کے سنگ ایسے گزرا
کچھ بھی نہ سوچا
آگے او بڑکھابڑ جیون کی راہیں ہیں
کیسے کٹیں گی
اور جوانی کے آغاز میں ایسے سوچا
ہر پھل کڑوا، میٹھا، کھٹا

اپنے چکھنے کی خاطر ہے، چکھ کر دیکھیں
آگے ساری عمر پڑی ہے
فرصت ہو گی تو سوچیں گے کیا کرنا ہے
کام، کمائی، دھندہ، پیسہ، بیوی، بچے
گھر، کنبہ، بیوہار، مراسم، دنیاداری
شعر کہے، افسانے لکھے
بچوں کے استاد بنے، ٹیچر کہلائے
دنیا میں مشہور ہوئے، کچھ نام کمایا

سانسوں کی مالا میں پروئے،
لمحے، ہفتے، سال، مہینے
گنتی میں کب آ سکتے تھے؟
ریت کے ذرے
اک اک کر کے
ریت گھڑی سے ایسے گزرے
گرتے گرتے ختم ہوئے
دن بیت گئے!!

سوچا، شاید کام یہی تھا جو کرنا تھا
سوچا، اس سے بڑھ کر آخر
کوئی کر بھی کیا سکتا ہے!

سوچنے والی ساری باتیں سوچ چکو
تو یہ بھی سوچو
آگے کیا ہے؟
صرف اندھیرا!!
(ایک ذاتی نظم)

ستیہ پال آنند / شیر اور میں

مہربانو، قدر دانو
آپ سرکس میں ہمیشہ
میرے کرتب دیکھنے آتے رہے ہیں
شکریہ، اے مہربانو
آپ کے تشریف لانے کا، کہ میرا
آخری شو دیکھنے کے بعد میری
قدر و قیمت آپ کو معلوم ہوگی

شیر کا ہمدم رہا ہوں
تالیوں کی گونج
اور تحسین کے جملے مرا انعام ہے، جو
ایک مدت سے مری جھولی میں پڑتا آ رہا ہے
آج لیکن
داد کے جملے لبوں پر ساکت و جامد رہیں گے
تالیاں خاموش ہوں گی!

''کوئی آئے، کوئی جائے
شو تو چلتا ہی رہے گا!''
ہر تماشا گاہ کا پہلا مقولہ یہ رہا ہے
اور میں اس بات سے منکر نہیں ہوں
آپ سب تو جانتے ہیں
میرا کرتب وہ ہے جس میں
شیر کا منہ اور مرا سر
اک بھیانک کھیل کے دو
لازم و ملزوم جز ہیں
شیر کے منہ کا کھلا رہنا
مرے سر کے تحفظ کی علامت
ہر تماشے میں رہی ہے
آپ یہ بھی جانتے ہیں
جان پر یوں کھیل جانا
سہل اتنا بھی نہیں ہے
شیر تو پنجرے کا قیدی ہے، مگر اے مہربانو
میں بھی برسوں سے اسی معمول کا پابند قیدی

مہربانو، قدر دانو
آج شب میں اپنا سر جب
شیر کے منہ میں بہت دھیرے سے رکھ کر
اپنی آنکھیں میچ لوں گا
اور پس منظر میں سارے ''طبلچی''
آخری ''ڈیڈ مارچ'' کی دھن تیز کر کے
روک دیں گے
روشنی کا ایک ہالہ مجھ پہ ہی مرکوز ہوگا
تو مرا اپنا سدھایا میرا ہمدم شیر
اپنا پہلا کرتب بھول کر
یکبارگی جبڑوں کو اپنے بند کر کے
میری گردن کاٹ دے گا!

مہربانو، قدر دانو
شیر اور میں
ہمدم و دیرینہ مشرب
اپنی پابندی سے یوں آزاد ہوں گے!!

ستیہ پال آنند

یہ گوریّا اڑ جائے گی

زود نویسی کا الزام تو سر ماتھے پر
لیکن میں مجبور ہوں، آپا
میری مجبوری کو سمجھو
میرے اندر کی اس راکھ میں دبے ہوئے ہیں
کچھ انگارے
کچھ جلتی، بجھتی باتیں جو
گھٹی گھٹی سی
آہوں کے مانند مرے دل میں اٹھتی ہیں
اور پھر سسک سسک کر مجھ سے ڈرتی ڈرتی
میرے لبوں تک آ جاتی ہیں
اپنی عمر کے رہتے رہتے مجھ کو یہ باتیں کہنی ہیں
وقت بڑا جابر حاکم ہے
کیا وہ مجھ کو
یہ باتیں کہنے کی مہلت دینے پر راضی بھی ہوگا؟

دیکھو، شام تو پڑ ہی چکی ہے
عمر کے سایے ڈھلنے لگے ہیں
یہ گوریا رات کی تاریکی سے پہلے اڑ جائے گی
اس کو چہکنے سے مت روکو
اُڑ جانے سے پہلے اس کو
جتنے گیت بھی گا سکتی ہے
گا لینے دو!

(ادا جعفری کے لیے...... ان کی فہمائش کے جواب میں)

ادیب سہیل

پتھر

پتھر ہی تاریخ ہے پہلی
پتھر ہی تو ہیں الواح قدیمی!
پتھر جب جڑنے پر آئیں
جڑتے جڑتے بن جائیں وہ ایک مہان پہاڑ
پتھر جب ٹکرانے لگیں تو
آپس میں ٹکرا ٹکرا کر
حد نظر تک خشک سمندر ذروں کا بن جائیں
خواب سراب کے دیدہ وروں کو آئنے دکھلائیں

پتھر سارے ایک سے ہیں جب
کیوں پھر کوئی راہ گزر میں پگ پگ ٹھوکر کھائے
کوئی بنے ماتھے کا جھومر کوئی گلے کا ہار

پتھر سارے ایک سے ہیں پھر بولو کیوں
جگ باشی انسان؟
ایک کی خاطر جان سپاری
دوجے کا ایمان؟

پتھر پیار ہے
پتھر پوجا ہے
پتھر ہی بھگوان
پتھر گیان اور دھیان!!

اقتدار جاوید

خدا نے تجھے مجھ سے پہلے چنا تھا

روشنی سے تراشی ہوئی انگلیوں پر نہ گن
ایسے بیکار دنیاوی دن
مور چھل کو ہلاتی
ازل تیری باندی
ابد تیرے مہمان خانے کا دلگیر دربان
بڑے خاندانوں کے دکھ بھی بڑے ہیں
عرب تجھ پہ بھاری
عجم تجھ پہ قرباں
بجھے گی تری تشنگی آسمانی کنوؤں سے
خدا نے تجھے چن لیا ہے

ہزار اصفیاء رات کے سرد نو کیلے تختے پہ گریہ کناں
اطلسی آسماں پر کھڑی ہو کے کیا بیچتی ہو
جدا تیری دوکاں
الگ تیرے سودے

مری شہر بانو!
جہاں روشنی سے دھلے ہاتھ تُو رکھ رہی ہے
وہاں ایک نادیدہ گھاؤ ہے
غرقاب سارے سمندر ہیں
طوفان کی اوّلیں رات ہے
ایک سونے کی ناؤ ہے
ساحل کا دُل ہے

اگر ایک دن اور ہوتا
(قیامت کے بعد ایک دن اور ہوتا)
تو میں روشنی اور پھولوں سے آراستہ
راستے سے گزرتا
ترا ہاتھ تھامے زمیں پر اترتا
ترے ساتھ رہتا
ترے دکھ پہ روتا
ترے ساتھ جیتا، ترے ساتھ مرتا!!

اقتدار جاوید

دوپہر کا ستارہ

گلا پھاڑ کر چیختی دیوداسی
نے آنکھوں کا پانی نتھارا
خلاؤں نے بے تُقل جھولی اندیلی
ہواؤں نے زرتار گھونگھٹ سنوارا
کرشماتی ہیئت، طلسمی تحیر
عروسانہ خاموشی، بھاری غرارا
جلی بے طرح سبز سر سبز لکڑی
نگاہوں میں پھیلا توے کا شرارا
چمکتے کناروں پہ رنگین مٹی
بدن کھول کر رکھ دیا اُس نے سارا
پلٹ آئی کاغذ کی ناؤ بالآخر
علائم کا لشکر، فلک تاز دھارا
نم آلود ڈھانچے میں عرشی ہیولا
مچھیروں نے ہنس ہنس تھپیڑوں پہ مارا
ابھر آئی پانی کے نیچے سے بستی
نظر آ گیا دُور سے گھر ہمارا
ہمارے بدن قفسی ہیں رگڑنے
سے لودیتا ہے آسیانہ تمہارا
تھا بالشت بھر دُور چرخ دولابی
تڑپتے ہوئے پیٹ میں گرم بھالا اتارا
جبیں داغتا ہے رگیں کاٹتا ہے
یہ چیچک کا دانہ یہ زہریلا پارا
جلائے گی سیال آتش لہو کی
کرے گا کوئی تر مرے کا نظارا
یہ بے جسم مخلوق پائے کہاں پر
زمانوں کا ناسور، اندھا غبارا
نہ چیخی گلا پھاڑ کر دیوداسی
نہ دیکھا کسی نے، کسی نے نہ دیکھا
لرزتا ہوا دوپہر کا ستارا!!

جیسے آکاش میں سوراخ کوئی

وہ کسی صوت کا آمیزہ ہے
یا خلاؤں میں بھٹکتا ہوا اک ریزہ ہے
جب خیالات کی تہ داری سے
کسی کرتب، کسی عیاری سے
اس کی تصویر ابھر آتی ہے
ماند پڑتے ہیں خد و خال معاً
جیسے بے تہہ نظر آتی ہے پاتال معاً
یا مجھے سیلِ معانی کی وہ رو لگتی ہے
جس میں الفاظ کنارہ کر لیں
یا ریاضی کا ہے مفروضہ کوئی
جس میں اعداد صفر رہتے ہیں
اپنی ہیئت میں عجوبہ سا ہے
جیسے آکاش میں سوراخ کوئی
جیسے پانی سے لدی شاخ کوئی
جس طرح جال لکیروں کا پڑے پتے پر
جس طرح اوس کا یہ قطرہ اڑے پتے پر!!

شاہین مفتی

ناممکن سے ذرا آگے

ہمیں معلوم ہے اب زندگی کے سرد صحرا میں
کسی خورشید کی آمد
یقیناً معجزے سے بھی کوئی اگلا قدم ہوگا
مگر ہم خوش گمانوں کو
کسی سورج، کسی مہتاب اور تاروں سے کیا لینا
جمالِ یار کا نقشہ ہے دامن پر
نظر کے تاپنے کو ریت کافی ہے
سرابِ آرزو اک تشنگی کا استعارہ ہے
اسے جتنا بسر کر لیں خسارہ ہی خسارہ ہے
سو ہم جیتے ہیں اک تمثیل کی صورت
وہی دامن کے کونے پر جمالِ یار کا نقشہ
وہی آنکھوں کے گوشے میں کئی صحراؤں کی وحشت
وہی دو چار گدلائے ہوئے آنسو
ہمارا ان دنوں بس ایسی چیزوں پر گزارا ہے
نہ کوئی شب ہماری تھی نہ کوئی دن ہمارا ہے
نہیں درکار ہم کو گر یہی عالم دوبارا ہے

انوار فطرت

شام کنارے کھڑی اکیلی بات

اپنے ساون
اپنے بھادوں
بیت چکے ہیں
اب آئے تو کیا آئے
رس کی گگری چھید پڑے
ٹپ ٹپ سارا
بہہ گیو سائیں
تن سارا اب
چپ چپ ہوئیا

آؤ!
دونوں مل کر
پل بھر
اک دوجے کو رولیں!!

انوار فطرت / آفریدہ، نا آفریدہ

درِ حیرت سے باہر جھانکتا ہوں
وہ صدیوں کی گلی میں قطرہ قطرہ گر رہی ہے
بھیگتا ہوں
بھیگتا جاتا ہوں اندر تک
جہاں ویران سکتے ہیں
ہوا کی سائیں سائیں
ہول کے گرداب میں سہمی ہوئی ہے

آسماں
گردش میں تو ہوگا
مگر آنکھوں پہ رکھے بوجھ کا
کوہِ سیہ
اوپر کی جانب دیکھنے بھی دے!

نگاہوں کے سمندر میں
زمانہ اندھے شیشے کے وراء
منظر سا لگتا ہے
مرے اندر وہ ذرّہ پاش بیٹھا ہے
میں تل تل چیتھڑے بن کر
فضائے روح میں بکھرا ہوا ہوں

جہاں دل ہے
وہاں سے مغز تک جانے میں
نوری سال پڑتے ہیں
نگہ سے قوت گویائی کی جانب

یہ بیسوں بیس صدیاں چل کر آیا ہوں
کسے معلوم
کتنی اور صدیاں
اور چلنا ہے

زمانے میں تجھے تخلیق کرتا آ رہا ہوں
جانتا ہے تُو
مری آنکھیں تری تجسیم کرتی آ رہی ہیں
اگر میں چاہتا تو
اپنی آنکھیں موند لیتا
کس میں ہمت تھی
جو مجھ کو روکتا
مگر میں منتظر تھا
اور ابھی تک منتظر ہوں

مری صدیو......!
درِ حیرت کے اس جانب
یہ میرا خواب گھر ہے
جس کے طاقوں، آلنوں اور کارنس پر
میں نے کچھ نیندیں سجا رکھی ہیں
اک سپنوں بھری چھن بھیج دو
ممکن ہے ایسا ہو
کوئی زرخیز سا قطرہ
سمندر بن سکے
اور میں جنم لوں!!

رفیق سندیلوی / مگرمچھ نے مجھے نگلا ہوا ہے

مگرمچھ نے مجھے نگلا ہوا ہے
اِک جنین ناتواں ہوں
جس گھڑی رکھی گئی بنیاد میری
اُس گھڑی سے
تیرگی کے پیٹ میں ہوں
خون کی ترسیل
آنول سے غذا
جاری ہے
کچی آنکھ کے آگے تنی
موہوم سی جھلی ہٹا کر
دیکھتا ہوں

دیکھتا ہوں
گرم گہری لیس کے دریا میں
کچھوؤں، مینڈکوں
جل کیکڑوں کے پارچوں میں
اُوجھڑی کے کھردرے ریشوں میں
سالم ہوں
نبود و بود کے تاریک اندیشوں میں
باہر کون ہے
جو ذات کے اس خیمۂ خاکستری کے
پیٹ کے پھولے ہوئے
گدلے غبارے پر
ازل سے کان رکھ کر
سُن رہا ہے

ہاتھ پاؤں مارنے
کروٹ بدلنے کی صدا

پانی کا گہرا شور ہے
اندر بھی، باہر بھی
برہنہ جسم سے چمٹے ہوئے ہیں
کائی کے ریزے
مجھے پھر سے جنم دینے کی خاطر
زچگی کے اک کلاوے نے
اُگلنے کے کسی وعدے نے
صدیوں سے
مجھے جکڑا ہوا ہے
ماں
مگرمچھ نے مجھے نگلا ہوا ہے!

رفیق سندیلوی

تُو تتلی تھی

تُو تتلی تھی
چھوٹی سی ایک بھنبھیری تھی
تیرے فرغل میں ہر رنگ تھا
تیرے سنگ تھا
موسم
پھول ترے متوالے تھے
تیرے گرد سُنہری ہالے تھے

تنکے کی طرح
کس آندھی نے
تجھے رکھا اپنے ہاتھ پہ
ماری پھونک
اُکھاڑے پتّوں کے خیام
پَروں کے پیراہن میں
کس نے لگا دی آگ
بتا کب بیضۂ بخت کو ٹھونگ لگی
پُھنکارکے روپ کے لاروے سے
نکل آیا ہے کیسے ناگ
بتا کس طرح اُگے
ترے ماتھے پر یہ سینگ
مُڑے کب پیر
بدل گئی کیسے تیری جُون
بدن کی دھجیوں پر
یہ ملا ہے کس کا خون!

اِک مائع آتش گیر

اک روغن دھندلے رنگ کا
اک مائع آتش گیر
بالائی تہوں پر بہتا ہے
ازلوں سے پیرا فین
سُوراخ کیا
خود سینۂ سنگ میں
برمے سے
اُمڈ آئی ہے
تیل کی لہر
یہ تیل چراغ جلائے گا
فوارہ تازہ خون کا
شادابی لائے گا
یہ آنسو
ڈھل کر ایندھن میں
پہیوں کو اور گھمائے گا
وہ پہلی کہانی اور تھی
اب نئی کہانی اور ہے
وہ صحرہ دانی اور تھی
یہ صحرہ دانی اور ہے!

رفیق سندیلوی

یہ سجیلی مورتی

اے ہوا

پھر سے مجھے چھو کر قسم کھا

صحن میں کس نے قدم رکھے تھے

چپکے سے

یہاں سے کون مٹی لے گیا تھا

وقت کی تھالی میں

کس نے لا کے رکھ دی

جھلملاتی لو کے آگے

رقص کرتی یہ سجیلی مورتی

جس کے نقوشِ جسم

روشن ہو رہے ہیں

ویشیا کے ہونٹ

پاؤں اک گرہستن کے

خمیری پیٹ میں

مخمل کی لہریں

نوری و ناری، سبک اندام لہروں میں

بھنور اک گول سا

پھر سے مجھے چھو کر قسم کھا

اے ہوا!!

تو جانتی ہے

راز سارا

دو طرح کی مٹیوں کو

ایک برتن میں ملا کر

گوندھنے کا!

ریاض احمد

ایک تاثر!

اب نہ اتریں گے صحیفے آسماں سے

اب تو ہم اپنے صحیفے خود لکھیں گے

شومیٔ تقدیر سے

ان صحیفوں کا کوئی قاری نہ ہوگا

آخرش اپنے لئے بھی ان کی ابجد اجنبی ہو جائے گی

اور ہم خفت مٹانے کے لئے

پیچھا چھڑانے کے لئے

یوں کہیں گے

ہم نے جو لکھنا تھا وہ تو لکھ چکے

اب اسے پڑھنا تمھارا کام ہے

پھر کوئی دانائے راز

اپنے قلم سے

ان صحیفوں کے بجھے الفاظ کو روشن کرے گا

تو صریرِ خامہ کے معنی بھی لو دینے لگیں گے

اور ہم یہ سوچتے رہ جائیں گے

لفظ اپنے ہی سہی، لیکن یہ معنی؟

کیا ہمارا بھی یہی مقصود تھا؟

(نوٹ) محترمی و مکرمی ناصر صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ ان سطور کا مطلب کیا ہے۔ آپ کا قلم ان الفاظ کو روشن کر دے تو شاید ان میں معانی لو دینے لگیں۔ وضعدار لوگ اس بات کو یوں کہتے کہ ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو ''تحسین ناشناس'' سمجھ کر آپ قبول کر لیں تو میرے لئے باعث اطمینان ہوگا۔ (ریاض احمد، لاہور)

فرخ یار

تاریخ اپنے کھاتے نئی کتابوں پر منتقل کر چکی

اوما اوما

دیکھ ترے ویرانوں سے تانبا نکلا ہے
دیکھ تری گلیوں پر
کیسے کیسے دن اترے ہیں
ہرے سنہرے بھرے بھرے دن
ایسے دن جن کی مٹھی میں
آنے والی دنیاؤں کے بیج پڑے ہیں

اوما اوما

پکنے دے کچھ دن یہ مٹی
یہ مٹی جو کھڑے کھڑے پیروں میں
گرم تنوں سے ریزہ ریزہ گرتی ہے
اور ہم جیون اوٹ سے
صدیاں گنتے رہ جاتے ہیں

اوما اوما

بہنے دے کچھ دن یہ پانی
یہ پانی جو اونچے پربت کے بل کھاتے
بے ترتیب نشیبی رستوں سے اترا ہے
یہ پانی، جس کے عکس میں
گھائل دل ہے
نیلے پَر ہیں

اوما اوما

دیکھ ترے کھیتوں، کھلیانوں، تہہ خانوں کے
قصے میں
کہیں کسی شہزادے،
دھول اڑاتے رتھ کا ذکر نہیں
تجھ کو گیلے پہناوے میں
شہزادوں سے، دھول اڑاتے رتھ سے کیا لینا ہے
پکنے دے کچھ دن یہ مٹی
بہنے دے کچھ دن یہ پانی!!

فرخ یار

خون اپنی گواہی پہ قائم رہا

دِل میں جو فاصلے تھے
کہاں طے ہوئے
خواب ایسی چھتوں سے اتارے گئے
جو برابر نہ تھیں
اور ہم بند کمروں کے تاریک
کونوں میں وسط ایشیائی کہانی کے
سوداگروں کی طرح
خوف کا پیٹ بھرتے رہے
دن گزرتے رہے

ہم نے کیکر کے پھولوں
پھلاہی کی خوشبو میں وعدے کیے
اور پرانی کتابوں میں رکھے ہوئے
مور کے پر کو بوسہ دیا
......سو گئے

اجنبی سرزمینوں سے آئے ہوئے
کارواں
نیلگوں پانیوں پر اُترتے رہے
دن گزرتے رہے!!

ORACLE 2010

جہاز اڑتے رہے ہمارے
طویل راتیں
کھنچی ہوئی تیسرے فلک تک
قدیم موسم
کہ جن کی جیبوں میں لا کروں میں
ہوا بھری تھی
بدن گواہی کی ساعتوں میں
نگل گیا وہ لکیر جس پر
قلم بیاں سے
بیاں قلم سے جڑا ہوا تھا

وصال تھا
اور وصال کی سیڑھیوں پہ خدشات
کھل رہے تھے
تھکی ہوئی انگلیوں نے
جانے کہاں کہاں کیا نشاں بنائے
مکالمے کے ہزار صندوق کھل رہے تھے

ہمیں لگا، جیسے اپنی مٹھی میں آ گئی ہوں
کئی زمینیں کئی ستارے
جہاز اڑتے رہے ہمارے!!

فرخ یار

راہداری خالی کروائی جا رہی ہے

ہاں وہ حکم جسے اس ارض و سما کے بجھتے پہروں میں
میزان کی منزل ہونا ہے
وہ حکم ابھی کچھ دیر میں
دستاویز پہ لکھا جائے گا
اور گہری رات کی ویرانی میں
روشن آنکھوں والے
دیدہ نادیدہ کے باہر
پرکھوں کی قبروں سے ہوکر
ہجرت کا دروازہ کھولیں گے

کتنی نسلیں اپنے اپنے
جیون کے زنداں میں
اس ہجرت سے جڑی ہوئی ہیں
ہم خوش بخت کہ اپنے اپنے جیون کے زنداں میں
دشت و بیاباں اور باغوں کی دیواروں سے
جو بھی خط کھینچیں گے
اس سناٹے تک جائے گا
جس سناٹے کے سینے میں
خاک اور خون کی حیرانی میں لپٹی صدیاں گونج رہی ہیں

ٹھہر اے دل!

عمودی زائچوں سے
منحرف ہونے کا لمحہ آن پہنچا ہے
ٹھہر اے دل،
ذرا اگلی گلی سے
ہو کے آتا ہوں
ٹھہر جا، اب نویسندہ
بیاں تبدیل کرنے پر
نہ قادر ہے نہ مائل ہے
وہ دن تو ہم گزار آئے
جنھیں سورج نظر انداز کرتے ہیں
جنھیں اندراج کی منزل نہیں ملتی

ٹھہر اے دل!
ٹھہر جا، اب زمیں کے باب میں
تازہ کہانی کا اشارہ ہے
درختوں میں
ہواؤں سے پرندے چہچہاتے ہیں
ہمارے آئنے ڈھلنے کی باری ہے!

پروین طاہر

التباس

ہمیں کس نے دھکیلا اس طرف
ان نور برساتی ہوئی نیلی فضاؤں سے
عنابی سرخ پھولوں سے اٹی
مخمل ردائی سرزمینوں سے
کنارِ آبِ جُو سے
وہ جہاں سیال چاندی بہہ رہی تھی

ہمیں کس نے جگایا
گنگناتے خواب سے
جس میں کسی لحنِ مسلسل کی
حسیں تکرار سے میٹھے مدھر نغمے اُبھرتے تھے
وہ جادو سی جکڑ پاؤں میں، آنکھوں میں
سماعت میں

ہمیں کس نے ہٹایا فیض پرور رہگزاروں سے
وہ جن کی ریت پر من کی فروزاں روشنی سے
ان سرابوں کی چھبی بنتی
کہ جن کی تشنگی سے روح تک سیراب رہتی تھی
ہمیں کس نے ....

لمحہ بے کار چلا جاتا ہے

لہرا اٹھتی ہے
کبھی ذہن کے خلیات
کبھی خون کی شریانوں سے
ایک سایہ سا کبھی من سے نکل
آنکھ کے آگے لپکے
''میں ہوں'' ''میں ہوں''
کاردھم دور تلک
رات کے سناٹے میں
خودشناسی کے بیابانوں میں
جاگ جاتا ہے تو
پھر پاؤں فقط ایک ہی گھمسن میں
کئی لاکھ دشائیں روندیں

کتنا بے کار چلا جاتا ہے اجلا لمحہ
ہم تو بس وقت گزیدہ ہیں
خمیدہ سر ہیں!

پروین طاہر

روح شکن

جہاں سارے نگر اور بستیوں سے
لوٹتے رستوں کا سنگم ہے
وہاں سب سے بڑے میدان کے
کیلے ہوئے اس دائرے میں
نصب تھا صدیوں پرانا جو مجسم
اب سنا ہے ٹوٹ کر گرنے لگا ہے
روشنی کی تیز دھارا کی
نکیلی کاٹ سے کٹنے لگا ہے

طلسم اس دائرے کا
اور سنگی پیرہن اجلا
ہمیں جو دور سے منزل
کبھی راہیں بجھاتا تھا
اگر خود ریت مٹی اور ملبے میں بدل جائے
تو پھر کیسے ہمیں وہ منتشر ہونے
بکھرنے سے بچائے گا!

کیا گماں خضر بھی ہو سکتا ہے

کشتیاں راکھ ہوئیں
انگلیاں آدھ جلے
عزم کے ٹکڑے ڈھونڈیں
سامنے پھیلا ہے صحرائی بگولوں کا غبار
اور
عقب میں ہے سمندر کی ہنسی

سن ذرا شہر گماں!
ہم تو مدہوشِ تخیل
تری گلیوں کے، گذرگاہوں کے
تجھ کو سر کرنے کی
پانے کی معطر خواہش
آنکھ کے آگے
کوئی جال بُنے رکھتی تھی

کان بھی
ٹھیک طرح سن نہ سکے
خوف سے بدکی ہوئی
تیز ہوا کی ہلچل
جال کے پار فقط ایک جھلک دکھلا کر
یہ ہمیں کونسے ساحل پہ اتارا تُو نے؟

پروین طاہر

خودگریز

کوئی خوابوں میں چندن پیڑ ہے
جس کی شرارت سے بھری شاخیں
گھنی نیندوں میں دھیرے سے
کبھی جو گدگداتی ہیں
تو منظر جاگ اُٹھتے ہیں
وہ من کی اوٹ میں رکھے ہوئے
ننھے دیے کی لو
ہوا کے ساتھ مل کر
چرمرائے زرد پتوں میں
شرر سا پھینک دیتی ہے

الاؤ!
اک الاؤ
الاماں چندن کا سلگاؤ
سلگتا ہے تو خوشبو پھیل جاتی ہے
خود اپنی ہی مہک سے دم اُلٹتا ہے
دبے پاؤں، گریزاں، دُور
پھر سے خواب منظر میں
اچانک لوٹ جاتا ہے
سلونا پیڑ چندن کا!

Beyond Distance

نہ جانے کون سے پل
حکم نامہ ہجر کا
قاصد اُٹھا لائے
نقارہ کوچ کا بجتے ہی
دل کے ساربانوں نے
پڑاؤ چھوڑ دینا ہے
کسی کو وقت نے
مہلت نہیں دینی
کہ آنکھوں میں
کوئی آنسو سجا لے
وقتِ رخصت
الوداعی ہاتھ لہرا لے
کسی کا لمس زادِ زندگی کر لے

بچھڑنا ہی اٹل ہے تو
ابھی سے دُور کیا رہنا
ابھی کیا فاصلوں کو درمیاں رکھنا!

شبه طراز

صور پھونکے جانے سے پہلے

درد کی شدت کی کوئی سمت بھی ہوتی نہیں
دور تک بس اک خلا ہوتا ہے......اور
خامشی......صحرا کی وسعت
چار سو گہرا اندھیرا......روشنی ہوتی نہیں
کہکشائیں سو گئیں
منجمد دریا ہوئے، ٹھنڈے الاؤ ہو گئے
کائناتی وسعتیں پھر سے سمٹ کر
ایک نقطہ ہو گئیں
اک سفر آغاز کا
ازلوں سے جاری ہے
ابد......انجام سب آزار ہے
زندگی درکار ہے......
یہ آنکھ پتھر ہو گئی......روتی نہیں
درد کی شدت کی کوئی
سمت بھی ہوتی نہیں......!

"یا مُصَوِّرُ"

زندگی......
ہے آگ کا اک دائرہ،
اور دائرے کو پار کرنا
بن جلے،
ہے اک ہنر
جو جل گیا سو جل گیا
جو پار کر لے......باہنر
سب نے گزرنا ہے......مگر
......یہ کھیل جاری ہے ازل سے
اے ابد تحریر کرنے والے
تُو پنسل اٹھا،
آگ اب بجھنے کو ہے،
دیکھنے والے سبھی ہیں منتظر
اک آخری منظر بنا......!

ارشد معراج

پیار ہمارا بھاگ نہیں

ترے وجود کی خوشبو سے جسم ڈھانپ لیے
کھلائے پھول گلابی سے خواب آنکھوں میں
نظر سے چھوتے گزرتے رہے عذابوں سے

وہی پرانا تجسس رہا رگ و پے میں
کہ سائن بورڈ کی، صورت دلوں کی سڑکوں پر
وصال ہو تو محبت کی شہرتیں پھیلیں
جو شہر بھر میں ہمارے لیے تفاخر ہوں

کبھی یہ شام بدن کاسنی سا ہے جس کا
وہ اپنے ساتھ اداسی کو کھینچ لائے تو
تری تمنا کے پنچھی مچلنے لگتے ہیں
سماعتوں میں Enigma کے گیت گونجتے ہیں
ہماری وحشتوں کے سب دریچے کھلتے ہیں
خمار اترتا نہیں ہے کہ ہم یہ جان سکیں
یہ کس نے باندھ کے رکھا ہے تیری یادوں سے
کہ جیسے مچھلیاں Aquarium کی قیدی ہوں

سنو کہ ہم ہی وضعداریاں نبھاتے رہے
کسی بھی ڈر سے کبھی راستے نہیں بدلے
وفا گمان سمجھتے رہے ہیں تیرے سوا
کسی کی چاہ میں دن رات ہم نہیں پگھلے

مارکیٹ کی روشنی میں دھندلاتے خواب

کمال کرتے ہو تم بھی ارشد!
یہ دور ڈسپوزیبل ہے بھیا اور اس کی چھتری تلے
رویّوں کی دھوپ چھاؤں پنپ رہی ہے
جدائیوں کا شمار کیسا......؟
یہ زرد پتوں کی آہٹوں کا دلوں میں رکھنا ملال کیسا؟
وہ دھیمی دھیمی تمازتوں کا خیال کیسا ؟
کہ گیلے ایندھن کو پھونکنے سے فضا دھوئیں سے
بھری ہوئی ہے، وہ ساعتیں بھی ہتھیلیوں پہ رکی
نہیں ہیں کہ مارکیٹوں کی روشنی جب سے دل
کے آنگن ٹھہر گئی ہے ہمارے ملبوس تیرگی سے
اٹے ہوئے ہیں، کبھی تعلق کا نوحہ میں بٹے ہوئے ہیں
مگر یہ کیا ہے
تمام شب ہم نے روئی کاتی
تو پھر سویرے سیانے تاجر
مکاں سے اگلے مکاں کی جانب چلے گئے ہیں
ہماری اجرت ہوا کے رخ پر بکھر گئی ہے

یہ جدلیاتی اصول سارے
تضاد کے سب عمل تبدل
ہیں فیکٹری کے اگالدانوں کی پیک بھیا
ہماری نیندوں میں
کاربن کے سیاہ سپنے
پگھل رہے ہیں!

ارشد معراج

فوڈ فیسٹیول

ہند سندھ کے پکھنو اکثر اڑ جاتے ہیں
سات سمندر پار......
سوہنے کب آتے ہیں
آنکھیں دیواروں میں چُن دیں
سانس کے رتھ کو ہم نے کھینچا......
جیون کو پاتال میں ڈھونڈا
عمر گنوائی
خود کو یہ سمجھاتے صاحب
ہندسوں کا یہ گورکھ دھندہ
بھول بھلیاں......

دل کے لان میں
گڈی کاغذ کے پھولوں کی خوشبو پھر بھی
زندہ رہنے کو کہتی ہے
ماں کہتی ہے
"اٹھ جا پُتر!
فجری ویلے سوہنا مالک روزی ونڈدا
توں وی اپنا حصہ لے لے"
وہ کیا جانے
تخمینوں کی ریت اڑتی ہے
اسی فیصد گرد میں اَٹ کر
کھانستے کھانستے مرجاتے ہیں
دور دیس کو جانے والے کب آتے ہیں

ڈاکٹر انور مینائی

مَوت

تن کی خاطر
پیامِ فنا
ہوں ازل سے
مگر
روح کی روشنی کے
سفر کا
نیا سلسلہ
بھی ہوں مَیں......!

قیادت

لال، پیلے
جامنی
نیلے
بنفشی
رنگ تو سب
دلربا ہیں
خوش نما بھی ہیں
مگر
ان سارے رنگوں کی
قیادت کرتا ہے
رنگِ سفید......!

یہ بے خبری مٹی

مٹی کی یہ خواہش بڑی پرانی ہے
اس کے اندر
ازل سے آنکھیں موندے لیٹی
ہریالی بھی جاگے
اس کی عریانی کو ڈھانپے
مٹی کو
ست رنگی آنچل اوڑھے رکھنے کی خواہش نے
پاگل ہی تو کیا ہوا ہے
لیکن!
یہ بے خبری، صحراؤں کی مٹی
جس کے لیکھ میں قرنوں سے
اپنی عریانی اوڑھ کے جینا لکھا ہے
کیا جانے!
ٹھنڈے جل سے بھرے ہوئے
بادل کے ٹکڑے
اس جانب کب آتے ہیں
اور آ بھی جائیں
تو مٹی کے خشک لبوں پر
پیار بھرا اک بوسہ ثبت کہاں کرتے ہیں
اس کو ننھی بوندوں کی
سوغات عطا کب ہوتی ہے

کبھی مل گیا تو

کئی لوگ ہیں
جو اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں
یہ بیزار، بکھرے ہوئے، دل گرفتہ
سب اپنی دعاؤں کی درماندگی
اس کی بے اعتنائی سے نالاں
بلاتے بلاتے اسے
تھک چکے ہیں
یہ سب اس سے شاکی ہیں
خود اپنی تقدیر لکھنے کے خواہاں
خود اپنی خطاؤں، سزاؤں کی فہرست
کو دیکھنا چاہتے ہیں

کسی دن اگر وہ انہیں مل گیا تو
سوالات کا ایک لامنتہی سلسلہ
اس کو درپیش ہوگا
سوالات جو
کتنی صدیوں پہ پھیلی
مسافت کی لاحاصلی سے جڑے ہیں
جو مجبور و مقہور سینوں کے اندر
کراہوں کی صورت رکے ہیں
لہو میں جو اک
گہرا دکھ بن کے اترے ہوئے ہیں

نصیر احمد ناصر/آنکھیں

ہم ستارہ!

ہم ستارہ!

دید کی گہرائیوں میں

کون سی آنکھیں رکھی ہیں

دل کی آنکھیں

یا کسی سپنوں بھرے چہرے پہ چپکی

چھوٹی چھوٹی خوبصورت

گڑیا جیسی گول آنکھیں......!!

ہم ستارہ!

ہم ستارہ!

رات کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں

مگر دن کے اجالے میں دکھائی ہی نہیں دیتیں

سنا تم نے

کسی آواز کی کرنیں دہائی ہی نہیں دیتیں

جو زندہ ہیں

انہیں یادوں میں آنے کے لئے

مرنا پڑے گا

زندگی کی چھوٹی چھوٹی

دکھ بھری خوشیاں مگر ہم کو رہائی ہی نہیں دیتیں

ذرا جلدی چلو......اب وقت کم ہے

کاغذوں کے ڈھیر میں گم

روشنی کا دم گھٹے گا

کچھ ہمیں اس کے لئے کرنا پڑے گا!

ہم ستارہ!

ہم ستارہ!

دن کی آنکھیں کس قدر ویران ہیں

بادل بہت نیچے اتر آئے ہیں

چاہو تو پکڑ لو ہاتھ سے

سورج ابھی گزرے گا

بھاری تیز قدموں سے لڑھکتا بھاگتا

پتوں بھرے فٹ پاتھ سے

کھڑکی کھلی ہے

دیکھنا مت!

دیکھنا مشکل ہے

اپنی آنکھ کی بینائیوں میں

ہم ستارہ!

ہم ستارہ!!

کون سی آنکھیں رکھی ہیں

دید کی گہرائیوں میں......!!!

نصیر احمد ناصر

دیوارِ قہقہہ

دیکھو دیکھو!!
اوپر سے نیچے تک دیکھو
آگے سے پیچھے تک دیکھو
جنگل اور پہاڑ سے لے کر
گھر کے باغیچے تک دیکھو
چڑیا، باز، ہُما اور ققنس
ہر پنچھی کی بینائی سے
حدِ فلک کی پہنائی سے
اُڑتے غالیچے تک دیکھو
شہروں میں، دیہات میں دیکھو
دن میں دیکھو، رات میں دیکھو
رستوں کے اطراف میں دیکھو
گدلے میں، شفاف میں دیکھو
اندر دیکھو، باہر دیکھو
پوشیدہ یا ظاہر دیکھو
دنیا کی اوقات میں دیکھو
اپنی اپنی ذات میں دیکھو
دیکھو دیکھو!!
اُس نادید کو ہر سُو دیکھو
کچھ بھی نظر نہ آئے جب تو
اک تجرید کو ہر سُو دیکھو
اور دیکھتے دیکھتے خوب ہنسو!!

[دیوارِ قہقہہ: ایک روایتی دیوار، کہتے ہیں جو اس کے اوپر سے نیچے کی طرف دیکھے بے اختیار ہنسنے لگتا ہے۔ (فیروز اللغات)]

برزخ دُھندلے خوابوں کا

اک یادِ قدیمی گلیوں میں
اک درد پرانا رستے میں
اک رنگ انوکھا کلیوں میں
اک پھول عجب گل دستے میں
اک گیت نباتی پتّوں پر
اک بیل ستونوں سے لپٹی ہے
اک صبح ازل سے چمکی ہے
اک شام ابد تک ٹھہری ہے
اک چاندر کا ہے کھڑکی پر
اک رات بہت ہی گہری ہے
اک دشت کا سینہ چھلنی ہے
اک ہاتھ پڑا ہے خنجر پر
اک زخم لگا ہے مٹی کو
اک سبز ردا سی بنجر پر
اک پیڑ گلابی بانہوں کا
اک برگد بوڑھی صدیوں کا
اک برزخ دھندلے خوابوں کا
اک عالم جاگتی نیندوں کا
اک عمر کا سارا قصہ ہے
دکھ درد خوشی کا حصہ ہے!!

پروفیسر فتح محمد ملک

اقبال اور عبادت کا اسلامی تصور

اقبال کی چند آخری یادگار نظموں میں سے ایک مختصر نظم کا عنوان ہے ''ندائے غیب''۔ یہ نظم گویا مسلمانوں کے یوم حساب کا منظر پیش کرتی ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اللہ میاں مسلمانوں سے چند سوالات پوچھتے ہیں اور آخری حصے میں خود ہی ان سوالات کا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ آیئے پہلے ان چبھتے ہوئے سوالات سے آنکھیں چار کریں جو عہدِ حاضر کی ملتِ اسلامیہ پر ایک فردِ جرم کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ حریمِ غیب سے جواب طلب کیا جاتا ہے:۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک!
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزا وار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نے گرمیِ افکار، نہ اندیشۂ بیباک!

گویا مسلمانوں کی ذلت کا یہ سبب ہرگز نہیں کہ وہ ارکانِ اسلام کی پیروی میں کوتاہی کے مرتکب ہیں بلکہ اس گناہ کی پاداش میں رُسوائی ان کا مقدر بن کر رہ گئی ہے کہ انھوں نے اپنے جوہرِ ادراک کو گم کر دیا ہے، اپنے نشترِ تحقیق کو کند کر کے رکھ دیا ہے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو گرمیِ افکار اور اندیشۂ بیباک سے محروم کر رکھا ہے۔ اللہ میاں کی بارگاہ میں مسلمانوں کے یہ گناہ دینِ اسلام سے انحراف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ اس نظم میں اللہ میاں مسلمانوں سے رسمی عبادات کی ادائیگی میں غفلت کا سوال نہیں اٹھاتے بلکہ اسلام کی سائنسی، حرکی اور انقلابی تعلیمات سے مسلمانوں کی روگردانی کو ان کا سب سے بڑا گناہ قرار دیتے ہیں۔ گناہ و ثواب کے اس تصور پہ مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے:۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

مرزا عبدالقادر بیدلؔ نے آدم کی عظمت کا راز ادراک کی روشنی میں پایا ہے: ''چیست آدم؟ تجلی ادراک''۔ مسلمانوں نے ادراک کے جوہر کو گم اور تحقیق کے نشتر کو کُند کر کے اسلام کی حقیقی روح کو فراموش کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ اب نہ تو ان کی نگاہوں سے افلاک لرزتے ہیں، نہ وہ ذروں سے لے کے ستاروں تک کے جگر چاک کر کے اللہ کا جلوہ دیکھنے کی سعادت حاصل کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی شعلہ بن کر غیر اللہ کے خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر سکتا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ وہ خود خس و خاشاک کا غلام بن چکا ہے۔

اسلام میں دینی فکر کی نئی تشکیل کے موضوع پر اقبال نے اپنے مشہور خطبات میں ذاتِ باری کے تصور اور عبادات کے مفہوم پر قرآن کی روشنی میں اظہار خیال کرتے وقت سائنسی مشاہدات اور تجربات میں انہماک کو عبادت قرار دیا ہے۔ مظاہرِ فطرت اللہ کی آیات ہیں۔ آیۂ کائنات کی سائنسی تلاوت قربِ خداوندی کا موثر ترین وسیلہ ہے چنانچہ:۔

"The scientific observation of Nature keeps us in close contact with the behaviour of Reality, and thus sharpens our inner perception for a deeper vision of it..... The truth is that all search for knowledge is essentially a form of prayer. The scientfic observer of Nature is a kind of mystic seeker in the act of prayer.... This alone will add to his power over Nature and give him that vision of the total infinite which philosophy seeks but cannot find". (1)

اقبال کے خیال میں خالقِ اکبر کی نت نئی تخلیقی اداؤں کا سائنسی مشاہدہ افضل ترین عبادت ہے۔ مظاہرِ فطرت کے مطالعہ میں جذب سائنسدان کو اقبال ایک ایسا صوفی قرار دیتے ہیں جو اللہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ قوانینِ فطرت کی سائنسی تلاش و جستجو کو وہ قربِ خداوندی کا موثر وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے رسمی عبادات کی پابندی کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ ان عبادات کی ادائیگی کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں مگر اسے کافی نہیں سمجھتے۔ تسخیرِ کائنات کو وہ رسمی عبادات کی عملی توسیع سمجھتے ہیں۔ کائنات کی تسخیر کی کبھی نہ ختم ہونے والی انسانی تگ و دو کو وہ تکبیرِ مسلسل سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا تسخیر کے اس عمل میں قدم بقدم آگے بڑھتا ہوا انسان کائنات کی وسعتوں اور رفعتوں میں مسلسل نعرۂ تکبیر بلند کرتا جا رہا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو سائنسدان واقعتاً ایک خدامست صوفی نظر آتا ہے۔ ایک ایسا صوفی جو مظاہرِ فطرت کے پردوں میں چھپے ہوئے حجاب اندر حجاب حسنِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنے کی تمنا میں مسلسل آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ حق کا ہر نیا جلوہ دیکھ کر وہ حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ اور یوں جمالِ حق کی والہانہ حمد و ثنا میں مصروف رہتا ہے۔ اپنی فارسی نظم ''آئن شٹائن'' میں اقبال اس عظیم سائنسدان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند تجلی کا متلاشی قرار دیتے ہیں:۔

جلوۂ می خواست مانند کلیم ناصبور
تا ضمیر مستنیر اُو کشود اسرار نور

من چہ گویم از مقام آں حکیم نکتہ سنج
کردہ زرد وشتے زنسل موسیٰ و ہاروں ظہور

دل و نگاہ مسلمان ہوں تو کارِ دنیا میں سرکھپانا سراسر عبادت ہے۔ فطرت کے خارجی مظاہر کے باطن میں اُتر کر اُن پر غلبہ حاصل کرنے کے فرض سے روگردانی اللہ تعالیٰ سے روگردانی کے مترادف ہے۔ اسلام میں عبادت کے اس تصور کو اقبال نے اپنی شاعری میں مختلف اور متنوع انداز میں بیان کیا ہے۔ اقبال کی نظر میں کتابِ فطرت کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ فطرت کی تسخیر کا عمل بھی جاری رہنا چاہیے۔ علم قوت کے بغیر فقط خیال آرائی بن کر رہ جاتا ہے۔ اور قوت علم کے بغیر تخریب کا سبب بن جاتی ہے۔ انسانیت کی روحانی تعمیر و ترقی کے لیے علم اور قوت کا امتزاج ازبس ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ذاتِ باری کے تصور اور عبادت کے مفہوم پر روشنی ڈالتے وقت اقبال نے اس حقیقت کی جانب درج ذیل الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

"Vision witout power does bring moral elevation but cannot give a lasting culture. Power without vision tends to become destructive and inhuman. Both must combine for the spiritual expansion of humanity." (2)

کائنات کی یہ روحانی تعبیر کارِ جہاں میں انہماک کو بھی اسلام کے نظامِ عبادات کا جزوِ لاینفک قرار دیتی ہے۔ چنانچہ اقبال کی شاعری میں کائنات کی بیک وقت تفسیر اور تسخیر کے اس روحانی تصور کی جلوہ گری دیدنی ہے۔ یہاں میں صرف ایک قطعہ بطور مثال پیش کرتا ہوں:۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات!
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملاّ و جمادات و نباتات!

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اقبال نے ملا کو جمادات اور نباتات میں شمار کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ نہ تو خود آگاہ ہے اور نہ خدا مست۔ جہادِ زندگانی میں دادِ شجاعت دینے کی بجائے وہ کارزارِ حیات سے مفرور ہو کر گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ وہ فقط تسبیح و مناجات میں اپنے انہماک ہی کو وسیلہ نجات سمجھ بیٹھا ہے۔ اجتہاد کی کٹھن راہ چھوڑ کر وہ تقلید کی روشنی پر گامزن ہے۔ جب وہ ہر آن بدلتی ہوئی زندگی کے نت نئے تقاضوں کی پکار پر اپنے کان بند کر کے رہبانیت کے غیر اسلامی مسلک پر کاربند ہو گیا تو رفتہ رفتہ "ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا"۔ اس صورتِ حال نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عقلی اور سائنسی علوم کی جس مشعل نے یورپ کے ازمنۂ تاریک کو روشن کیا تھا وہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے یورپ کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔ مسلمان گہری اور میٹھی نیند سو گئے۔ صدیوں پر پھیلے ہوئے ہمارے اس عرصۂ خواب کے دوران مغربی قوم میں سائنسی اور تجرباتی

علوم کی اس مشعل کو تھامے آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئیں تا آنکہ دنیائے اسلام میں اقبال جیسے دانائے راز پیدا ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کو اس خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور تسخیرِ فطرت کی عبادت میں مسلسل غفلت کے ہولناک اسباب و نتائج کا تجزیہ کرنا سکھایا۔ نظم ''ندائے غیب'' کے آخری شعر میں اقبال نے مسلمانوں کی ''محکومی و مسکینی و نومیدیِ جاوید'' کا بنیادی سبب خود اللہ میاں کی زبانی پیش کیا ہے:۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری

اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری!

درج بالا شعر میں اللہ نے تین قوتوں کو مسلمانوں کے زوال و ادبار کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ یہ تین قوتیں ہیں: شہنشاہیت، ملائیت اور خانقاہیت۔ اقبال نے اپنی نثری تحریروں میں بھی ملتِ اسلامیہ پر ان تین اداروں کے زہریلے اثرات سے مختلف اور متنوع انداز میں بحث کی ہے۔ انیسویں صدی میں اسلامی اصلاحی تحریکوں کے محرکات و عوامل سے بحث کرتے ہوئے وہ بڑے دوٹوک اور قطعی انداز میں انہی تین زوال پسند اداروں کو شدید ترین تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:۔

"They (reformers) found the world of Islam ruled by three main forces and they concentrated their whole energy on creating a revolt against these forces:

1. **MULLAISM**--- The ulama have always been a source of great strength to Islam. But during the course of centuries, especially since the destruction of Baghdad, they became extremely conservative and would not allow any freedom of Ijtihad, i.e., the forming of independent judgement in matters of law. The Wahabi movement which was a source of inspriation to the nineteenth century Muslim reformers was really a revolt against this rigidity of the ulama. Thus the first objective of the nineteenth century Muslim reformers was a fresh orientation of the faith and a freedom to reinterpret the law in the light of advancing experience.

2. **Mysticism**--- The masses of Islam were swayed by the kind of mysticism which blinked actualities, enervated the people and kept them steeped in all kinds of superstition. From its high state as a force of spiritual education mysticism had fallen down to a mere means of exploiting the ignorance and the cradibility of the people. It gradually and invisibly enervated the will of Islam and softened it to the extent of seeking relief from

rigorous discipline of the law of Islam. The nineteenth century reformers rose in revolt against this mysticism and called Muslims to the broad daylight of the modern world. Not that they were materialist. Their mission was to open the eye of the Muslims to the spirit to Islam which aimed at the conquest of matter and not light from it.

3. **MUSLIM KINGS**---The gaze of Muslim kings was solely fixed on their own dynastic interests and so long as these were protected, they did not hesitate to sell their countries to the highest bidder. To prepare the masses of Muslims for a revolt against such a state of things in the world of Islam was the special mission of Syed Jamal-ud-Din Afghani." (3)

ہر چند انیسویں صدی کی ان عظیم انقلابی شخصیات کی علمی اور عملی جدوجہد ان تین اداروں کی مادی اور روحانی جبرو استبداد کو ختم کرنے میں ناکام رہی تاہم ان کی فکری و انقلابی جدوجہد اقبال کی سی عہد آفرین شخصیت کے لیے سرچشمہ فیضان ثابت ہوئی۔ چنانچہ بیسویں صدی میں اقبال کی انقلابی فکر نے مسلمانوں کی حیاتِ نو کا سامان کیا ہے۔ انھوں نے فلسفہ و شعر میں شہنشاہیت، ملائیت اور خانقاہیت کے استحصالی اداروں کی تباہی کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا اولیں مرحلہ قرار دیا۔ ''ندائے غیب'' ان ہی تین اداروں کو مسلمانوں کے زوال، محکومی اور جمود کا ذمہ دار قرار دیتی ہے۔ اور یوں ان کو مٹا دینے کی جدوجہد کو کارِ ثواب قرار دیتی ہے۔ یہ ہے اقبال کا پیغام آج کے نام!

حواشی

(1).The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lahore, 1996, P.73.

(2).Ibid, P.73. Translation of both the extracts, by Shehzad Ahmed is as follows:-

''قدرت کا سائنسی مشاہدہ ہمیں حقیقت کے کردار کے بہت قریب لے جاتا ہے اور یوں اس کے باطن کا ادراک کرنے کی ہماری بصیرت کو بڑھا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم کی جستجو بنیادی طور پر عبادت ہی کی ایک شکل ہے، قدرت کا سائنسی مشاہدہ کرنے والا ایک طرح کا صوفی ہے، جو اپنی عبادت میں تگ و دو کر رہا ہے۔ اگرچہ اس وقت وہ محض مشکی ہرن کے پاؤں کے نشان پر چل رہا ہے اور یوں اس سفر کرنے کا طریقہ منکسرانہ جستجو ہے، مگر علم کی پیاس ایک دن ضرور اس کو اس مقام تک لے جائے گی، جہاں مشک نافہ ہرن کے پاؤں کے

نشانات سے بہتر رہنما ہوگی۔ یہی شے اس کے قدرت پر غلبے میں اضافے کا باعث ہوگی اور اس کو کلی لامتناہی کی وہ بصیرت حاصل ہوگی جس کی فلسفے کو تلاش ہے، مگر اس کو وہ پا نہیں سکتا۔ بصیرت کے بغیر قوت، تخریب کاری اور انسان دشمنی بن جاتی ہے۔ انسان کی روحانی وسعت کے لیے، دونوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے''۔

(3). Vahid, S.A.. (Editor). Thoughts and Reflections of Iqbal, Lahore, 1973, Pp.278-279, Urdu Translation of the Extracts, by Latif Ahmad Sherwani is as under:-

''سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان جلیل القدر ہستیوں کی غایت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے دنیائے اسلام میں تین مخصوص قوتوں کو حکمران پایا اور ان قوتوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کے لیے اپنی پوری قوت کو مرتکز کر دیا۔

۱۔ ملائیت: علماء ہمیشہ اسلام کے لیے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوالِ بغداد کے زمانے سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزادرائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کے لیے حوصلہ افروز تھی درحقیقت ایک بغاوت تھی علماء کے اس جمود کے خلاف، پس انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

۲۔ تصوف: مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں جس نے عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اسی نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصر جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کو مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی اس روح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

۳۔ ملوکیت: مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لیے وہ اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی شہید کا مقصد خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے''۔

مشکور حسین یاد

کلامِ اقبال اور عوام کی نفسیات

یوں آپ کلام اقبال کا تعلق انسانی معاشرے کے بڑے سے بڑے دانشور طبقے سے قائم کر دیجئے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کلام اقبال کا جس قدر گہرا تعلق عوامی نفسیات سے ہے اُس قدر کسی بھی دوسرے طبقے کی نفسیات سے نہیں۔ ہاں یہ الگ مسئلہ ہے اگر آپ یہ فرمائیں کہ خود نفسیات کا بنیادی طور پر جس سے تعلق ہے وہ انسان کی نفسیات ہے۔ یعنی نفسیات تو بنیادی طور پر تمام بنی نوع بشر کی صرف ایک ہی ہے۔ طبقات میں تقسیم ہونے والی نفسیات شاید کوئی وجود رکھتی ہو لیکن انسانی معاشرہ کے ہر طبقے کی نفسیات بنیادی طور پر ایک ہی ہوتی ہے۔ نفسیات کی طبقاتی تقسیم بے حد وقتی اور ناپائدار ہوتی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو نفسیات کی تقسیم ہی نے انسانوں کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے پھر نفسیات ہے کیا؟ نفسیات کس کو کہتے ہیں؟ بہت ہی عام فہم انداز میں جواباً یوں کہا جا سکتا ہے کہ نفسیات انسان کے سوچنے اور سمجھنے کی اُس صلاحیت کو کہتے ہیں جس کے مطابق وہ اپنی زندگی میں عمل پیرا ہوتا ہے۔ گویا نفسیات کے دو حصے ہوئے ایک سوچنا اور دوسرا سمجھنا۔ یا آپ سمجھنے کو پہلے رکھتے ہیں تو پھر ہم کہیں گے انسان کی نفسیات ہے سمجھنا اور سوچنا۔ میں نے سمجھنے کو اول اس لئے رکھا ہے کہ عام طور پر آدمی سمجھتا پہلے اور سوچتا بعد میں ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آدمی سوچے بغیر تو قدم اٹھا سکتا ہے سمجھے بغیر وہ ذرا سی بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ یہاں یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ آخر آدمی سمجھنے میں جلدی کیوں کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی فطرت میں سمجھنے کی صلاحیت براہ راست وجدان کی طرف سے آئی ہے۔ اور وجدان کسی بات کو غور و فکر کے بغیر سمجھنے کا نام ہے۔ اور چونکہ آدمی اپنے وجدان کی بدولت بڑی سے بڑی حقیقت کو چشم زدن میں سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لئے خواہ لاشعوری طور پر ہی سہی وہ اس توقع میں مبتلا ہوتا ہے کہ جب بڑی سے بڑی حقیقت کو کسی غور و فکر کے بغیر اپنی گرفت میں لیا جا سکتا ہے تو دوسری معمولی قسم کی حقیقتوں کو جلدی سے کیوں نہیں سمجھا جا سکتا۔

گویا اس طرح دیکھا جائے تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ انسانی نفسیات کی بنیاد وجدان پر زیادہ قائم ہے اور وجدان کی صلاحیت قدرت کی طرف سے ہر فرد بشر کو عطا کی جاتی ہے۔ گویا نفسیات بنیادی طور پر عوامی ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا وجدان کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وجدان کی پہلی خصوصیت تو یہی ہے کہ یہ صلاحیت ہمیں ٹکڑوں میں نہیں کلی طور پر اور براہ راست Immediatly ادراک سے آشنا کرتی ہے اور اسی لیے وجدان کو علم کی ایک ارفع صورت کہا گیا ہے۔ علاوہ ازیں وجدان کے ذریعہ ہمیں حقیقتِ عظمیٰ کا علم اور ادراک اُسی طرح ہوتا ہے جس طرح کائنات کی دوسری اشیاء کا بلکہ اُس سے بھی زیادہ ٹھوس انداز میں۔ وجدان ایک وسیع علم ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کے ذریعہ حاصل شدہ ادراک اور احساس عام احساس سے بلند

ہوتا ہے اور اپنی نوعیت کا الگ بھی۔ وجدان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آدمی کی ذرا سی توجہ بھی اس کی طرف رہے تو یہ آدمی کو ہمہ وقت فعال اور محرک رکھتا ہے۔ وجدان کی اسی خصوصیت کو فرانس کے مشہور فلسفی برگساں نے Elan Vital جوشِ حیات کا نام دیا ہے۔ گویا وجدان کے ذریعے کسی نہ کسی انداز میں عام آدمی شعوری یا لاشعوری طور پر حقیقت عظمیٰ یعنی اللہ سے مسلسل وابستہ رہتا ہے اور اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ ہر آدمی بنیادی طور پر صوفی ہوتا ہے۔ اور عام آدمی سے بڑھ کر نام نہاد خاص آدمی اور دانشور اس قدر حقیقتِ عظمٰی سے وابستہ نہیں رہتے۔ ان کا وجدان نچلے درجے کی عقل Reason کی زیادہ شمولیت کی وجہ سے خالص نہیں رہتا۔ بلکہ اہل دانش کی اس چھوٹے درجے کی عقل Reason انہیں اپنی طرف اتنی زیادہ ملوث اور متوجہ رکھتی ہے کہ پھر انہیں اپنی وجدانی صلاحیت کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں رہتی۔

ادھر اقبال کا وہ کلام جس نے اقبال کو واقعی اقبال بنایا تمام تر انسان کی وجدانی کیفیات سے بھرا پڑا ہے۔ اسی لئے میرا یہ کہنا بھی سوئی صد درست ہے کہ اقبال کی اعلیٰ درجے کی شاعری جس طرح عوام کے لئے ہے اُس طرح خواص کے لئے نہیں ہے۔ اقبال کی اس شاعری کو جلدی سے اپنے خالص اور اچھوتے Untouched وجدان کے زور پر جس طرح عوام سمجھتے ہیں اس طرح خواص کو اقبال کی شاعری سمجھنے کے لئے گونا گوں فلسفوں کی آڑی ترچھی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر بھی کچھ زیادہ ان کے پلے نہیں پڑتا۔ اقبال کو بھی اس بات کا احساس تھا اسی لئے وہ اس قسم کے ایک دانشور سے کہہ رہا ہے

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا / آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

اس کے برعکس ۶۲-۱۹۶۱ء کی بات ہے جب میں شیخو پورہ میں ایک معمولی سا ریونیو آفیسر تھا وہاں نور محمد میرے دفتر کا ایک چپڑاسی تھا یہ ایک صوفی منش تھا میرے دفتر کے سامنے اقبال کا یہ مشہور شعر اپنی دھن میں پڑھ رہا تھا۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق / عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

میں نے نور محمد کو اپنے پاس بلا کر پوچھا، حضرت یہ جو تم شعر پڑھ رہے ہو معلوم ہے کس کا ہے۔" جی ہاں معلوم ہے اپنے بہت بڑے شاعر اقبال کا ہے۔" اس کا مطلب سمجھتے ہو" جناب کچھ نہ کچھ مطلب سمجھتا ہوں اسی لئے تو پڑھ رہا ہوں۔"

کیا مطلب سمجھتے ہو؟" دیکھیں سر جس طرح آپ لوگ اقبال کو سمجھتے ہیں یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح تو میں آپ کو سمجھا نہیں سکتا۔"

نور محمد کیا کہہ رہے ہو؟" جی ہاں سر جب آپ کے پاس پڑھے لکھے آپ کے دوست جمع ہوتے ہیں اور اقبال پر بات کرتے ہیں تو ظاہر ہے مجھے بھی چائے پانی آپ لوگوں کے سامنے رکھتے وقت کچھ سننے کا موقع مل جاتا ہے۔ سر! سچی بات یہ ہے کہ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ لوگ اس طرح کی اونچی اونچی باتیں یا الجھی ہوئی باتیں کر کے اقبال کو ہم عوام سے دور کر رہے ہیں۔ یا پھر آپ لوگ خود ہم سے دور ہو رہے ہیں۔ اقبال نے تو کوئی بات ڈھکا چھپا کر رکھی ہی نہیں۔ کم از کم اپنے شعروں میں وہ بہت ہی واضح ہے"۔

کیا تم نے اقبال کو پڑھا ہے؟

"نہیں سر جی اتنی فرصت ہی نہیں ملتی۔ البتہ جتنے کچھ آپ لوگوں سے اقبال کے شعر سنے ہیں ان سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ اقبال آپ لوگوں کی نسبت ہم عوام سے زیادہ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اور آپ لوگ ہیں کہ اقبال کی سیدھی سادھی باتوں کو الجھانے میں پڑے ہوئے ہیں۔"
بھئی کوئی مثال دے کر میرا مطلب ہے اقبال کا کوئی شعر سنا کر بتاؤ۔
"سر! دوسرا شعر تو پھر کبھی سہی پہلے اسی شعر کو لے لیجیے...... بے فکر کود پڑا آتش نمرود میں عشق"۔
ہاں ہاں اسی شعر کا مطلب ہی سمجھاؤ
"توبہ توبہ سر سمجھانے والی بات نہ کریں میں اور آپ کو شعر کا مطلب سمجھاؤں گا۔ بس اپنا مطلب عرض کیے دیتا ہوں اور وہ یوں ہے کہ سر جب میں نے پہلے پہل یہ شعر اپنے مرشد سے سنا تو اس شعر میں جو بات میری سمجھ میں فوراً آئی وہ اس شعر کے پہلے حصے (مصرع) کا یہ پہلا ٹکڑا ہے "بے خطر کود پڑا" واہ بے خطر کودنے میں کیا مزہ ہے اور پھر کودا بھی کہاں؟ آگ میں اور آگ بھی کون سی نمرود کی آگ۔ اور پھر کودا کون! عشق۔ اس شعر کے دوسرے حصے میں سے میری سمجھ میں صرف دو لفظ آئے ایک عقل اور دوسرا تماشا۔ بس انہی دو لفظوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ حضرت ابراہیم کے آگ میں گرنے کو عقل یا عقل والے یعنی بہت پڑھے لکھے لوگ آج تک ایک تماشا اور مذاق سمجھ رہے ہیں۔ یہ لوگ سوچتے ہیں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص جان بوجھ کر ہنستا مسکراتا آگ میں چھلانگ لگا دے۔ مگر سر ٹھہریئے آپ برا تو نہیں مانیں گے ابھی پرسوں ہی آپ کے یہی چند پڑھے لکھے دوست گفتگو کر رہے تھے۔"
میں نے کہا، ہاں ہاں بولو نور محمد تم کچھ نہ کچھ تو میری طبیعت کو سمجھ ہی گئے ہو میں برا کیوں مانوں گا۔
"تو سر آپ کے یہی پڑھے لکھے دوست اسی شعر کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ اردو کے کسی بڑے شاعر نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم خود آگ میں نہیں کودے تھے ان کو زبردستی آگ میں ڈالا گیا تھا۔ یعنی زبردستی آگ میں ڈالے گئے تھے۔ ابراہیم۔"
میں نے درمیان میں نور محمد کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہ مصرع کچھ اس طرح ہے "بہ جبر آگ میں ڈالے گئے تھے ابراہیم"
نور محمد فوراً بولا۔ "تو سر کیا آپ کے اس بڑے شاعر نے یہ نہیں سوچا کہ حضرت ابراہیم ایک رسول تھے اور ایک پیغمبر اپنی مرضی سے آگ میں کس طرح چھلانگ لگا کر خودکشی کر سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے حضرت ابراہیم کو زبردستی آگ میں ڈالا گیا تھا لیکن اس زبردستی سے حضرت ابراہیم گھبرائے نہیں تھے۔ اور حضرت ابراہیم کے اسی نہ گھبرانے کو علامہ اقبال نے آگ میں بے خطر کودنا کہا ہے کیونکہ حضرت ابراہیم کو یقین تھا کہ اللہ کی راہ میں قدم اٹھانے سے کسی طرح بھی کوئی نقصان تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس بات کو مجھ ایسا عام آدمی جی ہاں ان پڑھ آدمی تو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے ہمارے پڑھے لکھے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ معاف کرنا سر یہ ساری باتیں ایمان کی ہیں۔ ایمان ہو تو اللہ پر یقین آپ سے آپ آدمی میں پیدا ہو جاتا ہے۔"
ذرا دیر رکنے کے بعد نور محمد کہنے لگا "اجازت ہو تو ایک بات کہوں بس جی آخری بات۔"

ہاں ہاں کہو نور محمد میں پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں۔
''میں نے تو جتنے شعر بھی علامہ اقبال کے سنے ہیں ان میں ایک بات ضرور ہوتی ہے کہ ان کو سن کر آدمی کے دل میں اللہ کا یقین پکا ہو جاتا ہے اور پھر کچھ کام کرنے کو دل بڑے زور سے چاہنے لگتا ہے۔ یقین کریں صاحب ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے علامہ اقبال کے شعر سنے ہوں اور مجھ میں یقین پیدا نہ ہوا ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے ہمارا یہ بڑا شاعر خالی پھیکی شاعری نہیں کر رہا ہے ہماری پوری ذات میں کرنٹ چھوڑ رہا ہے ایسے کرنٹ جن میں طاقت ہی طاقت اور خوشی ہی خوشی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ محسوس بھی ہوتا ہے کہ اس کی باتوں میں سے کوئی بات بھی جھوٹی نہیں ہے بلکہ یوں کہوں تو سرزیادہ ٹھیک نظر آتا ہے کہ اقبال ہمارے سامنے ایک بہت بڑی سچائی کو ظاہر کر رہا ہے اتنی بڑی سچائی کو کہ جو ہمیں ڈٹ کر جینے کا حوصلہ بخش رہی ہے''۔
نور محمد کی اس گفتگو سے اسی وقت میں نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا اس کا اظہار میں اس مضمون کی ابتدا ہی میں کر چکا ہوں کہ انسانی نفسیات جو ہر فرد بشر کی نفسیات ہے جس کو ہم عوامی نفسیات بھی کہہ سکتے ہیں اس کی بہت ساری بنیاد وجدان پر قائم ہے۔ اگر ہم وجدان کی حقیقت کو جان لیں اور مان لیں تو ہمیں انسان کی نفسیات کو سمجھنے میں کئی اعتبار سے آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یوں اس تمام سمجھنے اور سمجھانے کا تعلق اہل دانش سے ہے عام آدمی یہ باتیں فوراً سمجھ لیتا ہے کیوں کہ اس کا وجدان جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے Reasoning کی ملاوٹ سے پاک اور صاف ہوتا ہے۔ کنوارا اور معصوم وجدان جس کی بدولت بغیر کسی تجزیے کے عام آدمی بڑی بڑی باتیں سمجھ لیتا ہے۔ بس ذرا اس کو ان باتوں کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ اقبال کا کلام یہی توجہ دلانے کا کام سرانجام دیتا ہے مگر بات وہی ہے کہ پہلے کلام اقبال کو پڑھا تو جائے پھر دیکھئے انسان کے اندر کی یہ صلاحیت دانست یا صلاحیت ادراک جس کو عرف عام میں وجدان کہا جاتا ہے کس طرح اپنا کام دکھاتی ہے۔

کلام اقبال کو کوئی دیانت داری سے مطالعہ کرے تو اسے فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے وجود کی نچلی سطحوں سے اٹھ کر بلندی کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یعنی اسے بجلی کے کوندے کی طرح یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے پہلے وہ ایک عام آدمی تھا اب وہ اچانک ایک خاص آدمی بننے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ گویا عام اور خاص کا فرق بیک وقت مٹتا بھی ہے اور اجاگر بھی ہوتا ہے۔ کلام اقبال اس فرق کو مٹاتا اس طرح ہے کہ قاری اپنی ذات کو وجود کی بلندیوں کی طرف جاتا ہوا محسوس ہی نہیں کرتا بلندی کا یہ احساس اسے اپنی ذات میں شامل نظر آتا ہے۔ یعنی بلندی کا یہ احساس اس کے تمام وجود میں جاری و ساری ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے یہ بلندی اسے خاص اور عام کے فرق کی سطح سے اوپر اٹھا لیتی ہے۔ دوسری طرف عام اور خاص کا یہ فرق کلام اقبال کے قاری کی ذات میں اجاگر اس طرح ہوتا ہے کہ بلندی اسے اپنے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بلندی کے دکھائی دینے کی بات میں نے اس لئے کی ہے کہ کلام اقبال اپنے قاری کے جملہ حواس ظاہری کو متاثر کرتا ہے۔ وہ اُس وقت دیکھتا بھی بلندی کے ساتھ ہے، چھوتا بھی بلندی کے ساتھ ہے، چکھتا بھی بلندی کے ساتھ ہے، سنتا بھی بلندی کے ساتھ ہے اور اس کی قوت شامہ بھی ایک اعتبار سے خود کو اپنی تمام بلندیوں پر رواں دواں محسوس کرتی ہے۔

میں نے جو یہاں کلام اقبال کو دیانت داری کے ساتھ مطالعہ کرنے کی شرط لگائی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ کلام اقبال کو پڑھتے وقت ایک دفعہ تو آپ اپنے تمام علم وفضل کو فراموش کر ڈالیں اور یوں سمجھیں جیسے آپ کچھ نہیں جانتے۔ پھر دیکھئے شعرِ اقبال از خود کیسے کیسے منطقہ ہائے علم وفضل کی آشنائی کے خزانوں کا آپ کو مالک بناتا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب پھر عرض کر رہا ہوں کہ کلام اقبال کے ضمن میں لفظی مشکلات یا زبان کی مشکلات وہ معنی نہیں رکھتیں جو معنی کہ عام شعرا کے ہاں ہمیں محسوس ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں عموماً بڑے بڑے شاعر لفظ کی حرمت اور عظمت کو ڈھکا چھپا کر پیش کرنے کے عادی بھی ہیں اور اس کی جان بوجھ کر کوشش بھی کرتے ہیں جبکہ اقبال حریمِ لفظ کے سارے دروازے کھول کر بات کرنے کا عادی ہے۔ اور حریمِ لفظ کے دروازے اسی قاری کو کھلے ہوئے نظر آ سکتے ہیں جو اپنے آپ کو خواہ مخواہ عالم وفاضل یا دانشور نہیں سمجھتا...... مطلب یہ ہے کہ اقبال کے قاری کو اپنے وجدان پر پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے اور اسے ایسا کرنا بھی چاہیئے۔ اسی وجہ سے میں کلام اقبال کو خواص سے بڑھ کر عام آدمی کا سرمایۂ شعری سمجھتا ہوں۔

لیکن میری اس بات کو اس طرح زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم عمرانیات کے حوالے سے انگریزی کے ایک لفظ The Masses کے معنی پر غور کریں۔ یوں اس لفظ کے معنی جمہور، عامتہ الناس ہی کے ہیں۔ لیکن عمرانیات کی اصطلاح میں اس لفظ کے معنی وہ عام لوگ ہیں جن میں کوئی طبقاتی شعور نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان عام لوگوں میں شعور ہی نہیں ہوتا۔ اس لفظ کا مطلب عمرانیات کے حوالے سے یہ ہے کہ عام لوگ معاشرے کے تمام لوگوں کو اپنی طرح کا سمجھتے ہیں گویا ان عام لوگوں کی بنیادی پہچان ان کا انسان ہونا ہے۔ تو گویا اس اعتبار سے اقبال کی شاعری ان عام لوگوں کے لیے ہے جو معاشرے میں انسانوں کو چھوٹے بڑے اور ادنیٰ واعلیٰ میں تقسیم نہیں کرتے، سب کو اپنے ایسا انسان سمجھتے ہیں۔ سچ پوچھیئے تو کسی انسانی معاشرے کی تشکیل میں بنیادی حصہ انہیں عام لوگوں کا ہوتا ہے جو ایک فطری انداز کی مساوات کے ساتھ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ اور یہ فطری مساوات ہر انسانی معاشرے کو اکٹھا رکھنے کا سبب ہوا کرتی ہیں۔ بغور دیکھئے اگر یہ فطری مساوات موجود نہ ہو تو معاشرہ کا کوئی شعبہ بھی اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا۔ کیا تہذیب کیا تمدن کیا قانون کیا اخلاقی ضابطہ سب کے پس پردہ انسان کی یہی فطری مساوات کام کر رہی ہوتی ہے۔ اسی فطری مساوات کی بدولت ہم عدل وانصاف پر زور دیتے ہیں۔ یہی فطری مساوات ہماری ہر قسم کی دردمندی اور دکھ سکھ میں کام آتی ہے۔ اور شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ اسی فطری مساوات کے سہارے ایک انسانی معاشرہ ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اور یہی فطری مساوات انسان کی نفسیات کو جنم دیتی ہے۔ جب ایک انسان اپنے معاشرے کے دوسرے انسانوں کو بھی شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے جیسا سمجھتا ہے تو اُس میں اس سمجھ اور اس احساس کے باعث ایک عجیب قسم کی طاقت پیدا ہوتی ہے جو اسے جینے اور ڈٹ کر جینے کا حوصلہ بخشتی ہے۔

آپ ذرا توجہ فرمائیں تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ کلام اقبال کا بیشتر حصہ انسان کی اسی فطری مساوات اسی عوامی نفسیات کا ترجمان ہے۔ اور اسی عوامی نفسیات سے اپنی تمام تر توانائی حاصل کر رہا

ہے۔اور شاید آپ پھر حیران ہوں کہ اقبال کی خودی کا فلسفہ بھی عوام کی اسی نفسیات سے نشوونما پا کر پروان چڑھا ہے۔ دراصل ان سماجی یا عمرانی عوام میں ایک صحت مند نفسیات اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ یہ آپس میں سب ایک ہوتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی بڑا ہے اور نہ چھوٹا، نہ کوئی نرا عقلمند ہے اور نہ کوئی نرا جاہل، ان کا بنیادی معیار انسانیت یا انسان ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان میں ایک مثالی قسم کا اتحاد اور یک جہتی نمو پاتی ہے۔ اور یوں ان کے مقاصد بھی ایک ہو جاتے ہیں۔ ان عمرانی عوام Masses میں ہر کوئی شامل ہوتا ہے، اہلِ دانش بھی اہل علم بھی اور سیدھا سادا انسان بھی۔ وہی بات کہ اس مثالی اتحاد کے باعث ان عوام میں ایک مثالی توانائی بھی آ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مشکل سے مشکل کام کرنے کے لئے بھی تیار ہوتے ہیں۔ البتہ ان عمرانی عوام یا Masses میں یہ صورت حال ہر وقت نہیں رہتی۔ اگر ایسا ہو تو ان میں سے ہر فرد کی انفرادیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میں جس طرح خاص وقت پر مثالی اتحاد پیدا ہوتا ہے اسی طرح عام صورت میں ان میں مثالی انفرادیت پیدا ہونے کے امکانات بھی ہوتے ہیں اور یہ مثالی انفرادیت ان میں واقعتاً بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال کی شاعری اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح عوام سے مخاطب ہو کر زبردست بیداری کا پیغام دیتی ہے۔ اور اس پیغام کی کبھی یہ صورت ہوتی ہے کہ خطاب ایک فرد سے ہے لیکن اس کا اثر پورے افراد معاشرہ پر پوری آب و تاب کے ساتھ پڑ رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح اس پیغام کا خطاب کبھی عام لوگوں سے ہوتا ہے لیکن اس کے احاطہ اثر میں ایک ایک فرد اس طرح آتا ہے گویا یہ خطاب اسی ایک فرد کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کلام اقبال کے پیغام کو جس خلوص اور جذبے کے ساتھ ایک فرد محسوس کرتا ہے اسی طرح تمام افراد محسوس کرتے ہیں۔ اقبال کے پیغام کی حرارت اور خلوص کی گرمی دونوں کو پہنچتی ہے۔ اور پھر اس پیغام کی توانائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس توانائی کے سامنے عقل و خرد یا منطق و فلسفہ کی توانائیاں ایک طرف پڑی رہ جاتی ہیں۔ مثلاً اقبال کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے.....

کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک / یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے

اس شعر میں بظاہر کوئی فلسفہ یا منطق یا عقل کی بات نظر نہیں آتی۔ لیکن اس شعر کے تاثر سے کوئی قاری انکار نہیں کر سکتا۔ خیر انکار تو بڑی بات ہے اس شعر کا اثر یہاں تک ہوتا ہے کہ قاری سمجھتا ہے آسمانوں کی گردش کو دوسرا کوئی تو کیا روکے گا میں خود ابھی ابھی روک دیتا ہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میں ایک خود مختار انسان ہوں اور یہ زمین و آسمان تو برسوں سے ایک ڈگر پر چلے جا رہے ہیں۔ میرا چاند ستاروں کے اثر میں رہنا ایک بہت ہی فضول اور بے کار سی بات ہے۔ بلکہ میری کمزوری اور غفلت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ لیجئے، اب یا میں ختم ہو جاؤں گا یا ان چاند ستاروں کے اثر سے نکل جاؤں گا۔ شعر میں تاثیر اس بلا کی ہے جس کی وجہ سے یوں لگتا ہے کہ میں ختم نہیں ہوں گا بلکہ گردش افلاک کو میرے ماتحت ہونا پڑے گا۔ ظاہر ہے اس شعر کا مخاطب کوئی عقلمند اور باہوش شخص تو قطعی نہیں ہو سکتا۔ ایک عام آدمی یا عام آدمیوں کا معاشرہ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس شعر کو خالی کارتوس کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اس میں بارود تو بھرا پڑا ہے۔

اس شعر کے مقابلے میں اب اسی مضمون کا ایک دوسرا شعر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ شعر بھی اپنی جگہ

بہت موثر اور زوردار شعر ہے لیکن اس کا اثر اور زور اس شعر کی منطق میں ہے۔ جو بلاشبہ عوامی منطق ہے۔ مگر خواص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا / وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

حالانکہ خاص قاری اس شعر کے پہلے مصرع کو تو بخوشی تسلیم کرے گا لیکن دوسرے مصرع پر ضرور سوچے گا کہ ستارے کو فراخیٔ افلاک میں خوار و زبوں کیونکر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان جملہ عوامی حقائق اور علائق کے باوجود کلام اقبال جس طرح اپنے عام قاری کو معانی اور مطالب کی بلند فضاؤں میں لے جاتا ہے اور کیسے لے جاتا ہے دراصل اسی راز کو سمجھانے کے لئے اقبال کے بلند پایہ شارحین اور ناقدین کو طرح طرح کے فلسفوں کی اوگھٹ گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور اسی مقام سے شعر اقبال کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ عام قاری کے لئے نہیں خاص قاری کے لیے ہے۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اس طرح کے تمام فلسفے بیان کرنے کے باوجود اقبال کے خاص قاری پھر بھی سر کھجاتے ہی رہ جاتے ہیں اور عام قاری کی پہنچ تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ عام قاری یقیناً اپنے وجدان کے زور سے خاص قاری کی نسبت کلام اقبال کے ساتھ زیادہ بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔

احمد حسین مجاہد......غزل

سانجھ سمے جب بے کل من کی آشائیں مر جائیں...... ہُو
مورکھ جوگی اپنا کاسہ گدڑی پر دھر جائیں...... ہُو

دھیان کے دیپ کی مدھم لو میں انبر جیسی شکتی ہے
لیکن ایسے شانت سمے ہم، خود، ہی سے ڈر جائیں...... ہُو

دان کیا ہر سپنا ہم نے جس اوتار کے چرنوں میں
کھوٹے سکوں والے کھوٹے، رام اُسے کر جائیں...... ہُو

کس کا دوش تھا، کس کے کارن، یدھ میں ہم کو مات ہوئی
بھید یہ کھل جائے اب چاہے، اور کئی سر جائیں...... ہُو

ہم بنجارے پریت کے مارے، گلیوں گلیوں گھومیں گے
جن کے گھر ہوتے ہیں احمد وہ اپنے گھر جائیں...... ہُو

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم

نیپالی ادب پر اردو کے اثرات

نیپال زمانۂ قدیم سے اپنے جغرافیائی محل وقوع اور قدرتی حسن کے سبب سیاحوں، سنتوں، فنکاروں اور دانش وروں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے۔ یہاں پہاڑوں پر جس قدر قدرت کی رعنائیاں جھلملاتی ہیں، اسی طرح ترائی کے علاقے بھی فطری حسن و جمال سے معمور اور مزین ہیں۔ یہ ایک کثیر لسانی ملک ہے، یہاں نیپالی کے علاوہ تقریباً دو درجن زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں تبتی، گرونگ، برجی، اودھی، تمنگ، سیلتھامی، نیواری، ہندی، بھوجپوری اور اردو روز مرہ کے استعمال میں ہیں۔ ان زبانوں میں اردو کو خصوصی مقام حاصل ہے یہ نیپال کے گوشے گوشے میں بڑے پیمانے پر بولی، لکھی اور پسند کی جاتی ہے۔ یہاں اردو کی ابتداء اور ارتقا کا شاندار پس منظر رہا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہندوستانیوں کے لیے صرف مصائب ہی لے کر نہیں آئی۔ بلکہ اس سانحے نے اہل وطن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انہیں زندگی کی ہر سطح پر فعال اور متحرک کر دیا۔ انگریزوں کے مسلسل جبر و استبداد نے اپنے ملک، اپنی تہذیب اور زبان سے محبت کا جذبہ اور بھی بڑھا دیا.......... ۱۸۵۶ء میں انگریزی سپاہ نے اودھ پر قبضہ کر لیا اور نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے ان کے نابالغ فرزند میر حسین قدر کو سلطنت کا نائب مقرر کر دیا۔ اس سے قبل کہ نواب اسیر زندان ہوتے وہ چھپ چھپا کر کلکتہ پہنچ گئے۔ سلطنت کی اس روح فرسا شکست و ریخت سے نواب کی بیگم حضرت محل حد درجہ کبیدہ خاطر ہوئیں۔ انہوں نے اودھ کو مزید تباہی سے بچانے کا عزم کیا اور محل سے باہر آکر فرنگیوں کے مقابل صف آرا ہوئیں۔ انہیں پسپا ہونا پڑا۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کی ماتحتی قبول کر لیں، لیکن حضرت محل نے اس ذلت کی زندگی پر ہجرت کی صعوبت کو ترجیح دی۔ وہ اپنے فرزند برجیس قدر اور چند فدائیوں کے ہمراہ نیپال کی راجدھانی کاٹھمانڈو پہنچیں اور تاحیات وہیں مقیم رہیں۔ نیپال میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج بہت حد تک انہی مہاجرین کی رہین منت ہے۔ ان میں جو شعراء تھے انہوں نے لکھنو کی یادگاری محفلیں یہاں بھی آباد رکھیں۔ نواب برجیس قدر نے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۵ء کے درمیان اپنے رفقاء اور وفاداروں کے ساتھ مل کر نیپال میں شعر و ادب کی جو قندیلیں روشن کیں، ان کی ضو آج بھی نگاہ کو خیرہ کرتی ہے۔ قابل ذکر امر ہے کہ بالکل اجنبی اور نامانوس ماحول میں بھی اسی طرح ادب کی خدمت ہوتی رہی جس طرح لکھنو میں ہوتی تھی۔ عوام میں ان کی محفلوں کی دھوم تھی۔ اس زمانے میں نیپالی شعراء نے بڑی تعداد میں ان سے اثر قبول کیا اور اردو کی طرف راغب ہوئے۔ نصر اللہ حریف، خواجہ نعیم الدین پرخستی، غلام محمد خانقاہی، برجیس قدر، صاحب زادہ موصوف، منشی محمد حسین احقر، بھولا ناتھ فلک، سرور، اخوند امیر الدین واثق، حکیم خواجہ حسن شاہ، فاروق احمد عارف، خواجہ معظم شاہ رضا نیازی جیسے شعراء کی مساعی کا ہی ثمرہ ہے کہ نیپال میں اردو شاعری کا باضابطہ آغاز ہوا اور ارتقائی مرحلہ طے ہوتا رہا۔ ملاحظہ کریں

مذکورہ شعرا کے چند اشعار۔

طغیانیِ سیال جو حد سے گزر گئی/ مقراضِ موجِ دامنِ دریا کتر گئی

مستانہ وار کشتیِ جاناں جدھر گئی/ مقراضِ موجِ دامنِ دریا کتر گئی (نصر اللہ حریفؔ)

ترے دوست دشمن کریں سب مدارا/ کرم اور احساں ہے مجھ پر تمہارا (خواجہ نعیم الدین بدخشی)

کشتیِ شکستگانِ جہاں کی تلاش میں/ مقراضِ موجِ دامنِ دریا کتر گئی (غلام محمد خانقاہی)

حسرت دلِ حزیں پہ یہ عاشق کے دھر گئی/ مقراضِ موجِ دامنِ دریا کتر گئی (برجیس قدر)

وعدۂ وصل کیا مجھ سے قسم بھی کھائی/ یاد رکھنا یہ قسم اے بتِ بے پیرائی (صاحب زادہ موصوفؔ)

سرزمینِ نیپال پر محولہ بالا شعری کاوشوں کے ساتھ ہندو نیپال کے مابین صدیوں پرانا تہذیبی، لسانی اور ثقافتی رشتہ بھی ہے۔ اس باہمی اختلاط نے بھی نیپالی زبان و ادب کو اردو کے لفظی اور شعری سرمائے سے مالا مال کیا۔ نیپال کے بے شمار ادیبوں نے نہ صرف اردو کو پسند کیا بلکہ باضابطہ زبان سیکھی اور اس کے فروغ میں معاون بنے۔ ان میں عظیم شاعر اور دانش ور موتی رام بھٹ جسے بھانو بھگت آچاریہ (۱۸۷۱ء) کے بعد نیپال کا سب سے بڑا ادبی ستون تسلیم کیا جاتا ہے، کا نام نا قابل فراموش ہے۔ وہ کاٹھمانڈو میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوا۔ ابتداء میں اس نے نیپالی کے ساتھ سنسکرت اور ہندی میں درک حاصل کیا۔ پھر وہ مہاجر شعراء کی صحبت میں رہ کر اردو کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے نہ صرف لکھنا پڑھنا سیکھا بلکہ جم کر اردو میں شاعری بھی کی اور دیکھتے دیکھتے بہت سے نیپالی شعراء بھی اردو میں مشقِ سخن کرنے لگے۔ دراصل نیپالی میں وسیع پیمانے پر غزل کو اسی نے متعارف کرایا۔ اس نے غزل کے فن کو اس کے پورے تہذیبی اور روایتی لوازمات کے ساتھ برتا۔ لیکن صد حیف کہ اردو کا یہ مایۂ ناز نیپالی شاعر بہت کم عمری میں چل بسا۔ وہ صرف تیس سال کی عمر پا کر تمام محفلوں کو سونا کر گیا۔ افسوس کہ بہت تحقیق و جستجو کے باوجود اس کی اردو شاعری تک رسائی نہ ہو سکی۔ نیپال کے پرانے شعراء اور نقادوں سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ اس کا اردو کلام محفوظ نہیں رکھا جا سکا۔

موتی رام کے بعد ایک نیپالی ادیب دیوندر راجہ اوپادھیائے نے تراجم کے ذریعے اردو کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ اس نے میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ کے کلام سے نیپالی قارئین کو روشناس کرایا۔ مذکورہ شعراء کے کلام نے نیپال کی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ ایک اور مشہور شاعر رمولا دیوی شاہ نے اپنی غزلوں کے ذریعے عوامی سطح پر خاصی شہرت حاصل کی۔ اس ضمن میں پاکستانی ادیبہ ڈاکٹر نگہت طاہرہ تیر کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے رمولا دیوی شاہ کے چھ شعری مجموعوں سے کلام منتخب کر کے ''سوزِ گل'' کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا جسے کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ معروف شاعر کھڑک مان سنگھ نے نیپالی رسم خط میں غزلیں کہیں لیکن ۹۵ فیصد الفاظ اردو کے استعمال کیے تا کہ اردو اور نیپالی کے درمیان کم سے کم بعد رہ جائے۔

مختصر یہ کہ اردو کے سلسلے میں یہ تمام کوششیں بہت حد تک بار آور ثابت ہوئیں اور اس زبان کا جادو نیپال کے سر چڑھ کے بولنے لگا۔ اس کے الفاظ اخباروں، رسالوں، کتابوں، دفتروں، عدالتوں اور الیکٹرانک

میڈیا کے ذریعے چاروں طرف مشتہر ہونے لگے۔ یہ عوام کی محبوب تو بنی ہی، شاہی گھرانے میں بھی دلاری گئی۔ امراء اور روٗسا کا طبقہ اردو کے الفاظ استعمال کر کے فخر محسوس کرنے لگا۔ گھروں، دکانوں اور عوامی جگہوں پر غلام علی، جگجیت سنگھ، پنکج ادھاس اور طلعت عزیز جیسے گلوکاروں کے کیسٹ بجنے لگے۔ ہندو پاک کے غزل گائکوں کے نیپال دوروں نے غزل کو کافی مقبولیت بخشی۔ اردو کی اس بے پناہ مقبولیت سے نیپالی ادب کی ہر صنف نے بھرپور استفادہ کیا۔ جس میں گیت، غزل، کہانی اور تنقید کو خصوصی طور پر لیا جا سکتا ہے۔ یہاں غزل کے فن پر بحثیں ہونے لگیں، مذاکرے منعقد ہونے لگے۔ نقادوں کے ذریعے غزل کی فنی نزاکتوں کے التزام کو ناگزیر بتایا جانے لگا۔ فی الوقت نیپالی شعرا صنفِ غزل کے اس قدر گرویدہ ہیں کہ انہوں نے اپنی غزلوں کے کئی مجموعے شائع کیے ہیں۔ یہاں سے شائع ہونے والے بیشتر معیاری رسالوں نے غزل نمبر شائع کئے ہیں جن میں کو پیلا (کاٹھمانڈو)، کا چولی (پالپا)، اُپہار (جھاپا)، پرواہ (بھگت پور)، پروتساہن (اودے پور) کا خصوصی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں پرانے شعرا ہی نے نہیں، نئی نسل کے فن کاروں نے بھی شدت سے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ نیپالی ناقدوں نے اپنے طور پر غزل کے فن پر بہت عمدہ اور کارآمد باتیں کہی ہیں۔ ایک ناقد منوبراجا کی کے مطابق غزل بہت پرانی اور ہر دلعزیز صنفِ سخن ہے۔ اس کے کچھ اصول وضوابط ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:۔

''غزل گی ودیا ہو۔ پرانا غزل کار ہرو اردو بھاشا کا نیتی نیئم انوکولیت تھئے منے مدھبہ کال کا غزل ....دیکھا پرے۔''

ایک دوسرے ناقد وجے سیدانے غزل کے فن سے مکمل واقفیت کو لازمی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''غزل رچیا کا آپنے نیئم ہرو ردیف، قافیہ، وزن، موسیقیت، انداز بیان کو کوشل سمایو جن واٹ غزل اُت کرشٹ بننے سکنے چھ..........ردیف قافیہ کو وچلن جستہ کی کمزوری لے غزل ماہونو پرنے مٹھاس کین چھ۔''

اب نیپالی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں جن میں جا بجا اردو الفاظ کے برمحل استعمال نے چار چاند لگا دیے ہیں

میرا من کا شہرما شانت کونی چوک مجھے نا / آشچر یہ چھ تیاتی زیادہ جیان مردان شوق مجھے نا
جھرنا کو جسیو پانی جستے مایالاگ چھ بھیجی / سب تھوک خواہش کی اب کھانے تھوک مجھے نا (گوپال پرساونڈ گرولا)
موسم یوواداس بنے چھ، سارا ایک، اُداس / آوندولسنہ ہنڈ چھ جب ابھی بھارہ بنا
نرواست بھئے کو یہاں گھیرے موآواز ہرد / مونج لوس سڑک ما چھ کنے نعرہ بنا (ٹیکارام اداسی)
گہونگو بھئیو بڑھی کو بوجھ لے گئی نے رو کیو / اکر سبھی جھکے کو گردن اچالنی کہی لیہو (شرسٹھ پرپا پتھر)
آس ڈوبنوں ڈوبس کیوں آندھی بیری بیش / ترکھٹن پتھر پھوڑے آخر لی تجھے چھ بیش (بھیروناتھر مال قدم)
اب دونظموں سے چند مصرے۔ الی کتا آنسو پائی
آپنے اماں کو کاکھ ماشہر دیکھی گھٹے پرام آج ئی
گالی سپیرس تھین (ڈاکٹر متھر اکیتی)

پستک ہروکو بلوٹ جب جب
پانی وسواش سے چھوتو ہو دین
زرواتگ جنگل کو
جب جب لیں
کہی لے نیا بن سن کیں (کرشن جوشی)

چند گیتوں کے مصرعے بھی دیکھیں

تمی نیا زندگی یوں برباد نے بھئیو
آنسو کوتہ سمندر لی بنائے چھے بھئیو
راتی ایٹن آنکھا ہرو من رتی رہئیو
تمی بنا زندگی یو برباد نے بھئیو

(ہرن ہر تمن لسنا)

یو جوبن سلام یو بسیں لائی سلام
چالیس ورش جیون لائی سپرو پانی سلام

یہ رنگین موسم ہو ای سی بیتی نا جاؤس

نہ تو توس اب سلسلہ کہیلے بنی
پھولئے پھول کو موسم تمی لائی
میرو مایا ہر دم تمی لائی

ڈھاک کے ٹوپی سرما جھلک کے جھل کیو
چھات بھیتر مایا کو آگ جل تیو
ہے بجلی کوتار تار فرصت چھے نا اے حضور آوندے شنی وار

مندرجہ بالا گیتوں کے مصرعے نیپال میں حد درجہ مقبول ہیں اور پورے نیپال میں گائے جاتے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ ہر مصرعہ میں اردو کے الفاظ ضرور لیے گئے ہیں اور اس کے ذریعے گیتوں کو خوبصورت اور موثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے......... جیسا کہ اوپر درج کیا گیا ہے کہ اردو کے تئیں رغبت اور اردو الفاظ کے استعمال میں دلچسپی کا سبب مہاجر شعراء کی دین ہے۔ موجودہ دور کے شعراء نے بھی اسی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے اپنے اشعار کے گل بوٹے کھلائے ہیں اور ہر طرح کی ستائش اور صلے کی پروا کیے بغیر بے لوث ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں ملاحظہ کریں مذکورہ شعراء کے چند اشعار

دنیا کی بازگشت میں اپنی ہی بے صدا / ایسے میں کوئی تجھ کو پکارے کہاں کہاں (عبدالطیف شوق نیپالی)
ہر ایک شاخ پہ تُو آشیاں بنا راہی / تجھے تو برق کا اب زور آزمانا ہے (غلام جیلانی راہی)
گھر جلا کے بھی پوچھتے ہیں وہ / آگ کیسے لگی، جلا کیا ہے (نثار احمد نثار)
جب خیال آیا ہے دل کو تری رسوائی کا / اشک آئے مگر آنکھوں سے نکلنے نہ دیا
منزلِ عشق کا ہر مرحلہ دشوار بھی تھا / اور کچھ پاؤں کے چھالوں نے بھی چلنے نہ دیا (اشفاق رسول ہاشمی سرور)
فکر کو وسعت، جنوں کو حوصلہ دیتے رہے / زندگی کو ہر قدم اک رخ نیا دیتے رہے (امیر اللہ اسعدی رندرحیمی)
پتھر اٹھا کے میری طرف دیکھتا ہے کیا؟ / آئینہ فضا ہوں فدا آزما کے دیکھ (محمد عمر آثر)
میں جو سوچتا ہوں لفظ لفظ ہے تیرا / ہے میری فکر بھی تیری، دماغ تیرا ہے (زاہد آزاد)
چند آنسو، چند آہیں، زندگانی کا مآل / قہقہے وہ ایک دن سب چھین کر لے جائے گا (نثار نیپالی)
بناؤ کچھ ایسی فضا اس زمیں پر / چلا آئے خود آسماں دھیرے دھیرے (عبدالعظیم فہد جھنڈانگری)
زندگی چیختی ہے کیوں ہر سو / کاش اس کا پتہ کرے کوئی (شبانہ نکہت)
تنگ دل ہوتے گئے منظر ادھر اہلِ حرم / میں ادھر گرویدہ حسن تباہ ہوتا گیا (منظارالحق منظر)

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ اردو ادب کی ہر صنف نے موجودہ نیپالی ادب کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا ہے۔ وہ افسانہ ہو، ڈرامہ ہو یا کہ ناول، ہر جگہ اردو کے الفاظ وافر مقدار میں ملتے ہیں، جن کی تفصیل یا نشاندہی یہاں ممکن نہیں۔ فی الحال مشہور کہانی کار وشو پسور پرساد کوئرالا کی ایک نمائندہ کہانی کے چند جملے پیش کر کے ہم اپنی بات سمیٹنا چاہیں گے۔ اس کہانی میں غور طلب بات یہ ہے کہ اردو الفاظ کی کثرت کے ساتھ اسکا عنوان بھی خالص اردو سے مستعار ہے۔ یعنی ''ایک رات''۔

''کاجل کو آ کاش ما ایک سنگ سلمہ ستارہ جھلکے کا ہر دن کو ہی مجھے نا ...... تھانہ میں پراویٹ بنائے گو شخص کی ما، دربار ما خوب چہل پہل بھئے ...... باقی رہے کو کاغذ ما افسر ہرو کو دستخط پردے ہوا۔ پھیری تیون جلوس شانت بھیر بندی رہنیو اچانک شور لے دیکھیو ...... جیل کو باہر یا دایاں بایان، دو تالا ما کھڑا تھیئے''

مآخذ:۔

(۱) نیپال کا جغرافیہ و تاریخ، حصہ اول، مصنف حفظ الرحمٰن، ص ۸
(۲) نیپالی ادب اور اردو، ''تسطیر'' سہ ماہی (لاہور) جولائی / اگست ۱۹۹۹ء
(۳) A short history of Nepal - Netar Bahadar Thapa
(۴) Saarc Country Profile Govt of Pakistan
(۵) New Secondry history Vijay kumar/Dr. Rajesh Gautan P-98

نامی انصاری

اردو کے غیر مسلم ادیب و شاعر

ہندوستان کے بہت سے حلقوں کی طرف سے بار بار کہا جارہا ہے کہ عملاً اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس سے وابستہ غیر مسلم اُدباء اور شعراء بس خال خال ہی رہ گئے ہیں۔

امریکہ سے جناب ستیہ پال آنند کا ایک خط سہ ماہی تسطیر لاہور کے شمارہ نمبر ۱۷۔۱۸ میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے بڑے مایوسانہ انداز میں شکوہ کیا ہے کہ:۔

''۲۰۰۱ء میں اس وقت آدھ درجن سے کچھ ہی زیادہ ہندو شعراء اور ادیب ہندوستان میں رہ گئے ہیں...... اب لے دے کے راقم الحروف کے علاوہ جگن ناتھ آزاد، گیان چند جین، جوگندر پال اور بلراج کومل کے علاوہ شاید دو تین اور اصحاب (غیر مسلم) رہ گئے ہیں۔'' (تسطیر ۱۷۔۱۸۔صفحہ ۴۵۲)

عرض ہے کہ ستیہ پال آنند چونکہ مستقلاً امریکہ میں قیام پذیر ہیں، اس لیے ان کو ہندوستان کے ادبی منظر نامے کا پورا علم نہیں ہے۔ ہندوستان میں اس وقت بھی (مارچ ۲۰۰۲ء) اردو کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی تعداد آدھ درجن نہیں بلکہ تقریباً چھ درجن ہے اور یہ سب ایسے لکھاری ہیں جن کی تحریریں برابر ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے ادیبوں اور شاعروں کی ایک فہرست منسلک ہے۔ جس میں مشہور اور کم مشہور لیکن بقید حیات غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے ۵۷ نام شامل ہیں۔ ان میں معدودے چند کو چھوڑ کر باقی سبھی اصحاب کی کوئی نہ کوئی کتاب منظرِ عام پر آچکی ہے اور لوگ عموماً ان سے اور ان کے کاموں سے واقف ہیں۔ ممکن ہے کچھ نام سہواً چھوٹ بھی گئے ہوں۔ کیونکہ خود میں بھی اس فہرست کو مکمل نہیں سمجھتا ہوں۔

بقید حیات غیر مسلم اردو ادیب و شاعر (۱۶ مارچ ۲۰۰۲ء)

۱۔ جگن ناتھ آزاد
۲۔ گیان چند جین
۳۔ جوگندر پال
۴۔ گوپی چند نارنگ
۵۔ دیوندر اسرا
۶۔ بلراج کومل
۷۔ سریندر پرکاش
۸۔ مانک ٹالا
۹۔ رام پرکاش کپور
۱۰۔ سرسوتی مدن کیف
۱۱۔ رام پرکاش راہی
۱۲۔ جی۔ ڈی۔ چندن
۱۳۔ بھگوان داس اعجاز
۱۴۔ گیان سنگھ شاطر
۱۵۔ اندر سروپ سریواستوا
۱۶۔ پروین کمار اشک
۱۷۔ اندر کمار گجرال
۱۸۔ ویریندر پٹواری
۱۹۔ انل ٹھکر
۲۰۔ پرتپال سنگھ بیتاب
۲۱۔ بسنت کمار بسنت
۲۲۔ بنجے مصرا شوق
۲۳۔ چندر بھان خیال
۲۴۔ پریم سروپ ماتھر

۲۵۔ بھارت چند کھنہ
۲۶۔ نریندر لوتھر
۲۷۔ کرتار سنگھ دگل
۲۸۔ رتن سنگھ
۲۹۔ شرون کمار ورما
۳۰۔ نند کشور وکرم
۳۱۔ گلزار
۳۲۔ کے ایل نارنگ ساقی
۳۳۔ ش۔ ک۔ نظام
۳۴۔ جتندر بلو
۳۵۔ سوہن راہی
۳۶۔ گلشن کھنہ
۳۷۔ وید راہی
۳۸۔ بشیشر پردیپ
۳۹۔ خوشبیر سنگھ شاد
۴۰۔ پرکاش تیواری
۴۱۔ کبل ساہنی
۴۲۔ آنند لہر
۴۳۔ اوم کرشن راحت
۴۴۔ کرشن کمار طور
۴۵۔ سردار پنچھی
۴۶۔ شباب للت
۴۷۔ ستیہ پال آنند
۴۸۔ کنور سین
۴۹۔ آشا پربھات
۵۰۔ جینت پرمار
۵۱۔ ڈاکٹر نریش
۵۲۔ کشمیری لال ذاکر
۵۳۔ لوچن بخشی
۵۴۔ ویریندر پرکاش سکسینہ
۵۵۔ اندر موہن کیف
۵۶۔ ایس۔ ایس بھٹناگر شاداب
۵۷۔ رادھے شیام رستوگی
۵۸۔ کنول نین پرواز
۵۹۔ موہن چراغی
۶۰۔ کرشن موہن
۶۱۔ رمیش چندر دویدی شوق
۶۲۔ راج بہادر گوڑ
۶۳۔ امیر چند بہار
۶۴۔ م۔ م۔ راجندر
۶۵۔ پریتم سینی
۶۶۔ پریم پال اشک
۶۷۔ روشن لال روشن بناری
۶۸۔ اقبال کرشن
۶۹۔ گربچن سنگھ
۷۰۔ بی پی سریواستیوا رند
۷۱۔ نرمل سنگھ نرمل
۷۲۔ مشتاق سنگھ
۷۳۔ نگار اناوی
۷۴۔ گیان کرتار سنگھ گویا
۷۵۔ دیوندر سنگھ

شہرِ شب میں چراغاں

نثرِ لطیف کے یہ شذرے آپ کی سوچ اور اندازِ فکر کی سمت متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ پھر یہ خود کلامی آپ کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ کائنات کے گھمبیر اور لاینحل مسائل کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے۔ علم، کتاب، تخلیق کار، قلمکار، سچا لکھاری، سچا ادیب، خاکہ نگار، شاعری، شعر، ماہیے، گیت، لوک گیت، تراجم، تخلیقی عمل، نئی اصناف، لسانی مرعوبیت، تخلیق غرض زندگی کے تخلیقی رخ کے متعلق آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟ قاری اس سے آگاہ ہوتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ان سب کی بنیاد صرف اور صرف حرفِ صداقت پر رکھی گئی ہے۔ سچ کی معاشرے کو جتنی ضرورت آج ہے پہلے شاید کبھی نہ تھی۔ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے، ایک انسان کی حیثیت سے، آپ نے جو کچھ محسوس کیا اسے حیطۂ تحریر میں لے آئے۔ خوبی یہ ہے کہ لفظوں کی فضول خرچی سے گریز کرتے ہوئے، اپنی بات کو کم سے کم الفاظ میں بہتر اور مؤثر انداز میں بیان کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

(ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ ...... مکتوب بنام محمد فیروز شاہ)

محمود احمد قاضی

جدید ذرائع ابلاغ اور ادب کا مستقبل

جیسے کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ آغاز ہی سے انسان کو اپنی پہچان کا مسئلہ درپیش تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ پہچانا جائے اس لئے اُسے اظہار کے کسی وسیلے کی بھی ضرورت تھی ...... اب اظہار کیسے ہو؟ انسانی شعور ابھی محض غوں غاں کی حالت میں تھا اس لئے پہلے پہل اشاروں کی زبان ایجاد ہوئی۔ اس کے لئے پہلے کسی احساس اور خیال کی ضرورت تھی ...... یعنی اسے بھوک اور پیاس لگے گی تو اُسے کھانے پینے کی کسی چیز کی احتیاج کو پورا کرنے کے لئے اُس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ لیکن چونکہ انسان شروع ہی سے انفرادیت کا نہیں اجتماعیت کا مرہون منت رہا ہے اور یہیں اس کی collective wisdom کام آئی اور اُس نے دوسروں کے فائدے کے لئے غاروں میں ان اشیاء اور خوراک کو اشکال کی صورت میں واضح کیا۔ مختلف جانور اور دوسری قریبی اشیاء اس کے علم کا حصہ بنیں۔ پھر صدیوں کے سفر کے بعد اس کی غوں غاں لفظوں میں ڈھلنے لگی۔ یہ وقت اس کی زندگی میں ایک انقلاب تھا۔ اب وہ جب بھی چاہتا ایک لفظ ادا کرتا اور دوسرے پر اس کا مفہوم واضح ہو جاتا۔ اب یہ تو ہمیں پتہ نہیں کہ کس نے سب سے پہلے لفظ پانی ادا کیا اصل میں لفظ بھی ہے تو ایک اشارہ اور Signal مگر یہ اتنا بلیغ ہے کہ ہم جست لگا کر اس کے پیچھے چھپی خواہش تک پہنچ جاتے ہیں۔

پھر صدیوں تک ایک لمبی چپ چھائی رہی اور پھر انسان کی زندگی میں کاغذ آ گیا۔ اس ایجاد نے تو تہلکہ مچا ۔ ۔ پھر چھاپے خانے نے اس کی ترقی کے قدم کو مزید آگے بڑھا دیا۔ اب چھپائی مفاہم کی ترسیل کا وسیلہ بنا۔ لیکن انسانی ذہن کہیں ٹکتا کب ہے، وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں آئے دن نت نئی ایجاد کرنے لگا اور پھر Print Media کے ساتھ Electronic Media بھی آ گیا۔ اخبار اور رسائل کے ساتھ اب ریڈیو اور ٹیلی وژن نے انسان کی زندگی میں مزید تنوع پیدا کر دیا۔ اب Audio اور Visual Effect دونوں اس کے اظہار کے Tool ٹھہرے۔ اور آج ہم Computer Age میں داخل ہو چکے ہیں۔ Telex اور Fax مشینوں سے آگے اب Internet نے دنیا کو ایک Global Village میں تبدیل کر دیا ہے اور اب یہ بیسویں صدی جو اپنے اختتامی مراحل طے کر کے اکیسویں صدی میں داخل ہو گئی ہے، اس کے ہمراہ ہم Infromation Explosion کے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب بہت ساری چیزوں، اطلاعات اور علوم کے لیے ہم اپنے ذرائع ابلاغ کے وسیلے سے اپنا اظہار کرتے ہیں اپنی پہچان کرواتے ہیں۔

لیکن دیکھا جائے تو لکھے ہوئے لفظ ہی ہمارا سب سے بڑا سہارا ہیں۔ ہم یقیناً موسیقی سننے کیلئے Video Tape یا C.D (Compect Disk) سے مدد لیتے ہیں لیکن لفظ تو شاعر تخلیق کرتا ہے

ادب جو کہ ایک تخلیقی عمل ہے اور انسانی شعور کی پختگی کی علامت ہے لفظوں کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ ذرائع ابلاغ کا اپنا ایک رول ضرور ہے لیکن ایک خاص حد تک ...... اور اس کا ایک سب سے بڑا فائدہ انسان کو یہ پہنچا ہے کہ اُسے اپنے خیالات، احساسات اور ضرورتوں کو propogate کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔ گو کہ اس کا سب سے زیادہ فائدہ ترقی یافتہ اقوام ہی اٹھا رہی ہیں کہ تمام ذرائع ابلاغ ان ہی کے قبضہ میں ہیں۔ اب یہ سوالات اٹھائے جانے لگے ہیں کہ کیا ذرائع ابلاغ لکھے ہوئے لفظ کو Replace کر دیں گے؟ میرے خیال میں ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ لفظ کی اپنی ایک طاقت ہے۔ اور یہ طاقت اتنی سچی اور کھری ہے کہ ہمیں اب بھی بولنے کیلئے انہی کا سہارا لینا پڑتا ہے بلکہ ساری کارفرمائی اس سوچ اور خیال کی ہے جو ان مشینوں کے پیچھے موجود اشخاص کے ذہنوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں آج بھی تمام تر ذرائع ابلاغ کی سہولتوں کے باوجود ادبی اظہار کے لئے کسی غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور منٹو کی ضرورت رہے گی۔ کیونکہ یہ ان ہی لوگوں کی دماغی صلاحیت کے باوصف ہوا کہ انسانی ذہن کی تہذیب میں ان ہی لوگوں کا بہت بڑا حصہ ہے اب یہی شعر دیکھیے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے / آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غالبؔ کے اس شعر کو آپ کس طرح visualise کریں گے۔ اس کے مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس کے مفاہیم کے مکمل ادراک کے لئے ایک بار پھر ہمیں انہی اشخاص سے رجوع کرنا پڑے گا جو ادب کی ترقی و ترویج کے لئے دن رات لگے ہوئے ہیں۔ اصل میں یہ ساری چیزیں ایک دوسرے سے متحارب نہیں بلکہ معاون ہیں اور ہر ایک Method کا اپنا اپنا رول ہے اسی لئے ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اپناتے ہوئے ہمیں ان تمام لوازمات کا خیال رکھنا پڑتا ہے جو کہ کسی بھی چیز کے مکمل اظہار کے لئے ضروری پڑتے ہیں۔ امریکہ جیسے ملک میں بھی جہاں ذرائع ابلاغ نے ترقی کی آخری سرحدوں کو چھو لیا ہے اسے بھی انسانیت کی معراج کو پانے اور ایک خاص ذہنی سطح برقرار رکھنے کے لئے اپنے معاشرے میں ایک عدد این کریمر کی ضرورت رہے گی۔

کبھی وہ وقت بھی تھا کہ کہانی، کتھا، قصہ کہنے کے لئے ایک مجلس، نشست اور ایک بیان کرنے والے کی ضرورت تھی اور وہ ایک دفعہ کا ذکر ہے یا ہمارا تمھارا خدا بادشاہ جیسے الفاظ کا چناؤ کر کے اپنی بات کا آغاز کرتا تھا لیکن زمانے کی چال کی تیزی اور ترقی نے اُسے دوسرے دوراہوں پر لا کھڑا کیا۔ اب وہ اپنی ہی بنائی ہوئی مشینوں درمیان حیران و ششدر کھڑا اپنے ہی تماشوں سے خود کو اور دوسروں کو محظوظ کئے جا رہا ہے۔ اصل میں تمام ایجادات اور ترقی کے باوجود انسان ابھی تک اُس اسرار سے نہیں نکل سکا جو کہ اب بھی اس کی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اور اسی اسرار کو سمجھنے اور برقرار رکھنے اور اسے پرکھنے کے لئے cause and effect کی حقیقت کو پانے کے لئے اُسے اب بھی اس ادبی ورثے کی ضرورت ہے جو اس کے ماضی اور حال کو مستقبل میں منتقل کرنے کا سبب ہے۔

انسان اب بھی تصور کرنے والا ایک پرندہ ہے اسے نئی نئی کھوج اور تلاشنے کے نئے سفر کے لئے اب بھی اور بہت سے نئے آسمانوں کی ضرورت ہے اور وہ ایک نئی اڑان بھرنے کے بعد تھک کر نہیں بیٹھ سکتا بلکہ اور کچھ اور کی جستجو میں نئی پروازوں میں جت جاتا ہے۔ اس کی یہی لگن اُسے دوسری مخلوقات سے جدا کرتی

ہے بلکہ ممتاز بناتی ہے۔ اس کی ضرورتیں اور احتیاجات اپنی جگہ پر اس کے سارے لوازمات اپنی جگہ پر لیکن اسے اب بھی اپنی ذہنی روحانی اور اخلاقی برتری اور جمالیاتی اقدار کے لئے وہ جتن کرنے پڑتے ہیں جو شائد تمام ذرائع ابلاغ بھی مل کر اسے مطمئن نہیں کر پاتے اور اب ایسے میں اس کے پاس وہ کونسا ہنر رہ جاتا ہے کہ وہ اپنے تہذیبی اثاثے کو اس تخلیقی عمل کے ذریعے پیش کرے جو کہ اُس کی اب تک کی جستجو اور ارتقائی سفر کی ترجمانی کر سکے اور یہ کام یقیناً اب بھی ادب کی ترقی کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تمام تر انسانی ترقیوں اور نت نئے تماشوں کے ہوتے ہوئے بھی انسان کو اپنی تمام صلاحیتوں کا اظہار ان ادبی کاوشوں کے ذریعے ہی کرنا پڑے گا جو کہ ازل سے اُس کا پیچھا کر رہی ہیں۔ تمام فنونِ لطیفہ اب بھی اس کے وہ ساتھی ہیں جن کی مدد کے بغیر وہ ادھورا ہے۔ انسان اپنے اس ادھورے پن کو ہی پورے پن میں تبدیل کرنے کے لئے تگ و دو کر رہا ہے اور اس کے لئے یقیناً اسے اس وقت موجود تمام ذرائع ابلاغ کے ہوتے ہوئے اور ان کے رول کو مانتے ہوئے بھی اب تک اور آنے والے وقت تک ادب کی اتنی ہی ضرورت رہے گی کہ ادب بھی تو اُس کا مستقبل ہے جو ماضی اور حال کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ یہی تہذیبی ورثہ اُس کے مستقبل میں بھی اُس کے ساتھ رہے گا اور اُسے مزید اور مسلسل تخلیقی عمل کے لئے اُکساتا رہے گا۔

یونس صابرؔ...... ہائیکو

ٹھنڈیانی پربت
اس کا تپتا موسم بھی
ٹھنڈک پہنچائے!

☆

ٹھنڈیانی جا کر
ہم سب گرمائی چھٹیاں
کرتے ہیں انجوائے!

☆

برساتی نالہ
اُوپر اک چھوٹا سا پُل
اچھے ساتھی ہیں!

☆

نیچے گھاٹی میں
بل کھاتی پگڈنڈی پر
اک بہتا چشمہ

☆

پیڑوں کے پیچھے
کتنا دلکش منظر ہے
سُورج کا ڈھلنا

☆

اُس کو کالج پر
دیکھا اور چاہا، وہ پھر
ہر سیزن آئے

☆

چلتی رکتی ہے
یادوں کی ندیا میں اک
کاغذ کی ناؤ!

غلام جیلانی اصغر

مدار

بس ایک لمحے کی دوستی کا جواز کیا ہے؟
یہی کہ جسموں کی بے محابا طلب نے ٹکرا دیا ہے ہم کو
یہی کہ ہم دونوں اپنی اپنی اداس بیگانگی سے تھک کر
کنارِ راہِ طلب ملے ہیں!
پھر اس سے آگے مسافتیں ہیں،
طویل بے ڈھب مسافتیں ہیں
تھکے ہوئے دن کا جلتا سورج
وہ خود بھی میری تری طرح سے
مدارِ ہستی پہ چل رہا ہے
خود اپنی تنہائیوں کے دوزخ میں جل رہا ہے
اسی طرح جیسے تُو جلا ہے
اسی طرح جیسے میں جلا ہوں
مگر ہم اپنے بدن کے تنہا مدار پر ایسے چل رہے ہیں
کہ جیسے دونوں کے بیچ صدیوں کے فاصلے ہیں
بس ایک نقطہ بدن کا ایسا ہے
جس پہ ہم دونوں مل گئے ہیں
پھر اس سے آگے طویل صدیوں کے سلسلے ہیں!!

تیسری دنیا کے باسیوں کو مشورہ

اس کو آدھی دنیا دے دو
اس کی مٹی، لوہا، تانبہ
سونا، چاندی،
ہیرے، موتی
ہری بھری آسودہ فصلیں
کڑیل پیڑ، لہکتی شاخیں
چاندی جیسے بہتے دریا، نیلم جیسی جھیلیں
اس کو سب کچھ دے دو
شاید تم سے خوش ہو جائے
اور تمہارے بچوں کو جینے کی مہلت دے دے
تم تو سانس کی آمد و شد پر جی سکتے ہو
بھوکا رہنا جانتے ہو،
اپنا خون بھی پی سکتے ہو،
ننگے پاؤں ریت پہ چلنا
سردی کی آغوش میں سونا،
پھر بھی ہنسنا اور خوش ہونا
آدھی دنیا دے کر مل جائے گا ایسا جینا
مرنے سے بہتر ہے جینا!

غلام جیلانی اصغر

موجود سے لاموجود تک

اگر ہم اس طرح سوچیں!
''یہاں ہونے نہ ہونے کا کوئی مقصد نہیں ہے''
مگر جو بات ہملٹ نے کہی تھی
"to be,or not to be"
فقط اک partial سچ ہے؟
ہمیں ہونے کا کچھ کچھ تجربہ ہے
ہمیں جب بھوک لگتی ہے
تو کوئی چیز کھانے کی طلب بھی ہم کو ہوتی ہے
اگر جذبات جلتی آگ سی صورت
بھڑک اٹھیں
تو ہم آسودگی کے واسطے
محبت کا بڑی سنجیدگی سے سوچتے ہیں
''نہ ہونا'' ایک مفروضہ ہے، لا ہے
ریاضی میں حقیقت کے صحیح ادراک کی خاطر
مساوی قدر کو ہم لا بھی کہتے ہیں
اگر یہ لا نہ ہو تو پھر حقیقت کچھ نہیں ہوتی
مرا جینا حقیقت ہے، مرا مرنا حقیقت ہے
مگر یہ ایک لا ہے
فقط یہ بات کرنے اور چپ رہنے کا قصہ ہے
اگر میں بے محابہ بولتا جاؤں
تو کمرہ تالیوں کی گونج سے بجتا رہے گا
یہ to be کا ایک مظہر ہے
مجھے سب زندہ سمجھیں گے
اگر چپ سادھ لوں
اور سانس کی اس آمد و شد پر کوئی قدغن لگا دوں تو
مرے احباب روتے، آہیں بھرتے
مجھ کو مٹی کے گراں انبار کے نیچے دبا دیں گے
مرے خاموش ہونے کی خوشی میں یہ سزا دیں گے
یہ لا، موجود ہی کا ایک پہلو ہے!!

ترشنا

ہم لوگ عجب لوگ ہیں!
اک چھوٹی سی اُمید پہ جی لیتے ہیں برسوں
اک نیم تبسم پہ
بتا دیتے ہیں عمریں
اک لفظ ''محبت'' جو کہیں دور سے آئے
اس لفظ کو پڑھنے کے لیے ہم
راتوں کے اندھیرے میں جلا رکھتے ہیں آنکھیں
مانوس سی اک چاپ کو سننے کے لیے ہم
دروازے کے پہلو سے لگے رہتے ہیں پہروں
آشوبِ محبت کا مداوا نہیں کوئی
ہوتا تو ہر اک لمحۂ گزراں کو پکڑ کر
یہ پوچھتے اُس سے
کیا شہر ستم گر میں کوئی
شعبۂ انصاف نہیں ہے؟

انور زاھدی

نئے موسم کی چاہت

''نرودا'' نے اپنے اوائل زمانے میں
اک نظم میں یہ کہا تھا
''یہ وہ عمر تھی، شاعری جب،
مری جستجو میں، مرے سامنے آ گئی تھی،
وہ پر تھے، کہ......
میرا بدن جل رہا تھا
یہ لگتا تھا مجھ کو،
کہ درِ آسمانوں کے وا ہو گئے ہیں''
میں جب یاد کرتا ہوں
گزرے دنوں کو،
تو، لگتا ہے میری ملاقات بھی،
شاعری سے، کچھ ایسے ہی
بچپن کے بے خوف، انجان لمحوں میں
ممکن ہوئی تھی
گواہی کو گرمی کی راتوں میں
جلتے ستارے تھے،
بارش کی بوندوں میں،
خاموش گلیوں میں،
خوابیدہ قدموں کی ہلکی سی آہٹ تھی
آسیب زدگی کی
سُلگتی دوپہروں میں
جب سانس کی ڈور، اُلجھی ہوئی تھی
تو سردی کی شاموں میں
آنکھوں میں حیرت کے بادل سجانے کو
اُڑتے پرندے تھے
تاریک رستوں میں،
مستور رازوں سے اک بے کلی تھی
تبھی شاعری نے بڑے پیار کے ساتھ
میرے دھڑکتے ہوئے دل کو تھاما،
بشارت مجھے آنے والے زمانوں کی دی تھی
نئے ایک موسم کی چاہت کو
میرے لہو میں لکھا تھا!

ثمینہ راجہ/عدن

ہمیں اس باغ میں رہنے دیا ہوتا
وہیں آہ و فغاں کرتے
ہم اپنے ناتراشیدہ گناہوں کی معافی کے لیے
جن کو ہمارے نام پر، روزِ ازل سوچا گیا

اس باغ میں سرسبز تھے ہم
پتھروں میں سنگ تھے
پھولوں میں گل تھے
طائروں میں ہم بھی طائر تھے

ہمیں اس نیند میں رہنے دیا ہوتا
جہاں نوزائیدہ معصوم تھے ہم
ہر ثمر، ہر لذتِ تکمیل سے محروم تھے ہم
جسم پر ملبوس آبی تھے
مگر یہ دل حجابی تھے

تو ہم اس عالمِ خوابیدگی میں
نفس کی پاکیزگی میں
ساتھ، تیرے ساتھ رہتے
ہو چکا وعدہ، وفا کرتے
فرشتوں سے زیادہ ہم
تری حمد و ثنا کرتے
تجھے بھی یاد تو ہوگا
فرشتے جب ادب سے کہہ رہے تھے
"آپ وہ مخلوق پیدا کر رہے ہیں
جو زمیں پر شورشیں برپا کرے گی
خوں بہائے گی"
زمیں بھی کانپتی تھی
آزمائش سے پناہیں مانگتی تھی!

آسمانوں میں، زمینوں میں نہاں
سب حیرتوں کو
سارے رازوں کو
تو ہر اک جاننے والے سے بڑھ کر جانتا ہے
اپنی ہر اک مصلحت کو
خود ہی بہتر جانتا ہے
پھر بھی بہتر تھا
ہمیں اس قریۂ شاداب میں رہنے دیا ہوتا
وہیں اک نامکمل خواب میں رہنے دیا ہوتا!

ثمینہ راجہ

میں تمہارے فسانے میں داخل ہوئی　زندگی کی ہنسی نے

شام کی ملگجی روشنی
راستوں کے کناروں پہ پھیلی ہوئی تھی
فضا، زندگی کی اداسی سے لبریز اور زرد تھی
دور تک ایک نیلے تسلسل میں بہتی ہوئی نم ہوا
سرد تھی
آسماں نے زمیں کی طرف سر جھکایا نہیں تھا
ابھی اخترِ شام نے اپنا چہرہ دکھایا نہیں تھا
کہ جب میں نے بیکار دنیا کے ہنگام سے
اپنا دامن چھڑایا
دلِ مضطرب کو دلاسا دیا
آگے جانے کی جلدی میں
جنگل، پہاڑ اور دریا
کسی کو پلٹ کر نہ دیکھا
کہیں وقت کی ابتدائی حدوں پر کھڑے
اپنے پتھریلے ماضی کی جانب
بس اک الوداعی اشارہ کیا
خواب کا ہاتھ تھاما
نئے عزم سے سر کو اونچا کیا
اور تمہارے فسانے میں داخل ہوئی
شام کی ملگجی روشنی
راستوں کے کناروں پہ اس پل تھمی رہ گئی
زندگی کی اداسی سے لبریز ساری فضا
دم بخود
اور ہوا اپنے پاؤں پہ جیسے جمی رہ گئی

زندگی کی ہنسی نے مجھے ایک لمحے کو روکا
مگر غم کا صحرا، بہت دور تک
وقت کی آخری حد تلک پھیلتا تھا
کڑی دھوپ کی بیکراں وسعتوں میں
دریدہ، تپیدہ بدن دشت کے
فاصلوں میں، نمی کے لیے
راحتِ حسرتِ دائمی کے لیے
آنسوؤں کی ضرورت تھی
لیکن مجھے زندگی کی ہنسی نے کہیں ایک لمحے کو روکا

وہی ایک لمحہ
کہ جس میں ارادے بدلتے ہیں
اور زندگانی کے رستے بدلتے ہیں
لمحہ کہ جب رفتگاں کے بنائے ہوئے
سارے نقشے بدلتے ہیں
آئندگاں کے ستارے بدلتے ہیں!

ثمینہ راجہ

چاندنی اور دیوار

چاندنی روزن سے آئی
سامنے دیوار تھی
نیند جیسا تھا اندھیرا
چاندنی کے اور اس کے درمیاں،
چاندنی لائی اجالا اور خواب
زندگی کی روشنی
امید اور تابندگی
چاندنی لائی عجب خوشبو میں بھیگے کچھ گلاب
چاندنی کے ساتھ تھی ہلکی ہوا
دور پربت پر بسے اک شہر کی
اور لوک گیتوں کی صدا
اور شاعری
چاندنی کی آنکھ میں تھی اجنبی دنیا کی ضو،
اس کے دل میں جگمگاتے سرخ تارے کی چمک
آسماں کے اس طرف پھیلے کنارے کا خیال
جس میں جیتی ہے تمنا
جس میں ہوتا ہے وصال
جس سے اٹھتی ہے نئے آغاز کی معصوم لو،
چاندنی کے پاس تھا اظہار بھی
اقرار بھی
درمیاں تھا نیند جیسا گھپ اندھیرا
سامنے دیوار بھی!

مرا عہد اک رات ہے

مرا عہد اک بے پناہ رات ہے
ایک سیال اندھیرا
زمیں کے کناروں سے آگے
کہیں دور تک بہہ رہا ہے
کوئی روشنی کی کرن تک دکھائی نہیں دے رہی
خواب کی سیڑھیاں آسمانوں تلک جا رہی ہیں
مگر کہکشاں بجھ گئی ہے
یہ محسوس ہوتا ہے ماہ و نجوم
اس اندھیرے کے سیلاب میں بہہ گئے ہیں
کسی روشنی کی صدا
دور کے اس کنارے سے آتی نہیں ہے
کوئی شکل مشعل اٹھا کر
گھٹاٹوپ اندھیرے میں رستہ دکھاتی نہیں ہے
سویرے کی آواز
اب میرے دل کو بلاتی نہیں ہے!

کسے خط لکھیں
کس کو رنگیں ستاروں
دہکتے ہوئے سرخ پھولوں
دھڑکتی ہوئی آرزوؤں بھرا کارڈ بھیجیں
بھلا کس دریچے پہ اب
صبح سے پیشتر
نو شگفتہ گلابی کلی چھوڑ آئیں
کسے فون کر کے بتائیں،
ہمیں اس سے کتنی محبت ہے!

آغازِ عہدِ جوانی کا معصوم نغمہ
وہ سازِ غمِ عشق سے پھوٹتا اک ترانہ
محبت کا غمگین افسانہ
کس کو سنائیں

محبت!
یہ اک لفظ دل کو بہت درد دینے لگا ہے
محبت کہ جس کے فقط ہم دریدہ دلوں نے
پرانے زمانوں میں کچھ خواب دیکھے
محبت کہ جس کے دیئے زخم
ہم نے ہمیشہ اکیلے میں چاٹے
محبت کہ جس کے بیاں سے
زمانوں سے.........
ہم نے فقط رنج پائے
ہماری صدا
اس محبت کے جنگل میں گر کر کہیں کھو گئی ہے
ہماری ہنسی
اس محبت کے رستے میں اک سرد پتھر پہ
تھک ہار کر سو گئی ہے،

کوئی یادگارِ محبت کے اس سبز چمکیلے دن میں
ہماری ہنسی کو
کسی جگمگاتی کرن سے
ذرا گدگدا کر جگائے،
اندھیرے کے جنگل سے
گم گشتہ اک خواب کو ڈھونڈ لائے،

جو بیتاب آنکھیں، وہاں باغ میں
زرد پتوں پہ بکھری پڑی ہیں
کوئی ان کو جا کر اٹھائے
یہ ٹوٹا ہوا دل، محبت کے قابل ہے،
کوئی ہمیں بھی یہ مژدہ سنائے!

ثمینہ راجہ

SHANGRI-LA

کسی طلسم کی مدد سے اپنے پاس لائیں ہم
ہمیں بلا رہا ہے کتنی دور سے
وہ سبز پربتوں کے سائے میں کہیں چھپا ہوا
گلابی بادلوں کے نیچے
نیلی جھیل کے کنارے
مسکرا رہا ہے کتنی دور سے
کسی کے خواب میں مگر
ہماری آنکھ پر کھلا
کسی زمیں کا رنگ اپنی سرزمین میں گھلا
بہشت کا وہ عکس قاف کی کوئی مثال وہ
ہواؤں کا
فضاؤں کا
دعاؤں کا جمال وہ
جو چاندنی میں جھلملا رہا ہے کتنی دور سے،
کوئی نہیں
جو روز و شب سے قرض لے کے تھوڑا وقت
اس جمال روبرو تلک چلے،
کوئی نہیں، جو دل کی ہمرہی میں
زندگی کی خوشگوار آرزو تلک چلے،
یہ خوں میں جاگتی طلب کی بات ہے
کوئی جو سوزِ عشق تک
جو لمسِ خواب تک چلے
یہ باقی ماندہ عمر ہی کے روز و شب کی بات ہے،

کسی طلسم ہی سے تم کو ہم سفر بنائیں ہم
اگر نہیں
تو شنگریلا کس کے ساتھ جائیں ہم؟

ستم کی شاخ پر

ستم کی شاخ پر ہر روز تازہ پھول کھلتا ہے!
انوکھا باغ ہے یہ باغِ دنیا بھی
جب آئے تھے بھلا کب جانتے تھے
اس طرح کا گلستاں ہوگا
یہاں اشجار اور اثمار اور خوشبو
ہوائیں، ٹہنیاں، پتے
یہ گھاس اور اس کا نم، بہتا ہوا پانی
چمکتی دھوپ اور رنگین کرنیں
گھٹتے بڑھتے سائے
ساری زندگی پر پھیلتے سائے،
کسے معلوم تھا سب اس طرح ہوگا
انوکھا، اجنبی، بے وجہ اور بیکار
پُر اسرار......
اس اسرار سے اک لمحے کو جب پردہ ہلتا ہے
ستم کی شاخ پر اک پھول کھلتا ہے!!

مقصود وفا

ایک سوگوار نظم

اے عمروں کے غافل لمحے
دیکھ!...... ہماری آنکھیں دیکھ
اور پیروں کے چھالے گن
دور دراز کی مٹی میں ہیں صدیوں کے انبار
کتنے موسم آئے سفر میں
جانے کن کن ناموں کے
کتنی شاخیں، کتنے پتے، کتنے سورج
دھول ہماری شاموں کے
کتنی راتیں ہجر کی ہیں
اور کتنی صبحیں زخم ہوئیں
ان پیروں کے چھالے گن
اور ہماری پیٹھ پہ رکھے اس اسباب کو دیکھ
جس کے بوجھ میں دم گھٹ جائے......
اُس افسوس کو دیکھ!
ہاتھ ملیں تو خوں رستا ہے
دیکھ! لکیریں دیکھ!
اے عمروں کے غافل لمحے
گریہ زاری سُن
مچا ہوا ہے کھوکھلے تن میں
کس چُپ کا کہرام
ہم کس جنگل کی راتیں ہیں
کس صحرا کی شام
کن ہاتھوں کی ڈور پہ ناچے نامعلوم آغاز
کس مٹھی نے بھینچ لیا ہے راز بھرا انجام!

غلام حسین ساجد

تقطیب

نیند میں چلتا ہوں جتنی دور تک
برف سے خالی زمیں کی کھوج میں
کاش بیداری کے عالم میں کبھی
اپنی وحشت سے گریزاں خاک پر
دو قدم اس سے زیادہ چل سکوں

ڈیزی کٹر

ریت میں ڈھلتے پتھر
پانی ہوتی ریت
دھند میں چھپتا پانی
دھوپ میں جلتی دھند
دھوئیں میں گھلتی دھوپ
نیند میں بہتا زہر
سنگ اٹھے ہیں
ایک طلسمی آنچ سے کتنے شہر
کون ہے جس نے
خواب نگر پر ڈھایا ہے یہ قہر!

سعید احمد

جب بینائی ساون نے چرائی ہو

خستگیِ شہرِ تمنا کی نہ پوچھ
جس کی بنیادوں میں
زلزلے، موجِ تہِ آب سے ہیں

دیکھ، امید کے نشے سے یہ بوجھل آنکھیں
دیکھ سکتی ہیں جو......
آئندہ کا سورج زندہ
دھوپ کے پیالے میں
زیست کی ہریالی

زرد چہرے پہ یہ کیسا ہے پریشان لکیروں کا ہجوم
اور کیوں خوف کی بدشکل چھپکل پائی کوئی
تجھے باہوں میں جکڑنے کو ہے

زلزلے، نیند سے بیدار ہوا چاہتے ہیں کیا؟ تو کیا؟
چھوڑ بھی شہرِ تمنا کا خیال
(دیکھ امید کے نشے سے یہ بوجھل آنکھیں)
شہر مسمار کہاں ہوتا ہے
شہر آثارِ قدیمہ میں بدل جائے گا

صبحِ آئندہ کے افق سے دُور

ذہن کے کاغذ پر
یاد نقطہ سی کوئی
پھیل کر رات بنی
رات بھی کو کھ جلی
تازہ قبروں کی طرف لے کے چلی
(تازہ قبریں، کہ ہیں صدیوں کی چٹانوں میں دبی)

دل میں لاوہ سا ابلتا لاوہ
وصلِ امکانِ گزشتہ کا غبار
(شہر کا شہر ہے جس کی زد پر)

ناخنِ جوشِ جنوں
دیکھ چھل جائے نہ یہ زخمِ قدیم
اور چھڑ جائے نہ پھر ساز کوئی
لذتِ ایذا کا

ریشہ ریشہ الجھی
ریشمی رات کے جادو کی ردا
کھینچ کے سر سے اتار
راہ تکتا ہے کھلی باہوں سے
چاند، نسیان کا چاند

سعید احمد

ڈوبتے سورج کی سرگوشی

ڈھیر کرچیوں کے
آنکھ میں ہیں لیکن
آئنے کا نوحہ
ہر کسی قلم کی دسترس سے باہر

روشنی کے گھر میں
تیرگی کا پتھر......
کس طرف سے آیا؟......
کون ہے وہ آخر......؟
جو پس تماشا مسکرا رہا ہے

اک سوال ہوتی
زندگی نگر کی
سیڑھیاں خبر کی ڈھونڈتی ہے لیکن
خواب کے سفر کی ساعتوں پہ قدغن
سوچ رہزن سر ہے

نیند کی سحر جو
قریہ تمنا لوٹ لے گیا ہے
اس کے نقش پا بھی
چن لئے ہوا نے

منصفی کے داعی
بے یقین موسم بانٹتے ہیں گھر گھر
اور ہڈیوں کے ناتواں سے پنجر
سرخ بتیوں کے خوف کی سڑک پر
سائرن بجاتی ایک ناگہانی
تا ابد تعاقب......
ختم ہے کہانی......

سعید احمد

فردا کے خرابے میں بھٹکتے قدیم خیال

سارے میں گھپ اندھیرا
جب سانس لے رہا تھا
کن ممکنات کی ضو
ذرّہ وجود کا تھا

جو آرزو کے دکھ سے
بے رنگ کینوس پر
تصویر ہو گیا تھا

کس وصل کی طلب میں
صدیوں کے راستے پر
بے خواب دوڑتا تھا

ہر کام فاصلوں کے
بے آب آئینوں میں
اک عکس دیکھتا تھا
تنہائیوں کے برگد
موجود سے عدم تک
پھیلے قدیم سائے

بشریٰ اعجاز

نظم

تری نیند کے سرہانے
مری رات جاگتی ہے
مرا دکھ سنور رہا ہے
مرا درد جل رہا ہے
کسی خواب کی تمنا
کسی وصل کی ضرورت
کوئی اک اداس موسم
کوئی بے وصال خواہش
کوئی بے کمال راحت
کوئی شعلہ بار آہٹ
مری خاک چن رہی ہے
تری نیند کے سرہانے
مری رات جاگتی ہے
مری آنکھ سے نکل کر
کئی زاویوں میں ڈھل کر
کسی لمس سے گزر کر
کسی قرب سے سنور کر
یہ جو وقت بھاگتا ہے
مرے ساتھ جاگتا ہے
اسے آ گلے لگالیں
تری نیند کے سرہانے
اسے اوڑھ لیں، بچھالیں
مرے اے نصیب تجھ کو
ذرا دیر تو جگالیں!!

بشریٰ اعجاز

صرف ایک اشک ہے، بجھا ہوا

یہ دھول ہے
اڑا رہے ہیں
جس کو ہم ترے بغیر
یہ دشتِ ہول ہے
جہاں وفا شناس لوگ
دل کی محفلوں سے اٹھ گئے
فریب آئنہ ہے زیبِ داستاں
ہے عکس کی تلاش میں جگر فگار کارواں
محبتوں کی اوس شہرِ جاں میں خیمہ زن ہوئی
نہ راحتیں شمار کر کے درد مسکرا سکا
نہ نیند آئی رات کو
نہ دن کی آنکھ لگ سکی
عجیب سازِ زوال تھا
جہاں بسر کی مدّتوں کو کاٹنے میں
صَرف جسم و جاں ہوئے
مگر کبھی نہ کٹ سکیں
ہری زوال مدّتیں
حریمِ دوستاں میں
اک نگاہِ خوش کی دھوم تھی مچی ہوئی
اور ہم
اڑا رہے تھے دھول دشتِ ہول میں
سحر کی اور شام کی
حقیقتِ تمام کی

تھکن مسافتوں کی تھی
یا پھر رگوں میں
جم گیا تھا، بے دلی کا لوتھڑا
جکڑ لیے تھے پاؤں دلدلوں نے
یا کہ یرغمال بن گئی
حرارتوں کی حرکتوں کی داستاں
خبر نہیں
مرے حبیب! آج کچھ خبر نہیں
سنا ہے آج
خنجروں کی نوک پر
لہو نہیں ہے، صرف ایک اشک ہے، بجھا ہوا!

بشریٰ اعجاز

پکارا ہے......!

پکارا ہے
مجھے کس نے پکارا ہے
ذرا اے جاں ٹھہر جانا
ذرا اے چاند رک جانا
کوئی خوش فہم ساعت ہے
کوئی بیدار لمحہ ہے
طلوعِ صبح جیسا ایک منظر
تیرگی کے رخ پہ پھیلا ہے
نظر کا کینوس
اپنے نظارے سے یکایک بھر گیا ہے......
سکوتِ درد کا لمحہ
اچانک طربیہ [illegible] گنگنایا ہے
مرے اندر
کوئی روتے میں کھل کر مسکرایا ہے
یہ چمبیلی کی خوشبو ہے
کہ بادِ سبز کا جھونکا
مرے کمرے میں آیا ہے
مجھے اب رنج و غم پر کچھ نہیں لکھنا
زبانِ بے زبانی میں کوئی قصہ نہیں کہنا
فراق و ہجر کے مضمون پھیکے ہو گئے ہیں
تھے جن کو روگ لاحق
وہ بھی بیمار اچھے ہو گئے ہیں!

بہت اچھا کیا!

بہت اچھا کیا
رستہ بدلنا اب ضروری تھا
ضروری تھا
سفر میں سانس لینا
اور ٹھہر کر سوچنا
واپس پلٹ جانا
کسی کنجِ قفس میں بیٹھ کر
پھر تجزیہ کرنا
محبت کا، حقیقت کا
پرانی سوچ کے
سب زاویوں کو بھول جانا
اپنے آدرشوں کی ہمراہی میں
تازہ فکر کے غنچے سجانا
خود کو بتلانا
فقط اک درد کی تفہیم میں
جاں کو گھلانا کیا
محبت کے سفر میں
ساتھ چلنے کا بہانہ کیا
یہ قصہ اب پرانا ہے!

بشریٰ اعجاز

ملا بھی تھا کوئی یا......؟

بہت لمبی اداسی ہے
بہت گہرا اندھیرا ہے
بڑی بے نام فرقت ہے
بڑی بے رحم خاموشی
میں تنہائی کی پاتالوں میں بیٹھی سوچتی ہوں
ملا بھی تھا کوئی یا
خواب سا تھا بس ملن کا استعارہ تھا
وہ جس نے شوق کے جگنو
محبت کے لبادے میں •
بڑی چاہت سے ٹانکے تھے
وہ جس نے راستوں کی ظلمتوں میں
صبح کے تارے سجائے تھے
وہ جو قربت کی اوّل ساعتوں میں
بھیگتا تھا اور بھگوتا تھا
وہ جس کو جسم کے اسرار سب معلوم تھے
اور جانتا تھا پیار کی ساری کہانی کو
محبت کے انوکھے زاویے معلوم تھے جس کو
جو خواہش کو بدن کے اور دل کے واسطوں سے جانتا تھا
کہاں ہے وہ
مرے دل وہ کہاں ہے
بہت لمبی اداسی ہے، بہت گہرا اندھیرا ہے
میں تنہائی کی پاتالوں میں بیٹھی سوچتی ہوں
ملا بھی تھا کوئی یا ؟

اب کیا فرق پڑتا ہے

کوئی رستے سے لوٹے
یا بسرِ منزل وہ تنہا ہو
کنارِ دشتِ جاں ہو ابر کا ٹکڑا
یا بھوری ریت پر سورج کا گولا ہو
کوئی شامِ جدائی ہو
یا کوئی بے دلی سے راستوں میں
ساتھ چلتا ہو
کسی کی آنکھ بنجر ہو
یا بحرِ بے کراں کی موج
ساحل سے لپٹتی ہو
ستارہ کوئی شب کے تھال سے گر کر
چٹختا ہو
یا ٹھنڈی چاندنی کا دل
زمینوں میں دمکتا ہو
مراسم کے دوراہے پر
رہو تم اس طرف یا اُس طرف جاؤ
بھلا کیا فرق پڑتا ہے
کہ ساری بات تو قصے میں
حرفِ آرزو کی تھی
کمالِ جستجو کی تھی
فقط میں اور تو کی تھی
جسے ہم تم گنوا بیٹھے
دیئے سارے بجھا بیٹھے!

عذرا نقوی

اک نئی کہانی

یہ ہی بچپن سے مری ماں مجھے سمجھاتی تھیں
جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے ہیں
روز اسکول میں خوش خط یہی استانی بھی
لکھواتی تھیں
جیت سچ کی ہی ہوا کرتی ہے
دادا ابا کے سنائے ہوئے قصے میں بھی
سرخرو سچ ہی ہوا کرتا تھا
نانی اماں سے کہانی جو سنا کرتے تھے
ہم رات گئے
نیند میں ڈوبی ساعت میں اتر آتا تھا
ہر کہانی کا وہی ایک سا انجام ہوا کرتا تھا
اور سچ جیت گیا
کتنے نادان تھے بھولے تھے وہ لوگ
کون سی دنیا میں گم رہتے تھے
اپنی نادانی سے، ہم بچوں کو گمراہ کیا کرتے تھے
میں نے سوچا ہے کہ بچوں کے لیے
ایک کہانی لکھوں
میں لکھوں گی مرے پیارے بچو!
جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے ہیں
اس کو چلنے کی ضرورت ہی نہیں
جھوٹ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں
سچ اپاہج ہے، پھٹی آنکھوں سے بس تکتا ہے
جھوٹ کی تخت نشینی کی پریڈ!

خواب جنگل

نیند پالکی اتری رات دور جنگل میں
خواب خواب منظر تھا
دھیرے دھیرے بہتی تھی
سمفنی ہواؤں کی رات چاند بادل میں
چاندنی کی بانہوں میں جھیل والتز کرتی تھی
دھیمی دھیمی سی خوشبو ساتھ چلتی تھی
کنج میں درختوں کے بے خودی کے عالم میں
مست ڈار ہرنوں کی بیلے رقص کرتی تھی
ہرنیوں کی آنکھوں میں، مشک سی مہکتی تھی
کالے پیرہن پہنے،
باوقار پیڑوں نے وائلن سنبھالے تھے
جھومتے ہوئے پتے تالیاں بجاتے تھے
گنگناتی بیلوں پر پھول کسمساتے تھے
جگنوؤں کی جھلمل سے راج ہنس سوتے سے
جاگ جاگ اٹھتے تھے
آہٹیں پرندوں کی اپنے شب بسیروں میں
پائلیں بجاتی تھیں
اپنے بند کمرے میں آنکھ جو کھلی دیکھا
شہر کی کثافت سے مضمحل سا سورج پھر
ایک اور نئے دن کی دھول لے کے آیا تھا
ٹی وی والے کمرے میں صبح کا خبرنامہ
اطلاع دیتا تھا
ایک اور جنگل کو کاٹ کر لگا لیں گے راستہ ترقی کا

رانا سعید دوشی

اوپلے تھاپتی ہتھیلی

میری بنجر ہتھیلی پر بھی
دیسی کھاد کا اک ڈھیر تھا
جس کو، کسی مرغی نے پنجوں سے
تلاشِ رزق میں ایسے کریدا ہے
کہ اب اس پر لکیریں اُگ رہی ہیں
اور لکیریں بھی کسی دیہات کی
گلیوں کے جیسی
تنگ، ترچھی اور بدبودار
کیچڑ سے بھری، کچی
کہ جس کے بیچ
کھرلی سے بندھی گائے جگالی کر رہی ہے
ساتھ...... اک معذور سی گرتی ہوئی
دیوار گیلے اوپلوں نے تھام رکھی ہے
ذرا آگے
کسی چوپال میں ٹوٹی ہوئی اک کھاٹ کے نیچے
پڑی پگڑی پہ حقہ گر گیا ہے
اور چلم کی راکھ میں دبکی ہوئی چنگاریاں
بادل بناتی ہیں
ہرے پیپل کے طوطے اڑ گئے ہیں
اب مرے دن پھرنے والے
مجھے فٹ پاتھ کے طوطے بتاتے ہیں
کئی راتوں سے متواتر
میں بس! یہ خواب دیکھے جا رہا ہوں

جاگتے رہنا

گلی میں لالٹینیں لے کے پھرتے
رت جگے
لاٹھی بجاتے ہیں تو اس لاٹھی کی
ٹھک ٹھک سے
مرے سپنے بھی چکنا چور ہوتے ہیں
میں ان کی کرچیاں
پلکوں سے چنتا ہوں
تو ''لوگو! جاگتے رہنا'' کی
اک بوڑھی صدا چپکے سے
میرے کان میں
لفظوں کا سیسہ ڈال دیتی ہے
میں سونے کے عمل سے پیشتر ہی
جاگ جاتا ہوں

مری آنکھوں کی لالی
نیند سے بوجھل پپوٹوں سے
بڑے غمناک لہجے میں یہ کہتی ہے
''ہمیں ہی جاگنا ہے تو یہ پہرے دار
اپنی نیند کیوں برباد کرتے ہیں!''

رانا سعید دوشی

کاش میں بھی زمیں پر اگتا

ذرا سا بیج میں مخفی
میں سایہ دار پیپل تھا
مجھے جنگلی کبوتر نے
پرانی سی حویلی کے کسی چھجے کے نیچے
عین، پرنالے پہ لا کے بو دیا ہے
اور میں......
اگ بھی گیا ہوں

پر
مرا دھرتی سے کوئی رابطہ بنتا نہیں ہے
میں پرنالے کے گدلے پانیوں پہ پل رہا ہوں
مری شاخیں
مرے پتے
زمیں کی گود سے مانوس کیا ہوتے؟
جڑوں نے تو زمیں سے اُٹھنے والی
خوشبوؤں کا ذائقہ تک بھی نہیں چکھا
مگر پھر بھی
زمیں کی کھینچ میری جڑ کو اپنی سمت
کھینچے جا رہی ہے
جڑیں، دیوار کی درزوں میں بستے
کنکھجوروں کے گھروں میں گھس کے
پنجے گاڑ لیتی ہیں
مگر میں خود
زمیں کی سمت کھنچتا جا رہا ہوں

یونہی کھنچتا رہا تو
ایک دن میں نے زمیں کو چھو ہی لینا ہے
بھلے مجھ پر
حویلی کے در و دیوار ٹوٹیں
سارا ملبہ اور چھجا سر پہ آ جائے!!

رانا سعید دوشی

کفن میں جیب ہوتی تو!

کفن میں جیب ہوتی تو
مرے پسماندگاں مجھ کو
کبھی مرنے نہ دیتے اور......
میں مرنے کے لئے سو سو جتن کرتا

اگر میں خودکشی کرتا تو میری لاش کو
پنکھے سے لٹکا چھوڑ دیتے
پھر مجھے مردود کہہ کر
فاتحہ خوانی پہ پابندی لگا دیتے
مری میت پہ رو رو کر
زمیں کو بھی سمندر میں بدل دیتے
(سمندر میں کسی میت کو کفنایا نہیں جاتا)

وہ میری لاش کو فرعون کی میت سمجھ لیتے
کسی اہرام میں رکھتے
مری لکھی ہوئی تحریر میں ردّ و بدل کر کے
وہ دستاویز بنواتے
خبر اخبار میں چھپتی
میں اپنا جسدِ خاکی تجربہ گہ کے لیے ڈونیٹ کرتا ہوں
مجھے پھر کون دفناتا!
مرا پنجر کسی شیشے کے پنجرے میں سجا ہوتا!!

شکیل احمد طاہری

ناممکن کا ہونا

کیا کوئی بات بنے گی ایسے
یا کوئی رات کٹے گی ایسے
کیا کوئی ملنا طے ہے اس کا
ایسے کیا شنوائی ہو گی
کیا رکھا ہے ان باتوں میں
جو تم کرتے رہتے ہو
''کچھ بھی نہیں'' تو پہروں بیٹھے
یوں کیا سوچتے رہتے ہو

میں نے دیکھا ہے

موہنے روپ بدلتے منظرو
گود میں لیتی ہواؤ
مشکل وقتوں میں......
میں نے تم کو پتھر ہوتے دیکھا ہے
چاہ...... اُمنگ کے دھوئیں میں
تن گرماتی لڑکیو
میں نے تم کو جلتے لہو کا الاؤ تاپتے دیکھا ہے
زیست کے دھوکے میں
دنیا تیاگ کے
دور دراز کو جانے والے راہبو
میں نے تم کو لوٹ کے اپنی قبروں پر ہی
خاک اڑاتے دیکھا ہے!!

ثروت زہرا

ایک اور فتح کے بعد

کلسٹر بم کے ٹکڑوں سے
مری دھرتی
نئی دنیا اگائے گی
ہوا مردہ گلے جسموں کی بُو میں
لڑکھڑائے گی
ڈری سہمی ہوئی مائیں
اب اپنے وقت سے پہلے
زمانے کے ادھورے طفل جنمیں گی
کھلی آنکھوں میں حیرانی سمیٹے میرے بچے
اب زبانیں، درد سے آہوں سے
اور چیخوں سے سیکھیں گے
بلیک آؤٹ میں بیٹھے
ایڈسن کو شکریہ کی میل بھیجیں گے
عقوبت خانوں میں
بے داغ جسموں پر
زمانے کے ستم توڑے گئے تو کیا!
ہم ایوریوتھ (Everyouth) کریموں سے
ہر اک سلوٹ چھپالیں گے
کلوننگ کے لیے خلیے ملیں گے!
فرد ہم پھر سے بنالیں گے
زمیں یہ بجھ گئی تو کیا؟
کسی بھی اور سیارے پہ جا کر ہم
نئی دنیا بسالیں گے!

فرزانہ رضوی

گئے دنوں کے نشاں

گئے دنوں میں......
کچھ امکاں مرے ہاتھوں سے گرے
کچھ ہُنر دوسروں کے پاؤں تلے کچلے گئے
کچھ تمناؤں کو خوابیدہ ہی رکھنا تھا
وہ خوابیدہ رہیں
خواہشیں معیوب جو کہلائیں
انہیں چھوڑ دیا
چند جذبے تھے بلندی پہ
خود ہی آ گئے پستی کی طرف
اک محبت کی صفت، جس کو سنبھالے رکھا
زخمی رہی مرہم کے بغیر

ٹوٹے پھوٹے سہی، ان سب کے نشاں
پچھلے رستوں کے کنارے پہ ہیں محفوظ ابھی
آج میں باقی بچی ہوں جتنی
اُتنا ہی لے کے ادھر جاتی ہوں
اک ادھوری سی دعا پڑھتی ہوں
پھول خاموشی کے رکھ آتی ہوں

عشرت رومانی

کہانی

کیوں ساحل ہے نمناک ابھی!
کیوں دریاؤں میں ہلچل ہے!
پھر رم جھم ہے پھر ساون ہے
کیوں سونا دل کا آنگن ہے!
پھر یخ بستہ یہ راہیں ہیں
پھر بھیگی سرد ہوائیں ہیں

جب وقت کی کھڑکی سے باہر
ہم سوچ کی وادی میں اُترے
احساس کو پھر بیدار کیا
پھر لفظوں کو تلوار کیا
سنسان اجڑتی راہوں کو
اُن گلیوں اور چوباروں کو
پھر ہم نے گل و گلزار کیا
پھر یادوں کا دیدار کیا
پھر وقت کے سادہ صفحوں پر
الفاظ کو شعلہ بار کیا
مفہوم کو جب بیدار کیا
احساس کو پھر تلوار کیا

اب سوچ کے تپتے ساحل پر
احساسِ ستم کے خنجر سے
انساں کی کہانی لکھنی ہے
شعلوں کی زبانی لکھنی ہے

خلیق الرحمٰن

یہ مری روح

یہ مٹی کا بُت ٹوٹ جائے گا
فانی
مرا جسم مٹی میں مل جائے گا
اور بھٹکتی ہوئی روح میری
زمانوں کے پھیلے
سمندر پہ لہریں بناتے ہوئے
پانیوں میں اتر جائے گی

یہ مری روح قالب بدل کر
ہمالہ کی گمنام
اونچی چٹانوں کی یخ بستہ پوشاک پہنے گی
ساحل پہ کھلتے
بنفشے کے پھولوں کے سندر بدن میں
اُتر جائے گی
آسمانوں خلاؤں کا یوگی بنے گی
ازل سے ابد تک بکھر جائے گی!

خلیق الرحمٰن

ٹوٹمی اپنا قبیلہ یاد آیا

پھر ہزاروں سال گزرے
دوستوں کے ساتھ پلنگ پر گیا تو
ہم نے اک خیمہ لگا کر رات جنگل میں گزاری
دیر تک آتش جلا کر گوشت بُھونا
گپ لگائی
پھر اچانک
ٹوٹمی اپنا قبیلہ یاد آیا
ہاتھ میں بھالا اٹھایا
ہڈیوں اور سیپیوں کے ہار کو ڈالا گلے میں
چل پڑا چقماق کا پتھر اٹھا کر
دیر تک میں
ٹنڈرا میں منطقہ حارہ کے پھیلے جنگلوں میں
بارہ سینگھے ڈھونڈتا
چونے کے پتھر کی پرانی ایک تیرہ غار کی جانب بڑھا میں
تیل میں کائی کی بتی جل رہی تھی
آگ پر اک ارنا بھینسا بھن رہا تھا
اک طرف کوئی شکاری گیت گایا جا رہا تھا
ہڈیوں کی نلکیوں سے سیٹیاں سی بج رہی تھیں
کوئلے سے اک طرف
دیوار پر کچھ آڑی ترچھی سی شبیہیں
دیویوں کی بن رہی تھیں
ٹوٹمی اپنے قبیلے سے ملا
جنگل کی جانب چل پڑا میں
پھر کھلے میدانی قطعوں کی طرف
دریاؤں، تالابوں کے رستے ساحلوں پر
دھان کے، گندم کے کھلیانوں سے ہوتا
آہنی وادی کی جانب
کنکریٹی بستیوں میں آ گیا میں
رات گزری
پھر اُجالا دور تک جنگل میں پھیلا
ہم نے پیرا شوٹ کا خیمہ اکھاڑا
کار میں سامان رکھا
اُس گھنے جنگل کو چھوڑا
اور مہذب ایٹمی بستی کی جانب آ گئے ہم

ترنم ریاض

رابطہ

آنے والی نسلوں سے
کیا ربط رہے گا
اُن کی نسوں میں
جانے کیا سیّال بہے گا
آگ کے ہوں گے لوگ
کہ چلتے پھرتے پتھر
پانی کیا ہوتا تھا
اُن سے کون کہے گا

گناہ جیسا

تمہارے ابروؤں کے درمیاں
واضح عمودی خط
نگاہوں میں چھپے شعلے
انا کے ضبط کو
شیریں زبانی میں
چھپانے پر نہیں قادر
کہ مجھ کو گھر سے باہر جا کے
کوئی کام کر لینا
گناہوں جیسا لگتا ہے

جاوید فیروز

محبت......!!

محبت تو ترے کُرتے کا ٹوٹا وہ بٹن ہے
جس کو ہم نے جیب میں کچھ یوں چھپایا ہے
کہ جیسے کائناتی استعارہ ہو......!!
محبت! آئینے سے جھانکتا وہ عکس ہے
جس کے ٹھٹھرتے ہونٹ پر مسکان نیلی پڑ گئی ہے......
محبت تو درختوں کے کہیں اُس پار
بجتی بانسری کا دُکھ بھرا وہ گیت ہے، جاناں
جسے سن کر بدن کا ایک اک ریشہ لرزتا ہے
مرے اندر بکھرتا ہے......!!
محبت تو پلک کی اوٹ سے لپٹا وہ آنسو ہے
جسے باہر کی دنیا میں نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ملتا
کنارِ چشم لمحہ بھر ابھرتا ہے
لرزتا ہے
پھر اُس کے بعد واپس لوٹ جاتا ہے
مرے اندر کی دنیا میں......!!
محبت تو وہ نیکلس ہے
جسے رکھ کے کہیں تم بھول بیٹھی ہو
محبت وہ پرندہ ہے
جو اک دن شاخ سے اُڑ کے فلک کی نیلگوں حد سے پرے
کی ایک دنیا میں گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا
مگر وہ شاخ اب تک تھرتھراتی ہے
مسلسل بین کرتی ہے......!!

فاروق مونس

لامکاں جستجو میں

زندگی کے گھنے جنگلوں میں
کسی لامکاں جستجو میں
اٹھائے ہوئے اپنا رختِ سفر
میں مسلسل شب و روز کی
پُرتھکن سی مسافت سے
ٹوٹا ہوا جسم لے کر
اچانک ہی بوڑھے شجر کی گھنی چھاؤں میں
جب رُکا تو
وہ رونے لگا!
میں نے پوچھا کہ تیرے بدن پر بھی
جابر ہوا نے
لگائے ہیں چرکے
کہ تیری رگوں سے بھی وہم ویقیں
خوف بن کر ٹپکنے لگا ہے؟
تو کہنے لگا بے خبر اے مسافر!
ذرا دیکھنا! تم بھی جنگل میں ہو
اور یہاں کے قوانین
جنگل کے ہیں سب
یہاں زندہ رہنے کا حق بھی انہیں ہی میسر ہے
جن کی کماں سے نشانہ نہیں چوکتا
جن کے سینے میں پتھر کا دل جاگزیں ہے
یہاں کوئی غفلت کسی بھیڑیے کا نوالہ بنائے
یہاں خارزاروں میں دامن جو الجھے
تو پھر وہ رفو ہو نہ پائے
شجر کی کہن سالہ دانش
بھنور بن کے ناچی
بگولے لپٹنے کو دوڑے
تو میں بھی اچانک ہی
زادِ سفر کی مشقت اٹھا کر
کسی لامکاں جستجو میں
روانہ ہوا
پھر نئے اک سفر پر

وسیم صادق

ستارے خواب کیوں دیکھیں

ستارے خواب کیوں دیکھیں
انہیں تو جاگتے رہنے کی عادت ہے
یہ سچ ہے کہ
انہیں دھرتی کے لوگوں سے محبت ہے
انہیں اچھا نہیں لگتا
کسی بھی شخص کا تاریکیوں میں بے سبب رہنا
ستارے خواب کیوں دیکھیں
انہیں تو نیند میں ڈوبی ہوئی
کوئی بھی شے اچھی نہیں لگتی!

زرّیں یٰسین

اقدار

ہوا آہستہ چلتی ہے
مری سانسوں میں کوئی درد ٹھہرا ہے
زمین و آسماں کے درمیاں
یادوں کا میلہ ہے
دریچے آس کے وا کر دیئے لیکن
دریچوں سے پرے اک آہنی دیوار پھیلی ہے
جسے ہم تم مہذب لوگ سب
تہذیب کی اقدار کہتے ہیں
اور ان اقدار میں جکڑے ہوئے ہم سب
پرندوں کی طرح بے بس سے رہتے ہیں
ہوا آہستہ چلتی ہے

تعلق

وقت کے پگھلنے تک
تم ذرا یہیں ٹھہرو
جاگتے ہیں یہ لمحے
آرزو کو پلنے دو
غیریت کی دیواریں
اسقدر نہ پھیلاؤ
یاد کا کوئی چہرہ
میرے پاس رہنے دو

ایک دن

آج کا دن بھی گزرا یونہی
اس دریچے سے پرے
سوکھی ہوئی شاخ کو تکتے تکتے
ذہن کے طاق میں اٹکی ہوئی
الجھن کوئی بنتے بنتے
کسی بے معنی سی اک بات پہ
خود سے یونہی لڑتے لڑتے
آج کا دن بھی گزرا ہے یونہی
گزری ہوئی رات کی ٹوٹی چوڑی
زخمی پوروں سے یونہی چنتے ہوئے
ان کہی باتوں کا ادھڑا آنچل
گزری یادوں سے رفو کرتے ہوئے
آج کا دن بھی گزرا یونہی

سوال

ہم خزاں کے موسم میں
رنگ اور خوشبو کا
پھر سوال کر بیٹھے
زندگی ادھوری تھی
اور کسی کو پانے میں
جو بھی حال کر بیٹھے
آرزو رہی تشنہ
درد کی تہوں میں پھر
خود کو جال کر بیٹھے

ڈاکٹر نوازش علی

اسلم کمال کے تین سفرنامے......ایک جائزہ

مہرباں تنہائیوں میں اسلم کمال کے سفرناموں کے اوراق میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے، مسافتوں کی رفاقتوں کا احساس جاگتا ہے اور اجنبی دیسوں میں پھرنے کے باوجود مانوس اپنائیت کی سرشاری پورے وجود میں دوڑنے لگتی ہے۔ مصوروں، خطاطوں، مجسمہ سازوں، شاعروں اور ہنرمندوں کا ایک قافلہ مستقل طور پر آنکھوں کے سامنے سے گزرتا جاتا ہے اور زندگی اپنے خوابوں اور جذبوں سمیت بے نقاب ہوتی رہتی ہے۔

اسلم کمال نے اپنے پہلے سفرنامے ''لاہور سے چین تک'' کی ابتدائی سطروں میں لکھا ہے۔

''میں ان اوراق میں جغرافیہ کا طالب نہیں ہوں

شاعر ہوں، حسن پرست ہوں

میں مؤرخ نہیں ہوں، محقق تو بالکل نہیں

مصور ہوں، خطاط ہوں''

تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں یقیناً سفرنامہ کی ذیل میں نہیں آتیں تاہم تاریخ اور جغرافیہ سفرنامے کے عناصر ضرور ہوتے ہیں۔ لہذا ان سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی۔ اسی لیے اسلم کمال اپنے سفرناموں میں تاریخ اور جغرافیہ کو چھوتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

اسلم کمال کے اب تک تین سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا سفرنامہ ''لاہور سے چین تک'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ دوسرا سفرنامہ ''اسلم کمال اوسلو میں'' کے نام سے ۱۹۹۱ء میں چھپا جبکہ تیسرا ''گمشدہ'' کے عنوان سے جون ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ سفرنامہ نگاری کے حوالے سے اسلم کمال کے ہاں حیرت انگیز ارتقاء دکھائی دیتا ہے۔ ان کا پہلا سفرنامہ اپنے نام ہی سے واضح ہے۔ یہ لاہور سے چین تک کے سفر کو محیط ہے۔ ایک تو نقشِ اول ہونے کی وجہ سے اور دوسرے چینی میزبانوں کی صوابدید اور پروگرام کی نوعیت کے اعتبار سے تخیل کو اپنے امکانات کھنگالنے کے زیادہ مواقع میسر نہیں آسکے۔ ان کے بعد کے سفرنامے تخیلاتی جہاں آفرینی اور تخلیقی آوارہ خرامی کے باعث خوشگوار ارتقاء کی نشاندہی کرتے ہیں۔ چین کے سفرنامہ میں ان مقامات دیدکا خصوصی تذکرہ ملتا ہے جنہیں دیکھے اور بیان کیے بغیر چین کا سفرنامہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ شاہراہ ریشم، راکاپوشی، نانگا پربت، کے ٹو، بیجنگ، بیجنگ کا کیپٹل تھیٹر، پیلس میوزیم، گریٹ ہال آف دی پیپلز، نیشنل آرٹ گیلری، ریڈ اسکوئر، ماؤ ہال، سپورٹس کامپلکس، دیوارِ چین، چینی قہوہ، شنگھائی، ارضِ چین کی جنت ہانگچو، چینی سرکس وغیرہ۔ یہ اسلم کمال کا ایسا سفرنامہ ہے جو سفرنامہ کے روایتی فنی لوازمات پر پورا اترتا ہے لیکن وہ تخلیقی ابھار اس سفرنامے میں موجود نہیں جس کی وجہ سے اسے انتہائی اہم سفرناموں میں شمار کیا جاسکے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ یہ مصور اور خطاط اسلم کمال کا تحریر کردہ ہے جس میں مصوری اور خطاطی کے خصوصی حوالے

یقیناً آئیں گے، جو کہ دوسروں کے ہاں قدرے ناپید ہیں۔ ان کے باقی کے سفرنامے، سفرنامے ہونے کے باوجود کردار نگاری، واقعاتی بہاؤ اور اسلوبیاتی خصوصیات کی بناء پر محض سفرنامے نہیں رہتے بلکہ اس سے کچھ زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ زیادہ سے مراد یہ کہ وہ تخلیق کی سطح کو چھو لیتے ہیں۔

''لاہور سے چین تک'' میں اسلم کمال نے چینی خطاطی کے حوالے سے گراں قدر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ چینی خطاطی اپنی روانی، زاویوں، قوسوں، دائروں اور باہمی رچاؤ کے اعتبار سے اوج کمال کو چھوتی ہے۔ البتہ ارتقائی تنوع کے اعتبار سے مسلم خطاطی یقیناً پہلے نمبر پر ہے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے اور اس کی اس قدر جہتیں ہیں کہ اسے پوری طرح سے دائرہ نظر میں سمیٹا ہی نہیں جا سکتا۔ اس سفرنامے میں چین کی ثقافت، لوگوں کی عادات، چینی ہنرمندوں کی ہنرمندی، زمین کاشت کرنے کا سلیقہ اور قرینہ، چین کے مناظر، عمارات کا طرزِ تعمیر، کھانا کھانے کے آداب، سائیکلوں کا اژدحام، برف باری، پہاڑ، درخت، کھیت کھلیان، چینی مصوری، باغات، جنگل، سبزہ، گویا چین کی ثقافتی اور تمدنی زندگی کے بے شمار مظاہر سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ اس سفرنامہ میں چاشنی اور گلیمر پیدا کرنے کے دو چار مقامات تو آتے ہیں اور سفرنامہ نگار نے ان سے فائدہ بھی اٹھایا ہے تاہم یہ سفرنامہ کسی حقیقی یا فرضی عشق کی کوئی داستان نہیں سناتا۔ البتہ ایک مذہبی احساس ضرور ان کی تحریر سے جھلکتا ہے۔ یہ وہ زاویہ ہے جو سفرنامہ نگار کو زمین اور زمین کے مظاہر سے چمٹائے رکھنے کے باوجود زمین سے اوپر بھی اٹھاتا ہے اور اس طرح ان کی نثر میں ماورائی عناصر کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔

''لاہور سے چین تک'' میں چھوٹے چھوٹے ابواب بنائے گئے ہیں۔ البتہ ابواب کے عنوانات نہیں ہیں جبکہ باقی کے دونوں سفرناموں میں ابواب بندی کرتے وقت ابواب کے عنوانات بھی متعین کئے گئے ہیں۔ اس سفرنامہ میں ایک مقام پر ایک ایسا طرزِ تحریر سامنے آتا ہے جو آگے چل کر ان کے دیگر سفرناموں میں ایک امتیازی وصف کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور اس وصف میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ چونکہ خود مصور ہیں لہٰذا کسی فرد کی تصویر انتہائی خوبصورت لفظوں میں کھینچ دیتے ہیں۔ پہلے سفرنامہ میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر صرف ایک جگہ سامنے آئی ہے۔ یہ چند سطور دیکھئے۔

''حبیب الرحمٰن جو پاکستانی سفارتخانے کا سیکنڈ سیکرٹری ہے، ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ شروع شروع میں مجھے اور آغا ناصر کو یہ عجیب الخلقت چیز بڑی پرائی پرائی سی لگی تھی۔ چھوٹا قد، جلا ہوا گندمی رنگ، سر پہ بال بس بال بال بچے ہوئے، چھوٹی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں گول گول اور اوپر نوکدار لمبی بھنویں، درمیانی ناک اور مونچھیں قابلِ اعتراض قسم کی، گول چہرہ، چھوٹے چھوٹے بازو، موٹے ہاتھ، موٹی توند اور ٹانگیں بس ٹانگیں ہی تھیں۔ گردن کا ذکر اس لیے نہیں کرتا کہ وہ تھی ہی نہیں۔ پیچھے سے چلتا دیکھیں تو لڑھکتا دکھائی دیتا تھا اور آتا دکھائی دے تو خنجر لہراتے ہوئے کسی قاتل کا شبہ ہوتا تھا۔ دو دن میں ایسا گھل مل گیا اور ایسا کھلا کہ بند ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔'' (''لاہور سے چین تک''.........ص ۶۴)

یہ وصف ان کے باقی کے سفرناموں میں بے شمار مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کمال کی حلیہ نگاری محض دو ایک بڑے خاکہ نگاروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ حلیہ نگاری یا ظاہری شکل و صورت کی تصویر کشی اسلم

کمال ایسے لفظوں میں کرتے ہیں کہ متعلقہ فرد کا پورا چوکھٹا قاری کی آنکھوں میں نقش ہو جاتا ہے۔ اپنے دوسرے سفرنامے میں دیگر کرداروں سے قطع نظر گبریلہ کے کردار کی ظاہری ساخت، اس کے لباس، اسکی وضع قطع، چال ڈھال کو اسلم کمال نے اتنی بار بیان کیا ہے کہ اگر ان تمام سطور کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو ایک پوری اور مکمل جیتی جاگتی عورت اپنی زندگی کے تمام تر معمولات سمیت سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ ''اسلم کمال او سلو میں''...... اس سفرنامہ میں گبریلہ ایک ایسی خاتون ہے، جس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی روشنی جھلملاتی ہے۔ یقین، اعتماد اور بھروسے کی انتہا پر کوئی روشن ستارا اس کے وجدان میں طلوع ہو چکا ہے۔ وہ انتہائی حسین اور زندگی سے بھرپور عورت ہے۔ وہ فنِ مصوری کی تاریخ سے پوری طرح واقف اور فنِ مصوری کے حوالے سے خوبصورت گفتگو کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ اسلم کمال نے خود اپنی زبان سے فنِ مصوری کے بارے میں بہت کم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ زیادہ تر باتیں گبریلہ کی زبان سے کہلوائی گئی ہیں۔ مصوروں کی ذاتی زندگیوں کے احوال اور ان کے فن میں پوشیدہ رموز کو گبریلہ کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ اعلیٰ مصوروں اور عظیم مصوری کے پس پردہ جو محرکات عمل آرا ہوتے ہیں، ان سب کو گبریلہ کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔ فنِ مصوری کو سمجھنے کے لیے گبریلہ کی گفتگوئیں بے حد اہم ہیں۔ یہی اسلم کمال کا کمال ہے کہ وہ مصوری کے بارے میں اپنے نظریات اور احساسات کو گبریلہ کی گفتگوؤں کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے تحریر میں دلچسپی اور دلکشی کے عناصر کا اضافہ ہوا ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مصوری کے بارے میں جو کچھ ان کے سفرنامے میں کہا گیا ہے وہ تمام خیالات و احساسات اسلم کمال کے اپنے ہیں یا گبریلہ کے ہیں۔ یا گبریلہ، اسلم کمال کے فنی شعور اور جمالیاتی وجدان کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ لیکن اصل دیکھنے کی بات یہ ہے کہ گفتگوئیں جس انداز اور جن مقامات پر آئی ہیں وہ گبریلہ ہی کے جذبات وخیالات معلوم ہوتے ہیں۔

گبریلہ اپنے شوہر سے بے انتہا محبت کرنے والی خاتون ہے اور اس کا شاہر بھی دل و جان سے اس پر فدا ہے۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت جوڑا ہے۔ گبریلہ کے شوہر پال کا کردار زیادہ تر گبریلہ ہی کی زبان سے سامنے آتا ہے۔ قاری اور اسلم کمال سے اس کی بالمشافہ ملاقات محض چند ایک مقامات پر ہوتی ہے۔ گبریلہ ایک جگہ اپنے شوہر کے بارے میں کہتی ہے ''میں اپنے شوہر پال کی اپنے دل کی گہرائیوں سے قدر دان اس لیے ہوں کہ اس کی بیکراں محبت اور مہربان رفاقت نے مجھے شعورِ جمال میں زندہ رہنے دیا ہے''...... گبریلہ تخیل کی سطح پر خوبصورت زندگی بسر کرنے والی عورت ہے۔ اس نے ایک انگوٹھی پہن رکھی ہے، جس میں D اور اس کے اندر 2 کا ہندسہ ہے۔ معلوم کرنے پر پتا چلتا ہے کہ ایک ڈیگاس اور دوسرا ڈالی (یہ دونوں بڑے مصور تھے) ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں اور ڈالی، میں اور ڈیگاس اس رشتے میں بندھے ہوئے، میرے ساتھ، میرے گھر میں رہتے ہیں جیسے تم (اسلم کمال) اپنے کسی گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی میرے گھر میں موجود تھے (اسلم کمال دراصل گبریلہ کے گھر میں اپنی ایک پینٹنگ سے بنائی گئی تصویر کی صورت میں موجود تھے) وہ اپنے شوہر کے حوالے سے بتاتی ہے کہ میں پال کی معترف اس لیے ہوں کہ میں یہاں اس کے گھر میں رہتے ہوئے، اس کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے ڈالی، ڈیگاس، رینوئر، ریمبراں اور روبنز کی دوست بھی ہوں، داشتہ بھی

ہوں...... پال کی عظمت کو میرے سوا کوئی بھی سمجھ نہیں سکتا، جس نے مجھے میرے آئیڈیلز کے معیارِ جمال میں زندہ رہنے کی پوری آزادی دے رکھی ہے۔ بطور شوہر پال میرا آئیڈیل ہے۔ ایڈون (بیٹا) کی پیدائش پر اس نے ایک لاکٹ بنوا کر مجھے تحفے میں دیا تھا۔ یہ دیکھو...... روبنز، ریمبراں اور رینوئر...... اور گبریلہ نے اوپر سے نیچے کو ایک ایک کر کے اپنے بلاوز کے تین چار بٹن کھولے۔ چھاتیوں کے درمیان طلائی لاکٹ جس پر 3R کا حرف اور ہندسہ جھلمل کر رہا تھا۔ گبریلہ کا کردار اس سفر نامے میں پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ وہ خوبصورت موضوعات پر خوبصورت باتیں کرنے اور بہت زیادہ باتیں کرنے کی شوقین ہے۔ ذوقِ جمال نے اس کے لب ولہجہ میں بڑی نفاست اور لطافت بھر دی ہے۔ وہ پہلے بات کو بناتی اور سنوارتی ہے۔ پھر اس کے لیے ماحول سازی کرتی ہے۔ اور پھر اپنے پسندیدہ موضوعات کی جانب اپنی گفتگو کا رُخ موڑ دیتی ہے۔ اسے فنِ مصوری سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ وہ صاحبِ طرز قدیم مصوروں کی عاشق بھی ہے، محبوبہ بھی اور ماڈل بھی۔ وہ شعورِ حسن سے بھی مالا مال ہے اور اسے اپنے خوبصورت ہونے کا بھی شدید احساس ہے۔ وہ خود کو تمام بڑے مصوروں کی سٹر محسوس کرتی ہے۔ پال، اسلم کمال کو اپنے گھر میں گبریلہ کا سٹوڈیو دکھاتا ہے۔ جس میں وہ روبنز، ریمبراں، انگریس، ڈیگاس اور رینوئر کے لیے تخیلاتی سطح پر ماڈلنگ کرتی ہے۔ گبریلہ ایک وجود نہیں بلکہ تمام تر تخیل ہے۔ وہ ایک خواب ہے جو اپنا ایک وجود بھی رکھتا ہے۔ وہ وجود کی سطح پر جیتے ہوئے بھی تخیل کی سطح پر زندگی کرنے کا قرینہ جانتی ہے۔

گبریلہ کی شخصیت میں عجیب سحر ہے۔ وہ یہودی ہونے کے باوجود مذہب، ملک اور تہذیب و ثقافت کو درمیان میں حائل نہیں ہونے دیتی۔ اس کی قربت کا احساس صاف شفاف پانی کی طرح ہے، جس کی تہہ میں کوئی کثافت نہیں ہے۔ وہ خود اپنی خواہش پر اسلم کمال کے لیے نیوڈ ماڈل بنتی اور اپنے آپ کو برائے فن بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے جسمانی اور ذہنی حسن میں رکھ رکھاؤ کی عظیم روایتیں گندھی ہوئی ہیں۔ وہ دوسری بار پال کی خواہش پر اسلم کمال کے روبرو نیوڈ ماڈل بنتی ہے۔ ان دونوں مقامات پر اسلم کمال نے انتہائی مہارت اور مشاقی سے اس کا فگر پوری تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان کے قلم نے کہیں بھی ٹھوکر نہیں کھائی۔ وہ بڑی کامیابی اور مہارت سے ہوا و ہوس پیدا کرنے والے عناصر سے خود کو بچالے گئے ہیں۔ انہوں نے گبریلہ کے پورے وجود کو ایک ماہر مصور کی نظر سے دیکھتے ہوئے، اپنی تصویریں بناتی ہوئی نثر میں اس سلیقے سے پینٹ کیا ہے کہ بہکنے کے امکانات پاس پھٹکنے نہیں پاتے۔ لذت اندوزی میں کھتی ہوئی نقش نگاری کا ایک بھی چھینٹا صفحۂ قرطاس کو آلودہ نہیں کرتا۔ حالانکہ اس کے فگر کو دونوں مقامات پر جس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، پھسل جانے کے بے شمار مواقع موجود تھے۔ فنی رچاؤ میں جذبات کی روک تھام اور نثر کے بہاؤ سے ایک دلفریب منظر ابھرتا ہے، جو تقدیس کی منزلوں کو چھو لیتا ہے۔ گبریلہ کیا ہے؟ اسے صرف اسلم کمال ہی کے اسلوب میں دیکھا، پہچانا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بے مثال کردار ہے جسے اسلم کمال کے قلم نے پاکیزگی کا لافانی استعارہ بنا دیا ہے۔ یہی کردار ان کے تیسرے سفر نامے ''گمشدہ'' کے آخری باب میں ایک بار پھر غیب سے ظہور میں آتا ہے۔ اس اعتبار سے ''گمشدہ''...... ''اسلم کمال اوسلو میں'' کا تسلسل اور تکملہ ہے۔ اگرچہ وہ ایک الگ سفر نامہ ہے۔

ناروے ایک ایسا ملک اور اوسلو ایک ایسا شہر ہے، جسے فنکار فطرت کہا جا سکتا ہے۔ اس شہر میں چند ایک مجسمے ایسے ہیں جو کسی بادشاہ، وزیر یا کسی سیاستدان کے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف جدھر دیکھو ادیبوں، شاعروں، ریاضی دانوں، مصوروں، رقاصوں، معلموں اور کھلاڑیوں کے مجسموں سے یہ شہر بھرا ہوا ہے۔ اسلم کمال نے ناروے کے تہذیبی و ثقافتی مراکز سے لے کر نگوں کے ساحل تک پوری زندگی کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ناروے کی مصوری، خطاطی، مجسمہ سازی اور شاعری کے حوالے سے انہوں نے بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ لیکن ان کا عمومی طریق کار یہ رہا ہے کہ وہ مصوروں، خطاطوں، مجسمہ سازوں اور شاعروں کے بارے میں تمام باتیں اپنے کرداروں کی زبان سے کہلواتے ہیں تا کہ کسی ملک کی تہذیبی تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ تاریخ دان نہ بن جائیں۔ گویا اسلم کمال کے کرداروں کے ذریعے ہم عالمی شہرت یافتہ مصوروں اور شاعروں کی ذاتی زندگیوں سے اس طرح واقف ہوتے ہیں اور ان کے فن میں پوشیدہ رموز اور ان کے محرکاتِ فن سے اس طرح آگاہی حاصل کرتے ہیں کہ اجنبیت کے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ یہ مصور، شاعر اور مجسمہ ساز ہمیں ہمارے اپنے لگتے ہیں۔ یہ احساس دراصل اسلم کمال کی تحریر کی دلکشی کے باعث جاگتا ہے۔

''گمشدہ'' اسلم کمال کا تیسرا سفرنامہ ہے۔ وہ کئی مہینوں سے ناروے کے شہر اوسلو میں ہیں اور لندن میں سیاحت کی غرض سے آئے ہیں اور تقریباً ایک ہفتہ سے زائد قیام کیا ہے۔ یہ سفرنامہ اسی قیام سے متعلق ہے۔ ''گمشدہ'' میں ابواب بندی کرتے ہوئے عنوانات بھی قائم کئے گئے ہیں۔ اسلم کمال کی ایلز بیتھ سے دو ایک ملاقاتیں اوسلو میں ہو چکی ہیں۔ لندن آتے ہوئے اتفاق سے دونوں ایک ہی جہاز میں ہم سفر ہیں۔ وہ نارویجن شاعرہ اور شائستہ اطوار خاتون ہے۔ بقول اسلم کمال اس کی رنگت سفید، ہلکی سی سرخ اور اس میں سنہرے پن کی چمک ہے۔ اس کے بال سرخی مائل سیاہ، جن کی سٹائلنگ لوز اور لمبائی شانوں سے ذرا نیچے تک ہے۔ ناک نقشہ سبک، تیکھا اور پروقار لیکن ایک اداسی میں بجھا بجھا سا ہے۔ آنکھوں کا رنگ روشن براؤن ہے۔ گفتگو میں ٹھہراؤ اور اعتماد ہے۔ آواز دھیمی اور شائستہ ہے۔ لباس کے معاملے میں نارویجنوں کی طرح لاپرواہ ہے...... یہ خاتون اسلم کمال کی روم میٹ بنتی ہے اور بہت سے مقامات پر بطور ایک دوست کے ساتھ جاتی ہے۔ دونوں باہم جذباتی وابستگی محسوس کرتے ہیں۔ اسلم کمال نے اس وابستگی کو شاعرانہ زبان میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے ایلز بیتھ کے کردار کو بڑی مہارت سے اجاگر کیا ہے۔ کردار نگاری اسلم کمال کا وصفِ خاص ہے۔ ان کے تمام سفرناموں میں قابلِ ذکر افراد اپنی جلت پھرت، اپنی گفتگوؤں اور اپنے رویوں کی وجہ سے یادگاری کرداروں میں ڈھل جاتے ہیں۔

اسی سفرنامہ میں ٹیٹ گیلری کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ اس گیلری میں برطانوی مصوری کے فن کا ذخیرہ موجود ہے۔ مزید برآں ٹیٹ گیلری میں برطانوی مصوروں کے کام کے ساتھ پوسٹ امپریشنزم کے بیرونی دنیا کے مصوروں کا کام بھی موجود ہے۔ اس گیلری کو یہ فخر حاصل ہے کہ سیزان، گوگین، وان گاگ، پکاسو اور براک جیسے مصوروں کے کام کے علاوہ فیوچرازم، ڈاڈا، سرریلزم، ابسٹریکٹ، امپریشنزم، پاپ اور کانسپچوئیل آرٹ کی جدید پیش رفت کا ایک جامع سروے بھی یہاں پر اہل نظر کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ اس

گیلری میں جن بڑے بڑے مصوروں کا کام زینت بنا ہے ان کے بارے میں اور ان کی تصویروں میں موجود رنگوں کے کمالات کو متحیر کر دینے والے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس گیلری کے ایوانوں میں کاغذ اور کانچ کے ٹکڑے اکٹھے کرنے والوں کی طرح دن بھر گھومتے رہے۔ وہ اس عمارت کو احساسِ تشکر میں ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے اور دل ہی دل میں کہتے ہیں...... ''اے ارژنگ بے مثال! میرا دل جب تجھے دیکھنے کو بہت ترسا کرے گا، تو یہ جو بہت ساری حیرتیں، کتنی ساری لکیریں، اتنے سارے رنگ، ان گنت خیال، بے شمار خواب، بہت سارا علم اور ڈھیر ساری خوشیاں میرے دامنِ دل میں بھر کر تُو نے میرے ساتھ کر دی ہیں میں ان کا اپنی یادوں کے شیشے میں عکس ریز بنا کر تجھے اس میں سے دیکھ لیا کروں گا"

ٹیٹ گیلری کے علاوہ نیشنل گیلری کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ نیشنل گیلری کی دہلیز پار کرنا تہذیبوں میں قدم رکھنا ہے جہاں ایک لمحے کی مٹھی میں صدیاں بند ہیں۔ یہاں پنسل کی ایک لکیر میں زمانوں کا سفر طے ہوتا ہے۔ اس گیلری میں داخل ہو کر آدمی ایک دنیائے طلسم میں چلنے لگتا ہے۔ یہاں ہر قدم پر حیرت ایک نیا دروازہ کھولتی ہے۔ اسلم کمال نے لفظوں کے ذریعے اس گیلری کی حیرتوں کو جس انوکھے اور یکتا اسلوب میں بیان کیا ہے، قارئین بھی ان کے قلم کی ہمراہی میں چلتے چلتے حیرتوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس گیلری میں ہم تاریخ تہذیب و تمدن کے عظیم ترین لوگوں سے ملتے ہیں۔ نیشنل گیلری والا باب اس کتاب کا ایک اہم حصہ ہے۔ نیشنل گیلری کے مختلف کمروں میں جو تصاویر موجود ہیں ان میں سے بہترین کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ بے شمار مصوروں کی مصوری اور ان کے ذاتی احوال، مصوری کی مختلف تحریکوں اور مختلف ملکوں میں مصوری کی تاریخ سے بھی کسی حد تک متعارف ہوتے ہیں۔ چنانچہ مصوری اور مصوری کی تاریخ سے ناواقف قارئین بھی اس حصے سے بہت کچھ اخذ کر سکتے ہیں۔ تصاویر کی تفاصیل اسلم کمال نے انتہائی مہارت سے پیش کی ہیں لگتا ہے جیسے قارئین اصل تصاویر دیکھ رہے ہیں۔ وہ موقلم سے بنائی ہوئی تصاویر کے نقوش ایسے کھینچتا ہے کہ یہ گمان گزرنے لگتا ہے کہ لفظوں کی گرفت میں آئی ہوئیں تصاویر کینوس کی تصاویر میں ڈھل گئی ہوں۔

صنم کدہ کے عنوان والے باب میں مادام تساؤ ویکس کے میوزیم کی سیر کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس میوزیم کی تاریخ سے لے کر اس میں موجود بادشاہوں، سیاست دانوں، فلسفیوں، شاعروں، ادیبوں، گلوکاروں، کھلاڑیوں، ایکٹروں وغیرہ کے نایاب مومی مجسموں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

ٹیٹ گیلری میں اسلم کمال کی ملاقات مز جولیا وائٹ سے کروائی جاتی ہے۔ یہ خاتون آرٹ آف پینٹنگ کی دلدادہ ہے اور اس کی ایک آنٹی میڈم کلاڈیا ڈورس، ہسٹری آف آرٹ کے طالب علم کے لیے ایک نادر شخصیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ آنٹی سے ملاقات کا وقت طے کر لیا جاتا ہے۔ میڈیم کلاڈیا ڈورس والا باب اس سفرنامے کا ایک اہم باب ہے۔ میڈم کلاڈیا ڈورس ایک سو بیس سال کی ہے۔ اس کی یادداشت اتنی شاندار ہے کہ جیسے تاریخ کی کتاب کے اوراق کھلتے چلے جائیں۔ نصف انیسویں صدی اور تین چوتھائی بیسویں صدی اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اس کا عہدِ شباب بے حد خوبصورت تھا۔ اس نے فنِ مصوری کی تاریخ کا رخ بدلنے والے مصوروں کے لیے سٹنگز دیں اور بہت سے مصوروں کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات

تھے۔ اس نے خاصے امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کی۔ وہ مصوری کی تاریخ کا ایک بڑا خزانہ اپنے سینے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے گھر کے نوادرات کی اوٹ سے زمانے بولتے سنائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے ڈرائنگ روم میں خاموشی اور سناٹا بھی قدیم زمانوں سے آباد محسوس ہوتا ہے۔ میڈم کو ہسٹری آف آرٹ اور آرٹسٹوں سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ میڈم بتاتی ہے کہ انیسویں صدی پینٹنگ میں تغیرات وامکانات کی صدی ہے۔ اس نے بیسویں صدی کے آرٹ کو شکل دینے میں بنیاد فراہم کی۔ انیسویں صدی اپنا زادِ سفر پیرس میں بیکوئز لوئیس ڈیوڈ (۱۷۴۸-۱۸۲۵ء) کے سٹوڈیو سے لے کر چلی تھی اور اس صدی کی پوری صورت گری ڈیوڈ کے سٹوڈیو میں ہوئی تھی۔ فرانسیسی مصوری ڈیوڈ کے سٹوڈیو سے قیادت کا شعور لے کر نکلی اور اس نے پورے یورپ کو متاثر کیا۔ انقلاب فرانس کے بعد کیتھرین جو ایک مصورہ تھی، اپنا مستقبل قربان کر کے ڈیوڈ کی خدمت گزار بن گئی۔ وہ ایک بچی کی ماں بنتی ہے لیکن بچی کو باپ کا نام نہیں ملتا۔ کیتھرین کی بیٹی ایلن بڑی ہو کر ڈیوڈ کے ایک شاگرد انگریس کے لیے نیوڈ ماڈل بنتی ہے۔ اس کے بطن سے انگریس کے بیٹے ڈینئل نے جنم لیا لیکن اسے بھی اپنے باپ کا نام نہیں ملتا۔ ایلن نے ڈینئل کی اچھی تعلیم وتربیت کی۔ ڈینئل کی ملاقات میڈم سے ۱۸۸۷ء میں پیرس میں ہوئی اور دونوں میں گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ ڈینئل اس وقت چالیس برس کا اور میڈم سترہ برس کی تھی۔ ڈینئل پینٹر تو نہ بن سکا البتہ وہ الفاظ سے تصویریں بنانے کے فن سے واقف تھا، لیکن باپ کا نام نہ ملنے کی وجہ سے اس کی زندگی میں ایک خلا رہ گیا تھا۔ وہ آرٹ کا ایک ذہین نقاد اور مستند مؤرخ بن سکتا تھا۔ وہ انیسویں صدی کے امتیازات کے پسِ پردہ تفصیلات وجزئیات کے بارے میں اپنی ماں ایلن کی روایتوں کا مستند سامع اور تاثریت نگاروں کے ساتھ تعلق اور دوستی کے حوالے سے ان کے عہد کا عینی شاہد تھا۔ ڈینئل کی گرینڈ مدر کیتھرین نے ڈیوڈ کے زمانے میں جو تغیرات دیکھے، اس نے اپنی بیٹی ایلن کو بتائے اور انگریس کے دورِ زندگی کا مشاہدہ ایلن نے خود اپنی آنکھوں سے کیا۔ اس نے سارا علم ایک امانت کی طرح ڈینئل کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ اس سارے خزانے کو مستند مؤرخ کی حیثیت سے آنے والے زمانے کے سپرد کر سکتا تھا لیکن باپ کا نام نہ ملنے کے خلا نے اسے مستند مؤرخ نہ بننے دیا۔ اپنے شجرۂ نسب کی بے حیثیتی نے اسے ہمیشہ بے چین رکھا۔ وہ ایک عالی ظرف اور بے غرض انسان تھا۔ جو کچھ اس کے پاس زمانے کے لیے تھا وہ اس نے کسی حد تک میڈم کلاڈیا کے ذہن میں منتقل کر دیا۔ کلاڈیا سے بہت کچھ اگلوا کر اسلم کمال نے ''گمشدہ'' کے اوراق میں ہمارے اور بعد کے اردو دان زمانے کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ ڈینئل کے اشتیاق پر کلاڈیا، ڈیگاس اور رینوئر کی ماڈل بنتی رہی ہے۔ رینو نے میڈم کلاڈیا کے حسن وشباب کو آنے والے زمانوں کے لیے امر کر دیا۔ میڈم کلاڈیا تفصیل سے اپنی زندگی کے نجی واقعات بھی سناتی ہے۔ کن حالات میں وہ کلاڈیا موریس بنتی ہے۔ موریس شادی کے محض ایک سال بعد ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ میڈم واپس پیرس جا کر ڈینئل کو بہت تلاش کرتی ہے لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ بعد ازاں میڈم، کلاڈیا ڈورس بن جاتی ہے۔ ڈورس کے ذریعے وہ اپنے عہد کے دو بڑے مصوروں کانسٹیبل اور ٹرنر سے بھی ملتی ہے۔ ڈورس بھی ۱۹۰۸ء میں مر جاتا ہے۔ میڈم پچھتر برس سے ایک بیوہ کی زندگی گزار رہی ہے۔ میڈم کے گھر میں بے شمار بڑے مصوروں کی

پینٹنگز موجود ہیں۔ ایک انتہائی خوبصورت فی میل مجسمہ بھی ہے جو میڈم کی جوانی سے یادگار ہے۔ اسلم کمال نے اس مجسمہ کی سحر کاری کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس کردار کی پوری داستان حیات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی مصوری کے امکانات اور تغیرات اور مصوری کی تحریکوں کا بیان میڈم کلاڈیا کے توسط سے کیا ہے اور میڈم کے کردار کو اپنے اسلوب کے ذریعے بہت خوبصورتی سے پینٹ کیا ہے۔

اسلم کمال کے تینوں سفرناموں میں اتنے موضوعات اور اتنا مواد بکھرا پڑا ہے جو کئی ایک مضامین کا متقاضی ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تمام سفرناموں میں دیکھنے کی اصل بات یہ ہے کہ ان سفرناموں کے مطالعہ سے قارئین شعور کی نئی منزلوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ اگر ان ملکوں کے ساتھ اپنے معاشرتی ڈھانچے کا تقابل کریں تو یہ احساس ابھرتا ہے کہ دنیا میں سربلند اور باوقار ہونے کے لیے تہذیب و تمدن کے کن کن راستوں کو اپنے لیے منتخب کرنا ضروری ہے۔ مصور اور خطاط اسلم کمال کو سمجھنے کے لیے اور شعور و علوم اور دانائی کی گود میں پلی ہوئی تہذیبوں کے چمکتے ہوئے خدوخال دیکھنے کے لیے ان کے یہ سفرنامے بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی تینوں سفرناموں سے دنیا بھر کی مصوری کے جدید و قدیم نمونوں اور خزانوں سے واقف ہوا جا سکتا ہے۔ یہ ان کے سفرناموں کا ایک امتیازی وصف ہے جو دوسرے سفرنامہ نگاروں کے ہاں کم ہی ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے سفرناموں کے ذریعے مصوری، خطاطی اور مجسمہ سازی کو لفظوں کے ذریعے بیان کرنے کی طرف خصوصی توجہ دی ہے جس کی وجہ سے لفظوں کی تہذیب سے آشنا قارئین مصوری کی تہذیب سے بھی بہت حد تک واقف ہو جاتے ہیں۔ وہ جب کسی تصویر کو لفظوں کے ذریعے بیان کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ تصویر خود بولنے لگی ہے۔

مصور اور خطاط ہونے کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ کی تہذیب کے پارکھ بھی ہیں۔ انسانی حرکات و سکنات، چہرے کے خدوخال، لباس اور چال ڈھال وغیرہ کی جزئیات کو وہ اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ مصور کی فنی مہارت سے بنائی ہوئی تصویر کا نقشہ آنکھوں میں گھومنے لگتا ہے۔ جتنے بھی کردار ان کے سفرناموں میں آتے ہیں ان سے متعلق جزئیات کو وہ اس طرح سے سمیٹ لیتے ہیں کہ چند لفظوں میں یا چند مصورانہ سٹروکس کے ذریعے پوری شخصیت چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہے۔ وہ جب کسی مقام یا گھر وغیرہ کو بیان کرتے ہیں تو ایک پورا منظر نامہ تخلیق ہو جاتا ہے۔ وہ لفظوں کو گوندھ گوندھ کر اور اپنی آتش تخلیق میں پگھلا اور تپا کر منظر کو یوں پیش کرتے ہیں کہ وہ نئے شعور جمال سے طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ نثر یوں لکھتے ہیں جیسے آہستگی سے موقلم چکنے کاغذ پر رواں ہو۔ جو کہیں رکتا نہ ہو، کہیں اٹکتا نہ ہو، کہیں رکاوٹ کا احساس نہ دلاتا ہو بلکہ آہستگی، شائستگی اور روانی سے رواں رہتا ہو۔ ان کی تحریر میں ایک قرینہ، سلیقہ اور شگفتگی و تازگی ہے کہ مصوری اور خطاطی سے دلچسپی نہ رکھنے والے بھی ان کی تحریر کے بہاؤ میں بہنے لگتے ہیں۔ ان کی تحریر میں زندگی دھڑکتی ہے اور دھڑکتی ہوئی زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔

اسلم کمال کے سفرناموں کے ابواب میں کہیں افسانے کا برتاؤ ہے اور کہیں سفرنامے کا۔ خاص کر ”گمشدہ“ کو محض سفرنامہ نہیں کہا جا سکتا۔ سفرنامہ نگاری کے فنی لوازمات کی یہاں پر تلاش بیکار ہوگی۔ خواب اور

حقیقت کی آنکھ مچولی نے اور ان کی خود فراموشی اور خود گمشدگی نے ''گمشدہ'' کو تخلیقی توانائی سے بھرپور کتاب بنا دیا ہے۔ ان کی آخری دونوں کتابوں سے ادب و شاعری اور خاص کر مصوری کی تاریخ کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ البتہ انھوں نے جہاں جہاں تمام باتیں اپنے کرداروں سے کہلوائی ہیں، مکالماتی اسلوب کی وجہ سے یہ کردار جیتے جاگتے کردار بن گئے ہیں۔ ان کرداروں کی اصل حقیقت کیا اور کتنی ہے، ذہن ان سوالوں میں نہیں الجھتا بلکہ اسلم کمال نے کرداروں کو جیسا پیش کیا ہے، وہ ویسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اشیاء اور کرداروں کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور تخیل کی آمیزش سے انہیں شعور و آگہی کی علامت بنا دیتے ہیں۔ وہ تجریدیت اور ماورائیت کے عناصر سے اپنی نثر کے حسن کو بڑھاوا دیتے ہیں اور مذہبی احساس کی شمولیت سے عصر رواں کو ورائے عصر لے جاتے ہیں۔ مذہبی احساس کی اُن سطحوں سے وہ انسانوں کو محسوس کرتے ہیں کہ گبریلہ کی نیوڈ ماڈلنگ کا عمل اور ایلزبیتھ کی ہمراہی ایک روحانی کیف میں ڈھل جاتی ہے۔ البتہ مذہبی احساس ان کے ہاں محض ایک مذہب سے منسلک ہونے کے نتیجہ میں پیدا نہیں ہوا بلکہ سبھی مذاہب کی الوہیت کا پیدا کردہ ہے۔ مصورانہ اور شاعرانہ زبان استعمال کرتے ہوئے وہ مکانیت سے لامکانیت اور زمانیت سے لازمانیت کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ تحیر آمیز نثر لکھنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ قاری اسلم کمال کے تجربہ سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتا ہے کہ دونوں ایک ہی رشتے میں ڈھل جاتے ہیں۔ کوئی کوئی فنی نثر پارہ قاری کی دلداری کرتا ہے۔ تیرہ و تار تحریروں کے طویل طویل سلسلوں میں کہیں کہیں کوئی دراڑ پڑتی ہے اور تحریر بشارت بن جاتی ہے۔

مظہر نیازی......غزل

رُوٹھ گیا ہے سانول میرا
کیسے گزرے گا کل میرا
گلی گلی میں تنکا بن کر
پھرتا ہے دل پاگل میرا
آ و مل کر طے کر لیں ہم
سونا تیرا پیتل میرا
شاید صدیوں سے ہے پیاسا
اُجڑا اُجڑا یہ تھل میرا
بچپن کا ہمراز ہے یارو!
گاؤں میں اِک پیپل میرا
ہے بارود کی زد میں مظہر!
کون بچائے کابل میرا

شبانہ یوسف......غزل

شام کے لب پہ چپ، سحر خاموش
کچھ دنوں سے ہیں بام و در خاموش
آپ، مَیں اور رہگزر خاموش
کٹ گیا سارا ہی سفر خاموش
اک کہانی سناتے ہوں جیسے
پھول، بادل، ہوا، شجر خاموش
کون رہ رہ کے یاد آئے جب
چاند پھرتا ہے رات بھر خاموش
دیر تک مجھ سے گفتگو اکثر
کرتی ہے آپ کی نظر خاموش
کیوں شبانہ بلاسبب یونہی
پھر رہے ہیں نگر نگر خاموش

ڈاکٹر شاہین مفتی / اگر

خدمت میں اس صنم کے کٹی عمر پر ہمیں
گویا کہ روز اس سے نئی بندگی ہوئی

گرین کارڈ اور انگریز بہادر سے ہمارے معاملات اور مناقشات اس مقامِ دلبری پر منتج ہیں جو کوہِ ندا بھی ہے اور حرفِ ناسزا بھی، اس سماجی اور عاشقانہ کم مائیگی نے ہماری تین نسلوں کو اعصابی تشنج میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہمیں اب سوئے کوفہ و بغداد دیکھنے کی فرصت نہیں اور نہ ہی سلمیٰ و سلیمیٰ کا پیغام خروش ہماری نبض کی رفتار تیز کرتا ہے۔ ہم ڈالر فیوز میں مبتلا ہیں اور کسی او ڈیسی کے منتظر۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا سفر نامہ امریکہ ''اک جہاں سب سے الگ'' اسی نفسیاتی کش مکش کی شاندار ڈاکومینٹری ہے، کتاب کے سرورق پر وہ خود بھی ''سامری کے بچھڑے'' کے پہلو میں سعادت مندی کی تصویر بنے بیٹھے ہیں گویا ''سام سرکار میں'' پاکستانی عبودیت کا حق ادا ہو گیا ہے۔

حیرت آتی ہے اس کی باتیں دیکھ
خود سری، خود ستائی، خود رائی
واں سے خشم و خطاب ناز عتاب
یاں سے اخلاص و دوستی یاری

یہ سفر نامہ شعور کی رو کی تمثال کاری کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں سائینٹیفک معلومات کے بروقت استعمال، عام قاری کے لیے مصنف کی ساختہ متبادل اصطلاحات کی پیش بندی اور سنجیدہ مقامات پر تقابلی مطالعے کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ امریکہ کی تاریخ اور وہاں حبشی نژاد لوگوں کے رہن سہن پر مصنف نے بڑی سنجیدگی سے قلم اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کثیر المطالعہ آدمی ہیں، ایک زمانے میں انہیں فلمی ہیرو بننے کا بھی شوق رہا ہے، انگریزی زبان کے کثیر الاشاعت ناولوں سے بھی مانوس ہیں، کھڑکی توڑ انگریزی فلموں اور کیبل کلچر سے بھی ان کی دوستی ہے اور ان سے بھی بڑھ کر انہیں اپنے ادبی اور نفسیاتی سفر میں میرامتن کے پانچ درویشوں کی صحبت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ انگریزی کلچر کی بہت ساری جسمانی اور روحانی حیرت انگیزیاں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں، مستنصر اور مونکا کے رومان سلیم اختر کی قسمت میں نہیں، چنانچہ انہوں نے امریکہ یاترا میں سنگ و خشت سے اک جہاں پیدا کرنے کا تجربہ کیا ہے جو باتصویر ہے۔ جہاں کہیں معاملات زیادہ سنجیدہ ہونے لگے ہیں مصنف نے وہیں عہد جوانی کی شعلہ آفریں معلومات سے گوٹہ کناری ٹانک دی ہے، گریس کیلی اور نورما جین عرف مارلن منرو کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب کے نوجوان حافظے کی ایک جھلک پیش کرتا ہے، فرنیکفرٹ کی انارکلی، لال اینجلس کی گوالمنڈی، نیویارک کے بھاٹی، ہالی وڈ کے بانو بازار سے لاہور کا یہ کولمبس اپنی چشمِ اشتیاق سمیت یوں گذرا ہے جیسے کوئی ''سرسری جہان سے گذرتا ہے۔'' اس لاتعلق اور نیم باز سفر میں تلاشِ ذات اور تلاشِ حقیقت قسم کے فاضل فلسفوں کی گنجائش نہیں، یہ قمار بازی کو حلال اور شرمیٹ کو حرام سمجھنے والے

معاشی سطح پر آسودہ اور اخلاقی سطح پر لاتعلق مسلمانوں کی پکچر گیلری ہے جو ففتھ روڈ کو شاہ عالمی بازار میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ سیکس کرنسی، افراطِ زن اور حلال گوشت کی تحریمات کے مابین ''بنیاد پرستی'' کا مصنف جذباتی سطح پر اپنے سلسلے میں تبلیغی جماعت والوں سے بھی زیادہ بنیاد پرست ثابت ہوا ہے، اس کے لیے اس شہرِ قمار بازاں کی ڈسپوزیبل زندگی طلسم ہوش ربا کا درجہ حاصل نہیں کرسکی۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے جگہ جگہ اپنے بلڈ پریشر، یورک ایسڈ اور ورٹیگو کا تذکرہ کیا ہے، ایک ٹوٹل ری کال کے طور پر کئی مقامات پر عہدِ جوانی کو آواز دے کر کھنکارنے کی بھی کوشش کی ہے، اپنی بنیادی حسِ مزاح سے وہ کہیں کہیں ہلکا سا سسپنس پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہیں۔ کاش وہ اس نرگسی آئینے میں اپنے آپ کو پچاس برس پہلے دیکھ پاتے۔ انھوں نے لکھا ہے:۔ ''اگر میں جوان ہوتا، اگر میں سیکسی ہوتا، اگر میں فلمی ہیرو ہوتا، اگر بال سنہری اور یونانی مجسموں جیسے گھنگھریالے ہوتے اور سب سے بڑھ کر میں ڈرپوک نہ ہوتا تو آج یہ سفر نامہ کسی اور ہی اسلوب میں لکھا جا رہا ہوتا'' (ص ۱۵۴) لیکن ڈاکٹر صاحب جو کوئی بروک شیلڈ کے پوسٹر (ص ۴۴) سے بہل جائے اس کے لیے بروک شیلڈ کو مکان کا دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت ہے..............؟

کرامت بخاری

یہ شکستہ شجر

یہ شکستہ شجر
جس کی آغوش میں کچھ پرندوں کے پَر
جس کی شاخوں پہ ہیں کچھ لہو کے نشاں
یہ شجر، شجرِ جاں
جس پہ پیہم گری ہیں کئی بجلیاں
جس سے منسوب ہے ہجر کی داستاں
ہے رہینِ خزاں
جس کے سائے پہ سایہ ہے آسیب کا
جس کی چھاؤں تلے کوئی رُکتا نہیں
یہ شکستہ شجر
جس کی آغوش میں ہیں پرندوں کے پر
کون جانے کہ کب تک رہے بے ثمر
یہ شکستہ شجر

خزاں

اگر ہوا کا مزاج بدلے تو اُس سے کہنا
میں زندگی کی اُداس شاخوں کا زرد پتا
تمہاری تند اور تیز لہروں سے گر پڑوں گا
مگر یہ موسم، اُداس منظر، ہوا، یہ جھونکے
انہیں بتا دو، کہ شاخِ جاں پہ جو زخم ہوگا
بدلتے موسم کی زندگی اُس کو پُر کرے گی
حقیقتوں کے حصار سے اپنا رنگ لے کر
ہر ایک پتا نظامِ نو کی نوید ہوگی

ہوا سے بات

یہی دیکھتے کہ اک اور عہد گزر گیا
وہ جو فرصتِ مہ وسال میں مجھے دیکھتے

تیس پینتیس برس پہلے منظر بھائی سے ملاقات کے لیے ایک شخص آیا کرتا تھا جسے بلا جواز ہنسنے اور بار بار اپنے ماتھے پر پڑی اکلوتی زلف کو جھٹکا دینے کی عادت تھی، دونوں دوست ہماری بیٹھک کی دو مجہول قسم کی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر ایک دوسرے کو شعروں کی مار مارا کرتے، اس لمحے دونوں کے چہروں پر اختیار کردہ ذہانت کی چمک اور بہت کچھ جان لینے کا غرور ہوتا، اس احسان اکبر کا تعلق ضلع گجرات کی برانچ لائن کے ایک قریبی گاؤں نوشہرہ خواجگان سے تھا۔ احسان اکبر نے گاؤں کی اس سادہ زندگی کی یاد میں لکھا ہے:۔

یہاں سے اور تھوڑی دور
کوئی زندگی ہے
جس کی شادابی ابھی محسوس ہوتی ہے
یہاں خاشاک میں لپٹی ہوئی گلیاں ہیں
گرتی چھت ہے
صحنوں کی شکستہ باڑھ کے دھندلے کنارے ہیں
مجھے اب بھی خیال آتا ہے
پکی فصل کے لمحے
زمیں جن خوشبوؤں کو صرف میں لاتی تھی
اپنے جسم کی کچی مہک سے پھوٹتی تھیں
اور گھنے پیڑ
پت جھڑ میں پرندے جن کے کھو جاتے
مرے ماں باپ کے جیون کا حاصل تھے
وہ پگڈنڈی سے بنتی ٹیڑھی میڑھی راہ
جس سے میں الجھتا تھا
وہ میری زندگانی تھی
میں اپنے خواب کا ہے کو اٹھائے شہر آ نکلا

برانچ لائن کا یہ چھوٹا سا گاؤں جب جرنیلی سڑک اور جرنیلی بندوبست سے جا ٹکرایا تو احسان اکبر بھی پروفیسر

احسان اکبر ہو گئے۔ دنیا کو ''گلوبل ویلیج'' قرار دینے والے شاعر احسان اکبر اس ترقی سے ناخوش و بیزار ہی رہا کیونکہ وہ جانتا ہے ''بڑے گاؤں کا بڑا چوہدری اپنے ظلم میں بھی بڑا ہی ہوا کرتا ہے۔'' شیر اور بکری کبھی ایک گھاٹ پر ایک وقت پانی نہیں پی سکتے اور لوکل وزڈم کبھی یونی ورسل وزڈم سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خود آشنائی کے تکلیف دہ لمحے میں احسان اکبر نے کتاب اور تجربے کے انتساب کا معاملہ یوں چکایا ہے۔

اپنے ہاں پر عجب شکلِ حالات تھی/ نقد کیا تھا جہانِ کمالات میں
کیا علم، کیا دِرم، کیسے اوجِ کرم/ ایسے حالات میں
سب میں کیوں بانٹتے اپنی محرومیاں/ سو یہ نقدِ قلم
بے علم، بے دِرم آدمی کے لیے/ ہر کسی کے لیے

احسان نے غلاموں کے اس نصاب کو ورق ورق پڑھا ہے، سیاسی زوال اور معاشرتی صورتِ احوال کا ذائقہ چکھا ہے لیکن وہ آخری دم تک شکست کے جان لیوا احساس سے سمجھوتے کو تیار نہیں۔

ابھی سے ہم کیسے مان جاتے
ہر اک طلب، آرزو کا انجام ہو چکا ہے
ہمارا نیلام ہو چکا ہے

اس اکھاڑ پچھاڑ میں ''ہوا'' کا استعارہ احسان اکبر کی شاعری کی بہت سی نفسیاتی گرہیں کھول سکتا ہے

ے ہوا سے بات کرو
ے ہوا سے بات کیا ہو
ے ہوا تو فقط اٹھانا ہے
ے ہوا ان پڑھ، صبا جاہل، ستارہ بے خبر سب سے
ے ہوا کا رُخ بدلتی ہے تو موسم راہ لیتے ہیں
ے ہوا مری رازداں نہیں ہے
اسے مرا رازداں نہ کہنا
ہوا سے اپنے عذاب لمحات کی کوئی داستاں نہ کہنا
ے خزاں کی جو ہوا سے رشتہ داری ہے
وہ ہر رشتے پہ بھاری ہے
ے ہوا تو کیسے اداس لوگوں کو چھو کے آئی ہے
کن سے ملتی رہی ہے
کن کم نصیب تکیوں میں تیری بیٹھک ہے
سانس تک ہچکیوں میں لینے لگی ہے
ے ہوا چراغوں سے دوستی کر

اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے شہروں کی اجنبی رفاقتوں نے احسان اکبر کے نازک دل کو کئی طرح کے نقصان پہنچائے ہیں، ہوا سے گفتگو کا تجربہ محفل کی تنہائی کا تجربہ ہے ایک اور سطح کی ہمکلامی اور اپنی دریافت کی عدم موجودگی کا مسلسل خوف، ہوا سے سب مکالموں کا کچا چٹھا احسان اکبر کی مٹھی میں بند ہے اور وہ سوچتے ہیں۔

جانے اب کس کے مقابل ٹھہرے

لا

جو تقویم میں بامعنی ہے

احسان کی ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ صرف محبت کی بات کرنا چاہتے تھے لیکن اس سفر میں زمانے کا پڑاؤ آ گیا، شور اور ہنگامہ اتنا تھا کہ وہ کسی خاص مقام یا منظر سے کامل شناسائی حاصل ہی نہیں کر پائے۔

اپنے خواب کیسے تھے
جو نظر نہیں آئے
انتشار اتنا ہے
سو طرح کی تعبیریں

چنانچہ جس طرح سرپھری ہوا بے بضاعت پتوں کو ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے انہیں بھی زندگی کے ساتھ دور تک بھاگنا پڑا، جس طرح ہوا اَن سُنی کر دیتی ہے اسی طرح ان کی بات کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا، جس طرح ہوا کی رفاقت بے ثمر رہتی ہے اسی طرح شاعر کے معاملات محبت عدم ایقان کا شکار ہوئے۔

تُو تو اس قافلۂ عمر کو ہے بانگِ رحیل
تُو کہ جھیلوں کی طرح گہری ہے
تُو جو خوشبو کی طرح ٹھہری ہے
تو کہاں ٹھہرے گی، جو تجھ سے تعارف چاہوں

ذہنی بلوغت جہاں فلسفے اور ادراک کی ہم نشینی اختیار کرتی ہے وہیں صاحب علم اصحاب کو اس مشورے سے بھی نوازتی ہے کہ وہ اپنی بلند و بالا عمارت کی پہلی بلکہ دوسری منزل بھی گرا دیں تاکہ ان کے شخصی تہور کو ہر قسم کی انسانی آلائش سے منزہ سمجھا جائے، احسان اکبر نے اپنی کتاب میں یہی ظلم اپنے ساتھ روا رکھا ہے، یوں تو انہوں نے لکھا:۔

تمہارے جیسا کوئی نقش ہر نگار میں تھا / اگر تھے ہم بھی بہت با اصول کیا کرتے
کبھی یکجا نہیں کر پایا خود کو / جہاں بیٹھا چھوڑ آیا وہیں کچھ
تم سے دامن جب اپنا سمٹنے لگے / آنکھ میں اپنی بسنے لگے کہکشاں
لمس اپنے سے چھٹتی ہوں مہتابیاں / تب الجھتی ہوئی سانس ڈوری لئے
میرے خوابوں کی گہرائیاں جاننا / تب مجھے جاننا

ان معاملات کی روشنی میں ہم ''ہوا'' کو احسان اکبر کی شاعری کا ایک تانیثی استعارہ بھی قرار دے سکتے ہیں جو کئی

طرز کی رفاقتوں کا نعم البدل ثابت ہوئی ہے...... ایک بے نہایت آرزومندی کی بے جہت تمثیل بن کر۔

چراغ پھولوں کے
ان ہواؤں میں
جلنا مشکل ہیں
جل گئے تو
اجالا جتنا بھی ہو بہت ہے

کچھ برس پہلے احسان اکبر شاید گاؤں یاترا پر آئے، میرے دفتر تشریف لائے، ایک نظر میں شاید ہی کوئی انہیں پہچان پاتا، آسودگی کا نشہ ہرن ہو چکا تھا، چہرے کی چمک گردِ کارواں بنی تھی، ایک مسلسل اضطراب اور کپکپی نے انہیں نزار کر رکھا تھا، ''لوکل وزڈم'' کے غرور کو شانِ خداوندی نے ملیامیٹ کر دیا تھا، یہ خانہ خدا کی زیارت کا ردِعمل تھا جس کی ہیبت نے اپنے چاہنے والے کو جلا کر راکھ کر دیا، شاید احسان اکبر کے مکمل ظہور اور آگہی کو اسی غیاب اور حضوری کے بھرپور تجربے کی ضرورت تھی۔

مرا اک سوال گمان سا مرے نام ہے
یہ سوال ہے کہ گمان ہے ابھی طے نہیں
یہی ایک عمر سے سوچ ہے کہ جواز کیا مری ہست کا
یہ سوال ہے کہ ظہور کس کا سوال تھا
کوئی میرے نام بھی کام تھا؟

یہ مجہول آرام کرسی پر اپنے وجود سے بڑے قہقہے لگانے والا احسان اکبر نہیں تھا جو ۴ جنوری ۱۹۳۸ء کو سیہور (بھوپال) میں پیدا ہوا اور اپنی کچھ عمر ایک چھوٹے سے گاؤں میں بسر کی۔ یہ تو پروفیسر احسان اکبر تھے سیٹلائٹ ٹاؤن کالج راولپنڈی کے صدر شعبہ اردو، اقبالیات، جموں کشمیر اور اکیسویں صدی پر کتابیں لکھنے والے احسان اکبر، سراپا طریقت، سراپا شریعت، شاعر احسان اکبر گم ہو چکا ہے۔ عقل و وجدان کے تصورات زندہ تھے جن کا کہنا تھا:۔

حقیقت میں ہر آدمی محترم ہے
وہ خود اس کی جب تک نہ تردید کر دے

۲۰۰۲ء میں زندہ احسان اکبر سے ملاقات آپ کو بتائے گی کہ وہ روح اور علم کی کچھ اور منزلیں طے کر گئے ہیں، ایک سطح کا سکون اور الوہی سرشاری ان کے شخصی ہیولے کا حصہ بن چکی ہے وہ خدا اور رسول کی پوشیدہ رمزوں سے آشنائی کے بعد فنا کی کس منزل پر ہیں اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

تجھے نام لے کے پکارنے کا عجیب لمحہ تھا رات کو
وہ وصال تھا کہ میں ڈر گیا مرا نام یا ترا نام ہے

خوبصورت کتاب المسطر اسلام آباد نے شائع کی ہے اور یہ ۲۰۰۲ء ہے۔

ڈاکٹر شاہین مفتی

نویں کالم کا میٹر

گذشتہ دہائی میں اُردو نظم گو شعراء نے شاعرانہ خلفشار اور زندگی کی جبریت کے امتزاج سے جس تلازمہء خیال کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اُسے کسی روائتی منطق اور کلاسیکی تمثیل نگاری کے تناظر میں دیکھنا مناسب نہ ہوگا۔

مخلوط لسانی اور تہذیبی سرگرمیوں کی اس رزم گاہ میں جو شخص مصروف پیکار ہے اس کے گردوپیش اس کے ذاتی آشوب کا بھنور مزید گہرا اور گھمبیر ہوگیا ہے، اس کے پاؤں زمین پر نہیں اور وہ پروں کے باوجود اڑنے کی صلاحیت سے محروم ہے، آبِ قدیم کے ساحل پر کھڑا یہ ذی روح اپنی آواز کی بے جہت پہنائیوں میں ڈوبا ہوا ہے، یوں تو اس کی خوش گمانی نے ایک خیالی دائرہ تخلیق کیا ہے جہاں کائنات سمٹ کر اس کے پہلو میں آ گئی ہیں اور زمانے اُسے مرکزہ سمجھ کر اس کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں، اسمِ خفی سے لرزیدہ ہونٹ یقین کا سرمدی گیت گاتے ہیں اور آبِ قدیم آشنائی کے لَمس سے کسمانے لگتا ہے...... لیکن یہی تیرہ شبی کا ڈسا ہوا، قریہء اغیار کا ستایا ہوا، دیارِ دوستاں سے بھاگا ہوا آدمی جس لمحے خود آشنائی کے تجربے سے گزرتا ہے بڑی اُداسی سے اپنے آپ کو بتاتا ہے:۔

میں اک چشمِ گماں پرور کے رستے پر
اچانک آنے والا وہ ہیولا ہوں
کہ جس کو یاد رکھنے کا تکلف ہو نہیں سکتا

مرا ہونا نہ ہونا...... ایک ہی زمرے میں آتا ہے

انوار فطرت کی نظمیں اسی عدم موجودگی کی رصدگاہ کے وہ مسلسل تجربے ہیں جنہیں اس نے چھوٹے چھوٹے تمثیلچوں میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔

شش جہت سے پرے / کتنی جہتیں ہیں / کس کو خبر ہے
یہ چاہِ سیہ تو ازل سے / جوابوں کے / خوابوں کے
روشن سمندر / نگلتا چلا آ رہا ہے / یہ تصویر موجود ہے
کس کی تخلیق ہے / نام لکھا نہ پایا
کہیں دستخط ہی نہیں تھے

چنانچہ کائناتی وثیقہ نویسی کی گہری منافقت سے آشنا شخص جو ان نظموں کا واحد متکلم بھی ہے تجربات اور گیان دھیان کی چپقلش سے وصول ہونے والے ان کالے کاغذوں پر اپنے اندر کی گاڑھی سیاہی میں تھڑا ہوا انگوٹھا لگا کر حقِ ملکیت کی مسرت حاصل کرتا ہے۔ آخر یہ حقِ ملکیت اور اس کی مسرت کیا ہے؟ کسی ایسی شے کا

یقین جو موجودگی کی دسترس سے ماوراء ہے اور اعتبار کی ایک ایسی حالت جو انسانی بے بسی کو اثبات کا ایک مہمل جواز عطا کرتی ہے۔ انوار فطرت کی آنکھوں کو اسی لایعنیت کی بکھری ہوئی تصویریں زیر چشم دیکھنے کی سزا دی گئی ہے، اس انسانی شرائط کے بیع نامے کے ساتھ جو بے معنی الفاظ کی ایک محدود لغت کا غلام ہے۔ اسی واسطے شاعر کو اپنے چھوٹے چھوٹے نفسی وقفوں کے درمیان تجربے اور حروف کی ہم آہنگی کے لیے گہری مشقت درکار ہے چنانچہ انوار نے ایک تصویر کو دوسری سے جوڑنے کے لیے نظموں کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا تجربہ کیا ہے ''باتیں پاگل ہو جاتی ہیں''، ''مہا سنکھ کی چیخ''، ''زینے تو بس زینے ہیں'' اور کئی دوسری نظمیں اسی پس منظر اور شاعرانہ انتشار خیالی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اس تجریدیت نے نظموں کے اشاراتی نظام کو ابہام سے بچانے میں شاعر کی مدد تو کی ہے لیکن جذباتی نقطۂ عروج کو ایسی سرد مہری بھی عطا کی ہے جو شاعر کی نفسیاتی بے حسی کا استعارہ بن گئی ہے۔...... اس طرح اُداسی کا پھیلاؤ اور لمحۂ گم شدہ کا طلسم ہزار شکل تو اختیار کر گیا ہے لیکن وہ علامتی سطح پر خروشِ آہنگ سے محروم ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے تجریدیت کے تجربے نے انوار فطرت کو ن۔م۔ راشد کی ان نظموں کا پیروکار بننے میں راہنمائی کی ہے جن میں راشد نے لسانیات کے صوتی تجربات سے کئی طرح کے تاثرات قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ راشد کی نظم ''اندھا کباڑی'' اسی سلسلے کی اچھی مثال ہے، انوار کی نظم ''خواب مجھے بُنتا ہے'' کی یہ لائنیں دیکھئے:۔

اگلے دن کی تیز ہوا....../ اگلی رات کا خواب......

خواب کی تیز ہوا...... / تیز کا پچھلا خواب......

تانے...... / خوا...... / ہوا......

با...... / نے...... / بُنتا ہے......

''آب قدیم کے ساحلوں پر'' اور ''بائولا بیل'' میں بھی یہی لسانی پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔

کراچی اور لاہور کے بعد اب راولپنڈی اور اسلام آباد والے بھی شعوری اور فکری سطح پر ایک 'سکول آف تھاٹ' بنانے میں کامیاب ہو رہے ہیں لوکل فلیور کے طور پر انوار کی نظمیں ''ڈیپ فریزر میں رکھا شہر''، ''لئی کے بھیگے ساحل پر''، ''اب ہم کارٹون دکھائی دیتے ہیں''، ''مہا سنکھ کی چیخ'' فیڈرل کیپٹل اور اس کے گرد و نواح کی فضا اور مخصوص معاملات کو اجاگر کرنے والی نظمیں ہیں۔ بختِ برگشتہ سے نبرد آزما انوار نے ٹھیک لکھا ہے:۔

زمانہ کہ بینا بھی ہے اور ناطق بھی ہے
یہ سب کچھ کہاں مانتا ہے
صلیبیں بنانے کا فن جانتا ہے

انوار فطرت کی زندگی میں اس کے دوستوں کی دل نوازی نے محبت کے کئی تجربات کے رنگ بھرے ہیں، اس طرح زرغنہ ہول کی رائیگانی جذباتی سطح پر اگر اسے بار آور نہیں کر سکی تو کچھ زیادہ نقصان بھی نہیں پہنچا سکی، یہیں کہیں اس کا تانیثی استعارہ چھوٹی چھوٹی تصویروں کی البم میں ڈھلا ہے، ان تصویروں میں

مقامی رنگ مفقود ہے اور اس مجموعہ پر جدید انگریزی نظموں کے گہرے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

دسمبر کی گھنی راتوں میں
جب بادل برستا ہے
لرزتی خامشی
جب بال کھولے
کاریڈوروں میں سسکتی ہے
تو آتشدان کے آگے
کہیں سے وہ دبے پاؤں
مرے پہلو میں آتی ہے
اور اپنے مرمریں ہاتھوں سے
میرے بال سلجھاتے ہوئے
سرگوشیوں میں
درد کے قصے سناتی ہے (اُداس ایک لڑکی ہے)

آنسوؤں اور اُداسی کی دھنک میں لپٹی ہوئی یہ نظم پڑھتے ہوئے ایذرا پاؤنڈ کی ایک نظم کی کچھ لائنیں دیکھیے

"Wrapped my tears in an ellum leaf/ And left them under a stone
And now men call me mad because I have thrown
All folly from me, putting aside/ To leave the old barren ways of men"

انوار نے بھی دکھ اور تکلیف کے اس کو وِ غنودہ سے چھٹکارا پانے کے جتن تو کئے ہیں، پس دیوار جلوہ گاہ جھانک کر زندگی کی تلخیوں میں شہد گھولنے کا خواب بھی دیکھا ہے۔ لیکن وہ عصائے معجز نما اور دستِ روشن کی تمثیل سے محروم رہا ہے...... وہ چناؤ کی کچ کچ میں پڑنے والا شخص نہیں اور نہ ہی زندگی اور زمانے نے کسی لمحے اُسے آسودگی کی برمالا پہنانے کا وعدہ کیا ہے...... وہ جانتا ہے کل کا آٹھوں کالم کا میٹر آج کا نویں کالم کا میٹر ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں دل زائد، عشق لایعنی اور روح نام نہاد لگا کرتی ہے۔

یہ خوبصورت سیہ پوش کتاب راولپنڈی سے حرف اکادمی نے شائع کی ہے اور یہ ۲۰۰۳ء ہے دیکھیے آنے والے دنوں میں کسی پرانے گیت کی آہٹ سنتے ہوئے انوار کو اثبات کا آٹھواں دن نصیب ہوتا ہے یا وہ اپنی ذات کے جنگل میں اپنے ہی شکار پر اکتفا کرتا ہے۔

کوئی آنکھ حیطۂ خواب سے
ازل اور ابد کے حجاب سے
جو کھلی کبھی تو کھلے گا یہ
کہ مرے بسیط طلسم کی
ہے کلیدِ فتح کہاں دھری

پروین طاہر

گھمبیر شب کا رسیا......انوار فطرت

کولرج کہتا ہے کہ حسن تجریدی اعتبار سے کثیر الجہت کی وحدت، مختلف انواع کا ادغام ہے اور ہیئتی اعتبار سے متناسب کا Vital سے امتزاج۔ انواع کا یہ تجریدی ادغام انوار فطرت کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مگر یہاں انہدام اور ادغام باہم پیوست نظر آئیں گے۔ اگرچہ انوار فطرت اساطیری زمینوں، زمانوں، فضاؤں اور دیوتاؤں کا رسیا ہے لیکن وہ پہلے ان عناصر کو معنوی اعتبار سے منہدم کرتا ہے پھر Reconstruction اور ادغام کے لئے اپنی بے پناہ تخلیقی قوت، جمالیاتی تجربے اور علم کا استعمال کرتا ہے۔ انوار فطرت اپنی بے جہت مگر کشف آور پہنائیوں کے کنج گم گشتہ سے آب قدیم کے سانولے جزیروں کے ساحلوں پر اپنے خوابوں کے ورود وغیاب کا نظارہ کرتا رہتا ہے۔ رات اس کا Obsession ہے، اُس کا عشق ہے۔ جس کی آخری محرابوں میں کافوری شمعیں اجال کر صدیوں کا سرود چھیڑتا ہے تو کائناتیں اس کے پہلو میں سمٹ آتی ہیں۔ زمانے غبار ہو کر چرخ کھاتے ہیں اور اس کا ''وہ'' جو شاید اس کا اپنا آپ ہے، خدا ہے، حسن ہے، سچ یا گیان ہے، خطِ موہوم میں اس کی پہچان بن کر ابھرتا ہے۔ اسی لمحے سے اس کی وہ نظمیں جنم لیتی ہیں جنھیں ہم خواب سلسلے کی نظمیں کہہ سکتے ہیں اور یہی نظمیں اس کی شعری شناخت کا اہم پہلو تشکیل دیتی ہیں۔

خواب اور حقیقت کے ٹکراؤ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی کش مکش جہاں کسی تخلیق کار کے لئے ایک لاینحل معمہ ہے، وہیں یہ کش مکش Agony اور تخلیقی مہمیز کا کام بھی کرتی ہے۔ یہ ٹکراؤ عام طور پر تخلیق کاروں کے ہاں ایک جھٹپٹے کا منظر یا پھر شام کی سلونی کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ جہاں رات دن سے اور خواب حقیقت سے ملتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر انوار کے ہاں وجودین کی واضح ڈیمارکیشن موجود ہے۔ یہ ڈیمارکیشن قاری کے ذہن کو یک بیک جھٹکا بھی دیتی ہے اور شاعر کے زندہ اور طاقتور ہونے کی دلیل بھی فراہم کرتی ہے۔ اس کی شاعری یا تو آخری شب کی شاعری ہے کہ رات اسے بے پناہ پسند ہے یا چکا چوند کر دینے والی تیز دھوپ اور مکمل شعور کی شاعری۔ یہی کیفیات اس کی نظموں کی دو اہم اقسام کو تشکیل دیتی ہیں۔ ایک تیسری قسم ہے جسے ہم New Mysticism کے زمرے میں رکھیں گے۔ آیئے اب ہم ان اقسام کو مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔

انوار فطرت کے باطنی اجزائے ترکیبی خواب، خیال اور الوہی نیند پر مشتمل ہیں۔ جب وہ نیند میں ہے تو دن کی تیز روشنی سے کٹا، دھندلی چاندنی میں ملبوس، خواب در خواب کے تانے بانے میں الجھا مکمل Elienation میں ہے۔ اس مقام پر وہ ایک Conscious Being نہیں بلکہ اس کے خواب کی مہار لاشعور کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں وہ سادہ اور اوریجنل ہونے کے باوجود Instincts کی سطح مرتفع پر ہے۔ یہ وصف جو خاص کو عام سے ممیّز کرتا ہے یقیناً ودیعت ہے۔ وگرنہ Instincts سے ایک راستہ پاتال کو بھی جاتا

ہے جس کا سراغ انوار کے ہاں اشارتاً بھی نہیں ملتا۔ ایسی نظموں میں وہ قاری کو اپنے ساتھ یوں اُڑاتا ہے جیسے کوئی بچہ فضا میں تیرتے کسی رنگین پر کو پکڑنے کی دھن میں ہو۔ یہاں اُس کی نظم، شعور اور زمان و مکان کی دست برد سے محفوظ ہے اور قاری کی قوت، اس کا اپنا شعری وجدان۔ وہ اپنے خواب سے حظ اٹھانے، اس کے مکالمہ کرنے، اسے مجسم کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ انوار کا خواب اس کے لئے موسیقی کے سُروں جیسا ہے جو اپنا مادی وجود نہ رکھتے ہوئے بھی اُسے سلائم کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس Phenonenon کا Analysis کریں تو یہ لطافت، یہ Sublimation شاعر کی اپنی کیمسٹری اور سائیکی میں موجود ہے۔ جسے اس کے ذہنی خلیات لطیف خواب کی شکل دے دیتے ہیں۔

''وہ معصوم سا خواب تھا / اک شب دھند کا فرغل اوڑھے مجھ پر اُترا /
''میں کیسا ہوں؟'' / میں نے اُس کو بتایا (وہ جیسا تھا) /
''تم نے کیسے جانا؟'' / میرے پاس یہ دو آنکھیں ہیں /
جب میں پلکیں موندتا ہوں تو نندیا مجھ کو گود میں لے لیتی ہے /
اور میں تم کو دیکھا کرتا ہوں'' (میرے خواب نے مجھ کو دیکھ لیا تھا)

''دن کی تیز ہوا / مرے تانے بانے بکھرا دیتی ہے /
رات اِک خواب / ہمیشہ / مجھ کو / نئے سرے سے / بُنتا ہے''
(خواب مجھے بُنتا ہے)

''آسماں خواب انگیز ہے / رات اس کی ہی دوری کے /
تنہا سمندر کا کالا پرندہ ہے جو / خوابگاہوں میں سہمی ہوئی /
جھاڑ آنکھوں میں چاند چمکتا رہا'' (آسماں خواب انگیز ہے)

اسی قبیل کی دوسری نظمیں مرن کام، ایک پرانے گیت کی آہٹ، خروشِ نہنگ لا، کینچلی بدلتی رات، شیشے کی دیوار وغیرہ ہیں۔ یہ نظمیں جمال، تخیل، خواب و خیال، نادیدہ کے خوف اور مقدس اشتیاق کی آمیزش سے تشکیل پاتی ہیں۔ یہ نظمیں گھمبیر راتوں کے رسیا اور خواب سے مکالمہ کرنے والے شاعر کی نظمیں ہیں۔ ان سے قریب ترین نظموں کی وہ Lot ہے جن کے موضوعات مابعد الطبعیاتی اور نفسیاتی ہیں۔ ان نظموں کو ہم New Mysticism کے زمرے میں رکھیں گے۔ یہ نظمیں Mystic اس لئے ہیں کہ ان کے سوالات وہی ازلی اور بنیادی ہیں یعنی انسان کی بے بسی، نارسائی، علم و شعور اور ادراک کا محدود ہونا، اپنے ہونے یا نہ ہونے کی بے اختیاری وغیرہ۔ مگر New اس لئے کہ آج کا شاعر ان کے جوابات، حواس اور علم کے نئے ادراک سے تلاشنے کی کوشش کرتا ہے۔ انوار کے Self Negation کی وہ صورت نہیں جو صوفی کے رضا و تسلیم سے جنم لیتی ہے۔ اس کے ہاں Negation کو انسانی مقدرات کا حصہ سمجھا گیا ہے۔ مقدرات سے

Annoyance اور جھنجھلاہٹ کا اظہار بار ہا ملتا ہے۔ اس Annoyance نے اس کے ایک خاص شعری رویے کو جنم دیا...... وہ ہے احتجاج۔ کبھی تو یہ احتجاج دبا دبا رہتا ہے اور کبھی کبھار ایک چیلنج کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی احتجاج کبھی موت کی خواہش، کبھی موت سے محبت اور کبھی کسی کائناتی طنز کی شکل دھار لیتا ہے۔ نظموں سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''کب تک پانی، آگ، ہوا اور مٹی کے آمیزے سے /
اپنے ادھورے اور بے کیف زمانے خلق کروں گا؟''
(چیخ اری او مہا سنکھ کی چیخ)

اس سوال کا جواب نظم کے اگلے بند میں موت کی خواہش کی صورت ملتا ہے۔

''آٹھویں دن! / ایسا کوئی اُپائے ہو سکتا ہے؟ / جیون کی زنجیر سے باہر /
گرے پڑے اس حلقے کے وقفے کو پھاند کے تُو آ جائے /
بول ارے او مہا سنکھ میں بیٹھے، رغضے والے لال بھبو کے دھڑ دھڑ کرتے دِن''
(چیخ اری او مہا سنکھ کی چیخ)

صوفی شعراء کے ہاں جو تردیدِ ذات کا سلسلہ خود ان کے اپنی ذات کے نامکمل اور عیب دار ہونے کے ساتھ جڑتا ہے اور یوں تردیدِ ذات کے سوتے عجز و انکسار سے پھوٹتے تھے مگر یہاں Self Negation میں بھی ایک عجب شانِ بے نیازی ہے۔ انسانی وقار ہے۔ وہ اپنی بے شناختگی، بے بسی اور نارسائی کو ایک بڑے ازلی سلسلے کے ساتھ جوڑتا ہے۔ جس میں شاعر جو بذاتِ خود انسان کا استعارہ ہے۔ معصوم و بے گناہ ہے۔

''مَیں قائل تو نہیں / لیکن...... مَیں جانوں / میرا ہونا ر اور نہ ہونا ر
ایک ہی زمرے میں آتے ہیں'' (مَیں قائل تو نہیں)

''جس نے جنم کی گھٹی چکھی / اُس کو زینے طے کرتے رہنا ہے''
(زینے تو بس زینے ہیں)

''گولے کی / اس کھینچ میں بابا / بام کہاں / پاتال کہاں ہے /
کس کو خبر ہے؟ / زینے تو بس زینے ہیں / ان کو ہمیں /
اور ہم کو انھیں بس طے کرتے رہنا ہے'' (زینے تو بس زینے ہیں)

اسی قبیل کی دوسری نظمیں لمحہ گم شدہ کا طلسم ہزار شکل، اے وہ، رسائی، اک دن بس اک دن وغیرہ ہیں۔

اب تک جن نظموں کا ذکر ہوا ہے اگر ہم انھیں رات، خواب اور چاندنی سے Associate کرتے ہیں تو نظموں کی ایک بالکل دوسری قسم ہے جسے ہم دن، تیز روشنی، مکمل شعور اور تیز حساسیت سے Relate کر سکتے ہیں۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ایک طرف کو ملتا، خاموشی اور سرگوشی میں بات کرنے والا

شاعرایسی کاٹ دار نظمیں بھی تخلیق کر سکتا ہے۔ اگر چہ یہ کاٹ اسلوب کی سطح پر کم اور زیر نظم زیادہ ہے۔ یہ آگ، یہ چبھن بعض اوقات عنوان اور اکثر اوقات کسی پنچ لائن میں جوہری توانائی کی طرح مخفی رہتی ہے۔ قاری پر کھلتے ہی یک دم اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ شاید انوار کا لہجہ بلند آہنگ نہیں مگر شعور اور حقیقت سے کھائی ٹھوکر، غم و غصہ، احساس اور معاشرتی تفاعل کے نتیجے میں پیدا ہونے والا Reaction بلند آہنگ ہے۔ چند سطریں ملاحظہ کیجئے:

"تمھارے دریا مرے پڑے ہیں / اور ان پہ غلاظت کی سبز کائی /
کفن کی صورت دھری ہوئی ہے / تمھاری مٹی میں / ریت کی بے شمار آنکھیں /
دہک رہی ہیں / اب ان میں کوئی بھی شکل پانے کی / استطاعت نہیں رہی ہے"

(شہر نامرد سے خطاب)

"... تو آؤ شیطاں! / اذان صبحوں / صبیح سچ سے / گناہ لاریب کی سندلیں /
گناہ و لاریب کا ستارہ / زمیں کے گنبد پر آچکا ہے"

(ہجوم یاراں ہے کھل کے بیٹھو)

انوار کی نظم کی پہلی دو اقسام وہ ہیں جن کے ساتھ قاری انوار فطرت کو Relate کرنا چاہتا ہے مگر کتاب میں نظموں کی تیسری قسم کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شاعر کو اصرار ہے کہ وہ دن کے اجالے، حقیقت پسندی اور معاشرے کا فعال شاعر ہے۔ اس ن اپنے دونوں روپ خوب نبھائے ہیں۔ کیونکہ کہتے ہیں:

"شاعرانہ صلاحیت کے دو تفاعل ہیں۔ ایک کے ذریعے یہ علم، قوت اور لطف کے نئے نئے مواد پیدا کرتی ہے اور دوسری کے ذریعے یہ ذہن میں خواہش پیدا کرتی ہے کہ نئے مواد کو ایک مخصوص آہنگ اور ترتیب سے خلق کیا جائے جسے حُسن The Beautiful اور خوبی The Truth کہا جا سکتا ہے۔"

(کولرج، مضمون: Defence of Poetry)

انوار فطرت کے تخلیقی اور تکنیکی Tools تلاش کرنا تو نقادوں کا کام ہے مگر ایک بات ضرور ہے کہ علامت، استعارہ اور Image انوار کی شاعری میں جگہ جگہ ملتے ہیں جو کہ نظم جدید کی اہم "شاملات" ہیں۔ مگر یہ عناصر اس کی ترجیح یا Obsession نہیں۔ اس کی بیانیہ نظم بھی اتنی ہی دلکش اور تہہ دار ہے جتنی علامتی۔ وہ درویش منش، سادہ اور بیجنل ہے۔ وہ اپنی عمومی شناخت کے کرب میں مبتلا نہیں بلکہ کائناتوں میں انسان کی اصل شناخت کا متلاشی ہے۔ لیکن بحیثیت شاعر اس کی شناخت طے شدہ ہے کیونکہ وہ سچ ہے اور سچ کا طلبگار بھی۔

آفتاب اقبال شمیم

ایک بے ہیئت نظم

تین سائے
سہ پہر سے بوند بوند رستا ہوا کیمیا
ایکس رے پلیٹ پر
ابھرتے بھربھری سفیدی کے خاکے
لڑکی اپنی سندرتا کے سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی
ہر لمحہ ایک گھٹتے ہوئے لمحے کے روپ میں
اور ایک نوجوان
آسودہ اور ہموار زندگی کے راستے پر
جنس اور محبت کی فرض کردہ دلدل میں
دھنستا ہے اور نکل کر پھر دھنستا ہے
اب اُس کی شنید کا ٹیپ
خود کار داخلی توجہ پر چلنے لگا ہے
ایک ان سُنی نظم......
سہ پہر اُباسی لیتی ہے
اور وہ کہتا ہے میں ہم جنس ہوں
اور پھر
آدھی شام کے سمے
وہ دونوں
مجھ سے اپنی محبت کا اعتراف کرتے ہوئے
مجھے اپنی جوٹھی چمچیوں سے کھانا کھلاتے رہے
بتاؤ نا! اس مواد سے میں نظم کیسے بناؤں

دوجنسیہ

کیسا دیوانہ ہے
جہاں بھر کی لڑکیوں کو فتح کرنے
یا ان سے مفتوح ہونے کے
خواب دیکھتا ہے
جیسے مٹی کی پہلی اکائی سے اُس کا خمیر اٹھا ہو
جیسے اس کا اندر
سارے براعظموں کی نیم گرمی کا علاقہ ہو
اور جانے پانی کو مچھلیوں کی یا مچھلیوں کو پانی کی
چاہت ہے
سمندر بولتا ہے
اور ساری مچھلیاں اس کے گھمبیر بولوں کے سُر ہیں
اگر یہ سُر ایک سُر بن جائیں
تو سمندر اپنی آواز کی بدصورتی سے ہلاک ہو جائے
اُسے آنکھوں سے پانی کی شہوت ٹپکاتی ہوئی
نمفومینیک مخلوق اچھی لگتی ہے
وہ سب خشکیوں پر
اور پانیوں میں ماہی گیری کرتا ہے
اور جہاں بھر کی لڑکیوں کو فتح کرنے
یا ان سے مفتوح ہونے کے
خواب دیکھتا ہے

محمد صلاح الدین پرویز / امپیکٹ

(نصیر احمد ناصر کے ساتھ گزاری ہوئی اک شام کے نام)

کل بہت دنوں کے بعد
میرا ایک دیرینہ دوست مجھ سے ملنے آیا
میں دیر تک اس کی نظمیں سنتا رہا
یوں تو وہ صحراؤں کی مئی ☆ کا ایک جلتا ہوا اداس دن تھا
لیکن اس میں جانے کہاں سے نومبر کی سرد ہوائیں بھی شامل ہوگئی تھیں
''زرد پتوں کی شال'' اوڑھے کچھ پیڑ بھی ڈرائنگ روم میں آ کر
ہماری باتیں سننے لگے تھے
پہاڑیاں، دھند، ڈاک بنگلے
اور جھیلوں پر سہمے ہوئے لکڑی کے پُل
ہماری گفتگو کی چائے میں ڈھلنے لگے تھے
......وہ ایک زعفران سی لڑکی تھی
آنکھوں میں نیلی جھیلوں کا اسرار لئے
سینے پر پہاڑوں کے دکھ اوڑھے
انتظار سلگا سلگا کر
جانے کس کے لیے اپنا چہرہ تمتمائے رکھتی تھی
......اور وہ، وہ ایک دھان پان سی لڑکی تھی
آنکھوں میں غزالوں کا احساس لئے
سینے پر دھان اور گندم،
دونوں بہ یک وقت سنبھالے
بارش میں اور بے بارش میں
ہر سمے کے موسم میں کھلکھلاتی رہتی تھی
بھاگتی رہتی تھی
کہ اسے کوئی نہیں پکڑ سکے گا
......اور اور وہ بھی تو تھی

وہ، وہ ایک مہربان سی لڑکی......
ابھی ہم یادوں کی البم کا اگلا ورق
پلٹنے ہی والے تھے
کہ مہتاب، شب کے ہمراہ
ہمارے ڈرائنگ روم میں بنا اجازت
مسکراتا ہوا گھس آیا
اور ہماری باہر کی فضاؤں میں کھلنے والی
کھڑکیوں کے پٹ کھولنے لگا
''باہر بہت دھوپ اور سینڈ اسٹورم ہے
ساری یادیں میلی ہو جائیں گی'' ہم نے کہا
''دھوپ اور سینڈ اسٹورم! نہیں تو...... ! یہ کیسے ممکن ہے
ہم صحرا میں تو نہیں ہیں!''
''اچھا تو پھر ہم کہاں ہیں!''
''یار تم لوگ بہت بور کرتے ہو...... میں جا رہا ہوں......''
یہ کہہ کر اس نے شب کا ہاتھ پکڑا
اور غصے میں ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا
(واقعی ان دونوں کے جانے کے ساتھ ہی وہاں اندھیرا ہو گیا تھا)
ہم جب بہت دیر کے بعد
موم بتی تلاش کر کے، اسے لائیٹر سے جلا کے
اس کے شعلے کو ہتھیلیوں کی حفاظت میں لئے
کھڑکی تلک لائے تو دیکھا
دور کسی برفیلی چوٹی پر بنے ہوئے
ایک ڈاک بنگلے کی بالکونی میں
''ایک لڑکی اداس بیٹھی تھی''
نیچے وادی میں
ایک اداس یوکلپٹس کے پیڑ کے نیچے ایک لڑکا
بالکل یوکلپٹس سے ملتا جلتا

اداس اداس لیکن استادہ
لڑکی کو اپنے پاس بلا رہا تھا
(شیڈو ولیے میں کچھ لوگ شاید دونوں کو واچ کر رہے تھے)
فضاؤں میں
پہاڑ، پیڑ، پتے، برف، جھیل
رمز، اسرار، سحر، کشف، سناٹا
پتہ نہیں کس کس کی سسکیوں کا آرکسٹرا گونج رہا تھا
اس منظر سے ہم پہلے اداس ہوئے
پھر تھوڑے سے بوجھل ہوئے
پھر تھوڑے سے عبادت گزار ہوتے ہوئے
ان دونوں کے وصل کی دعا مانگتے ہوئے پلٹے تو حیران ہوئے
نومبر کی سرد ہوائیں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک ہمارے ساتھ تھیں
زرد پتوں کی شال اوڑھے کچھ پیڑ بھی
جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک
ہماری باتیں سن رہے تھے
ڈرائنگ روم سے اچانک غائب ہو گئے تھے
''کیا سب مر جاتے ہیں!''
میں نے اپنے دوست سے ایک اوٹ پٹانگ سا سوال کیا
''ہاں سب مر جاتے ہیں''
''یادیں بھی!''
''ہاں وہ بھی''
''تو پھر کیا زندہ رہتا ہے!''
''نظمیں، بس نظمیں زندہ رہتی ہیں''
''ہاں شاید نظمیں ہی زندہ رہتی ہیں!''
میں نے کہا اور ایک نئی نظم لکھنے بیٹھ گیا......

☆ مئی ۱۹۹۳ء

خورشید اکرم / ہتھیار

تندور کی لپلپاتی آگ پہ بیٹھے
روٹیاں سینک رہے تھے
ایک مرد اور ایک عورت......
زندگی کے زنداں کے دو قیدی
آگ اور آٹا اور مٹی ایک دوسرے میں
پک رہے تھے وہاں
کچے مکانوں کے درمیان
رات کی رانی اور
اشوک کے پیڑوں کی ہریاول خوشبو پھیلی تھی
لیکن اس سے بڑا تھا
روٹی کی سوندھی مہک کا ہالہ
ماتھے کی بندیا سی گول روٹیاں بناتے
ایک عورت کے ہاتھ
تھپ تھپا تھپ تھپ کی آواز
سہاگ کے ڈھول کی مٹھاس ہے اس تھاپ میں
پانی کے چھینٹے تندور کے کناروں پر گرتے ہیں
جیسے چھن چھن بج رہے ہوں مجیرے
آہنی سیخوں کے ٹکرانے کی آواز ابھرتی ہے
جیسے توڑی جا رہی ہوں زنجیریں
یہ ایک آہنگ ہے زندگی کا
ذرا سی لے بگڑ جائے تو
شکل بگڑ جاتی ہے روٹی کی
ذرا سی چوک ہو جائے تو
جل جاتی ہیں انگلیاں
راکھ چاندی کے برادے کی طرح
جم گئی ہے ان کے بالوں پر
روٹیاں سینک رہے ہیں وہ
اپنی نم آنکھوں کے گرم تندور میں
مگر وہ روٹیاں کہاں سینک رہے ہیں
دہکتے تندور پر جھکے وہ دو انسان
زندگی کے دیو سے لڑنے کے لیے
چھوٹے چھوٹے ہتھیار بنا رہے ہیں!!!

خورشید اکرم

روز

تپتی دھوپ میں چلتے چلتے
اور جسم کی خندق بھرتے بھرتے
اتنی تھکن بھر گئی ہے روح میں
کہ ہر خوشی اک دیوانگی لگتی ہے

منہ اندھیرے چڑیوں کا چہچہانا
محض ایک شور معلوم ہوتا ہے
اور لنگوروں کا ڈال ڈال کودنا
ایک حیوانی فعلِ محض
چنچل دنوں والی صبح

روز آتی ہے
نرم گرم کرنیں
میرے تلوے گدگداتی ہیں
میرا سر سہلاتے سہلاتے تھک جاتی ہیں
پھر چڑھتے دن کی گاڑھی دھوپ
اپنے بھاری پنجے میرے کاندھوں پر دباتی ہے
ٹوٹے ہوئے بدن کے ٹکڑے

ہاتھ کو ہاتھ
پاؤں کو پاؤں اور
آنکھ کو آس سے جوڑ کر

اُٹھ پڑتا ہوں
تپتی دھوپ میں چلنے کے لیے
جسم کی خندق بھرنے کے لیے!!!

انوار فطرت

وہ نادید سے مکالمہ کرتا ہے

اس کا کینوس
بھیدوں بھری رات کے
کسی نامانوس لمحے میں
سانس لینے لگتا ہے

اتھرا سرخ گھوڑا
اس کے نگار خانے میں
اس کی انگلیاں چاٹتا ہے

وہ اپنی ذات کے خط پر
کائنات کی بنیاد استوار کرتا ہے
رات اس پر
تخلیق کا دن
طلوع کرتی ہے
اور اس کی خواب گاہ میں
اجنبی دنیائیں
سرگوشیاں کرنے لگتی ہیں
نادید
اس کے گرد
سرسرانے لگتا ہے
وہ لکیر کی ساری سمتوں میں رہتا ہے

(راحت سعید کے لیے)

انوار فطرت

آبِ قدیم کے ساحلوں پر

ڈُووووُر
مری بے جہت پہنائیوں کے
کسی کنجِ گم گشتہ میں
دو دِگماں انگیز کے سناٹوں کے اُس پار
وہ آبِ قدیم گونجتا ہے
جس کے سانولے جزیروں کے ساحلوں پر
میرے خوابوں میں معدوم ہوتے خوابوں کے غول
وردِ دوغیاب کرتے ہیں
اور میری ویران آنکھوں کے مندروں میں
میری نا آسودہ کاماؤں کی
تھکی آتماؤں کے ہونٹ
کسی اسمِ خفی کے ورد میں
لرزاں رہتے ہیں
خاموشیاں
سرگوشیاں کرتی
اِدھر
اُدھر
سرسراتی ہیں
میں یہاں شبوں کی آخری محرابوں میں
کافوری شمعیں اجالتا ہوں
اور عود ولوبان سلگا کر
ہرے نور سے ترشی
قربان گاہ پر رکھے عکس نمائے ازل گیر کے سامنے
صدیوں کا سرود چھیڑتا ہوں
اس کی سرمدی لے پر
یقین کا رقص کرتا ہوں
لاریب کا گیت گاتا ہوں

کائناتیں میرے پہلوؤں میں سمٹ آتی ہیں
اور زمانے میرے دائروں میں
غبار ہو کر چرخ کھاتے ہیں
لیکن.........آہ!
وہ کسی اجنبی ثانیے کے
خطہء موہوم میں
یک بیک نمودار ہوتا ہے
اور یہ کہہ کر تحلیل ہو جاتا ہے

''میں تجھے پہچانتا ہوں
تو نے پہچانا مجھے.........؟''
آبِ قدیم
ڈُووووُر ڈُور تک
لرز لرز جاتا ہے

ابرار احمد / جب آنکھیں پرانی ہو جاتی ہیں

جب آنکھیں پرانی ہو جاتی ہیں
چیزیں اور چہرے دھندلانے لگتے ہیں
اور اندر کی دُکھن بڑھ جاتی ہے
خالی پن میں
رائیگانی شور مچاتی ہے
ایک وقت ایسا بھی آتا ہے
جب محبت
زندگی سے زیادہ ضروری ہو جاتی ہے
اور یہ وہ وقت ہوتا ہے
جب ملتفت چہرے
آپ کو قدرے اجنبی انداز سے دیکھنے لگتے ہیں
لیکن خاک ہو جانے تک
محبت کا انتظار ختم نہیں ہو سکتا
اسی لیے شاید
میرے سامنے کہیں موجود، کہیں ناموجود
یہ خواب ناک، بے پناہ، دل پذیر آنکھیں
آنسوؤں کی طرح
میرے دل میں گرنے لگی ہیں
ایسے آنسو جنہیں میں پونچھ نہیں سکتا
بس اپنی آنکھوں سے بہا سکتا ہوں
ایک ایسی محبت
جو نہ جانے محبت ہے بھی یا نہیں
رات بھر
میں ستاروں کی راکھ چنتا ہوں
اور کہیں کہیں موجود
روشن ستاروں کو دیکھتے ہوئے
ان آنکھوں کو یاد کرتا ہوں
جن میں رک کر
میری بے خواب راتیں آرام کر سکتی تھیں
بجھے ہوئے سگریٹوں کی راکھ سے
میرے اندر کانٹے سے ابھر آتے ہیں
نارسائی اور ملال کی
گرد آلود ہوا چلنے لگتی ہے
ایک موہوم امید اور انتظار کی اذیت لیے
میں ہر نئے دن میں داخل ہوتا ہوں
ان آنکھوں کی ہم راہی میں
جو میرے ساتھ ہیں
یا شاید نہیں

ابرار احمد / خاموشی

ایک اجنبی سرزمین پر
نئی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے
اس نے سوچا ہوگا
ان جمع ہو جانے والی اینٹوں سے
وہ ایک ایسا گھر بنائے گا
جس کے وسط میں فوارے ہوں گے
رہداریاں اور پھول ہوں گے
اور تنہائی کی شاموں میں
دیوار سے لگ کر
وہ بادلوں اور دوستوں کا انتظار کیا کرے گا
اُس صبح
جب اس نے خوابوں سے بوجھل
اپنی خوبصورت آنکھیں کھولی ہوں گی
تو نہیں جانتا ہوگا
کہ وہ سورج، آئینے میں اپنے چہرے
اور زندگی کو آخری مرتبہ دیکھ رہا ہے
اور نہ یہ کہ اس روز آغاز ہونے والا
اس کا سفر بہت دور تک پھیلا ہوا ہے
جب اس کا دل
سینے کے پنجرے سے زور زور سے ٹکرایا ہوگا
تو اس نے اس کی منتیں کی ہوں گی
سمجھایا ہوگا
جب اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہوں گی
تو اس نے گاڑی سے باہر
دور تک پھیلے میدان اور درخت دیکھے ہوں گے
اور گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں
اور نظر کی حد سے پرے
اس کا اپنا گھر، بیلوں میں ڈھکا ہوا
بارش میں بھیگتی، گھومتی ہوئی سیڑھیاں
اور اس نے ایک خواب دیکھا ہوگا
اندھیرے میں ڈوبتے چلے جانے کا
ایک بچی کے پھیلے ہوئے بازو اور جھولے
ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے کچھ چہرے
تب اُسے معلوم ہوا ہوگا
کہ یہ تو اَبد کا اندھیرا ہے
پھر اسے کچھ بھولے ہوئے گیت یاد آئے ہوں گے
اور دوست...... اور گزری ہوئی چند محفلیں
محبت کرنے والے کچھ لوگ
بچپن، آبائی مکان اور پرندے
چند مہربان ہاتھ...... اپنی طرف بڑھتے ہوئے
اور وہ مسکرا دیا ہوگا
اس نے سوچا ہوگا
''ٹھیک ہے!!''
اور مسکراہٹ کے عین وسط میں
ایک خاموشی
اس کے ہونٹوں پر منجمد ہو گئی ہوگی
خاموشی...... جو مٹی کی آواز ہے۔
خاموشی...... جو سب آوازوں کا باطن ہے
خاموشی
جو اس کی مٹی کے چہار جانب پھیل گئی ہے!

اسماء راجہ / اندھیرا ایک سمندر ہے

ابھی وقت باقی ہے
یا بہہ گیا ہے
دنوں کے ان نشیبی راستوں پر
اپنے انت کی جانب
میں گہری نیند میں ہوں یا جاگتی ہوں
اندھیرا ایک سمندر ہے
یہ مجھ کو موج در موج بے حد کی جانب لے کے جاتا ہے
جہاں سورج نہیں ہے
میں بے حد کی اس دہشت سے سانس روکے ہوئے
ایسے گزرتی ہوں
کہ جیسے میرے پاؤں کے نیچے کی یہ زمیں
زمین نہیں، بس زمین کا سایہ ہے
ٹوٹا ہوا ایک ستارہ ہے
گہرے پانیوں میں راستے کا شائبہ ہے
میں کیسے اس جہانِ خاروخس سے بچ کے چلتی ہوں
کیا میں جاگتی ہوں؟
میں ہوا کی سلطنت میں ہوں
اور گراتی جارہی ہوں، ایک ایک کر کے سارے خواب
تمہارے خواب اور وہ خواہش
ستاروں سے گزرنے کی،
روشنی کرنے کی تمنا بھی کہیں پر بھول آئی ہوں
میں ذیلی راستوں کی راہرو
میرا زادِ سفر ایک خوف ہے
اندیشہ ہے کہ
لے جائے گی کہاں پر راہ گزر مجھ کو
کہاں پر آندھیاں جا کر میرے دامن کو چھوڑیں گی
رات کہاں پر ٹھہرے گی
چاند کہاں پر اترے گا
اب کس آواز سے اس قدیمی خامشی کا در کھلے گا
مجھے اب کس جگہ پر
میرا سورج ملے گا!

پروین طاہر

چوتھی جڑ

تم نے کہا تھا
اس درخت کی کوئی جڑ نہیں
نہ اس کو پھل لگتا ہے
نہ اس کی چھایا میں بیٹھا جا سکتا ہے
تم نہیں دیکھ سکتے
کہ دیکھنے کے لیے آنکھیں بند کر کے
تپسیا میں بیٹھنا پڑتا ہے
کاش تم دیکھ سکتے
ایسے بے شمار درختوں کی جڑیں
رود بارِ انگلستان کے اُس طرف
گنگا، جمنا کے ڈیلٹوں کے اس طرف
ایراوتی اور چناب کے دوآبوں میں
اور روہی کے ویرانوں میں
ان درختوں کو پھل نہیں
پھول لگتے ہیں سفید اور زرد
جنہیں ولیم، داس، حسین اور فرید کا قلم چُنتا ہے
ان سے صدیاں اور نسلیں مہکتی ہیں
کاش تم دیکھ سکتے
میرے دل میں اُگے اس درخت کو
جس کی ایک جڑ چنبے کی ہے
دوسری پیلو کی
تیسری شاہ حسین کے مزار پر جھومتے بڑ کی
اور چوتھی تمہاری محبت کی

تم بھی کن رس نہیں تھے

یاد ہے ہمارے ایک دوست نے کہا تھا
"وادی سُر لگانے سے راگنی باطل ہو جاتی ہے"
تجھے راگنی کے باطل ہونے کا تصور
کتنا ناگوار گزرا تھا
میں بھی اُن دنوں ایک راگنی کے حصار میں تھی
جس میں لگنے والے سارے سُر کومل تھے
یہ سُر دائیں جانب لہراتے
تو چاروں شانے چت دائیں جانب جا گرتی
بائیں طرف ڈولتے
تو دل پسلیوں سے اُچھل کر مٹی میں جا رُلتا
نیچے سرکتے تو
پاتال میں جا گرتی
اوپر اُٹھتے تو فضا میں معلق ہو جاتی
تب ہی پتہ چلا کہ
لہروں کی سنگت میں
زندگی گزارنا کتنا مشکل ہے
تم بھی کن رس نہیں تھے
میں نے چپکے سے راگنی میں وادی سُر لگا دیا
تا کہ جی سکوں
پاؤں زمین پر ٹکا کر!!!

اسماء راجہ

بہن

میرے سینے میں دل کی جگہ
ایک بھاری پتھر رکھا ہے
میری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں دن کو
چمگادڑوں کی طرح اور رات کو
مگر مچھ کی آنکھ کا آنسو بن جاتی ہیں
میں اپنے ہاتھوں پر اُگے کانٹوں سے
تمہیں ہاتھ ملانے کے بہانے زخمی کر دوں گی
تمہاری سفید کبوتروں جیسی ہنسی کو
کتوں کا راتب بنا دوں گی
اور سبز آنکھوں والی محبت کو
گدھوں کے حوالے کر دوں گی
میں تمہارے کھانوں میں
زہر ملا دوں گی
کیونکہ میں تمہاری بہن ہوں
میں ہمیشہ تم سے محبت کروں گی!

موت میرے دل سے گزری

موت نے میرے آسمان کا
سب سے روشن ستارہ توڑ لیا
موت نے میرا باغ اجاڑ دیا
موت میرے دل سے گزری
اور اسے نوحہ بنا دیا!

موت

اے ظالم!
اے سفاک!
اے دغا دینے والی
میں بھی مرنا چاہتی ہوں
اس وقت کو دیکھنے کے لیے
جب تجھے موت آئے گی!

A Moment of Distress

صرف میں ہی کم نصیب نہیں تھی
زندگی!
کہ تجھے جی نہ پائی
تیرا مقدر بھی
محبت سے خالی لکھا گیا تھا

ملاقات

دھوپ اور گرد سے
کملایا ہوا دن
سبز ہو جاتا ہے!

پروین طاہر

آخری مؤقف

سچ کسی بگولے کی مانند
سینے سے اٹھتا
اور ہونٹوں تک آنا چاہتا
مگر میرے ووکل کارڈز اُسے روک لیتے
واپس میری پسلیوں سے
سر ٹکراتا غصے سے پاگل ہو جاتا
کبھی درد بن کر
میرے دماغ میں جا گھستا
کبھی تشنج بن کر
مری مٹھیوں میں آن چھپتا
کبھی چلانے لگتا
''تمہارے سینے کو گھر بنایا تھا
تم نے قید خانہ بنا دیا''
کبھی گھگیانے لگتا
''میں گلاب بن کر
تمہارے گالوں پہ کھلنا چاہتا ہوں
مگر یہ سُرخ جسیمے مجھے
تمہاری جلد تک نہیں آنے دیتے
میں ستارہ بن کر چمکنا چاہتا ہوں
لیکن تم پلکیں موند لیتی ہو
میں لمس بن کر تمہاری پوروں میں اُترنا چاہتا ہوں
مگر مصلحت مجھے قلم تک بھی نہیں آنے دیتی''
اُس سے نظر ملانے کی جرات نہیں تھی
اس لیے اُس کا گھر ہی مسمار کر دیا!

نفی گزیدہ

کیا تجھے یاد نہیں
محض دو بوند اثبات سے
گلابوں کی بے انت فصل اُگ آئی تھی
جس کی مہکار سے دم اُکھڑنے لگا تھا
تجھے شاید مجھے بچانا تھا
یا نفی کو بھی آزمانا تھا
اَن گنت گلابوں کی بے انت تباہی
دو بوند نفی کا کرشمہ بن گئی
زمین تو وہی
بارشیں بھی بہت
مگر نفی گزیدہ زمین
کوئی گل کھلانے
یا کوئی معجزہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی!

اسماء راجہ

ستاروں کے لیے ایک ابدی جائے امان ہے

ستارے ہمیں دیکھتے ہیں
نوری سالوں کے فاصلے سے
اپنی کرنیں بکھیرتے ہیں
ان سمندروں اور سبزہ زاروں پر
جگمگاتے رہتے ہیں
مسکراتے رہتے ہیں
ستارے جب ٹوٹتے ہیں
تو زمین کی آغوش میں
پناہ لیتے ہیں
ستاروں کے لیے
ایک ابدی جائے امان ہے
ستارے
ہمارے دلوں کی طرح
کسی اور کرۂ ارض پر
کسی اور زمانے میں
کسی اور برفستان میں
منجمد ہونے کے لیے نہیں ہیں!

یہ سب ختم ہونے کے لیے ہے

رات کے کسی لمحے میں
اچانک
مجھے ایسے لگتا ہے
جیسے اب کبھی صبح نہیں ہوگی
سورج نہیں نکلے گا
جیسے یہ ساری دنیا
بس اسی لمحے میں ختم ہو جائے گی
مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا
سب کچھ موجود رہتا ہے
اور اسی طرح رہے گا
کئی سالوں یا نوری سالوں تک
مگر یہ ہاتھ
مٹی میں مل جائیں گے
جن کو تم نے کبھی چھوا ہی نہیں
یہ آنکھیں
جن کو تم نے دیکھا ہی نہیں
اور میرے دل میں بہتی ہوئی یہ دنیا
جس کو تم نے کبھی سوچا ہی نہیں
ختم ہو جائے گی!

اسماء راجہ

Anti Prism

اگر تم یہاں ہوتے
میرے پاس
تو میں دکھاتی تمہیں اپنے آنسو
دیکھو ان میں کتنے رنگ ہیں
یہ کھلتے پھول جیسا گلابی
ساتھ بیتے ہوئے لمحوں کا، میرے چہرے کا رنگ
یہ کھلکھلاتا ہوا سرخ ہے
میرے لہو کا، تمہاری ہنسی جیسا
کاسنی رنگ، تمہارے گیتوں کا اور میری نظموں کا
سنہری باتوں کا رنگ
سفید ہے میرے دل میں برسنے والی بارش
اور میری خواہشوں کا سبز
یہ میری روح کا رنگ ہے نیلا آسمان جیسا
جس روح کی گہرائیوں سے میں نے تمہیں چاہا ہے
پر اسرار ہے تمہاری خاموشی کا رنگ گہرا بھورا
یہ زرد انتظار ہے طویل دنوں کا
سرمئی ہے میری اداس شاموں کا رنگ
اور خاکستری میری بے بسی کا
سیاہ ہے تنہائی اور وحشت کا رنگ
.اور میری بے خواب آنکھوں کا
اور یہ آنسو ہے
بے رنگ
میری زندگی جیسا

ہم جیسے

کہیں بھی چین سے نہیں رہتے
شہروں میں اور جنگلوں میں
وادیوں اور بیابانوں میں
بے قرار پھرتے ہیں
ناموجود کو تلاشتے رہتے ہیں
ہوا کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے
دھوپ کی شدت میں
اور بارشوں کے ساتھ
دُور کے خوابوں میں کھوئے رہتے ہیں
روتے ہیں گہری نیند میں
نا معلوم کے دکھ پر
اور آنکھیں بند کیے ہوئے
دنیا سے گزرتے ہیں
یہ ہم جیسے ہیں
جو ساری عمر
دشمنوں کی خوشی کا
سامان بنے رہتے ہیں
یہ جانتے ہوئے بھی
کہ شکست مقدر ہے
زندگی سے لڑتے رہتے ہیں!

اسماء راجہ

آج میں نے ایک دریا پار کیا

آج میں نے ایک دریا پار کیا
وہ پہاڑ دیکھا
جس جگہ میں خواب میں گری تھی
اور درخت
جنھوں نے اپنے سائے سکیڑ لیے
آج میں نے
آسمان کی سمت نہیں دیکھا
ہوا کی سرگوشیاں نہیں سُنیں
ستارے اور خواب نہیں اوڑھے
کبھی کبھی کام آتا ہے
ہنر مندی سے سامنا کرنا
یا محض بھول جانا

وہ کیسے زندہ رہتے ہیں

میں یہ تو جانتی ہوں
کہ لوگ
رنج سے
خوف سے
اور شرمندگی سے
مر جاتے ہیں
مگر میں یہ نہیں جانتی
کہ جب کبھی ان کو بچا لیا جاتا ہے
تو وہ کیسے زندہ رہتے ہیں!

ایک محبت

میں نے اس کا منہ چڑایا
اسے تنگ جوتے پہنا دیئے
اسے ٹھوکر مار کر زمین پر گرا دیا
پھر بھی جب وہ اٹھ کھڑی ہوئی
تو میں نے
ایک موٹا سا رسہ اس کے گلے میں ڈال کر
چھت سے لٹکا دیا
اور انہماک سے اسے مرتا ہوا دیکھنے لگی

اسے مرے ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں
مگر اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا
وہ میرا منہ چڑاتی ہے
مجھے ٹھوکر مار کر گرا دیتی ہے
اور ہر روز
میرے مرنے کا تماشا دیکھتی ہے!

یُوشَے کے لیے

تجھ کو دیکھ کر
زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے

(یُوشَے ــــ پانچ سال کا بھتیجا)

بشریٰ اعجاز / مسافر!!

مسافر!
میری آنکھیں سامانِ سفر نہیں بن سکتیں
اور میرا چہرہ منزل کا استعارہ نہیں بن سکتا
مَیں جانتی ہوں
مَیں اچھی لگتی ہوں سے زیادہ کچھ نہیں
ورنہ تم منزلوں کا خواب
اپنی آنکھوں سے نہیں، میری آنکھوں سے دیکھتے
میری آنکھیں
جو تمھارے لمس میں بھیگنے سے پہلے ہی
دوریوں کے بے لمس راستوں کا رزق بن چکی ہیں
انھیں خواب دیکھنے
اور تعبیریں لکھنے کی اجازت نہیں
انھیں کھل کر دیکھنے اور سوچنے کی بھی اجازت نہیں
بے ارادہ فیصلوں
اور بے یقین امیدوں کے ڈھیر پر رکھی
اک تنہا محبت کا باب لکھنے سے پہلے
مسافر اتنا یاد رکھنا
محبت فیصلہ نہیں
منزل بھی نہیں
محبت فقط اک راستہ ہے
جس پر چلتے ہوئے مسافر
ازلوں اور ابدوں کے پار اترتے ہیں
مجھے معلوم ہے

مَیں تمھارا ازل نہیں
نہ ہی تمھارا ابد بن سکتی ہوں
مجھے یہ بھی معلوم ہے
تم نے ازلوں اور ابدوں کے پار اترنے کا فیصلہ
لکھ لیا ہے
تمھارا ہر قدم
تمھاری جانب اٹھتا ہے
منزلیں تمھاری ہتھیلیوں کا مقسوم ہیں
مَیں جانتی ہوں
میری آنکھیں سامانِ سفر نہیں بن سکتیں
اور میرا چہرہ منزل کا استعارہ نہیں بن سکتا
مگر میں وہ راستہ تو بن سکتی ہوں
جس پر چل کر تم
ازلوں اور ابدوں کے پار اترو گے
اور نا معلوم کی دھند میں کھو جاؤ گے!!

بشریٰ اعجاز / تعلق کی صدیاں

نور کی بوند سے بنی ہوئی تقدیر
ہر کسی کے حصے میں نہیں آتی
تقدیر بنانے کے لئے
نور کی بوند خود پیدا کرنا پڑتی ہے
ہاتھوں سے، آنکھوں سے اور خوابوں سے
وہ خواب جو آنکھوں کو شاداب کردے
اسے دیکھنے کے لئے آنکھیں نہیں دل چاہیے
چہروں پر وقت کی رفتار ٹھہر جائے تو
واپسی راستوں پر کھلنے لگتی ہے
مگر وقت نہیں رکتا
ہتھیلیوں سے ریت اور روشنی کی طرح
چھن چھن کر گرتا رہتا ہے
ہم دیکھتے ہیں...... اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے
خود سے بڑے آرام کے ساتھ بچھڑ جاتے ہیں
ہنستے کھیلتے مل جانے والی جدائی
اس قرب کی اترن ہے
جو کبھی وجود پر کھلا ہی نہیں ہوتا
جس نے لہجوں اور بینائیوں کو چھوا ہی نہیں ہوتا
جس نے روح اور وجود کے سنگم کے
سُر اور تال سنے ہی نہیں ہوتے
جو پانی بن کر ٹھہر جانے والے لمحوں کی
میراث نہیں بنتا
ہم نے آس اور ملن کا گھر بنانے سے پہلے توڑ دیا
اور اس گھر کے

نظر نہ آنے والے ملبے پر بیٹھ کر
پانی کے چند بے رنگ قطرے بہانے کی
مہلت بھی خود کو نہ دی
ہم کیا کریں
پانی پر بنائے ہوئے گھر
اور خوشبو پر لکھی ہوئی باتیں
تقدیر کا حصہ نہیں بن سکتیں
روزنامچوں کا پیٹ نہیں بھر سکتیں
کچھ رنگ، کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں
جن کی تفہیم الفاظ سے ممکن نہیں ہوتی
جو کسی نظم، کسی شعر میں نہیں سما سکتے
(روزنامچے جنھیں چھو بھی نہیں سکتے)
کچھ درد ایسے ہوتے ہیں
جنھیں بہانے کے لئے
عمر کی صدیاں کم پڑ جاتی ہیں
کچھ تعلق ایسے ہوتے ہیں
جن کے شجرے دلوں کے پنوں پر رقم ہوتے ہیں
جن کا ادراک وجود اور زبانیں کر ہی نہیں سکتیں
تم نے کبھی سوچا
تعلق کی یہ دراڑ
جو تمھارے دل سے ابھر کر مجھ تک پہنچی ہے
اس کی صدیاں عبور کرتے کرتے
میں تھک گئی تو کیا ہوگا
میں ہار گئی تو کیا ہوگا؟

جواز جعفری

سفر میرے پاؤں میں کُھجلی کرتا ہے

مجھے میرے ہاتھوں کی مزدوری دو
کہ میں تمہارا بدن کھود کر
دودھ کی نہر نکال لایا ہوں
میں نے تمہارے لیے خود کو خرچ کر ڈالا
اور اپنے لیے کچھ نہ رکھا!
مجھے اپنے پیٹ کی راہنمائی قبول نہیں
میں اپنے دن بڑی تیزی سے خرچ کر رہا ہوں!
دُنیا...... میری ایڑی کے نیچے پڑی سو رہی ہے
میں نے خود کو
اپنی مٹھی میں پناہ دے دی
میں اپنے ''خوابوں کی گٹھڑی'' سرہانے رکھے
سو رہا ہوں
سفر میرے پاؤں میں کھجلی کرتا ہے!
یہاں لوگوں کے پیٹ
اُن کے پاؤں سے آگے چلتے ہیں
میں اپنا پیٹ کاٹ کر
بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں!
میرے باغوں میں
پرندے کم ہو رہے ہیں
اور میرے ''حصے کے آسمان'' پر
حادثہ لکھا ہے
میری زمین کی گود
اُجڑنے والی ہے!

مجھے ایک المیے کا سامنا ہے

میرے شہروں میں کتبہ سازی کا فن عروج پر ہے
میرے لوگ اپنے مہ و سال گم کر چکے
یہاں صرف دھماکوں کے جنم دن منائے جاتے ہیں
میرے شاعر (سالگرہ کے کیک کے روبرو)
حالت سجدہ میں ہیں
میں جب دُور کھڑا
ان کی قصیدہ گوئی پر تین حرف بھیجتا ہوں
تو لوگ سر بازار میرا لباس نوچنے لگتے ہیں
میں اپنا ستر
لفظ کی چھال سے ڈھانپتا ہوں
مجھے دُنیا برہنہ نظر آنے لگتی ہے!
مجھے ایک المیے کا سامنا ہے
جس کے سامنے میری شاعری بے دست و پا ہے
قصیدہ گووں نے اپنے شعروں میں
ہارن لگوا لیے ہیں
اور اُن کے ہاتھ شاعری کے
گریبان کی طرف بڑھ رہے ہیں!
میں گمشدہ رشتوں کی تلاش میں ہوں
میری سماعت، تخلیقی آلودگی کا دکھ سہتی ہے
میرے دودھ میں، اندھیرا اُتر رہا ہے
میرے لوگ، خوشی اور آزادی گم کر بیٹھے ہیں
اور میرا ادب
خواب میں نجات ڈھونڈ رہا ہے!

جواز جعفری

میں جنگ کی بارات کا دولہا ہوں

جوانی،
میرے معصوم بچوں کا فطری حق ہے
جنگ مجھ سے
میری عمر کا ایک حصہ مانگتی ہے
میری کمر کے مقدر میں کمان ہونا نہیں لکھا!
موت، میرے سینے میں گھونسلا بناتی ہے
اور خوف
میری ہڈیوں کا مسافر ہے!
یہ میرے گرم ہاتھ
جو کبھی میری محبوب عورتوں کی بوسہ گاہ تھے
موت ان پر نشان لگاتی ہے!
کاش میں مرنے سے قبل اپنی بوڑھی ماں کو
اپنی گود میں بھر سکتا
بنسی کی موت پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں!
میں جنگ کی بارات کا دولہا ہوں
تابکاری میری اداس آنکھوں میں سُرمہ لگائے گی
اور اُسی لمحے زندگی میرے رُخسار پر بُجھ جائے گی
میرے جوتے
کیچڑ میں اوندھے منہ سوئیں گے
اور میری قمیص کے چیتھڑے
کسی ادھ جلے درخت کی برہنگی ڈھانپیں گے!

روش ندیم

مکھیوں کو ناشتے میں ڈائنوسار کیوں دیتے ہو

"انقلاب ابھی دودھ پیتا بچہ ہے
اسے بڑا ہونے میں وقت لگے گا
ہمارے پاس اتنا وقت نہیں
ہم ہر روز
بھوک اور ذلت کی میخوں پر
اپنا آپ رگڑنے کے لئے مجبور کیے جاتے ہیں
ہم تاریخ کی کروٹ کا انتظار نہیں کر سکتے
ہم ہر چیز جلا کر راکھ کر دیں گے"
میں نے تقریر ختم کی
تو ہر طرف خاموشی چھا گئی
اچانک ایک بوڑھا
قہقہہ لگاتے ہوئے اٹھا
اور ماں کی بڑی سی گالی دے کر
کہنے لگا
"کامریڈ تمھاری پتلون کی زپ کھلی ہے"!!

انجلاء ہمیش

بنتِ داستاں

کہیں کوئی احساس چھو گیا
صدیوں سے جما ہوا خون رسنے لگا ہے
مگر جو درد پنپ رہا ہے اسے اپنے اندر سمیٹ لو
کہ خاموش جذبوں کی کوئی کہانی نہیں ہوتی
ریت سے بھری آنکھوں میں سمندر کیسے اترے
جس سفر پہ تم نکلی ہو اس کی کوئی حد نہیں
کوئی سمت نہیں
دیکھنا
اپنے آپ کو تلاش کرتے کرتے کہیں کھو نہ جاؤ
ایسا سوال کیوں پوچھتی ہو
جس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں

کبھی سجدے میں گر کے خدا سے وہ داستاں ضرور مانگنا
جو ادھوری رہ گئی تھی
جو کائنات کی اندھیر نگری میں کھو گئی تھی
سنا ہے تمہاری داستاں کو راستہ دکھانے والا
خضر بھی کہیں بھٹک گیا ہے

ڈاکٹر شبنم عشائی

پھر کوئی سفر......

آنسو بہا دوں
کہ نظم لکھوں؟
آنسو کھنگالیں گے
من کو!
نظم بہلائے گی
دل کو!
ڈھل جاؤں
کہ بہل جاؤں؟
......نہیں تو نراشا
میرے پیروں میں
پازیب توڑ کر
پھر کوئی سفر
باندھ دے گی!

فہیم شناس کاظمی

میں پھر تنہا رہ گیا

میں سمندر سے دوستی کے لیے
بارش کی سفارش لایا
سمندر بانہیں پھیلا کر، بے تابی سے بڑھا
بارش اس کی بانہوں میں سماگئی
اور میں پھر تنہا رہ گیا

یامین

خواب کی بات

چراغ
دیر سے جلتے تھے
اور تیری باتوں سے شام بھر جاتی تھی
جیسے سمندر کی نیلی وسعت پر
پرندہ،
پر کھولتا ہے
تو آسمان اس کی اُڑان سے
بھر جاتا ہے
رات کی رات
میرے خواب گنجان ہو جاتے تھے
پھر ایک اور
خالی دن کا
سناٹا، بجنے لگتا تھا

ڈاکٹر رخشندہ پروین

Reality Check

کیا مجھ سے لفظ کھو گئے ہیں؟
مجھ سے اکثر کام
وہ کام جو بہت عام سے دکھتے ہیں
اور عام سے لوگ کرتے ہیں، نہیں ہوتے
مجھ سے اکثر چیزیں کھو جاتی ہیں
میں نے کئی برسوں سے نظم نہیں کہی
مجھ پر اب لفظوں کا، خیالوں کا، خوابوں کا
موسم نہیں آتا
یاد نہیں آخری بار کب
کھلکھلا کر بے ساختہ ہنسی تھی
پلاسٹک مسکراہٹ کی بجائے سچی مسکان
میں اکثر سوچنا شروع کر دیتی ہوں
کیا میں زندہ ہوں؟
میں جو کچھ کرتی ہوں
کیا وہی کچھ کرنا چاہتی ہوں؟
میری زندگی
کسی ریموٹ کنٹرول کے تحت تو نہیں ہو گئی؟
میں Pragmatic ہوں
میں عقل مند ہوں
زیادہ دیر تک ایسی باتیں نہیں سوچتی
ایسی باتیں سوچتے رہنے سے
آدمی شاعر یا فلاسفر بن جاتا ہے اور اس کے
بے روزگار ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے!

ڈاکٹر رخشندہ پروین

جگنو کیسے ہوتے ہیں؟

مجھے جگنو اچھے لگتے تھے
میں اپنی بیٹی کو جگنو کہہ کر بلاتی تھی
میری بیٹی حیران ہوتی تھی
پوچھتی تھی
جگنو کیا ہوتا ہے؟
میں جواب دیتی تھی
جگنو بہت پیارا ہوتا ہے
جب بے تحاشہ اندھیرا ہوتا ہے
وہ تب بھی چمکتا ہے

رات ٹی وی پر ہم ماں بیٹی نے
دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو
دنیا کی ایک بہت ہی چھوٹی ریاست کو
اس کے نہتے عوام کو
''آزادی'' دلانے کا عمل براہ راست دیکھا
رات کی سفاک تاریکی میں
چمکتے ہوئے، جگمگاتے ہوئے بے باک بم
عورتوں پر، بچوں پر، بوڑھوں پر، جوانوں پر
گرتے ہوئے گرجتے ہوئے ہولناک بم
یہ ہم ماں بیٹی نے دیکھا
میری بیٹی خوشی سے چلائی
امی دیکھو! اتنے سارے جگنو
آہا مجھے پتہ چل گیا جگنو کیسے ہوتے ہیں
آہ! مجھے بھی پتہ چل گیا
اب کے جو نسل جوان ہو گی
وہ جگنو کیسے جانے گی!

حقیقت

میں جب تک
اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں
اپنے کانوں سے سن سکوں
اپنی زبان سے بول سکوں
اپنے ذہن سے سوچ سکوں
اپنے قلم سے لکھ سکوں
میرا نام
تباہی پھیلانے والوں ہتھیاروں
کی فہرست میں رہے گا!

اے مُطرب......!

اے مُطرب......
آج کی رات سازِ رفتہ چھیڑ
یوں جیسے دعائے کرب
بے اختیار آسماں کو اٹھتی ہے
کسی بھولی ہوئی راگنی کا لہریا
گرفتِ دل و جاں میں مدغم ہوتا ہے
آج بتا کہ محبت کیا شے ہے؟
عشق فتنہ انگیز تر کیوں زِ حیات میں
ہر کسی کے لئے مختلف کیوں ہے؟
حیاتِ جاوداں کس کو ملتی ہے؟
فنا کے دروازے کدھر کو کھلتے ہیں؟
یوں ساز و آواز کا جادو جگا
کہ دل کی رگوں میں منجمد رنج و محن نابود ہو جائے
وہ سوز جاگے جو اپنی تاثیر میں
زمزمۂ موت کو بھی شُغل کر دے!

خواب

رات پھر ایک خواب دیکھا
ترے اطراف
کسی بیگانے وصل کے بے باس پھول تھے
اور پہلو میں میری یاد کے ہمشکل کانٹے
تو کانٹوں پہ ہتھیلی رکھ کے
دل کے لہو سے ریکھاؤں کو دھوتا تھا
شاخِ غم کو والہانہ چومتا تھا
بہت دور پُرشکوہ ایوانوں سے لپٹ کے
اک بیقرار روح بین کرتی تھی
سر پٹختی تھی خاک ملتی تھی
درمیان وقت کا پُرشور سمندر
دیوہیکل نہنگ کی طرح
اپنے جبڑے کھولتا، بند کرتا تھا!!

فرحان حنیف

مونالیزا

تم کون تھیں؟
کیا تھیں؟؟
کب تھیں؟؟؟
مجھے کچھ نہیں معلوم
اُن کو بھی کچھ نہیں معلوم
جو بھاری قیمتیں دے کر
تمہیں مجھ سے خریدتے ہیں
تم کیا واقعی خوبصورت ہو؟
لیکن تمہارا شکریہ
کہ
تمہارے ذریعے
مجھے
دو وقت کی روٹی ملتی ہے

فرحت سپنا

ایک گزارش

اے صلاح الدین پرویز!
آپ نے اپنی گزارش پیش کی
محی الدین ابن عربی کو
کیونکہ
آپ ان کو جاننے والوں میں سے ہیں
لیکن
میں کس کے آگے سیس نواؤں
کس کے آگے کشکول پھیلاؤں

اے صلاح الدین پرویز!
میرے من تک کوئی سیڑھی نہیں جاتی
آپ اپنے حرفوں کی سیڑھی بنائیں
اور میرے من کی
تاریک گھپاؤں میں اتریں
اور کوئی ایک شمع جلائیں آگہی کی
اور میرے تن کو جواز فراہم کریں
اس کے ہونے کا
مجھ کو میرا وجود لوٹا دیں
اے صلاح الدین پرویز!

روبینہ راجہ

میں اب ویسی نہیں ہوں

میں جیسی بچپن میں تھی
ویسی اب نہیں ہوں
میں اپنے دل کا
گمشدہ گوشہ ہوں
جسے میں نے خود چرایا
پھر اُسے وقت کی بلندی سے
نیچے پھینک دیا
اب دل کے کہنے پر
اُسے ڈھونڈ رہی ہوں
میں جیسی بچپن میں تھی
ویسی اب نہیں ہوں
زندگی میرے منہ میں
سوکھی روٹی کا نوالہ ہے
بے مزہ اور ضروری
میں اس کے لئے ایک
ذائقہ چرانا چاہتی ہوں
میں جیسی بچپن میں تھی
ویسی اب نہیں ہوں
میں بچپن میں چور نہیں تھی
اب ہوں......!!

وہ اور میں

اُسے بھی
پہاڑ پر رہنا اچھا لگتا ہے،
مجھے بھی
گہرے بادل اوڑھنا اچھا لگتا ہے
اُسے بھی
ڈھلوانوں سے لڑھکتی دھوپ اچھی لگتی ہے
مجھے بھی
چائے اچھی لگتی ہے
اُسے بھی
مکئی کی روٹی اور ساگ اچھا لگتا ہے
مجھے بھی
راتوں کو جاگتے رہنا اچھا لگتا ہے
اُسے بھی
اونچی آواز میں شعر پڑھتے رہنا اچھا لگتا ہے
مجھے بھی
میلوں پیدل چلنا اچھا لگتا ہے
اُسے بھی
مہمان اچھے لگتے ہیں
مجھے بھی
خدا اچھا لگتا ہے
اُسے بھی
مجھ سے نفرت ہے
اور مجھے بھی !!

نصیر احمد ناصر

عظیم روحیں معمولی جسموں میں رہتی ہیں

چیزوں کو
کسی بھی سمت،
کسی بھی زاویے سے دیکھیں
وہ اپنی ہیئت اور ماہیت سے
باہر دکھائی نہیں دیتیں
البتہ
لوگوں کی بات اور ہے
ایک طرف سے عظیم الجثہ دکھائی دینے والے
کسی دوسرے رخ سے
انتہائی چھوٹے نظر آتے ہیں
اور بعض اوقات
معمولی جسموں کے بھیتر
عظیم روحوں کے مساکن ہوتے ہیں!

میرے لئے خواب کون دیکھے گا؟

میں تمہارے لئے
بہترین زندگی
اور اپنے لئے
ایک خوبصورت موت کے خواب دیکھتا ہوں!!

ساحلی عورتوں کے نام

سمندر تمہارے اندر ہے
اور تمہاری آنکھیں وہ کھڑکیاں ہیں
جہاں سے تم نظارہ کر سکتی ہو
اپنے ساحلوں کا
اور دیکھ سکتی ہو
اپنی کشتیاں
مستولوں سے لپٹے بادبان
چٹانوں سے ٹکراتی لہروں کی
غضب ناکیاں
اور اتھلے پانیوں میں
دم توڑتی وہیل مچھلیاں
بے شمار آبی پرندے
اور ایک جزیرہ
سیاحوں سے بھرا ہوا.....

خواب اور آنسو

خواب اور آنسو
جماہی لینے کے عرصے میں
آنکھوں سے پھسل کر
دل کی گہرائیوں میں جا گرتے ہیں!

نصیر احمد ناصر

آخری آدمی کا کلام

تم نہیں دیکھ سکتے
لیکن میں دیکھ سکتا ہوں
نیند کا سایہ
اور دھوپ کی پرچھائیں
اور قدیم پتھروں
اور درختوں کی چھال سے
برآمد ہوتی روحیں
اور سُن سکتا ہوں
ہوا کی سرگوشیاں
اور دروازے کھلنے کی آواز
اور آ جا سکتا ہوں
ان راستوں پر
جو تمہارے وجود کی اٹلس پر
کہیں دکھائی نہیں دیتے
تم نہیں جانتے
لیکن میں جانتا ہوں
کہ جب
کسی گزرے ہوئے خواب میں
واپس جانے کا وقت قریب ہو
تو عقبی صداؤں کی
بے آواز لے تیز ہو جاتی ہے!

نئے گوتم کا اُپدیش

دکھ ڈائری میں نہیں لکھا جا سکتا
نہ کسی نظم میں ڈھالا جا سکتا ہے
اور نہ ہی نروان کے فاقوں میں
شانتی مل سکتی ہے
تاریخ تھک کر ٹھہر گئی ہے
اور دنیا
نئی صدی میں داخل ہو چکی ہے
ایک بار پھر ملنے کے لیے
ہمیں ایک طویل خواب ترتیب دینا ہو گا!

جب تم مجھے ڈھونڈنے آؤ گے

جب تم مجھے ڈھونڈنے آؤ گے
تو میں
یہیں کہیں ہوں گا
راتوں اور دنوں کے درمیان
پگڈنڈیوں کے آس پاس
پھولوں کی کیاریوں میں
گھاس کی پتیوں میں
یا کسی تازہ بنی ہوئی
قبر کی نرم بھربھری مٹی میں!!

جے وی فوش (۱۹۸۷ء-۱۸۹۳) کو کیٹلونیا کی شاعری کا عظیم جهت نماقومی شاعر مانا جاتا هے۔ ۱۹۸۵ء میں اسے اسپین کے اعلیٰ ترین ادبی اعزاز سے نوازا گیا۔ جے وی فوش کی شاعری اعلیٰ تخلیقی اٹھان کے ساتھ ساتھ عظیم تجرباتی اور مشاهداتی عکسوں پر مبنی هے جو اس کی دھرتی کی کوکھ سے جنم لیتے هیں اور دیوارِ خیال پر جگمگاتے هیں۔ اس میں میڈیٹیرینئین خطے کی فکری اور ثقافتی روح کے ساتھ ساتھ خوابوں اور ماقبل تاریخ کی طلسماتی کائنات کی بھی عکاسی هے۔ وہ ایسا شاعر هے جو بیك وقت جدید ترین بھی هے اور قدیم ترین بھی۔ اس کے لئے کہا جاتا هے که وہ کسی بھی وقت کچھ بھی لکھ سکتا هے۔ وہ شعور کے ساتھ لاشعوری کائنات کا بھی متلاشی تھا۔ اس کی چند شاهکار نظموں کے انگریزی سے اردو میں تراجم سندھ کے ماهر سوشیالوجسٹ، سندھی ادبی سنگت نواب شاہ کے سیکرٹری جنرل ممتاز دانشور جناب سارنگ سهتو نے ترجمه کے فنی لوازم اور زبان و بیان کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے هوئے کئے هیں جو ''تسطیر'' کے لئے حاضر هیں۔

(فهیم شناس کاظمی)

نظمیں: جے وی فوش

ترجمہ: سارنگ سهتو

(۱) جب مَیں سوتا ہوں تو صاف دیکھتا ہوں

جب بارش ہوتی ہے
مَیں تنہا رقص کرتا ہوں
کائی کی طرح......
سونے کا رنگ اور مچھلی کی کھال پہن کر
یہاں پر ایک سمندر ہے
اور ایک نارنجی آسماں
ہوا میں اُڑتا ایک پرندہ
نئی شاخیں نکالتا ایک پودا
سمندری قزاقوں کی پرانی پناہ گاہ
جہاں اب بڑا سا سورج مکھی ہے
جب بھی بارش ہوتی ہے
مَیں تنہا رقص کرتا ہوں
رقص کرتا ہوں اور ہنستا ہوں
جب مَیں ہنستا ہوں تو کبڑا نظر آتا ہوں
ٹوٹے ہوئے فرش پہ جھکے ستون کی طرح
مَیں بوڑھے آدمی کا سا لباس پہنتا ہوں
مالکِ مکان کی خوبرو بیوی کا تعاقب کرتا ہوں

چیڑ اور شاہ بلوط کی طرح
اپنا پرچم لہراتا ہوں
اور سوئی کی نوک سے قتل کرتا ہوں
اس بھوت کو........
جس کا میں نے کبھی نام نہیں سنا
جب میں سوتا ہوں تو صاف دیکھتا ہوں
دونوں ہاتھوں میں موتی سجائے
میٹھے زہر کے نشے میں مدہوش
میں سمندر کی کھاری جھاگ کے دل میں رہتا ہوں
یا میں چشمہ ہوں
جو پہاڑ کے کہیں اندر سے پھوٹتا ہوں
یا کسی جنگلی جانور کی کھال ہوں
یا گھٹتا ہوا چاند
پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر
جیسے وہ مرتا ہے
جب میں سوتا ہوں تو صاف دیکھتا ہوں

(۲) سرحدیں

شعلوں میں گھری
شاہراہ سے گزرتے ہوئے
سرحد عبور کرتے ہوئے
میں نے محسوس کیا کہ سامنے کچھ بھی نہیں ہے
قدیم آسمان کا لامحدود سلسلہ
مدھم سی ٹمٹماتی قندیل
جس کا عکس دیوار پر لرزاں ہے
کوئی ہاتھ مجھے روکتا ہے
لیکن میں آگے بڑھتا جاتا ہوں
ایک سرد ہاتھ........
ایک کرخت آواز........
قدیم اوس میں بھیگی ایک کرخت آواز گونجتی ہے
"تم ہی اس تمام خونریزی کے ذمہ دار ہو"
اور میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں
تصور میں اپنی موت کا نظارہ کرتا ہوں
اپنے آبائی ملک کے
سارے سامان کو سارے سامان کو
پیچھے برف پر چھوڑ کر
اپنے قدموں کے نشانوں کے ساتھ
آگے نکل جاتا ہوں

(۳) تنہا ماتمی لباس میں

قدیم ماتمی لباس میں.......... تنہا
میں خود کو اکثر
تاریک تنہائیوں........ انجان چراگاہوں
چالاکی سے راستہ روکنے والے
گردابوں میں محسوس کرتا ہوں
میں خود سے پوچھتا ہوں
میں کون ہوں..........؟
کسی بوڑھی زمین کے لئے
کسی مردہ سمندر کے لئے
یا کسی گونگی چراگاہ کے لئے
کیا تم کسی پاگل کی طرح یہ امید رکھتے ہو
کہ میں کہوں

کسی معجزاتی اجنبی ستارے کے پیچھے
تھکے قدموں سے مسلسل رواں ہوں
میں اپنی تنہائی میں لافانی ہو جاتا ہوں
میرے سامنے
ہزاروں سال ماقبل کی تاریخ کا نظارہ روشن ہے
جہاں حیرت، حیرت نہیں ہے
وہاں میں خود کو نوزائیدہ دیکھتا ہوں
اجاڑ بیابان میں
یا کسی برفانی چوٹی پر
مجھ پر منکشف ہوتا ہے
کہ میں پہلے بھی یہاں آوارہ گردی کر چکا ہوں
اور اسی سے
خدا کا جال
یا شیطان کا فریب
مجھے دوبارہ جکڑ لیتا ہے

(۴) ایک آوارہ فنکار کی یادداشت

اندھیرے میں
ادھ کھلا گلاب ہے
صحرائی راستے کے ساتھ پام کا تنہا درخت ہے
سمندر ایک آسمان میں مقید ہے
ان عکسوں پر
منافع میں بدلتے ہوئے دل پر
میں دوبارہ سوچتا ہوں

کہ اگر تم ہو
تو میں بھی ہوں
مردہ شام میں جلے ہوئے درخت
نشے میں مدہوش دروازے کی دستک
رات کے سناٹے میں
پیار کی سسکیاں
میں دوبارہ کچھ کہنا چاہتا ہوں
لیکن الفاظ ماند پڑ جاتے ہیں
میرا خالی سینہ دھڑکنے لگتا ہے
صبح صادق میں ڈوبتا ہوا آخری ستارہ
سرمئی شام میں
بچوں کی آوازیں
جنگل میں
درختوں کے کٹنے کی آوازیں
نام اور گھر کو بھولتے ہوئے
میں منجمد زمانوں کے راستوں پر نکل پڑتا ہوں
اور خود سے بھی
اجنبی ہو جاتا ہوں

پنجابی نظم: **سارا شگفتہ**

ترجمہ: **فہیم شناس کاظمی**

وہ کہتا تھا

میری ویرانیوں نے
صبر کو عریاں کر دیا
دکھ کے چشمے پر
آدمی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا
میں گنتی رہتی ہوں انھیں
جدا جدا ہیں میرے ہاتھ
شام مٹی سے کھیلتی ہے
میں نیت کی چھاؤں سے ڈرتی ہوں
اور دیواروں پر بھی پردے ڈالتی ہوں
آنکھوں کو بھوک لگی
تو سورج میں سارے پرندے مر گئے
میں ہاتھوں سے گونگی ہوں
سلام کی ردا میرے گھر تخلیق نہیں ہوئی
مٹی مجھ سے کلام نہیں کرتی
لہروں نے پتھروں پر اپنی زبانیں رکھ دیں
میں نے مٹی میں ستارے قید کئے
تو مقدر کے سارے پھولے جل گئے
میں مٹی چھانتی چھانتی بے زمین رہ گئی
میں نے سارے دریا لپیٹ دیئے
سمندر میرا جھوٹ رہ گیا
چراغ کی صبح دیکھنی ہو تو
رات کو دکھ کی چٹیاں لگاؤ
رات چاندنی کی جھانجھر پہن کر
اس کا نام پوچھتی ہے........
جو کہتا تھا........
نام لینے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے
پتھر مانگنے سے ہاتھ اندھے ہو جاتے ہیں
اور آنکھیں جنگل مانگنے لگتی ہیں

پروفیسر آفاق صدیقی

شیخ ایاز کی شخصیت اور شاعری کے کچھ نقوش

کسی زمانے میں شکار پور سندھ کا پیرس تھا اور یہ زمانہ وہی ہے جب شیخ ایاز نے وہاں جنم لیا تھا۔ خطۂ مردم خیز، تہذیبی و ثقافتی حسن و جمال سے نشاط انگیز اور شعر و نغمہ سے ترنم ریز۔ جس ہونہار بالک نے ایسے رومانی ماحول میں آنکھ کھولی ہو وہ اگر اپنی خداداد صلاحیت سے بچپن ہی میں واقعی شاعر بن جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ''ذات نہ آہی ذات جو وہی سو جھی'' (جوہر قابل کسی کی ذات نہیں جو کوشش کرے سو کامیاب ہو) حضرت شاہ لطیف بھٹائی کا یہ قولِ زریں شیخ ایاز پر صادق آتا ہے۔ اس کے جوہر قابل اور نابغہء روزگار شخصیت نے نوجوانی کے دنوں ہی میں شاعری اور افسانہ نگاری کی تخلیقی لگن کا کچھ ایسا جادو جگایا کہ شہرت و مقبولیت میں نو بہ نو اضافہ ہوتا رہا اور پھر اس کی شخصیت کا وہ روپ سروپ بھی زمانے نے دیکھا کہ جو بات فرانس میں سارترے کے لیے کہی گئی تھی کہ ''سارترے فرانس ہے اور فرانس سارترے'' ویسے ہی ''ایاز سندھ اور سندھ ایاز''۔ یہ اس شیخ ایاز کا ذکر ہے جس نے 'سفید وحشی' جیسے افسانے لکھے اور 'باغی' جیسے گیت۔ وہ بھی ایسے دور میں جب دوسری عالمی جنگ شباب پر تھی اور برطانوی سامراج کا نقطہء عروج۔

۴۷ء سے پہلے کا وہی پر آشوب دور تھا۔ ترقی پسندی کی ہمہ گیریت اور تحریک آزادی کی ہمہ جہت سیاسی حسیت کا دور جس میں ایاز کے انقلابی نغموں کی گونج نے سندھی زبان و ادب کے ممتاز پارکھ پروفیسر ایم۔ یو ملکانی سے خراج تحسین ان الفاظ میں وصول کیا۔

"Sheikh Ayaz is the Youngest fire brand of ndhi Poetry"

اور پھر حسام الدین راشدی نے ایاز کو نئی راہیں اور نئے ادبی مضامین تلاش کرنے والا شاعر قرار دیا۔ ہر چند کہ ایاز کی ولولہ انگیز انقلابی شاعری کا وہ ابتدائی زمانہ صرف چند برسوں پر محیط رہا کیونکہ ۴۷ء میں ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ آبادی کا تبادلہ، خون خرابا، ظلم و تشدد، جبر و ستم، لوٹ مار اور آتش افروز ہنگامے، انھی ہنگاموں میں ایک نئی مملکت کا قیام اور کراچی میں ایاز کے حصول تعلیم کا اختتام۔ بہت سے اہل قلم دوستوں کی جدائی، اپنی تنگ دستی اور معاشی تنگ و دو، عشق میں ناکامی کا شدید ردعمل اور نئی سحر پر بھی شب گزیدگی کے روح فرسا آثار، ان تمام عوامل نے ایاز کو ہنگامی طور پر سندھی شعر و ادب سے بے نیاز سا کر دیا مگر فارسی، انگریزی اور اردو میں مطالعہء ادب کی جوت جاگتی رہی۔ حلقہ ارباب ذوق کراچی کی نشستوں کے لیے دو ڈھائی برسوں میں جو آزاد اور مقفیٰ شعری تخلیقات وجود میں آئیں ان پر رومانیت اور وجودیت کے فلسفے کی چھاپ گہری نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں تصوف کی کوئی لہر اٹھتی ہے۔ کہیں نراجیت اور قنوطیت کا گماں ہوتا ہے اور کہیں ساری تنگ و دو کو گہوارۂ خامشی میں سلا دینے کی خواہش جاگتی ہے۔ گویا سیاسی، معاشی اور معاشرتی تضادات و فسادات کا وہ زمانہ ایاز کے لیے

"پراگندہ روزی پراگندہ دل" کی کرب ناکیاں لایا تھا۔

۱۹۵۰ء میں ایاز نے کراچی کو خیر باد کہہ کر اپنے رفیق دیرینہ شیخ عبدالرزاق راز کی دعوت پر سکھر میں رہائش اختیار کی اور وکالت کا باقاعدہ آغاز کیا جو دیکھتے ہی دیکھتے خوب چمکی۔

میں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء ہی میں سکھر سوشارو کو اپنا لیا تھا۔ مولائی شیدائی، شیخ راز، رشید بھٹی، مقبول صدیقی، خالد علیگ، علی احمد بروہی، حسن حمیدی اور کئی دوسری علمی و ادبی شخصیات سے وہیں ملاقاتیں ہوئیں اور دوستوں کی معاونت سے پیر حسام الدین راشدی کے مشورے پر اپریل ۱۹۵۰ء میں ہم نے دوروزہ سندھی اردو کانفرنس منعقد کر ڈالی۔ پھر شیخ ایاز بھی سکھر اور خیر پور کے اس کاروان ادب میں شامل ہو گئے جو پورے سندھ پر چھایا ہوا تھا۔ ایاز کو ہم نے اپنا ادبی قائد بنا لیا۔ اور ۱۹۵۱ء میں ماہ نامہ "کوھئن" کا اجرا کیا جس کے پہلے شمارے میں وہ نظم شامل اشاعت ہوئی جو اس وقت پیش کر رہا ہوں۔ "رفیقو اپنی مشعلیں ڈھونڈ لاؤ"

سحر ہوگئی، زندگی سوگئی
الجھنے لگیں مشعلیں آندھیوں سے
عزم خیبر شکن، آہنی جان و تن
سلجھنے لگی کاکل شب رفیقو!
پنجہ خواب میں موم سے ہوگئے
مگر جب رفیقو!
مگر یہ تو دستور روز ازل ہے
مشعلیں بجھ گئیں، پاسباں سو گئے
شب و روز اک دوسرے کا تعاقب کریں گے
اور نوع بشر کو یقیں ہو گیا ہے
رفیقو اپنی مشعلیں ڈھونڈ لاؤ
کہ نور سحر تا ابد یونہی رخشاں رہے گا
شب تیرہ و تار سوئے زمیں پھر پر افشاں ہوئی ہے

سکھر کے سندھ ادبی سرکل کی باقاعدہ تنقیدی نشستیں ہوتی رہیں اور ایاز کی تازہ بتازہ شعری تخلیقات میں اپنے طور پر جمع کرتا رہا "عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں"۔ ہاں مجھے ایاز سے یہ برابر شکایت رہی کہ سندھی شاعری سے کنارہ کش ہو کر صرف اردو شاعری کیوں؟ جب بھی میں نے روزانہ کی ملاقاتوں میں یہ بات کہی ایاز کی طرف سے یہی جواب ملا "میری سندھی شاعری اب کون سنے گا؟" میں اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اور وہ سندھی شعری تخلیقات جو ۵۱ء سے پہلے کی تھیں ان کے منظوم ترجمے کا بیڑا اٹھایا۔ مختلف جریدوں میں ان کی اشاعت ہوئی اور میں نے نہ صرف ایاز کے ابتدائی دور کی شاعری بلکہ افسانہ نگاری پر رسالوں اور اخباروں کے لیے مضامین بھی لکھے جن کو عنقریب 'ایاز کہانی' میں پیش کر رہا ہوں۔

۵۳ء میں ہم نے ایاز کی سربراہی میں سندھ ادبی کانفرنس سکھر کا انعقاد کیا جس میں پورے پاکستان سے تمام زبانوں کے اہل ادب شریک ہوئے بلکہ بھارت کے مندوبین بھی آئے اور اس طرح ایاز کی ادبی شہرت و مقبولیت برصغیر کے ادبی حلقوں تک پہنچی۔ ۵۴ء میں ہم نے سندھ ادبی سرکل کی جانب سے شیخ ایاز کی شاعری کا پہلا اردو مجموعہ کلام 'بوئے گل نالہ دل' شائع کیا جس میں وہ منظوم تراجم بھی شامل اشاعت ہوئے جو میں نے کئے تھے اور بھرپور پیش لفظ و تعارف بھی لکھا تھا۔

وہ زمانہ ایاز کی معاشی خوشحالی کا زمانہ تھا۔ زندگی ایک 'رقاصہ، روز و شب' بن کر اس کے سامنے

'نوکِ خنجر پر رقص کناں رہی لیکن وہ عالمِ وارفتگی میں اپنی رُوح کی راگنی کے ارتعاشِ سرمدی میں گم ہوکر "بادلوں کی تہوں میں بھٹکتا ہوا شوقِ وارفتہ" بن گیا۔ اُن دنوں ایاز کا کہنا تھا "زندگی میں میرے لیے دو چیزیں سب سے زیادہ پرکشش ہیں ایک اچھی کتاب ایک حسین صورت"۔ سرِ دست حسین صورتوں پر تبصرے سے گریز کرتے ہوئے یہ بتاتا چلوں کہ ایاز کو اپنی پسند کی اچھی کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا شوق جنوں کی حد تک تھا۔ شعر و ادب کی زیادہ تر کتابیں انگریزی اور اردو میں ہوتیں جن سے میرا بھی بھلا ہوتا۔ شام کے وقت جب ہم دونوں 'لبِ مہران' کی سیر کو جاتے تو ایاز کی سندھی، اردو اور انگریزی میں ملی جلی فلسفیانہ گفتگو بڑا مزا دیتی۔ مارکسی فلسفہ، حیات کے بعد ایاز کی شاعری پر گہرا رنگ کروچے کے فلسفہ، جمالیات، فرائیڈ کے فلسفہ، جنسیات اور فرانس کے وجودیت پسندوں کا تھا۔ مجموعی طور پر اس ابتدائی دور کی شاعری میں اکیلا مانجھی، ہرجائی بھنورا، تشنہ لب وحشی ہرن، چاند سے ہم آغوش ہونے کے لیے اڑتا پنچھی، نگر نگر اور ڈگر ڈگر گھومنے پھرنے والا تنہا راہی جیسی علامتیں واشارتیں زندگی کا مقصد یہ ظاہر کرتی ہیں۔

آرزوؤں کے پھول چن لینا — قصہ ہائے بہار سن لینا
پھر مہکتی ہوئی فضاؤں میں — سنتے سنتے مدام سو جانا
ہے یہی اختتام سو جانا

لاڑکانہ کے ہری دریانی دلگیر اور کامریڈ بخاری، دادو کے سوبھو گیان چندانی، جیک آباد کے عبد الکریم گدائی، نواب شاہ کے حیدر بخش جتوئی، حیدر آباد کے ابراہیم جویو اور کئی دوسرے ممتاز دانشوروں اور شاعروں کو ایاز کے خیالات سے اختلاف تھا۔ اکثر خوب بحث مباحثہ ہوتا۔ مگر ایاز کے طرزِ فکر اور طرزِ احساس میں سندھی ادبی بورڈ کے قیام اور سہ ماہی 'مہران' کے اجراء سے یہ تبدیلی آئی کہ بہت ڈوب کر سندھی کی کلاسیکی شاعری کے حوالے سے شاہ جو رسالو، سامی کے اشلوک اور سچل سائیں کے سندھی و سرائیکی کلام کو پڑھا اور بیت و وائی جیسی ہیئتوں میں بڑی والہانہ کیفیات کے ساتھ اپنی سندھی شاعری کو نئی زندگی دی۔ انہیں دنوں شاہ جو رسالو کا منظوم ترجمہ ہوا جس کی ایک الگ کہانی ہے مگر ایاز کی شاعری کو شاہ جو رسالو کے گہرے مطالعے سے جو ذخیرہ الفاظ ملا اسے سندھی شاعری میں ایاز نے نیا رنگ و آہنگ دیا۔ اس شاعری میں سندھڑی سے بے پناہ پیار کا جذبہ، سندھی زبان و ادب سے قلبی دل بستگی اور از سرِ نو ترقی پسند نظریات کی بازگشت کے عناصر نمایاں رہے۔ لیکن ایاز کے لہجے میں وہ گھن گرج اور شدت و حدت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ون یونٹ کے قیام اور سندھی زبان کی حق تلفیوں کے نتیجے میں ۵۸ء کے مارشل لاء سے ابھری اور اس کی شاعری اپنی نغمگی کے ساتھ ساتھ سیاسی بصیرت کا ایک عہد آفرین گنجینۂ معنی بن گئی۔ میں نے اس دور کے بیشتر گیتوں، دوہوں اور آزاد نظموں کو یکجا کر کے ان کا ترجمہ کیا تھا۔ جو کچھ طبع زاد تخلیقات کے ساتھ جویو صاحب نے ایاز کے تجویز کردہ نام 'کفِ گلفروش' کے نام سے چھپنے کو بھی دیا تھا مگر منظرِ عام پر نہ آسکا اور بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔

۱۹۵۹ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا تو شیخ ایاز کو مرکزی عاملہ کا رکن بنایا گیا اور میرے حصے میں سب ریجنل سیکرٹری شپ آئی۔ ۶۱ء اور پھر ۶۴ء میں ہم نے جو یادگار رائٹرز کونشن منعقد کیے

ان کا اثر یہ ہوا کہ ایاز کی شاعری کے ترجمے پنجابی، پشتو، بنگالی، بلوچی اور ہندی میں ہونے لگے۔ شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوا تو حاسدوں، بدخواہوں اور نظری و فکری حریفوں کی تعداد بھی بڑھی مگر اس تعداد کے مقابلے میں شیدائیوں کی تعداد کہیں زیادہ رہی۔ انہی دنوں مرکزی گلڈ نے ایاز کی سندھی شاعری کا مجموعہ "پنور میری آ کاس" شائع کیا۔ جو انعام یافتہ بھی ہوا مگر ۶۵ء کی جنگ کے دنوں میں نظم "سنگرام" کی اشاعت قید و بند کا سبب بن گئی اور جبریت کا یہ سلسلہ ۷۲-۷۱ء تک چلتا رہا۔ ساہیوال جیل کی ڈائری اس کی گواہ ہے۔ نہ صرف پہلا مجموعہ بحق سرکار ضبط ہوا بلکہ شاعری اور نثر کی جو کتاب بھی آئی ضبط ہوئی۔ اخبارات میں غداری، ملک دشمنی اور دہریت کے کیسے کیسے الزام لگتے رہے لیکن ایاز کی شاعری میں کوئی جھول نہ آیا۔ اس کا مزاحمتی اور احتجاجی نعرہ تو ون یونٹ کے خلاف اور سندھ کے حقوق کی بحالی کے لیے تھا۔ یہ نعرہ مستانہ جیئے سندھ کی تحریک کا وہ نعرہ تھا جو سندھ کے کونے کونے میں گونجا اور ہزاروں لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ مخالفین نے برسر اقتدار جابروں کی سرپرستی میں مہاجر، پنجابی، پٹھان محاذ کا شوشہ چھوڑا۔ کراچی اور پورے سندھ میں لسانی تنازعات کی فتنہ انگیزی نے سر اٹھایا۔ ایاز کی مخالفت میں دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹرز چسپاں کیے گئے۔ طرح طرح کے مذموم ہینڈ بل اور اشتہارات تقسیم ہوئے۔ ایک انگریزی اخبار مسلسل ایاز دشمنی میں اداریے اور کالم چھاپتا رہا جس کے خلاف سکھر میں ہم نے گلڈ کی جانب سے عدالتی چارہ جوئی کی۔ پھر ایک اور نام نہاد مارشل لاء کے تحت ۷۰ء میں ایاز کو اسیر زنداں کر دیا گیا اور اس وقت رہائی ملی جب بھٹو صاحب برسر اقتدار آئے۔ وہ شیخ ایاز کی شخصیت اور شاعری کی قدر و منزلت سے واقف تھے۔ سکھر آئے تو سرکٹ ہاؤس میں اہل قلم اور مقامی صاحبان دانش کو عصرانے پر مدعو کیا۔ بطور خاص بڑی محبت سے ایاز کو محفل سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے اور آدھ گھنٹے کے بعد واپس لے آئے۔ تقریب کے بعد جب ایاز صاحب کی کار میں رشید بھٹی، شیخ راز اور میں دفتر کی طرف پلٹے تو یہ انکشاف ہوا کہ موصوف کو سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا جا رہا ہے۔

میں ان دنوں گورنمنٹ ماڈل کالج میر پور خاص سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اس لیے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ انھوں نے یہ چاہا کہ میں ان کے ساتھ رہوں اور سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آ جاؤں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اب اس سے آگے کا احوال ڈاکٹر غلام علی الانہ صاحب، سائیں غلام ربانی آگرو اور آپ سب پر چھوڑتا ہوں اور شاعری کی کچھ جھلکیاں دکھاتا ہوں، مثلاً سندھی سے ترجمہ کیے ہوئے دوہوں میں سے کچھ دوہے اور کچھ دیگر شعری تخلیقات:۔

ہیر جلی اور بجھ گیا رانجھا سارا جھنگ تباہ
راکھ میں اپنی کافی ڈھونڈے بیٹھا وارث شاہ

پاؤں ہوئے پنیوں کے اوجھل راکھ ہوا بھنبھور
ہائے سسی یہ تیرے ٹکڑے اور ہوا کا شور

سانجھ ہوئی پنچھی گھر لوٹے اور کبیرا روئے
اپنی اپنی جنم بھوم سے پریم سبھی کو ہوئے

مہک پون میں برکھا رت کی اور نہ گھنا گھنگھور
کہیں کہیں اب اجڑے تھر میں بول رہا ہے مور

''سامراجیوں سے''

اب بہت دن سے یہاں
شیر ہے کوئی نہ اس کی گھن گرج
یہ بھی کیا کم ہے کہ کوئی سہما سہما جاندار
بول اٹھتا ہے کہیں سے ناگہاں
ہاں کبھی تو یہ رُکے بادل برس ہی جائیں گے
اور گرجتی گونجتی مخلوق آندھی کی طرح
جس طرف بڑھنا ہے بڑھتی جائے گی
دیکھنا ان ناتواں ہاتھوں کے ہاتھ
توڑ دیں گے ہر کڑی زنجیر کو
جن میں ہے خوں ریز اشکوں کی قطار
ہوں گی وہ آنکھیں اچانک شعلہ بار
ان کی گہرائی کا اندازہ تمہیں ہو جائے گا
جب بھی اس خاموش سطح آب پر
کوئی طوفاں آئے گا
تم تو بہرے ہو مگر میں سن رہا ہوں آہٹیں
آہٹیں افتاں و خیزاں بجلیوں کی آہٹیں
تم تو اندھے ہو مگر میری نظر
دیکھتی ہے ان تڑپتی بجلیوں کو سر بسر
تیرگی کو اپنا کاشانہ بنائے
بیٹھے ہو انجان بن کر منہ چھپائے
وقت اک ایسا بھی آئے گا ضرور
رن میں جب ہوگا ہمارا سامنا
ہوگی پھر جنگی رتھوں کی ریل پیل
کامراں ہوں گے ہمارے حوصلے
پس کے رہ جاؤ گے تم گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے
جانتا ہوں اور میرا جاننا
ایک چنگاری کی جیسی آنچ ہے
لاوا بن کر پھیل جائے گی کبھی جو ہر طرف
جل اٹھے گا یہ جہانِ پر فریب
جو تمہارے ظلم کی تخلیق ہے
بس یقیں کر لو یہی انجام آخر کار ہے
جیت ہماری اور تمہاری ہار ہے
آگ کے شعلوں میں جب
راکھ ہو جاؤ گے تم
پھر سے یہ شعلے جنم دیں گے نئے انسان کو

مشعلِ امید

زندگی کے جال میں کتنی ہی خوشیاں اچانک آ گئیں
خوب ناچیں اور تڑپ کر مر گئیں
پیار کی کیا کیا امنگیں نت نئی خوشیوں میں تھیں
اس بھری دنیا کی ہر شے بے ثبات
موت سے بچ کر رہی ہے کس کی ذات
پھر بھی پیاری ہے ہمیں یہ کائنات
کون کہتا ہے کہ رنجیدہ رہو
ہر گھڑی ہے اک دفینہ
اس میں تم کرتے رہو انمول ہیروں کی تلاش
ہر غبار آلودہ شام اک نیا ریئے کی جھول ہے
نکلیں گے اس جھول سے
لاکھوں ستارے جگمگاتے جاگتے
سونے کے ذروں کی طرح
حسن استقلال سے اس وقت تک
لَو ہماری مشعل امید کی
اپنے سب ہمراہیوں کی راہ میں
نو بہ نو ہوتی رہے گی ضو فشاں!
(شیخ ایاز ..... سندھی سے ترجمہ، آفاق صدیقی)

نظمیں: شیخ ایاز
ترجمہ: فہیم شناس کاظمی

(۱) موت سے مکالمہ

موت.........
تُو کسی بھی لمحے
مجھے پروں سے ایسے پکڑ لے گی
جیسے بچے تتلیوں کو پکڑتے ہیں
اور تجھے یہ بھی خیال نہیں آئے گا
کہ نئی بسنت کھلی ہے
پھول کھل رہے ہیں
یہ چنبیلی کا موسم ہے

(۲) مَیں شمس تبریز نہیں ہوں

تم اتنی خوبصورت ہو
کہ میں تمھاری طرف
آنکھیں اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا
کیونکہ میں شمس تبریز نہیں ہوں
کہ سورج سے آنکھیں ملاؤں
تم کتنی ہی نیچے اُتر آؤ
جیسے سورج ندی میں اتر آتا ہے
مَیں تمھیں آنکھیں اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا
چاہے آنکھیں
ندی کی طرح چھلک رہی ہوں

(۳) مجھ میں تُو.......

جب انسان تنہا ہوتا ہے
وہ بالکل تنہا نہیں ہوتا
احساسِ تنہائی........ ہجوم میں ہوتا ہے
اور اپنا پن........ انبوہ میں گم ہو جاتا ہے
اپنا پن........ جس سے دوستی پائیدار ہے
جو اس زینے پر...... تمھارے ساتھ چڑھتا ہے
جو خدا کی سمت جاتا ہے
جہاں فرشتے
خوش آمدید کہنے کو منتظر ہوتے ہیں
اپنا پن........
جو شاعری پر
پیغمبری کی مُہر لگاتا ہے
اسے حیاتِ جاوید عطا کرتا ہے
اپنا پن........
خودی کا نہیں بے خودی کا بھائی ہے
تم کبھی اسے اپناؤ
پھر دیکھو کیسے اسرار کھلتے ہیں
جو آج تک تم سے اوجھل ہیں
مگر تم میں ہی پوشیدہ ہیں

نظمیں: نور الہدیٰ شاہ

ترجمہ: فہیم شناس کاظمی

(۱) شتیلا کیمپ "برج البراجنا"

مٹی گوندھ کر
اس سے روٹی کیوں نہیں پکائی جا سکتی

اب وہ.........
میرا گریبان پوری قوت سے پکڑ کر
چیختا ہے
تمھاری چھاتیاں بھی اب مٹی ہو گئی ہیں
ماں......... ان میں دودھ کیوں نہیں آتا
کیوں.........؟
بیٹا ہم مٹی ہی کی خاطر تو مر رہے ہیں
مگر مٹی پیٹ تو نہیں بھرتی ماں
ہونٹوں کو گیلا نہیں کرتی
اب تو چمگادڑیں بھی
ہمارے ہونٹوں کو دیکھتی ہیں
ایک شب.......
اس نے اپنی بانہیں
میرے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا
ماں.........
پیٹ بھرنے کے لئے.... جینے کے لئے
'کیا زندہ آدمی..... مردہ آدمی کا گوشت
نہیں کھا سکتا'
اس کے بعد
وہ اور بچوں سے جس لاش پر لڑا،
وہ اس کے والد کی لاش تھی
اس نے مجھ سے پوچھا.........ماں
بابا کے گوشت پر.........
سب سے پہلا حق میرا ہے ناں...

(۲) ایسا لگتا ہے

ایسا لگتا ہے
جیسے کچھ بھی نہیں بدلا
بس میرے اندر
کوئی کھڑکی بند ہو گئی ہے
ہوا ٹھہر گئی ہے
کچھ بھی تو نہیں بدلا
بس سارا نیل گگن سنسان ہو گیا ہے
سب ستارے گر گئے ہیں
اور سورج جل گیا ہے
ایسا لگتا ہے.........
جیسے خواب آنکھوں سے اڑ گئے ہیں
آشیانے خالی ہو گئے ہیں
میں نے خطوط کے ساتھ آنسو بھی جلا دیے ہیں
تنہائی کو
زہر کی طرح پی لیا ہے
جیسے میرا کمرہ
سراب ہی سراب ہے
کوئی قافلہ مجھے چھوڑ گیا ہے
میں کسی سے بچھڑ گئی ہوں
کوئی مجھ سے بچھڑ گیا ہے

نظمیں: **امر سندھو**

ترجمہ: **فہیم شناس کاظمی**

(۱) بکھرے آئینے کے عکس

تعبیریں
سورج ابھرنے کے بعد
کسی شہید کی بیوہ ماں کی طرح
نیند کی قبر پر تمہارونے آتی ہیں
خواب بے لباس ہو کر
خواہشوں کے تعاقب میں نکلے تو
وحشی بھیانک انگلیاں
خواہشوں، خوابوں اور وجود کے
پوسٹ مارٹم کے لئے
پاگل کتے کی طرح بپھر کر
کوٹ کی جیبوں سے باہر نکل آئیں
بچ جانے کے بعد میرے خواب
بیداری سے ہاتھ ملا کر
موت کی وادی کی سمت گم ہو گئے
آوازوں کے جنگل میں
قہقہے
واپسی کا راستہ گنوا بیٹھے اور
آوازیں
خوشبو کی انگلی پکڑ کر
تیز دھوپ میں
مرے وجود کی تلاش میں
آسمان کی سمت چلی گئیں
مجھے موت کا دکھ نہیں مارتا مگر
اُس انگلی کی وعدہ معاف گواہی مارتی ہے
جسے پکڑ کر میں نے چلنا سیکھا
جو انگلی مجھ پر
حملہ کرنے کے الزام سے بچی
غور کیا تو وہ میری تھی اور
مجھے یاد آیا کہ
میری انگلیاں
بچپن ہی میں کٹ گئی تھیں

(۲) نیند نہ کرنے کا دُکھ

میں نے اپنی کوکھ میں
دہکتے انگارے بھر لئے تھے
اور خوشبو
میرے وجود کو سنگسار کر کے
جلاوطن ہو گئی
اس دیس کی بکھری بکھری ہوائیں
جب منظم ہوتی ہیں
تو با آوازِ بلند
سورج کی حدت کو گالیاں دیتی ہیں
میں نے بولنے کی کوشش کی
تو آوازوں نے آکٹوپس بن کر
مجھ پر حملہ کر دیا
پھر بھی میں
موہن جودڑو کے بیل کو عنوان بنا کر

نظم لکھنا چاہتی ہوں
مگر
تجریدی نظمیں نیند بھگانے کے بجائے
میرے بستر پر سو کر خواب دیکھنا چاہتی ہیں
میں نے جب مسلسل جاگنے کا سبب ڈھونڈنا چاہا
تو پتہ چلا.......
میرے بچپن ہی میں
میری پاگل ماں نے
میری آنکھوں کی بھوئیں اور پلکیں
کسی کو خیرات میں دے دی تھیں
میں کبھی نہیں سوئی
مگر خواب میری آنکھوں میں
آشیانے بنا کر مسلسل سو رہے ہیں
ماں نے کہا تھا کہ
اگر تم سوئیں
تو تمھارے خواب بیدار ہو جائیں گے!

نظمیں: علی اظہار
ترجمہ: فہیم شناس کاظمی

(۱)

طوفان ہمارے دوست ہیں
جو ہمیں یاد دلاتے ہیں
ہمیں اپنے گھروں کو.......
کس طرح بچانا چاہیے

(۲)

راستے.........
جب تجھے مجھ سے علیٰحدہ دیکھتے ہیں
ان کی پیشانی پر
شکنیں ابھر آتی ہیں
اور لوگ کہتے ہیں
روڈ نیا بننا چاہیے

(۳)

لاحاصل عشق
لوبان کے دھوئیں جیسا ہوتا ہے
جس پر بھٹکتی روحیں مست ہوتی ہیں

(۴)

میں آج بھی سوچتا ہوں
وہ بہار میں آئی
یا
بہار اس کی وجہ سے آئی
مجھے معلوم نہیں ہو سکا

(۵)

محبت آزادی کا منشور ہے
مگر جنھیں ملتی ہے
وہ ہمیشہ کے لئے غلام ہو جاتے ہیں

(۶)

بے شک وقت تمام زخموں کا مرہم ہے
مگر ایسا کوئی مرہم نہیں
جو وقت کے گھاؤ بھر سکے

(۷)

ہم....... شرطوں میں جیتے ہوئے
اور
اپنے ہاتھوں ہارے ہوئے ہیں

(۸)

جو کنارے پر ڈوب جائیں
وہ......
لہروں کو عزیز کیسے ہو سکتے ہیں

(۹)

جو بے پروا ہو کر جیتے ہیں
دراصل.......
وہی جیتے ہیں

(۱۰)

محبت کو
ہونٹوں کی مسکراہٹ
اور آنکھوں میں
کسی حد تک چھپایا جا سکتا ہے
مگر نفرت کو
کسی بھی طرح چھپایا نہیں جا سکتا

نظم: **پشپا ولپ**
ترجمہ: **فہیم شناس کاظمی**

کولہن

میں پراچین سے کی کوئی ہستی ہوں
اور میرا دل موہن جو داڑو کی مورتی
میں وہ رقاصہ ہوں
جس کے نرت بھاؤ کو اٹھے ہاتھوں نے
دو سفید کبوتروں کی طرح اپنی چونچیں ملا رکھی ہیں
میری پائل کی آواز سے
مندر کی گھنٹیاں جاگتی ہیں
اور سورج آسمان سے چہرہ نکالتا ہے
جو دنیا کے لئے صبح کا پیامبر ہے
میں ہی لکشمی ہوں
میں ہی سرسوتی
میں ہی دُرگا
اور سچ پوچھو تو جبر کو تباہ کرنے والی
''کالی دیوی'' بھی میں ہی ہوں
جس کی پوجا صرف مندروں میں کی جاتی ہے
باہر تو میں
راستے کی دھول ہوں
آنکھ میں پڑا خس ہوں
رات کو..... صرف کالی چادر
اور دن میں صرف چولھا ہوں
سفید کپڑے اور پگڑ باندھے
کوٹ اور بوٹ پہنے مرد کے پیچھے
سر پر بھاری پوٹلی اٹھائے
رُخ پہ پلّو گرائے
برہنہ پا..... چلنے والی کولہن
حقیر معمولی کولہن ہوں

کولہن:
سندھ کے قدیم خانہ بدوش غیر مسلم قبیلے کی عورت

نظم: **امتیاز ابڑو**

ترجمہ: **فہیم شناس کاظمی**

وصیت نامہ

وصیت نامہ تیار ہے
جس میں انگور کے خوشے نہیں
ایک گرفتاری ہے
جو تقسیم کرنی ہے
ایک مہربانی ہے
ایک گم ہو جانے والے جزیرے کا درد ہے

یہ وصیت نامہ......
کسی شکست خوردہ وقت کا ہے
جو ہمارے شہر کے اغوا کے وقت غروب ہوا تھا
کسی جج کا ہے جس کے ہاتھ میں قلم تھا
مگر دستخط کسی دوسرے نے کئے
کسی کسبی کا ہے
جس کی آغوش میں روپے بھی تھے
اور دل بھی
جس کی زندگی
ایک مَس سے شروع ہوئی
اور ایک عضو پر ٹھہر گئی
یہ وصیت نامہ کسی کا بھی ہو سکتا ہے
اس سپاہی کا بھی
جو سیٹی بجانا بھول گیا
اور ایک محب شیدی* پیدا ہوا
اور ایک ڈاکٹر کا بھی
جس نے چھری اٹھائی
اور ایک افیمی کا جنم ہوا

یہ وصیت نامہ
بہت کچھ ہے...... یہ تم
اپنے بچوں کو ضرور پڑھاؤ
ورنہ وہ تم کو قتل کر دیں گے
اس میں ایک رات کا سفر ہے
جس میں تمام لوگ جاگ پڑے تھے
اپنی محبوباؤں کو بھی پڑھاؤ
اس میں ایک بچے کا ذکر ہے
جسے ایک کھلونا دینا ہے
اور یہ تم پر ہے
کہ اسے جو چاہو دو
ایک جھنجھنا............
یا چھوٹی سی توپ

*محب شیدی: سندھ کا ایک بدنام ڈاکو

نظم: **ارشاد کاظمی**

ترجمہ: **فہیم شناس کاظمی**

تمھاری جستجو......؟

تمھارے حصول کے لئے
کوئی بھی جنگ نہیں لڑی جائے گی
کوئی شہر بھی نہیں جلایا جائے گا
تم اور میں

جس رستے پر...... جس پارک میں
آخری بار ملیں گے
وہ رستہ...... وہ پارک دنیا کے
عجائبات میں شمار نہیں ہوگا
تم اور میں...... اگر مارے بھی گئے
تو ہمارے بدلے کے لئے
کسی نئے فرقے کا آغاز نہیں ہوگا
تاریخ کے اوراق میں
ہمارے ناموں کو
اتنی جگہ بھی نہیں ملے گی
جتنی کسی شہزادی کی کنیز کو
یا محل کے پہرے دار
کسی خواجہ سرا کو مل سکتی ہے

نظمیں: **ممتاز عباسی**
ترجمہ: **شاہد حنائی**

(۱)

تمھاری خوشی کی خاطر
میں دنیا بھر کی باتوں سے
دست بردار ہو کر جینے کی راہ
اختیار کر چکا ہوں
تمھاری خوشی کی خاطر
میں نے اپنے نفس کی بے جا خواہشوں کو
دھتکار کر
ہمیشہ کے لئے چپ کرا دیا ہے
تمھاری خوشی کی خاطر
میں نے اپنے آپ سے پیار کرنا
شروع کر دیا ہے

(۲)

اے دوست
دن کی روشنی کی باتیں
رات کے اندھیرے میں
دفن نہیں ہو سکتیں

(۳)

دن کے
اجالے میں
آیا مرد
رات کی تاریکی کو
جواب نہیں دینا پڑے گا

(۴)

تمھاری جستجو کی
رنگین دنیا میں
میں خود سے
بہت دور چلا گیا ہوں
جہاں
نہ اپنی طرف پلٹ سکتا ہوں
نہ ہی
تم تک پہنچ سکتا ہوں

تخلیق: سراج   ترجمہ: شاہد حنائی

آٹھواں آدمی

اس رات اسے الٹا لٹکایا گیا تھا۔ اس رات آسمان پر تھوہر اگ آئے تھے۔

چھت سے جھولتے، لوہے کی سلاخوں کے پار، برآمدے کے دروازے کی سمت اس کی زخمی نگاہوں میں آسمان کی صرف ایک تکون سما سکی تھی۔ آسمان جو آزاد تھا، مگر لہولہان محسوس ہوتا تھا۔ خون اس کی آنکھ کی پتلی میں جھلکنے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کے بوجھ سے بند ہونے لگی تھیں۔ اسے لگا آسمان پر تھوہر اگ آئے ہیں، جو اس کی آنکھوں، اس کی نگاہوں کو جلانے لگے تھے۔ آسمان کی یہ تکون اس کی آنکھوں میں اٹک کر رہ گئی تھی جس کے کونے بار بار کھنچتے اور پھر واپس اپنی جگہ چلے جاتے۔ اس مثلث میں کتنے تارے ہوں گے؟ اس نے سوچنا چاہا مگر یہ سوچ شروع ہونے میں برسوں گزر گئے۔ آسمان کی تکون پیچھے چلی گئی اور ترچھے کونوں سے تھوہر اس کی پتلیوں میں چبھنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اس تھوہر کو ہٹا دے۔ اس کی پلکیں اس تھوہر کا بوجھ اٹھانے کی تاب کھو چکی تھیں۔ اس نے چاہا کہ پلکیں گرا لے تاکہ اس تھوہر کی کرنیں اس کی پتلیوں میں نہ چبھ سکیں۔ مگر لہو کے بہاؤ نے اس کی پلکیں بند نہ ہونے دیں۔ اس لمحے اسے گمان گزرا جیسے اس کی آنکھیں بیراج ہوں اور اس کی پلکیں گیٹ جو لہو کے دریا کے سامنے بے بس تھے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جبڑوں میں لہو کا گھونٹ کھولنے لگا۔ کنپٹیوں میں نقارے بجنے لگے۔ اس کی داڑھی کے بال الٹ کر اس کے گالوں میں چبھنے لگے۔ مجھے سوچنا نہیں چاہیے، اس نے سوچا، ورنہ لہو بہنے لگے گا۔

آخر وہی ہوا۔ لہو اس کی ایک باچھ سے بہہ کر داڑھی سے ہوتا ہوا کچھ کنپٹی کے قریب بالوں میں پھیل گیا اور کچھ کان کی لو کے پیچھے سے قطرہ قطرہ فرش پر ٹپکنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا گرنے والا خون مستطیل شکل اختیار کر گیا۔ آسمان کی تکون اور غلام کا لہو مستطیل شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ سوچ، درد کی لہر بن کر آئی جو اس کے حلق اور لوؤں سے ہو کر اوپر چڑھنے لگی اور اس کے جبڑوں سے ہو کر دونوں شانوں کی ہڈیوں میں اٹک گئی۔ پھر وہاں سے تقسیم ہو گئی۔ اس کی ایک شاخ شانے کی ہڈیوں سے ہوتی ہوئی اس کے بازوؤں میں دھڑکنے لگی۔ سوچ اور درد کی یہ لہر لمحہ بہ لمحہ بھاری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کے بازوؤں کی رگیں اس بوجھ سے یک بہ یک ٹوٹ جائیں گی۔ درد کی یہ شاخ اس کی کہنیوں، کلائیوں اور ہتھیلیوں کو چیرتی ہوئی ہاتھوں کی دسوں انگلیوں کی اٹھائیس پوروں میں دھنس گئی۔ سوچ کی دوسری شاخ حلق عبور کر کے دل اور پھیپھڑوں میں دوڑنے لگی۔ اس کے دل اور پھیپھڑوں میں ذبح کئے گئے کبوتر تڑپنے لگے۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں ایک غیر محسوس آس نے جھانکا: کاش درد کی اس شاخ کی یہ آخری منزل ہو۔ کاش! اس کی دھڑکن درد کی اس تیز لہر سے اس سوچ کے سہارے تھم جائے اور اس کی پلکیں ابلتی ہوئی پتلیوں پر گر جائیں۔ مگر اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ درد کی یہ شاخ خون کے بہاؤ میں شامل ہو کر

مزید اوپر چڑھنے لگی۔ اس کے وجود میں چلتی ہوئی رانوں، گھٹنوں، پنڈلیوں اور پنجوں میں سرایت کر گئی۔
اچانک اس نے کرسی سرکانے کی آواز سنی۔ یہ آواز اس کے کانوں اور آنکھوں کے اتنی قریب تھی کہ اس کی منوں وزنی پلکیں بھی جھپک گئیں۔ لہو کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں نے یہ آواز سنی اور اس کے کانوں نے یہ آواز دیکھی ہو۔ اس کا بدن تھر تھرا اٹھا۔ آسمان کی نگون اور روشنی کا تھوہر، کسی خواب کے چوراہے پر اس کی نگاہ کی پہنچ سے دور ہو گئے اور اس کے عوض خاکی ڈریس کا مستطیل اس کی پلکوں میں اٹک کر رہ گیا۔

''اوئے......اب بھی نام نہیں بتاؤ گے؟''

گالی بکتے ہوئے ہونٹ، اس کی نگاہ کے مستطیل سے بھی باہر تھے۔ شاید اسے یہ اس لئے محسوس ہوا کہ یہ گالی اس کے اور خاکی ڈریس کے مستطیل کے درمیانی فاصلے میں معلق ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے کانوں کی بجائے اس کی آنکھوں نے اس گالی کو دیکھنے، سننے اور محسوس کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس کی بجائے اس نے پھر کرسی کھینچنے کی آواز قریب آتی محسوس کی۔ اک دھندلا سا خیال، اس کی سوچ کے شور میں ڈوبنے تیرنے لگا کہ یہ گالی بھی کرسی کی طرح لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ شاید یہ کرسی اور گالی ایک ہی لکڑی سے بنی تھیں۔ جس کا رنگ اس تھوہر سے ادھار لیا گیا تھا۔ جس کی نکوئی نوکیں اس کی آنکھوں میں چبھی جا رہی تھیں۔

''آخری دفعہ کہہ رہا ہوں......بتاؤ کہ دوسرے کون کون تھے؟ ورنہ ''!

اس کی کنپٹی پر یہ لفظ دھم دھم کرنے لگے۔ اس کے کانوں کے پردے کھل گئے۔ اسے یوں لگا کہ یہ لفظ اس کے کانوں میں داخل ہونے کی بجائے اس کے کانوں سے خارج ہوئے تھے۔ اور اس کے ارد گرد گرم ہوا کے بھنور کی طرح گول دائروں میں گردش کر رہے تھے......''ورنہ......ورنہ......ورنہ......''

اس نے ان لفظوں کو اپنی باہر نکلتی ہوئی پتلیوں کے ساتھ نہایت غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے ان لفظوں کی بازگشت کی پیچھے چند دھندلی دھندلی شکلیں جھانکتی دکھائی دیں

''ورنہ......تمھاری بیوی......'' / ''ورنہ......تمھاری ماں ـــ'' / ''ورنہ ـــ تمھاری بہن ''

اس کی پتلیاں، ان دھندلی دھندلی صورتوں کے بوجھ سے مزید باہر نکل آئیں اور ان صورتوں کی عریانی اس کے خون میں تحلیل ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ اس عریانی کو فراموش کر دے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بلکہ ایک اور عریانی، خاکی ڈریس کی عریانی، اس عریانی پر جھولنے لگی اور پہلی مرتبہ اس کے منہ سے شکستہ آواز نکلی۔ ''ال ـــ اللہ''

''بچو! ابھی اللہ کو بہت یاد کرو گے۔ جب تک نام نہیں بتاؤ گے اس وقت تک یوں ہی الٹے لٹکے رہو گے اچھا پانی پیو گے؟''

اسے اپنے ہونٹوں کا صحرا یاد آ گیا۔ تاروں کی اداسی میں اس کی زبان سے ''پانی'' کا لفظ سنتے ہی اس کے لب اور سوکھ گئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی زبان پر بھی تھوہر اگ آئے ہوں۔ خاردار، نوک دار تھوہر اور یہ تھوہر اس کے حلق سے نیچے اترنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد اٹک گئے اور اس کی نوک دار شاخیں اس کے گلے کو نوچنے لگیں۔ ہلکی ہلکی کھانسی کے احساس سے......وہ تڑپ اٹھا۔ مجھے کچھ نہیں پتہ......ورنہ نتھنوں سے خون بہنا شروع

ہو جائے گا۔ قے ہو جائے گی اور درد کی ٹیسیں پورے جسم میں دوڑنے لگیں گی۔
پھر کرسی گھسٹنے کا زلزلہ، اس کے وجود کے جلتے پہاڑ کو ہلا گیا۔ خاکی ڈریس کا مستطیل اس کے قریب تر آتا گیا۔ اس کی آنکھوں میں گھستا گیا۔
''اچھا چلو نام نہیں بتاتے تو صرف یہ بتادو کہ باقی ہتھیار کہاں چھپا رکھے ہیں۔؟''
اس نے یہ الفاظ اپنے بدن پر رینگتے ہوئے محسوس کیے۔ یادوں کے لال بیگ کی طرح جو اس کے بن ران اور بغلوں سے چمٹ گئے تھے۔ اس کے جسم میں ان لال پروں والے کیڑوں کی یاد لوٹ آئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب خاکی ڈریس کا مستطیل ابھی بنا نہیں تھا۔ ابھی صرف لکڑی کا آدمی تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں لکڑی کی چھڑی تھی اور دوسرے ہاتھ کی درمیانی اور شہادت والی انگلی میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ لکڑی کے آدمی کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ ناتا تھا تو صرف یہ کہ وہ شمال تھا اور یہ جنوب۔ البتہ یہ خطا ہو سکتی ہے کہ یہ خالی ہاتھ تھا اور اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ چھڑی اور خالی ہاتھ کا رشتہ جرم کا رشتہ تھا۔ اس جرم کی بابت اس نے صرف یہ سوچا تھا کہ یا تو اس کے ہاتھ میں چھڑی نہیں ہونی چاہیے، یا پھر میں بھی خالی ہاتھ نہ ہوتا۔ مگر اس سوچ سے بہت پہلے چھڑی اور خالی ہاتھوں کے فاصلے سمٹ کر مسجد کے مینار اور قبرستان کی حیثیت حاصل کر چکے تھے...... جوں جوں اس کے پاؤں سوجتے گئے، توں توں بید کی چھڑی اس کی نگاہ کی آخری حد بنتی گئی۔ اس حد کے پار صرف آوازیں تھیں۔ بید کی چھڑی کی شپاک کی آواز، لکڑی کے آدمی کے ہانپنے کی آواز اور اس کے پھیپھڑوں سے چبا چبا کر نکلنے والی آواز۔ ان آوازوں میں ایک نیا رشتہ پیدا ہو گیا تھا۔ وقت کا رشتہ۔ گنتی کا رشتہ، تسلسل کا رشتہ، جب گننے والا اس کی یادداشت کی حدیں عبور کر گیا، جب تسلسل رفتار کی شکل اختیار کر گیا۔ جس طرح بجلی کے تیز رفتار پنکھے کے پر ساکت دکھائی .... دیتے ہیں اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں اور دانتوں میں سے ایک مجروح کراہ نکلی تھی ''اللہ......''
یک دم لکڑی کے آدمی کی آواز جامد وقت کو عبور کر آئی ...... ''ارے خنزیر کے...... سچ بتاتا ہے یا......''
اس ''یا'' کے امکانات اس کا طواف کرنے لگے۔ اس نے ان امکانات کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی آنکھوں میں بگولے چلنے لگے تھے اور ان بگولوں کی دھند میں یہ امکانات خوف اور اذیت کے سائے بن کر گونجنے لگے، جو سنگین کی نوک سے باریک لیکن پل صراط سے زیادہ چوڑے تھے۔
اوئے کرو نگا ...... یہ یوں نہیں مانے گا'' لکڑی کے آدمی کی آواز کی بازگشت اس کے سوجے ہوئے پیروں سے ٹکرا کر، اس کی شلوار کے پیچ وخم اور کُرتے کے دامن میں الجھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے بگولے تھم گئے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔
بنچ کی سرد لکڑی اور اس کی یخ عریانی کے درمیان ٹھنڈی چھاؤں کے احساس سے زیادہ اس نے لکڑی کے آدمی کی آنکھوں سے بہتی اوس جیسا ٹھنڈا خون کھولتا ہوا محسوس کیا اور اس احساس کے ساتھ ہی اس کی جلد میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے اپنا لڑکا سفید بیل یاد آ گیا۔ ذبح ہونے سے پہلے اس کی کھال کے بال بھی کھڑے ہو گئے تھے۔
''آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں کہ ہتھیار کہاں دبا رکھے ہیں؟ اگر صحیح صحیح جواب نہیں دو گے تو یہ چھڑی......''
لکڑی کے آدمی کی دھمکی بید کی چھڑی کے سرے کی مدد سے خوف کا علم بن گئی۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں ہے......'' اسے یاد آیا۔ بہتی یاد بے بسی کا لبادہ اوڑھ کر اس کے لبوں تک آ گئی۔
''اس کا مطلب ہے تمھیں یہ پتہ ہے کہ ہتھیار دفن کر رکھے ہیں۔ مگر تمھیں یہ معلوم نہیں کہ کہاں دبا رکھے ہیں...... ایسا ہی ہے نا؟'' لکڑی کے آدمی نے اس کی بے بسی کا فائدہ اٹھایا۔
''نہیں...... ہاں...... نہیں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔'' الجھاوؤں نے اس کے ذہن اور زبان کے بیچ فاصلے پیدا کر دیے تھے...... اس نے بے بسی کے ساتھ پھر آنکھیں بند کر لیں۔
''اچھا ہتھیار لایا کون تھا؟'' لکڑی کے آدمی نے سگریٹ جلاتے ہوئے نئے سوال کا دھواں پھینکا۔ اس نے آنکھیں کھولیں مگر ان میں کوئی جواب نہ تھا۔
''اچھا جیپ کس کی تھی؟''
''مجھے بالکل پتہ نہیں ہے......'' اس نے جیسے خود سے کہا ہو۔
''یعنی ہتھیار جیپ میں ہی آئے تھے مگر تمھیں یہ علم نہیں کہ جیپ کس کی تھی؟''
الجھاوں کا دھوں اس کے گرد اگرد پھیلنے لگا۔
''ہتھیار، جیپ...... مجھے کچھ پتہ نہیں ہے......'' الجھاوؤں نے بے بسی میں پناہ لے لی
''تم یوں شرافت سے نہیں مانو گے......''
اس دھمکی کا کوئی وجود نہیں تھا اور کسی خیالی غبارے کی طرح اس کے اوپر گھومنے لگی۔ اس نے اس غبارے کو کوئی وجود دینا چاہا۔ گھونسے، تھپڑ، ٹھڈے، لاتیں اور آخر کار بید کی چھڑی۔ فی الحال اس کی عقل اور تصور میں اس غبارے کی یہی شکل ممکن تھی۔ اس نے بنا دیکھے آنکھیں لکڑی کے آدمی کی طرف پھیر لیں۔ نہ دیکھنے کے باوجود لکڑی کے آدمی کے ہونٹوں میں سلگتے سگریٹ کی سرخی اس کی آنکھوں میں گھسنے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی، ابھی پلکیں گری ہی تھیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی خود بخود اٹھ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بدن میں زلزلہ آ گیا اور سارے حفاظتی بند توڑ گیا۔ اس کی چھاتی کے بال، سگریٹ کے شعلے کے قریب گول دائرے بن کر جلتی بلتی کھال کے دھوئیں میں بھاپ بن گئے۔ وہ اپنی ہی جلد جلنے کی بو نہ پہچان سکا۔ البتہ سر پر جلتی اون کی بو اسے یوں محسوس ہوئی جیسے یہ بو اس کے سوجے، کٹے پھٹے، نیلے زخمی پیروں سے آ رہی ہو اور اس کے نتھنوں تک جاتے ہوئے گھڑی بھر کے لئے اس کے سینے میں رک جاتی تھی۔ اس بو نے اسے شعلے کی جلن یاد دلائی جو اس کی چھاتی کے دونوں طرف رکھ دیا گیا تھا اور وہیں جل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کناروں میں جو بھر بھر پانی آ رہا تھا وہ گھوم پھر کر اس کی کنپٹی پر جم رہا تھا۔
''کیوں؟...... اب بھی اپنی ضد نہیں چھوڑو گے......؟'' لکڑی کے آدمی کی آواز اس کے چھاتی پر رکھے شعلے کے آس پاس ہوا کا جھونکا بن کر گزر گئی۔ وہ چپ، اس کی آنکھیں چپ، مگر اس کے کان زیادہ سننے لگے تھے۔ اس نے پھر دیا سلائی کی رگڑ سنی۔ اس کی دونوں بغلوں میں بھنور بھڑ کنے لگے، بُن ران میں آگ جل اٹھی۔ اس کے کندھوں پیٹ اور گھٹنوں کی تہوں میں بھونچال آ گیا۔ آگ کے شعلے بھڑ کتے رہے۔ شعلوں کی جھنیاں پکتی رہیں۔ آنکھوں کی بجائے اب اس کا دل رونے لگا۔ کیونکہ ہر حادثے کے بعد اس کی آنکھیں زیادہ سختی سے بھنچ

جاتی تھیں۔ اسکا نچلا ہونٹ دانتوں کا اضافی حصہ بن گیا تھا۔ اور پھر اک زوردار زلزلہ اس کے اندر امنڈ آیا۔ پیلا پیلا زہر اس کے نتھنوں سے پھوٹ کر اس کی باچھوں سے بہنے لگا۔ اس وقت اس نے بہت پرے زلزلے کے اس طرف یہ سرگوشی سنی۔ ''شاید غشی پڑ گئی ہے، پانی چھینک کر ہوش میں لاؤ......''

جب دوبارہ اس کی آنکھیں کھلیں تو اسے ایک کی بجائے لکڑی کے کئی آدمی دکھائی دیے جو سائے کی طرح اک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر آگ کے لال بیگ چپکے ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ سب لکڑی کے آدمی پھر ایک بن گئے۔ مگر اس لکڑی کے آدمی کے کئی ہونٹ تھے جو ایک طویل قطار میں اس کی آنکھوں تک پہنچ چکے تھے۔ ان سب ہونٹوں میں ایک ہی سگریٹ تھا۔ مگر اس سگریٹ میں بے شمار شعلے تھے۔ جو اس کی پتلیوں میں دہکنے لگے تھے۔

''چھوڑ دو اب، ہوش میں آ گیا ہے...... یہ مردود بڑے سخت جان ہوتے ہیں......''

اس نے لکڑی کے آدمی کی پہلے دھیمی اور پھر بلند آواز سنی ''اس کو...... پانی...... دو''

پانی...... اس کے لب پانی کے تصور سے ہی پھڑکنے لگے۔ اس کی زبان کی بیابان میں بیری کے کانٹے اگ آئے۔ زبان تالو میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ مگر وہاں بھی کانٹے ہی کانٹے تھے۔ اس نے گلاس میں پانی انڈیلنے کی آواز سنی۔ اس آواز کے ردعمل میں اس کے حلق میں بھی ویسی ہی آواز پیدا ہونے لگی۔ پانی...... کیسا ذائقہ ہوتا ہے پانی میں؟ اس کا کلیجہ گلاس میں ہی رہ گیا جہاں پانی تھا......

''لو اب، پانی پیو'' کسی نے کہا۔ مگر یہ کیسا پانی تھا جس کے قریب آتے ہی اس کے پیٹ کی ہر شے باہر آنے لگی تھی۔ اس نے اپنے لبوں اور آنکھوں کو پوری قوت سے بھینچ لیا۔ اس کے باوجود بھی یہ پانی اس کے قریب تھا اور اس کے منہ...... اندر جانے کے جتن کر رہا تھا۔ اس نے گردن ہلا کر اس بیگانی اپنائیت سے بچنے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹوں سے...... ان کو توڑنے کی کوشش میں گلاس اس کی داڑھی اور گردن پر چھلک گیا۔ اس کا معدہ اچھل کر باہر آ گیا...... اسے اپنی عریانی نئے سرے سے محسوس ہونے لگی۔ بینچ کا سرد تختہ اب اس کی برہنگی کا حصہ بن چکا تھا۔ اب اسے اپنی عریانی بھی ٹھنڈی گیلی لکڑی سے بنی ہوئی لگی۔ اسے پیشاب کا خیال آیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کا دھیان گلاس کی طرف گیا پھر اسے ہچکی آ گئی۔ قے اس کے حلق تک آ کر رک گئی۔

''ارے اب بھی باز آ جاؤ...... بھیڑ کے...... کیوں خواہ مخواہ خود کو مرواتے ہو...... اگر صرف اتنا بتا دو کہ ہتھیار کہاں دفن ہیں، تو تمھیں چھوڑ دیں گے......''

ایک طویل گہرا سانس اس کے پیٹ کی تہوں میں بڑھ کر درخت بن گیا اور وہ اس درخت سے ڈرنے لگا۔ اس درخت کے طوفانوں نے اس کی آنکھوں کے پٹ کھول ڈالے اور لکڑی کا آدمی اندر داخل ہو گیا۔

''شاباش...... شاباش...... بتاؤ...... خواہ مخواہ دوسروں کی خاطر خود کو نہ مارو......''

یہ ''دوسرے ''کون تھے اس نے سوچا مگر یہ سوچتے ہی اس کی آنکھوں کے پٹ پھر بند ہو گئے۔ وہ بڑبڑایا ''دوسرے؟''

''ہاں ہاں دوسرے...... جو تمھارے ساتھ تھے؟''

''میرے ساتھ...... دوسرے بھی تھے؟ کون تھے وہ...... ؟اس کی بند آنکھوں کی اوٹ میں سائے لرزنے لگے۔
''ارے...... کی اولاد، وہی تو تم سے پوچھ رہے ہیں...... '' لکڑی کے آدمی نے اس کی برہنگی کو بید کی چھڑی کا احساس دلایا۔ اس کی پلکیں لرزیں اور سختی سے بند ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے گلے میں سانس اٹک گیا اور چھڑی اوپر اٹھنے پر اس کے نتھنوں سے پھنکارتا ہوا باہر نکلا۔
''یہ اس طرح نہیں مانے گا...... مجھے دو یہ پلاس...... نہیں نہیں یہ نہیں...... وہ بڑی سنی''
یہ لفظ اس کے کانوں یا آنکھوں نے نہیں سمجھے۔ جانے کیوں اسے پھر اپنی عریانی یاد آ گئی اور کوئی اندیشہ پھانس بن کر اس کے گلے میں پھنس گیا۔ اس کی چھاتی، بغلوں اور بن ران میں خوف کے ہیولے تنے سرے سے دھواں دھواں کرنے لگے۔ جب اس کے پہلے انگوٹھے کا ناخن اپنا ماس چھوڑ کر سنی کے لوہے کا رنگ اختیار کرنے لگا، تب اس کی کنپٹی، کانوں اور پتلیوں میں پہلی دفعہ یہ سوال اذیت بن کر ابھرا کہ میرے ساتھ'' دوسرے'' کون تھے؟ یہ ''دوسرے'' اس سے باہر تھے۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ اب یہ'' دوسرے'' اس میں آ سمائے ہیں اور اس کے ساتھ تڑپ رہے ہیں، چیخ پکار کر رہے ہیں۔ مگر ان کی چیخوں اور تڑپنے کی آواز اس سے بہت دور تھی۔ یہ آواز اتنی ہی زندہ تھی جتنا وہ خود زندہ تھا، جتنے اس سے باہر'' دوسرے'' زندہ تھے۔ لیکن جب سنی اس کی شہادت والی انگلی کے ناخن میں فٹ ہو گئی تب وہ آواز مر گئی۔ جب سنی کو کھینچا گیا تو کوئی دھیمی سی آہ اس کے دانتوں تلے دب کر رہ گئی۔
''دوسرے میر...... میرے...... ساتھ...... تھے......''
''کون تھے وہ؟'' سنی نے اس کی چھوٹی انگلی کو جکڑ لیا۔ وہ یہ طے نہیں کر سکا تھا کہ یہ چھوٹی انگلی تھی یا ساتھ والی یا...... اس کی آنکھوں کے تاروں کے پیچھے انگلیاں...... ننگی، بغیر ناخنوں والی انگلیاں...... کھمبیوں کی طرح اس کی آنکھوں کی ٹھنڈی زمین کو چیر پھاڑ کر سر اٹھا کر کھڑی ہو گئیں۔ ان انگلیوں کا کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ مگر کھمبیوں کے سرے لہو رنگ ہونے کی وجہ سے اس کی پتلیوں کے بھورے سیاہ رنگ میں سرخ تندور کی طرح دہک رہے تھے۔ اس کی پتلیوں کے یہ سرخ سیاہ، سیاہ سرخ تندور پلکوں سے باہر آ کر وہیں پتھر ہو گئے۔
''پھر چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں...... دیکھو کم بخت کہیں مر تو نہیں گیا...... '' لکڑی کے آدمی کا لہجہ اس کی گردن کے پسینے کے قطروں میں بوکھلانے لگا اور پھر اوس ٹھنڈی لہر بن کر اس کی کنپٹیوں میں جا گھسی۔
جب اس کی کنپٹیوں کی برف نے بڑھ کر اس کے جبڑوں کو جکڑ لیا تو اس نے پھر لکڑی کے آدمی کی آواز سنی'' لگتا ہے اسے دوسروں کا کچھ پتا نہیں ہے۔''
''دوسروں کا پتہ ہو یا نہ ہو...... مگر اسے یہ یقیناً معلوم ہے کہ ہتھیار کہاں چھپائے ہوئے ہیں۔'' یہ آواز نئی تھی۔ بھاری تھی۔ غیر جانبدار تھی۔ کسی بھی جذبے سے عاری تھی۔
''مگر مانے گا نہیں'' لکڑی کے آدمی کی آواز میں بیزاری تھی۔ تھکاوٹ تھی۔
''مانے گا تو اس کا باپ بھی'' یہ آواز اور زیادہ غیر جانب دار تھی۔ کسی بھی جذبے سے عاری اور ٹھنڈی۔
''آپ خود دیکھیں۔ ہم نے تو ہر طریقہ آزما کر دیکھ لیا ہے...... اب تو کوئی انگ سلامت نہیں رہا، پھر بھی......''

''ہوں..... اچھا عورتیں؟'' پہلی مرتبہ اس سوال میں کوئی جذبہ تھا، کوئی جانب داری تھی۔
''جی ہاں..... یہ نسخہ بھی آزما کر دیکھ لیا ہے، اس کی بیوی، اس کی بہن..... اور ہاں بڑھیا بھی.....''
''اس کی ماں تھی شاید..... ان میں سے ایک حاملہ تھی..... آخری مہینہ..... اس کی بیوی یا اس کی بہن..... صحیح یاد نہیں آ رہا.....'' لکڑی کا آدمی ہنسا۔ مگر اس ہنسی میں بھی بیزاری تھی، تھکاوٹ تھی۔ کھوکھلی ہنسی جس کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ جس کی کوئی اخیر نہیں ہوتی۔ بے مقصد بے کل ہنسی۔
''اب کہاں ہیں.....؟'' نئی آواز میں سختی آ گئی، لکڑی پیدا ہو گئی۔
''چھوڑ دیا..... صبح ہونے سے پہلے کہیں.....''
''کچھ بتایا.....؟ سوال میں ایک سے زیادہ معنی تھے یا ایک ہی معنی کے دو سوال تھے۔
''ہاں..... نہیں'' لکڑی کے آدمی نے مختصر جواب دیا۔ اس میں سارے معنی شامل تھے۔
''اور یہ.....؟'' یہ سوال اتنا مختصر نہ تھا۔
''یہ..... ہاں تقریباً پاگل ہو گیا تھا..... پھر واسطے دیئے..... منتیں کیں..... پھر چیخ چیخ کر رونے لگا۔ چہرہ گھٹنوں میں چھپا کر کافی دیر سسکتا رہا۔ کانپتا رہا۔ لکڑی کا آدمی کوشش کے باوجود مختصر جواب دینے میں ناکام رہا۔
''پھر بھی سچ نہیں اگلا؟'' یہ سوال گویا لکڑی کے آدمی کے جملے کا باقی حصہ تھا، جس کے بغیر بات نامکمل تھی۔
''ہاں..... نہیں'' لکڑی کا آدمی پھر بوکھلا گیا۔
''اور اس کے ساتھی.....؟'' آواز کی سختی میں قدرے مٹھاس آ گئی۔
''تین تو دو بدو فائرنگ میں مارے گئے..... باقی ایک جو زخمی ہو گیا تھا وہ ہسپتال میں مر گیا.....''
لکڑی کے آدمی نے بید کی چھڑی میز پر یوں رکھی جیسے وہ بھی مر چکی ہو، جس سے اب اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔
''اور ہمارے آدمی.....؟'' یہ سوال اس قدر دھیما تھا کہ لکڑی کے آدمی نے اس کی تسلی کرنے کے لئے مردہ چھڑی کو پھر اٹھا لیا۔ دوسرے ہاتھ پر چھڑی مارتے ہوئے اس نے کہا۔
''گذشتہ رپورٹ کے مطابق سات..... نئی رپورٹ کے مطابق آٹھ''۔
''وہ کیسے.....؟''
''آٹھواں آدمی ان میں سے تھا۔ اس نے اپنی رائفل اپنے نرخرے کے نیچے رکھ کر ٹریگر دبا دیا..... کچھ لوگوں کو کہنا ہے کہ جب گاؤں پر چڑھائی کی گئی تو اس نے فائر کرنے سے انکار کر دیا..... اور مجبوراً اسے شوٹ کرنا پڑا..... اس کی لاش اناج کے کُٹھلے کے پیچھے پڑی ملی.....''
اس لمحے اسے یک بہ یک کئی خیال آئے۔ لکڑی کا آدمی، خاکی ڈریس کی تکون بن گیا۔ آسمان کی تکون میں ان گنت تارے جھل مل کرنے لگے۔ روشنی کے تھوہر میں قوسِ قزاح کے رنگ بھرنے لگے۔ اور اسی ست رنگے نور میں اسے ''آٹھواں آدمی'' دکھائی دیا، جس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ کوئی امید مسکراہٹ بن کر اس کے کٹے پھٹے ہونٹوں کے غباروں میں پھیل گئی۔ اور اس نے اپنی ساری توانائی آخری سانسوں میں یک جا کرتے ہوئے کہا..... ''میں تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گا.....''

ناصر شہزاد

شعر کے انگ سے رنگ جھنجھوڑا
میں نے غزل کو گیت سے جوڑا
پیچھے روکے بابل کی نِج
آگے کھینچے پیار نگوڑا
آزادی کی پہلی حکایت
خیمے ، ماتم ، خالی گھوڑا
میں نرووش ہوں مان رکی او ماں
اُس مورکھ نے ہاتھ نہ چھوڑا
تم نے موڑ لیا مُکھ مجھ سے
مجھ سے کیوں تم نے مُکھ موڑا
کچی گگن کے سادہ قصے
گجرا توڑا ، منکا پھوڑا
نیچے ماس نے مٹی پہنی
اوپر رنگ رتوں کا اوڑھا
ضد ، انکار ، اقرار ملن کا
لیکن کم کم ، تھوڑا تھوڑا
ساری سجل ، وہ ساری سُندر
ناک میں تیلی ، پاؤں میں توڑا
میں اور پی ، تنہائی ، توبہ
انگ سریر کو مسلا ، مروڑا

ناصر شہزاد

عبرتوں اور عبارتوں کے لئے
بیتی عمریں بشارتوں کے لئے
کتنے قریے کہانیوں کے امیں
کتنے برگد بجھارتوں کے لئے
میں یہاں بے کنار بھیڑ کے دوار
آپ ٹھہرے صدارتوں کے لئے
نین تیری ڈگر تکیں دن رین
یاتراؤں ، زیارتوں کے لئے
رائیگاں رنگ سب تمنا میں
ساری خوشیاں اکارتوں کے لئے
نیچے گاگر کے چھوئی موئی سکھی
پتھ پہ سیاں جسارتوں کے لئے
رُوپ بہروپ کے بناں سُندر
رنگ روغن امارتوں کے لئے
شیام سند حسن سہاگ ، بانسری آگ
سُر ملن کے سفارتوں کے لئے
کھیل ، گڑیاں ، لڑکپنے کے وہ دن
تیری میری شرارتوں کے لئے
مرگ خوں گھیر ، کربلا تفسیر
حق ہمیشہ حقارتوں کے لئے

جلیل عالی

اک آوارہ سا لمحہ کیا قفس میں آ گیا ہے
لگا جیسے زمانہ دسترس میں آ گیا ہے

یہ کس کونپل کھلی ساعت صدا دی ہے کسی نے
رُتوں کا رَس ہر اک تارِ نفس میں آ گیا ہے

ہم اُس کوچے سے نسبت کی خوشی کیسے سنبھالیں
ہمارا نام اُس کے خار و خس میں آ گیا ہے

انا کے فیصلے کیا ، مرضیِ پندار کیسی
مرا ہونا نہ ہونا اُس کے بس میں آ گیا ہے

لہو میں لو کہاں موجود زندہ رابطے کی
نبھانے کو فقط بے روح رسمیں ، آ گیا ہے

اُتر آئے اُن آنکھوں میں کچھ ایسے عکس عالی
کہ دل پھر سے گرفتِ پیش و پس میں آ گیا ہے

جلیل عالی

خوف سے خواب اجالا نہیں ہونے والا
یوں تو مہتاب یہ قریہ نہیں ہونے والا

یہ تو یادوں کی مسافت نے تھکا رکھا ہے
اُس کی فرقت کو زمانہ نہیں ہونے والا

ہو چکی آخری حد اُس کے ستم کی اے دل
درد اب اور زیادہ نہیں ہونے والا

اب کسی بات پہ ہوتی نہیں حیرت ہم کو
ہو چکا وہ بھی کہ جو تھا نہیں ہونے والا

ہم جو ڈھونڈیں گے تو جنگل میں ملے گا رستہ
خود بخود کوئی کرشمہ نہیں ہونے والا

بہہ گئے کتنے یقیں وقت کی طغیانی میں
اک گماں ہے کہ جو پسپا نہیں ہونے والا

اکبر حمیدی

کس روز یہ اصرار ہمارا نہیں ہوتا
کچھ اور بھی ، اتنے پہ گزارا نہیں ہوتا

رونے سے کہاں بدلے گا تقدیر کا لکھا
کیا چمکے گا ، آنسو تو ستارا نہیں ہوتا

جمہوریت اُس ملک میں ہوتی ہے جہاں پر
اک طبقے کا ہر شے پہ اجارا نہیں ہوتا

اُس شہر کی تقدیر میں ویرانی لکھی ہے
جس شہر کو میخانہ گوارا نہیں ہوتا

شعلہ تری چاہت کا فروزاں رہا دائم
ہارا بھی ، تو ہمت کبھی ہارا نہیں ہوتا

نقشہ ہی تو طے ہوتا نہیں ہے اسی باعث
اینٹیں نہیں ہوتیں کبھی گارا نہیں ہوتا

جس شہر میں اظہار کی آزادی نہیں ہے
وہ سب کا ہے اکبر وہ ہمارا نہیں ہوتا

اکبر حمیدی

سر مغرور ترے آگے جھکا دیتا ہوں
روز اس کافر مطلق کو سزا دیتا ہوں

روز اک نامہ ترے نام رقم کرتا ہوں
جو رقم کر نہیں سکتا وہ جلا دیتا ہوں

عقل بھی جذبہ بھی دونوں مرے ساتھی ہیں مگر
بعض اوقات میں دونوں کو اٹھا دیتا ہوں

ڈر ہو جب پانی مری آگ نہ ٹھنڈی کر دے
آگ کو پانی کے شعلوں سے ہوا دیتا ہوں

جب کبھی پانی کی حدت سے لگا ہوں تپنے
آگ کے چھینٹوں سے پانی کو بجھا دیتا ہوں

سوچتا ہوں کبھی ، تُو نے مجھے وہ کچھ نہ دیا
پھر خیال آتا ہے میں بھی تجھے کیا دیتا ہوں

ایک دریا سا رواں ہے مرے اندر اکبر
اکثر اوقات یہاں غوطہ لگا دیتا ہوں

ابرار احمد

جانے یہ حوصلہ رہے نہ رہے — تجھ سے اب رابطہ رہے نہ رہے

جانے یہ قرب کب تلک ہو نصیب — جانے یہ فاصلہ رہے نہ رہے

جو نہیں کچھ، ہمیشگی ہو اُسے — جو ہے، جانے سدا رہے نہ رہے

جو ہے موجود، جانے ہو کہ نہ ہو — جو نہیں، کیا پتہ رہے نہ رہے

کیا خبر ابتدا بھی ہو معدوم — کیا خبر انتہا رہے نہ رہے

بزمِ یاراں میں دن گزار کوئی — جانے یہ سلسلہ رہے نہ رہے

میں بھی آؤں نہ آؤں ہاتھ اپنے — تُو بھی پھر دوستا، رہے نہ رہے

کس کو معلوم استوار ہو کیا — کون جانے کہ کیا رہے نہ رہے

آ نکلتے ہیں سیرِ دنیا کو — پھر یہ موجِ ہوا رہے نہ رہے

سو ہی جائیں گے ہم بھی بالآخر — تُو بھی پھر جاگتا رہے نہ رہے

اک نگاہِ کرم ادھر بھی کہ پھر — یہ جفا، یہ وفا رہے نہ رہے

کان دھر لحنِ آرزو پہ کہ پھر — سازِ دل میں صدا رہے نہ رہے

سُن کوئی پل ہماری بات بھی سُن — جانے پھر مدّعا رہے نہ رہے

یوں بھی اَب کون پوچھتا ہے ہمیں — کہیں کچھ بھی پتہ رہے نہ رہے

ہم کہاں کے سنبھلنے والے ہیں — کیا ہمیں دوسرا رہے نہ رہے

خاک ہو جائیں ہم بلا سے تری — کوئی تیرے سوا رہے نہ رہے

آج کہہ دوں نہ جانے پھر میرا — یاں کوئی ہم نوا رہے نہ رہے

منزلیں کیا ہیں جانتے ہیں تو پھر — اَب کہیں راستا رہے نہ رہے

تُو نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے، سو اَب — خود سے بھی رابطہ رہے نہ رہے

نیک و بد ایک ہوں خدا معلوم — کچھ بُرا، کچھ بھلا رہے نہ رہے

ہاتھ جیسے ہے کوئی شانے پر — اور یہ آسرا رہے نہ رہے

خاک اُڑنے لگی ہے، اَب شاید — نقش معلوم کا، رہے نہ رہے

اقتدار جاوید

یہ نا معلوم دریا کے کنارے
کھلیں مفہوم دریا کے کنارے

کروں گا بین مل کر میں ہوا سے
کسی مرحوم دریا کے کنارے

چلا ہوں رکھ کے سینے میں کوئی لَو
بہت موہوم دریا کے کنارے

مجھے صحرا کی وسعت میں ہے رونا
مجھے مت چوم دریا کے کنارے

نکل کر جنگلوں سے میں نے آخر
مچا دی دھوم دریا کے کنارے

اقتدار جاوید

رنگ اس تیر بے تاب میں بھر اور بھی سُرخ
بالکونی سے نکل کر ۔ اسے کر اور بھی سُرخ

تجھ سی اک بیر بہوٹی کے گزرنے سے ہُوا
سُرخ اینٹوں سے بنایا ہوا گھر اور بھی سُرخ

نرم ، دھوئی ہوئی ایڑی ، اُفق انداز شفق
کیسے تصویر میں آتی ہے نظر اور بھی سُرخ

پیش ہے سُرخ لہو سے یہ لپکتا ہوا دل
تجھ کو کیا چاہیے اے کارِ ہنر اور بھی سُرخ

جس طرح پھیلتا جاتا ہے اندھیرا جاوید
ویسے ہو جاتا ہے تندور اُدھر اور بھی سُرخ

اقتدار جاوید

دعا کے ساتھ گیا اختیار بندے کا
ابھی تلک نہیں اُترا خمار بندے کا

ردائے ہجر مہیّا کرو کہ آبِ خواب
تری رضا پہ ہے دارومدار بندے کا

یہ جاودانی حدیں راستے میں پڑتی ہیں
دیار اذن نہیں ہے دیار بندے کا

یہ نرم گھاس، یہ مٹی (یہ آسمانِ خاک)
یہیں کہیں پہ ہے پروردگار بندے کا

ہوائے شام میں خوشبو عجیب ہے جاوید
مزار ہے اسی دریا کے پار بندے کا

اقتدار جاوید

ساحل تھا، سمندر تھا، جزیرہ تھا، ہوا تھا
اب کون کرے گا یہ تعیّن کہ وہ کیا تھا

تب پھیل رہے تھے مری ہر سمت میں آفاق
مَیں نقطے کی صورت کسی محور میں گھرا تھا

اُس عالمِ حیرت میں نظر اٹھتی نہیں تھی
اُس عالمِ حیرت میں ہوا تھی نہ دیا تھا

کچھ خواب ہی ایسے مرے پروان چڑھے تھے
مَیں رہ کے زمانے میں زمانے سے جدا تھا

اَب اس لئے الفاظ نئے برتے ہیں مَیں نے
آزار پرانا تھا مگر دکھ تو نیا تھا

ناصر زیدی

لطف کی مجھ پہ جو نظر نہ ہوئی
کیا مری زندگی بسر نہ ہوئی

میرے ماضی میں ساتھ تھا جو مرے
حال کی اُس کو کیوں خبر نہ ہوئی

جو بھی تقدیر میں لکھا تھا ، ہُوا
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی

آپ کا جھوٹ معتبر ٹھہرا
میری سچائی معتبر نہ ہوئی

ہے یقیں ایک دن سحر ہو گی
کیا کرو گے میاں ! اگر نہ ہوئی

وصل کا دن تو کٹ گیا پل میں
ہجر کی رات مختصر نہ ہوئی

اعتبار آ گیا انھیں ناصرؔ!
التجا میری بے اثر نہ ہوئی

ناصر زیدی

نہیں ہے کوئی بھی غمخوار اس زمانے میں
سکون ملنے لگا ہے فریب کھانے میں

سنایا جس کو بھی اُس نے ہی لطف لے کے سنا
عجب مزا ہے مری زیست کے فسانے میں

وہ جن کی سوچ بھٹکتی ہے مقبروں میں ابھی
جواز ، اُن کا بھلا کیا نئے زمانے میں

ملال یہ ہے تمھارا بھی ہاتھ شامل تھا
ورق سے اہلِ جہاں کے مجھے مٹانے میں

کچھ اور حیلہ بہانہ مری تسلی کو
نہیں ہے کوئی نیا پن کسی بہانے میں

اندھیرے میرے مقدر کے چھٹ سکیں شاید
جو روشنی کا گزر ہو غریب خانے میں

مقامِ شکر ہے پھر سے نہ آ سکا ناصرؔ!
کسی بھی تیرِ نظر کے کسی نشانے میں

شاهین مفتی

بس مرے مہربان کافی ہے
میرا اتنا ہی دھیان کافی ہے
اُس نے پَر نوچ کر کہا ہم سے
تم کو اتنی اُڑان کافی ہے
تیری چوکھٹ سے اٹھنے والوں کو
بندگی کا نشان کافی ہے
اب کے بے گانگی کے موسم میں
دل سا اک رازدان کافی ہے
پاؤں بھر اس زمین کے بدلے
مٹھی بھر آسمان کافی ہے
جرمِ الفت کے فیصلے کے لئے
آپ کا اِک بیان کافی ہے
ہم سے تیرہ نصیب لوگوں کو
روشنی کا گمان کافی ہے
ساری دنیا تمھیں مبارک ہو
مجھ کو میرا جہان کافی ہے
سچ تو یہ ہے کہ اہلِ دل کے لئے
ایک ہی امتحان کافی ہے

شاهین مفتی

وہ کبھی منظروں میں شامل ہے
آئنہ آئنوں میں شامل ہے
اُس کو دِل سے جدا کروں کیسے
وہ مری دھڑکنوں میں شامل ہے
خوں بہا مانگتا ہے دنیا سے
جو مرے قاتلوں میں شامل ہے
چپ ہے خلقِ خدا تو یہ نہ سمجھ
یہ تری سازشوں میں شامل ہے
بعد مدّت کے یہ کُھلا مجھ پر
دِل مرے دشمنوں میں شامل ہے
اِک نہ اِک دن سراغ پالیں گے
راستہ راستوں میں شامل ہے
ٹکڑے ٹکڑے ہُوا ہے شیشۂ دل
اِک چبھن آنسوؤں میں شامل ہے
ایک رنگِ ملال بھی اَب کے
ہجر کی بارشوں میں شامل ہے
اے شبِ ہجر تیری عمر دراز
تُو مرے رت جگوں میں شامل ہے

شاهین مفتی

دیارِ عشق میں یہ معجزہ تو ہونا تھا
اُسے بھی بندے سے آخر خدا تو ہونا تھا

جھپٹ پڑا ہے جو تجھ پر گروہِ تشنہ لباں
تجھے بھی پیاس کا اک تجربہ تو ہونا تھا

یہ آگ پانی کی جھوٹی رفاقتیں کیسی
میانِ دیدہ و دل معرکہ تو ہونا تھا

وہ جس کے خوف سے رستے بدل بدل کے چلے
اس ایک ڈر کا کہیں سامنا تو ہونا تھا

درِ قفس پہ ہمیں دیکھ کر کہا سب نے
تمھارا جرم ہے کیا فیصلہ تو ہونا تھا

بہت دنوں سے یہ دل کانپ کانپ اٹھتا تھا
پھر اس کے بعد کوئی سانحہ تو ہونا تھا

ہماری جان ہی لے کر ٹلا ہے موسمِ ہجر
کہیں پہ ختم یہ سب سلسلہ تو ہونا تھا

حصار کھینچ کے بیٹھے ہیں تیرے نام کا ہم
کتابِ زیست کا اک حاشیہ تو ہونا تھا

حدودِ وقت سے آگے بھی ایک منزل تھی
سفر نصیب کو اک دن جدا تو ہونا تھا

شاهین مفتی

یوں تو اس بزم میں کیا کیا نہیں ہونے والا
پر کسی بات کا چرچا نہیں ہونے والا

اس کے دعوئ مسیحائی کی شہرت پہ نہ جا
دلِ بیمار تو اچھا نہیں ہونے والا

موجِ خوں کاٹ کے گزری ہے کہیں تیغِ ستم
میرا یہ خواب تو سچا نہیں ہونے والا

بس یہی سوچ کے اب خلق خدا جاگتی ہے
پھر کوئی حشر تو برپا نہیں ہونے والا

خوئے تکرار سے اغیار بھی کیا پائیں گے
دل کے بازار میں سودا نہیں ہونے والا

جس کو سائے کی رفاقت بھی میسر نہ ہوئی
کوئی مجھ جیسا بھی تنہا نہیں ہونے والا

ہم نے پانی میں ملا دی ہے لہو کی خوشبو
اب یہ دریا کبھی صحرا نہیں ہونے والا

اس سے پیمانِ وفا باندھ لیا ہے دل نے
جس کا اک عہد بھی ایفا نہیں ہونے والا

یوں تو ہم کچھ بھی نہیں ہیں مگر اے جانِ جہاں
ڈھونڈیے شوق سے ہم سا نہیں ہونے والا

حنیف ترین

کیف و مستی کا حال خوشبو ہے
انتہائے کمال خوشبو ہے
دل ہے آئینۂ جمال اُس کا
عکسِ سرمد خصال خوشبو ہے
آگہی کے کمال میں مضمر
ہر جمال و خیال خوشبو ہے
صوت منصور جس پہ حاوی تھی
وہ اناالحق مقال خوشبو ہے
یا اخی یا اخی کا پس منظر
ہر فراق و وصال خوشبو ہے
سبز خلوب کی جلوتوں کے بیچ
ہر جواب و سوال خوشبو ہے
نادِ مستی ، نشاطِ روحِ حیات
شعلۂ سبز ، لال خوشبو ہے
جب پکارا ندا یہی آئی
لامکاں تک بحال خوشبو ہے
دل کی تسکین ، گلکدہ ہی سہی
روح کا اندمال خوشبو ہے
لامکانی لطافتوں کے طفیل
وحدتِ لازوال خوشبو ہے

حنیف ترین

جہانِ کون و مکاں میں اسے تلاش کیا
خودی کے زخم نے وہ راز مجھ پہ فاش کیا

یقین بنتے ہی پانی سا بہہ گیا پتھر
سکوتِ سیلِ رواں نے جو ارتعاش کیا

بصیرتوں سے ملا جو بھی کربِ آگاہی
اسی کے کرب کو سوداگرِ معاش کیا

غرورِ سنگ دلی مستقر ہوا تو اسے
طلب نے صبر کے شیشے سے پاش پاش کیا

تھے خوں میں اپنے نہائے گلاب سے منظر
جو گزری رُت تو مرے دل کو قاش قاش کیا

تھیں وہ بھی لذتیں جن تک خرد نہیں پہنچی
تو پھر جنوں کی رسائی نے انکشاف کیا

دھواں سا پھیل گیا کائناتِ دل میں حنیف
یہ کِس خیال نے پھر مجھ کو زندہ لاش کیا

عابد سیال

خبر نہیں ہے کہ لے جائے گا کہاں مجھ کو
اُڑائے پھرتا ہے اک لمحۂ رواں مجھ کو

بدن میں جست کی خواہش نے سر اُٹھایا ہے
قریب لگنے لگا ہے اَب آسماں مجھ کو

کسی سخن کی کرامت مری مسافت ہے
کسی نظر کا اشارہ ہے سائباں مجھ کو

ہے کوئی شب کہ اٹھاتی ہے یاس کی دیوار
کوئی کرن ہے کہ رکھتی ہے خوش گماں مجھ کو

کسی زمانۂ بیدار کا ہدف دے کر
بس اَب تو چھوڑ چکی ہے مری کماں مجھ کو

اَب اس سفر سے پلٹنا تو میرے بس میں نہیں
زمیں کی کھینچ بلاتی ہے رائگاں مجھ کو

یہ کیسی کشف کی ساعت کا سامنا ہے مجھے
دکھائی دینے لگا ہے مرا جہاں مجھ کو

عابد سیال

یہ رنگ، روپ، تب و تاب وہم ہے یا خواب
یہ جس سے میں ہُوا سیراب وہم ہے یا خواب

یقیں کی ڈور مرے ہاتھ سے پھسلتی ہے
یہ مجھ کو کھینچتا گرداب وہم ہے یا خواب

زمیں پہ ٹکتے نہیں پاؤں لہر ایسی ہے
یہ رقصِ آتش و سیماب وہم ہے یا خواب

وہ میرے سامنے اک موجِ رنگ کی صورت
میں اس گمان میں غرقاب، وہم ہے یا خواب

یہ سطر سطر سلگتی کتابِ عمر کے بیچ
خنک حروف کا اِک باب وہم ہے یا خواب

یہ کیسے درد کی تلخی لہو میں گھلتی ہے
یہ لمس جرعۂ زہراب وہم ہے یا خواب

کبھی حواس کا پرکھا ہُوا بھی ایسا ہے
کہ جیسے نقش سرِ آب، وہم ہے یا خواب

عابد سیال

اپنی تنہائی کے یقین کے بعد
چپ ہوں آواز اولین کے بعد

شام اور مخملیں پڑاؤ ہے
دھوپ اور کھردری زمین کے بعد

سارے اسرار کھلنے والے ہیں
بس اسی پردۂ مبین کے بعد

چہرۂ صبح پر چمکتی ہیں
وہی کرنیں تری جبین کے بعد

اک یقینی مفارقت میں رہے
اک ملاقات بے یقین کے بعد

آج تک بام و در سسکتے ہیں
ساعت ہجرت مکین کے بعد

عابد سیال

نام بے نام ہو گئے کیسے
کام ناکام ہو گئے کیسے

جو تعلق تھے گوہر شفاف
شیشۂ خام ہو گئے کیسے

جو سخن تیرے میرے دل میں تھے
خلق میں عام ہو گئے کیسے

صبح نو کی شباہتوں والے
پرتو شام ہو گئے کیسے

اک نظر دیکھ شہر دل کی طرف
کوچہ و بام ہو گئے کیسے

وقت اپنے نقوش چھوڑتا ہے
کیسے گل فام ہو گئے کیسے

نثار جیراجپوری

افق سے تا افق رستہ نہیں ہے
یہ سورج اس لئے ڈھلتا نہیں ہے

شگوفے کس طرح کاٹوں جگر کے
جنوں کے ہاتھ میں تیشہ نہیں ہے

تمہارے شہر دل میں کیسے آؤں
کہ میرے ہاتھ میں ویزا نہیں ہے

یہاں پتھر کئی آباد تو ہیں
کوئی حد نظر شیشہ نہیں ہے

یہ سورج کیا اپاہج ہو گیا ہے
جو اپنے پاؤں پہ چلتا نہیں ہے

محاذوں کی جو باتیں کر رہا ہے
کوئی بھی معرکہ جیتا نہیں ہے

کرو کچھ اور باقی وار دل پر
کھلونا یہ ابھی ٹوٹا نہیں ہے

نثار جیراجپوری

جو میری سوچ میں صندل بسے ہیں
انھیں سے دل کے یہ جنگل بسے ہیں

انھیں سے رنگتیں ہیں بادلوں میں
جو تیری آنکھ میں کاجل بسے ہیں

لہو رستا بہت ہے پانیوں سے
یہاں ہر موڑ پر مقتل بسے ہیں

جو گزرے ساتھ پھولوں تتلیوں کے
نگاہوں میں وہی دو پل بسے ہیں

نہ آنکھوں کو چبھیں ساجن کی گلیاں
ابھی ان میں سکھی بابل بسے ہیں

نثارؔ آخر یہ کیسے ختم ہوں گے
مری راہوں میں جو دلدل بسے ہیں

شہاب صفدر

مصور جب مناظر خواب کے تصویر کرتا ہے
قلم فطرت کا حرفِ آفریں تحریر کرتا ہے

سخن کرتا ہے عکس دلربا سادہ سے لہجے میں
اُسے رنگوں کی خوشبو سے وہ پُر تاثیر کرتا ہے

تضادوں کو بیاں کرتا ہے نیلی پیلی سطروں میں
سیاہی سے نمایاں لفظ کی تنویر کرتا ہے

عجب فنکار ہے غم اور خوشی کے کھینچ کر خاکے
بیک لمحہ ہمیں [illegible]د اور دلگیر کرتا ہے

نمائش گہ میں ہے ہر چہرہ مثلِ حلقۂ حیرت
شہاب اک نقش گر آئینوں کو زنجیر کرتا ہے

([illegible] مشہور مصور صادقین ایوارڈ یافتہ مصور رجب خان کے نام)

شہاب صفدر

مہر گلیوں میں نہ غرفوں میں وہ مہتاب آئے
چھوڑ ہم جن کے لئے شہریت خواب آئے

اسی دکھ سے ہوئیں آئینے کی آنکھیں دھندلی
کتنے منظر تھے جو اک رَو میں تہِ آب آئے

ہر قدم اک نئی زنجیر نے روکا پھر بھی
زندہ رہنے کے نہ دیوانوں کو آداب آئے

ہم سے کم فہم ہوئے جن کے خم و پیچ میں گم
آنے والے انہیں راہوں سے ظفریاب آئے

ہاتھ سے چھوٹ گری زخم تمنا کی کتاب
سنسنی خیز کئی ایسے بھی ابواب آئے

اب کہ بہتا نظر آتا ہے مگر شہر وجود
یوں تو ہر سال مصیبت کے وہ سیلاب آئے

اجنبی دیسوں میں ہے ایک زمانے سے شہاب
دیکھیے کب اُسے یادِ صفِ احباب آئے

کاشف مجید

دہکتی آگ کو جب خاک پر اُتارا گیا
ہمیں پکارا گیا اور بہت پکارا گیا

ہمارا اور تمھارا ملال ایک سا ہے
اِدھر چراغ بجھا اور اُدھر ستارا گیا

بہت خلوص سے تُو نے عطا کیا تھا جو
وہ ایک خواب بھی مجھ سے نہیں گزارا گیا

عجیب جنگ یہاں پر لڑی گئی جس میں
نہ کوئی زندہ بچا اور نہ کوئی مارا گیا

مجھے خبر ہے، وہ میری طرف بھی دیکھتا تھا
مجھے خبر ہے، مگر مَیں نہیں دوبارہ گیا

کاشف مجید

جو خلقت سُن رہی ہے
کہانی آگ کی ہے
ذرا سی آگ مولا
بہت بے رونقی ہے
مَیں اُس کا لاڈلا ہوں
سو مَیں نے آگ لی ہے
دہکتی آگ ہے اور
کوئی بارہ دری ہے
یہ دریا آگ کا ہے
یہ کشتی آگ کی ہے
بہت سے پھول دے کر
ذرا سی آگ لی ہے
ہماری آگ ہم سے
کنارا کر رہی ہے
جو اُس کو مانتے ہیں
بس اُن کو آگ دی ہے
نظر آتی نہیں جو
اک ایسی آگ بھی ہے
کوئی بھی آگ کب تک
کہ ہر شے عارضی ہے

شہناز مزمّل

ہر اک منظر میں خود کو ڈھونڈتا ہے
ترا عاشق تماشا بن گیا ہے

نیا ہر زاویہ امید کا ہے
بھروسے سے بھروسہ اٹھ گیا ہے

فصیلِ جسم شاید گر رہی ہے
یہ دل پہلو میں اب رکنے لگا ہے

ہر اک بستی ہے اب صحرا کی صورت
مجھے ہی کیوں اکیلا کر دیا ہے

شبِ ہجراں شبِ قربت بنا دے
چراغِ نیم شب بجھنے لگا ہے

نمازِ عشق قائم ہو گئی ہے
ترا عاشق مکمل ہو گیا ہے

میں جو مانگوں گی وہ مجھ کو ملے گا
بتا کاتب ترا کیا فیصلہ ہے

شہناز مزمّل

مرے اندر تو اس کی روشنی ہے
تعلق جس سے میرا دائمی ہے

میں اپنے آپ کو کیسے سمیٹوں
اکائی ذات کی بکھری پڑی ہے

فصیلِ شب کا آنچل بھیگتا ہے
سحر کی آنکھ بھی کچھ شبنمی ہے

دیے امید کے بجھنے لگے ہیں
ہوا سے دوستی مہنگی پڑی ہے

مری پلکوں پہ تارے ٹوٹتے ہیں
کسی سے پھر بچھڑنے کی گھڑی ہے

دریچہ دل کا پھر سے کھولتی ہوں
سماعت پر مری دستک ہوئی ہے

کوئی آہٹ ہو لمحے جاگ جائیں
خموشی جان لیوا ہو گئی ہے

علی حسین جاوید

کسی کو زر تو کسی کو ہنر دکھائی دے
خیال و فکر سے عاری نظر دکھائی دے

وہ چھیڑتے ہیں بہاروں کے تذکرے بے سود
اُداس، صحنِ چمن میں شجر دکھائی دے

میں اُس کے نقشِ کفِ پا کو چوم لوں بڑھ کر
نسیمِ شوق کا منظر اگر دکھائی دے

کبھی تو بابِ اثر تک رسائی ہو اپنی
کبھی تو تیرہ شبوں کو سحر دکھائی دے

ابھی ہیں دشتِ وفا کی مسافتیں باقی
نگاہِ شوق میں پنہاں سفر دکھائی دے

ابھی تو امن کے قصے لبوں پہ ہیں مفقود
ابھی تو وقت کے نیزے پہ سر دکھائی دے

کہ دل کی آنکھ سے دیکھے اگر کوئی جاویدؔ
گلِ اُمید ہر اک شاخ پر دکھائی دے

علی حسین جاوید

میں کیسی رہ گزر پر گامزن ہوں
سمندر کے سفر پر گامزن ہوں

شبِ تاریک کی ظلمت چھٹے گی
میں اُمیدِ سحر پر گامزن ہوں

نہ جانے ختم کب ہو گی مسافت
صدائے بحر و بر پر گامزن ہوں

مجھے مل جائے گا فن کا خزینہ
رہِ عزمِ ہنر پر گامزن ہوں

کہ خاک و آب سے میری نمو ہے
ازل سے خشک و تر پر گامزن ہوں

علی جاویدؔ دشتِ آگہی میں
میں نادیدہ سفر پر گامزن ہوں

رانا مدثر ضیاء

کسی کتاب میں تھا اور نہ داستان میں تھا
عجیب سوز بھرے زخم کی زبان میں تھا

مَیں اک چراغ تھا دریائے ظلمتِ شب میں
مرا قیام کبھی ساحلی چٹان میں تھا

زمین ہی نے مجھے گود لے لیا ، ورنہ
ستارہ ساز نے رکھا تو آسمان میں تھا

مَیں سبز بخت کہ سویا ہوا تھا منزل پر
اٹھا تو دشتِ مسافت کے درمیان میں تھا

گرا دیا ہے اناؤں کی بادشاہی نے
جو ایک تاج محل نقش میرے دھیان میں تھا

سوال کرنے سے پہلے بھی انکشاف ہوا
مرا بچن تو کسی اور امتحان میں تھا

ضیاء پکارتا کس کو صدائیں کیا دیتا
میں چھت پہ پہنچا تو دریا مرے مکان میں تھا

رانا مدثر ضیاء

دیے پہلو بہ پہلو جاگتے ہیں
اندھیرے پھر بھی ہر سُو جاگتے ہیں

مَیں خوابوں کے تصرف میں نہیں ہوں
مری سوچوں کے جگنو جاگتے ہیں

ابھی سویا نہیں بختِ ولایت
ابھی سلطان باہُوؒ جاگتے ہیں

کسی کی یاد میں دھونی رمائے
کئی ہم ایسے سادھو جاگتے ہیں

مری آنکھیں تو اب پتھرا گئی ہیں
مگر پلکوں پہ آنسو جاگتے ہیں

فقیہہ وقت تھک کر سو گیا ہے
یہ پائل اور گھنگھرو جاگتے ہیں

ضیاء سارے دریچے کھول رکھنا
سنا ہے رنگ و خوشبو جاگتے ہیں

ابوبکر جمیل

دے چلا تجھ کو تجھے تجھ سے جدا ہوتے ہوئے
یہ وفا تو کر چلا میں بے وفا ہوتے ہوئے

اس نگر سے جانے کیوں ممکن نہیں ہے واپسی
اس نگر میں واپسی کا راستہ ہوتے ہوئے

کیا خبر تھی آپ سے بھی اجنبی بن جائیں گے
کیا سے کیا ہم ہوگئے ہیں کیا سے کیا ہوتے ہوئے

شام کا سورج تھا وہ اور میں سمندر کی طرح
مل گیا وہ میری لہروں میں مرا ہوتے ہوئے

رو دیا لگ کر گلے سے اس شجر کے آج میں
ہاتھ سر پر رکھ دیا اس نے بڑا ہوتے ہوئے

تو مجھے اور میں تجھے حاصل نہ کر پایا یہاں
تو مرا ہوتے ہوئے اور میں ترا ہوتے ہوئے

لگ رہا ہے شاعری کرنی پڑے گی اے جمیل
یہ گلی کے لوگ یہ آب و ہوا ہوتے ہوئے

(کوالالمپور)

یاسمین حبیب یاسم

جیون ایک پہیلی ہے
دنیا ساری اکیلی ہے

دل دروازہ کھلتا ہے
سونی جسم حویلی ہے

مایا پھر بھی مایا ہے
پیسہ ہے یا دھیلی ہے

سندر لمحے روتے ہیں
خواہش ایسے جھیلی ہے

کتنی پرانی اداسی ہے
پھر بھی نئی نویلی ہے

اک دل دے کر یاسم کو
ہم نے دنیا لے لی ہے

میل باکس

☆Dear Naseer Ahmed Nasir, A few days ago i received five copies each of your two excellent books, "Arabchi So Gaya Hai" & "Pani Men Gum Khvab". I thank you for these wonderful gifts. A little earlier, i got a copy of each of the above for my personal use. I thank you most cordially for them. Please send us 10 copies of the new Tasteer. You will be happy to know that "Tasteer" is liked here more than most other contemporary literary magazines. We sent you some books a few weeks ago and 5 copies of "Shab Khoon" are sent to you every month. Plese tell me whatever elso you want from here in exchange. Please send some of your poetry for "Shab Khoon" as soon as possible. Thanks. I should have written sooner but i was in hospital for some days & have generallly not been working through this whole month of January which has been unbelievably cold here. The doctor has ordered me not to move about even within the house while the cold weather persists. In fact am still somewhat unwell and do not work, spending nearly all my time in bed. I am not bedridden, It is just that my heart starts giving me trouble if i move about. Things will get better after the weather warms up. I hope you are well in every way, yours, with best regards.

(Shams-ur-Rehman Faruqi - Allahabad, India)

☆☆Dear Faruqi Sahib, It is shocking for all of us that you been hospitalized due to your heart problem. Whole the circle of our literary friends is praying for your health. I am suffering from the same problem. I was on the verge of By Pass operation but thank God, second opinion of doctors saved me from this horrible experience. May God bless you with a good health. Best Wishes from me and friends. (Naseer Ahmed Nasir)

☆ مجھے ڈاکٹر امجد پرویز صاحب نے آپ کی علالت کے بارے میں بتایا تو میں بہت پریشان ہوا۔ کئی بار ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی مگر رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ تاہم میں نے کل رات اور پھر آج صبح کتنی ہی بار ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ٹیلی فون خراب ہے۔ مزید انتظار اب ممکن نہیں، لہٰذا خط لکھ رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں، بائی پاس آپریشن تو اب عام ہے اور بے حد کامیاب بھی ہے۔ انشاء اللہ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کے دوست آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ میں بدستور پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ میری بیگم علالت کے کئی مدارج سے گزری ہیں اور گزر رہی ہیں۔ پچھلے دنوں ان کا Pathological fracture ہو گیا، ڈاکٹروں نے تین گھنٹے کے اپریشن میں ٹانگ کو جوڑ دیا۔ وہ ابھی بستر پر ہیں۔ میں اب پچھلے کئی ماہ سے لاہور ہی میں مقیم ہوں، کبھی کبھی ٹیلی فون پر اپنی خیریت کی اطلاع دے دیا کریں۔

(ڈاکٹر وزیر آغا۔ لاہور)

☆ گزشتہ دنوں شاہین کے فون سے معلوم ہوا کہ آپ اب راولپنڈی شفٹ ہو گئے ہیں۔ تازہ ''ارژنگ'' آیا تو اس میں آپ کا نیا پتہ دیکھا، غالباً آپ اپنا مکان بنا کر آباد ہوئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ خوشی کی بات ہے میری طرف سے مبارک باد! ویسے بھی میرپور کے مقابلہ میں راولپنڈی آپ کے حسب حال ہوگا، وہاں آپ کے دوستوں اور تسطیر کے قلم کاروں کا وسیع حلقہ موجود ہے یوں آپ میرپور کے مقابلہ میں زیادہ خوش، فعال اور مصروف رہیں گے۔ تسطیر کو اتنی تاخیر ہو چکی ہے کہ اب تشویش ہونے لگی ہے۔ اس بنجر عہد میں اچھے اور معیاری ادبی پرچے صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ایسے میں تسطیر کا دم غنیمت ہے۔ پھر ہندوستان میں بھی تسطیر خاصا مقبول ہے اس لیے اسے نظر بد سے بچا کر ہر حال میں جاری رہنا چاہیے۔ آپ جس طرح سے ادیبوں کو بحثوں میں شامل کر لیتے ہیں وہ جداگانہ اہمیت کا حامل ہے۔ میری نیک تمنائیں آپ کے لیے ہیں۔

(ڈاکٹر سلیم اختر۔ لاہور)

☆ جب سے رسائل میں آپ نے لکھنا شروع کیا ہے، اس وقت سے میں آپ کی شاعری کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ بلاشبہ اسلوب، لفظیات اور فکر کے اعتبار سے آپ منفرد ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب شاعری پامال راستوں کا سفر بن گئی ہو، اپنی راہ الگ نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ''تسطیر'' مل رہا ہے، شکر گزار ہوں۔ جب آپ نے پہلی بار رسالہ بھیجا تھا تو میں نے سالانہ قیمت کا چیک بھجوا دیا تھا اور ساتھ ہی عرض کیا تھا کہ جب یہ رقم ختم ہو جائے تو مجھے دفتر کی طرف سے مطلع کر دیا جائے میں مزید رقم بھیج دوں گا۔ مطلع فرمایئے کتنی رقم میری طرف واجب ہے۔ چونکہ میں رسالوں میں لکھتا نہیں ہوں، اس لیے جن پرچوں کو پڑھنا چاہتا ہوں، ان کی قیمت ادا کر دیتا ہوں۔

(مشفق خواجہ۔ کراچی)

☆☆ ''تسطیر'' بلا قیمت حاصل کرنے والے احباب کے لیے جناب مشفق خواجہ جیسی موقر ادبی ہستی کا یہ خط مشعل راہ ہے۔ امید ہے کہ احباب رسالہ خرید کر پڑھنے میں شرمندگی محسوس نہیں کریں گے۔ (ن۔ا۔ن)

☆ ''تسطیر'' کا نیا شمارہ حیدر جعفری سید صاحب نے بھیجا۔ آپ کا اداریہ اور ''تاریخ، ادب، تنقید اور نئی نظم'' پر بڑی اہم اور آگے غور کرنے والی بحث ہے۔ کتابوں کو آپ بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے

اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے ہم عصر لکھنے والوں کی تعریف اور تنقید دونوں ہی سے بچ کر چلنے لگے ہیں۔ حالانکہ ادب تو اعتراف اور اختلاف ہی کے راستے پر چلتا ہے۔ میری مختصر کہانیوں میں کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ رسالہ پوری طرح پڑھ کر دوسرا خط لکھوں گی۔ میری نئی کتاب ''بات پھولوں کی'' پریس سے آ گئی ہے۔ آپ کو جلد بھیجوں گی۔ **(جیلانی بانو- حیدر آباد، بھارت)**

☆ تسطیر کا تازہ شمارہ ملا۔ اس میں وہ ساری رعنائی اور دانائی ہے جو اس کا نشانِ امتیاز بن چکی ہے۔ اب اتنے مؤقر شماروں کے بعد اس کی مناسب ستائش مشکل نظر آتی ہے۔ ایلن ٹیری (Allen Terry) انگلستان کی ایک انتہائی خوبصورت اور ذہین مغنیہ تھی۔ برنارڈ شا اُس دور کا بہت مشہور اور معروف ڈرامہ نگار۔ ایک مرتبہ ایلن ٹیری نے شرارتاً لکھا۔ اگر ہم دونوں شادی کر لیں تو بچے کی شکل مجھ سے اور ذہانت آپ سے مل جل کر ایک جینیاتی کرشمہ ہو گی۔ شا نے جواب دیا کہ اگر اس کی شکل مجھ سے اور ذہانت آپ سے ملتی جلتی ہوئی تو یہ ایک حادثہ ہو گا۔ مجھے ایسے ہی حادثے کا خدشہ ہے۔ ممکن ہے میری تعریف (Poverty line) سے نیچے رہ جائے اور آپ کو یا قارئین کو دکھ ہو۔ مختصر یہ کہ تسطیر ایسا ہی خوبصورت اور باوقار ہے جیسے اس کے پیش رو۔ صرف ایک تبدیلی نظر آئی ہے کہ ہر گوشے کا عنوان خطِ نسخ میں چھاپ دیا ہے۔ نظم میں خواتین کو مردوں سے الگ کر دیا ہے۔ یہ Segregation اچھی نہیں لگتی۔ زندگی میں دونوں طبقے ایک دوسرے سے خاصے دور ہیں۔ کسی ادبی Document میں ان کا ملنا جلنا علیحدگی یا چار دیواری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اب تک صرف آپ کی دعائیہ نظم اور اداریہ پڑھا ہے۔ ''خدا خود بھی رو دے مجھے بھی رلا دے'' یہ نظم ۱۹۹۰ء میں لکھی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد کی دہائی میں عالمی سطح پر اتنے ظلم ہوئے ہیں کہ خدا نے ہمیں رلانے کے علاوہ شاید ہم سے اپنا رشتہ ہی توڑ لیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم ایک آزاد قوم ہیں۔ میں نے باقی تخلیقات کا ابھی مطالعہ نہیں کیا۔ شمارے کی وجاہت دیدنی ہے۔ میری ایک ہمسائی کہا کرتی تھی کہ جسے دیکھ کر لطف نہ آئے اسے کھا کر کیا لطف آئے گا۔ یہ گاؤں کی ذہانت کا اظہار تھا۔ دیکھنے میں کیونکہ تسطیر خوبصورت اور نظر نواز ہے اس لیے اس کا مطالعہ بھی انتہائی خوشگوار ہو گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے تساہل کی وجہ سے اپنی نظمیں بروقت نہ بھیج سکا۔ دیر سے آدمی دعوت میں آئے تو عام طور پر بھوکا رہ جاتا ہے۔ نہ چھپنے کا اتنا غم نہیں جتنا کہ برات میں عدم شمولیت کا۔ میری نظم کے عنوان کے متعلق آپ کی رائے بہت معقول ہے۔ شکریہ۔ تسطیر کے موجودہ شمارہ پر اپنی پُر خلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں اور سرورق کے ڈیزائن پر بھی۔ میں خوش ہوں کہ آپ اتنے مصروف ہیں یعنی صحت مند ہیں۔ میں اپنی ساری خباثتوں کے باوجود دعا کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اس لیے ہر نماز میں آپ کے لیے، محمود واجد کے لیے اور نعیمہ (جو شدید علالت میں گرفتار ہے) کے لیے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں۔ مجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جو ہر چیز پر قادر ہے میری دعائیں قبول بھی کرتا ہے یا التوا میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن مجھے ایمان کی حد تک یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت رحم کرنے والا ہے۔ خط طویل ہو گیا ہے۔ جس کے لیے شرمندہ ہوں۔ **(غلام جیلانی اصغر ...... سرگودھا)**

☆ ''تسطیر'' ملا اور آپ کی نظموں کا مجموعہ ملا ''عرا بھی سو گیا ہے''۔ آپ کی نظم کا شروع سے قائل ہوں۔ کتاب

ہاتھ میں لے کر محسوس ہوا جیسے جدید نظم کی صدی آپ نے ہاتھوں پہ رکھ دی! تسطیر میں پھر ایک چھوٹی سی نظم دے کر آپ نے مجھے حیران کیا اور مرید کر لیا۔ اس بار خط کے ساتھ کچھ نظمیں بھیج رہا ہوں، دیکھ لیجئے گا۔ جناب ستیہ پال آنند کا خط پڑھ کر جی بھر آیا۔ رضا صاحب نے دہلی جانے سے پہلے فون پہ مجھ سے بات کی تھی۔ اور مجھ سے اکثر پنجابی میں بات کرتے تھے۔ مزا لیتے تھے۔ بمبئی سے لدھیانہ گئے تھے جہاں انہیں ''شرومنی'' آوارڈ ملا۔ وہاں سے دہلی تشریف لائے ''پدم شری'' آوارڈ کے لیے اور بس...... ایک مفصل خط بعد میں ضرور لکھوں گا۔ لیکن آپ کی کچھ نظموں پہ نظر پڑ گئی۔ سبحان اللہ۔

''بتا میری آنکھوں کی ازلوں میں ٹھہرے ہوئے نم
تجھے کن زمانوں کی نیندوں نے گھیرا ہوا ہے......''
''...... وہ جس نے سمندر کے بھیگے سفر میں کہا تھا
محبت جزیرہ ہے، دکھ بادباں ہے......''

''مرگ بیچ'' بہت خوبصورت نظم ہے۔

(گلزار ۔ممبئی، بھارت)

☆ ہمیں یاد ہے کہ آپ تسطیر پابندی کے ساتھ بھیجتے تھے اور ہم بھی پابندی کے ساتھ اس کے لیے لکھتے تھے۔ اس کی سیکولر اور لبرل پالیسی موجودہ حالت میں بہت مفید تھی۔ نہ جانے کیوں یہ سلسلہ ٹوٹ گیا! پھر خاموشی کی ایک غیر اعلانیہ سیما بن گئی۔ اس بدلاؤ کے پیچھے کیا تھا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ ہو۔ اس چپ کو ''پانی میں گم خواب'' نے توڑ دیا۔ آپ نے شاعری کی ہے اور شاعری کا فن جن نزاکتوں، جس حسن کاری اور فضا بندی کا تقاضا کرتا ہے وہ آپ نے اسے دیا۔ اس پر ابہام کی دھند بھی آپ نے نہیں چھانے دی۔ اس کے پس منظر میں نظریئے اور اجتماعی شعور کی پرچھائیاں بھی ہیں جن کو ہم اپنے ذہن کی فوکسنگ کے ذریعہ سامنے اسکرین پر لا کر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس پر جس سنجیدگی کے ساتھ جم کر لکھنے کی ضرورت ہے اس کے لیے وقت چاہیے اور یہ وقت آپ کو دینا ہوگا۔ ''پانی میں گم خواب'' آج کے بین الاقوامی تناظر کو بھی گرفت کرتا ہے۔ اسی تناظر میں آپ سے کافی جونیئر شاعر روش ندیم کا مجموعہ ''شو بیبر پر لکھی نظمیں'' ان دنوں زیر نظر رہا۔ اب کہ آپ کا مجموعہ ملا اور اس کی پہلی خواندگی مکمل کی تو یہ تاثر ابھرا کہ

میں نے جو رسم فغاں کی تھی قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی رسم زباں ٹھہری ہے

تو محسوس ہوا کہ روش نے تو آپ ہی کے اسلوب اور طرز بیاں کا اتباع کیا ہے۔ ایک منفرد آواز کی کوکھ سے اگر دوسروں کی آوازیں جنم لینے لگیں تو منفرد آواز کی حیثیت کو سند مل جاتی ہے۔ اس مرحلہء شوق اور انداز جنوں میں ٹھہراؤ نہیں آنا چاہیے۔ میں آپ کو لمحہء موجود کی بین الاقوامیت کے تناظر میں اصغر گونڈوی کا جدید تر روپ کہوں گا۔ Vision کی Uniqueness اور تشکیلی و تمثیلی فضا بندی اور ایک عجیب جادوئی سا تاثر جو اصغر کے یہاں محسوس ہوتا ہے اردو کی شعری تاریخ میں ''پانی میں گم خواب'' سے پہلے تک دستیاب نہیں تھا۔ فیض تو سراسر کلاسیکی روایت میں رہے اور اپنے نظریاتی مقصد کو بھی ابہام کے دبیز پردوں میں چھپاتے چلے گئے۔ شاعری جس حسی ادراک، زبان کی نفاست و نزاکت اور جمالیاتی تناظر سے لطف اندوزی کا تقاضا کرتی ہے وہ آپ

نے اسے دے دیا ہے یہی بڑا جان لیوا کام بھی ہے۔ مجھے تو معلوم نہیں کیوں احساس ہوتا ہے کہ اصغر گونڈوی کی غزلوں میں جو تحیر، ناقابلِ بیان نشہ اور کیفیت اور ماورائی و مذہبی حسیت کا سیکولر مکالمہ ہے وہ کروٹ لے کر ''عرا بچی سو گیا ہے'' اور ''پانی میں گم خواب'' کے اندر سمٹ آیا ہے۔ Unique Vision غالب اور اصغر کے یہاں سے ہوتی ہوئی آپ تک آ گئی۔ اس حقیقت کا اظہار بھی بیشتر اُردو شاعروں کے لیے ہضم کرنا مشکل ہو گا۔

(پروفیسر ریاض صدیقی- کراچی)

☆ علی دانش کا شکریہ کہ انھوں نے میری تفہیم غالب پر توجہ فرمائی۔ مگر جناب یہ تو دوسرے شمس الرحمان فاروقی نظر آ رہے ہیں کہ علم تو بہت ہے مگر اس کا صحیح اطلاق نہیں کر پا رہے ہیں۔ نقطۂ نظر کا اختلاف اور چیز ہے اور بات کو سمجھنا ہی نہیں اور من مانی لکھتے چلے جانا دوسری بات ہے۔ دیکھ لیجیے یہ وہی ہجرت کا جدید تصور ہے جس کی پروفیسر ریاض صدیقی نے بہت تعریف کی تھی۔ آجکل مزے یہ آ رہے ہیں کہ ایک مضمون لکھ کر بیٹھتا ہوں تو غزلوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ اور یہ سن کر شاید آپ حیران ہوں کہ میں نے افسانے بھی لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ انتظار حسین سے میں نے کہا میری جان ہوشیار ہو جاؤ ادھر بھی توجہ فرما رہا ہوں۔ کہنے لگے ''تنقید اور شاعری کون سے تنگ میدان ہیں بلکہ اب آپ اپنی غزلوں کا مجموعہ جلدی سامنے لائیں یعنی شاعری کیا کریں''۔ سیدھی سی بات ہے بھائی یہ سب فرصت کی برکات ہیں۔ ایک طرف فرصت نے آغوش وا کی ہوئی ہے دوسری طرف ۷۷ سال کی عمر ہو گئی۔ ایک ایک لمحے کو کام میں نہ لایا جائے تو کتنی بڑی ناشکری ہے۔ میرے جلدی لکھنے پر لوگ اس طرف توجہ نہیں فرماتے۔ عمر بھر سوچتا رہا ہوں تو اب اسے باہر بھی نہ لے کر آؤں تو اور کیا کروں۔

(مشکور حسین یاد ... لاہور)

☆ آپ نے اچھا کیا کہ اقتدار جاوید پر تعارفی نوٹ لکھا۔ اقتدار جاوید کو نظم تعمیر کرنے کا سلیقہ ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے بیشتر ہم عصروں سے ممتاز ہے۔ اگر اپنی کارکردگی سے مطمئن نہ ہو گیا تو کسی مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ ''سویرا'' کو دوبارہ شائع کرنا شروع کیا ہے۔ کسی وقت کلام کی فرمائش کروں گا۔

(محمد سلیم الرحمن- لاہور)

☆ ''تسطیر'' کا شعبۂ منظومات خاصا کمزور جا رہا ہے۔ اسے مزید کمزور کرنے کے لیے یہ چار تازہ غزلیں ارسال ہیں۔ شاید آپ انھیں اکٹھے چھاپنا پسند کریں۔ میرے حساب سے میری ایک غزل آپ کی فائل میں پہلے سے موجود ہے۔ آپ لاہور آتے ہیں تو مجھ سے نہیں ملتے۔ شاید کسی سے بھی نہ ملتے ہوں۔ خوش رہیے!

(ظفر اقبال- لاہور)

☆ تسطیر کا نیا شمارہ ملا۔ بہت معیاری پرچہ آپ نے نکالا ہے۔ جی خوش ہو گیا۔ اس دور میں جب ادبی خلوص میں ملاوٹ عام ہو گئی ہے آپ کے رسالے میں ادب کے خالص رشتے باقی و زندہ ہیں۔ ساتھ میں آپ نئے رجحانات کو بھی اہمیت دے رہے ہیں۔ اداریے میں آپ نے ''عصری آگہی'' پر زور دیا ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جسے تخلیقی سطح پر ادیبوں اور شاعروں کو سمجھنے اور اپنانے کی ضرورت ہے۔

(ڈاکٹر جمیل جالبی- کراچی)

☆ میں ''پتلی پیکنگ کی'' کا پیکٹ آپ کے لیے تیار کر چکا تو آپ کا خط بھی آ گیا۔ کسی بھی تحریر کے لیے آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ''تسطیر'' میرا اپنا ہے۔ مظہر الاسلام کی فرمائش پر ایک سندھی اخبار کے لیے میں نے اپنے کرداروں کے حوالے سے ایک تحریر لکھی ہے۔ چونکہ یہ سندھی میں شائع ہوگی اس لیے اگر ''تسطیر'' میں جگہ پا جائے تو مضائقہ نہیں۔ بلکہ یہ باقاعدہ سلسلہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر بار کسی ناول نگار یا افسانہ نگار سے کہا جائے کہ وہ اپنے کرداروں کے بارے میں ''تسطیر'' کے لیے لکھے۔ یوں نثری ادب کی کم تو جگی کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

(مستنصر حسین تارڑ۔ لاہور)

☆ ''تسطیر'' میں آپ نے کتابوں پر تبصروں کا باقاعدہ سلسلہ شروع نہیں کیا۔ نئی کتاب پیش خدمت کر رہا ہوں۔ اگر اس پر تبصرہ کر سکیں یا کروا سکیں تو مجھے کچھ نئی روشنی مل سکے گی۔ تبصرے ادبی پرچے کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ لکھنے والوں کو اس سے محروم نہ رکھیں۔

(۲)

آپ کے والد گرامی کی وفات کا پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ میں ایصال ثواب کے لیے فاتحہ پڑھ کر ان کے لیے دعا کر رہا ہوں۔ میرا چھوٹا بھائی اپریل میں فوت ہو گیا تھا۔ یہ سانحہ میرے لیے ایسے ہی تھا جیسے نیویارک میں ایک بہت بڑا ٹاورزمیں بوس ہو گیا، میں ابھی تک اس صدمے سے نہیں نکل سکا۔ اسی دوران انجائنا کا ایک شدید حملہ ہو گیا اور اب مسلسل چار ماہ سے ڈاکٹروں کی نگرانی میں ہوں۔ ''تسطیر'' کی اشاعت میں تاخیر پر فکر مندی ہے۔ ادبی پرچے کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ ایک بات واضح ہے کہ گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں ''تسطیر'' نے اہل ادب کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ آپ اس کی اشاعت منقطع نہ کیجیے بلکہ اپنے وسائل کی حدود میں لانے اور باقاعدگی سے چھاپنے کا اہتمام کیجیے۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں اور دارالحکومت میں منتقلی آپ کے لیے سودمند ثابت ہو۔

(ڈاکٹر انور سدید۔ لاہور)

☆ سب سے پہلے تو آپ کے والد گرامی کے انتقال پر اظہار تعزیت۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ پھر آپ کو پنڈی منتقل ہونے پر خوش آمدید۔ اللہ کرے یہ تبدیلی آپ کو راس آئے اور آپ کی صحت بہتر ہو جائے۔ مجھے آپ کی نظمیں اچھی لگتی ہیں۔ ایک تو یہ فارسی زدہ اور ابہام کا شکار نہیں ہوتیں، دوسرے عام فہم ہونے کے باوجود گہری معنویت، اور لطافت اور بلاغت کی حامل ہوتی ہیں۔ ان میں عہدنو کا پورا انسان دکھائی دیتا ہے۔ عنوانات فوراً ہی دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ کسی اچھی تخلیق کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ اسے پڑھ کر آپ کے اپنے اندر تخلیق کی موم بتی سی روشن ہو جائے اور آپ کا جی چاہنے لگے کہ فوراً لکھنے بیٹھ جائیں۔ آپ کی نظمیں پڑھتے ہوئے میں نے بارہا اپنے اندر ایسا ہی تخلیقی اضطراب محسوس کیا۔ بھلا 'بہت دور ایک گاؤں' پڑھ کر بچپن اور گاؤں کیسے یاد نہیں آئے گا؟ آپ اداسی سے کیسے بچ پائیں گے؟ نظم 'پانی میں گم خواب' کا ردھم اتنا دلنشیں اور خوبصورت ہے کہ مجھے زبانی یاد ہوگئی ہے۔ ویسے بھی یہ ایک ایسی نظم ہے جسے ہر کسی کو یاد کر لینا چاہیے۔ امن، سلامتی اور خوشحالی کے خوابوں کے ٹوٹنے کا اتنا بڑا اندیشہ اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ بعض نظموں میں خوبصورت افسانے پوشیدہ ہیں۔ آپ کی نظموں میں لفظوں کا صوتی آہنگ اور امیجری بھی

قابلِ تعریف ہے۔ انگریزی لفظیات اور تراکیب پر مشتمل عنوانات آپ کے ہاں فیشن یا مرعوب کرنے کے حربے کے طور پر نہیں آئے بلکہ یہ ہم عصر زندگی اور جدید حسیت کو واقعیت اور جامعیت کے ساتھ گرفت میں لینے اور پیش کرنے کے لیے علامتوں اور استعاروں کی صورت میں آئے ہیں۔ مثلاً ''ویپ ہولز'' کی معنویت اور تاثیر سے سول انجینئرنگ سے متعلق آدمی بہتر طور پر لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ اللہ کرے آپ اسی تاب و توانائی سے فکر انگیز اور خوبصورت نظمیں لکھتے رہیں۔ **(منشا یاد - اسلام آباد)**

☆ گزشتہ دنوں حضرت مشفق خواجہ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ اچانک انھوں نے آپ کی شاعری کا تذکرہ چھیڑ دیا، آپ کی نظم نگاری کے بارے میں انھوں نے جو highest ریمارکس دیئے اور جس بے پناہ پسندیدگی کا اظہار کیا، اس سے مجھے دلی مسرت ہوئی۔ مشفق خواجہ ادبی آراء کے سلسلے میں بہت کھرے اور شمشیر بُراں قسم کے آدمی ہیں، بہت کم شعراء کو خاطر میں لاتے ہیں، آپ کی شاعری کی مدحت اُن کی زبانی سُن کر میرا اس بات پر یقین اور پختہ ہوگیا کہ سچے حرف کبھی ضائع نہیں جاتے، آپ جیسا گوشہ گیر شخص جو محض لفظ لکھنے اور انہیں چھپوانے پر یقین رکھتا ہے اور ہر طرح کی جھوٹی شہرت طلبی اور جعلی ادبی سماجیات سے کوسوں دُور ہے، محض اپنے شاعرانہ تجربے کی صداقت اور اپنی تخلیقی انفرادیت کے سبب ہمارے عہد کے ادب پڑھنے والوں کے دلوں پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور یاد کیجئے گا۔ **(فراست رضوی - کراچی)**

☆ عرصہ سے آپ نے سہ ماہی تشکیل کے لیے نظمیں ارسال نہیں کیں۔ آپ کا کیا خیال ہے! افغانستان پر امریکہ کا حملہ اور امریکہ کے خانگی حالات کی ناگوار تبدیلیوں سے ستیہ پال آنند، احمد سہیل اور افتخار نسیم (افق) کس حال میں ہوں گے! جو لوگ اردو ادبی رسائل سے مالی رابطہ رکھتے تھے، اب وہ کیسے نبھائیں گے! میں بڑی مشکل سے سہ ماہی تشکیل شائع کر رہا ہوں۔ آپ کے تو احباب زیادہ ہیں جب کہ میرے دشمن زیادہ ہیں۔ پھر بھی میں اپنا کام تو کر ہی رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ آپ نے تسطیر کے گذشتہ شمارہ میں صلاح الدین پرویز کے نام سے ''کتاب عشق'' سیریز میں نظمیں شائع کیں۔ مگر شائد آپ کو خیال نہیں رہا کہ ''کتاب عشق'' میرے مکتبہ تشکیل پبلشرز کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے شعری مجموعہ: شاعر عباس حیدر زیدی کا اشتہار گذشتہ کئی سال سے تشکیل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ظاہر ہے، یہ ادبی دیانت کا تقاضہ ہے کہ میں نے تشکیل کے حالیہ شمارے ۴۲-۴۰ کے اداریہ میں اور ریجنل اور نقل دونوں کے فرق کو ظاہر کر دیا ہے۔ براہ کرم تسطیر کے آئندہ شمارے میں کتاب عشق کے معاملہ کو جگہ دیجئے۔ یہ بھی درست ہے کہ صلاح الدین پرویز سے مفاہمت نہیں ہو سکے گی۔ آپ سے ایک درخواست ہے کہ ایک نئے کہانی کار ارشد رضوی کی بیس کہانیوں کا مجموعہ پڑھ کے چار پانچ سطروں پر مشتمل فلیپ لکھ دیجئے ارشد رضوی آپ کے مداح ہیں۔ **(احمد ھمیش - کراچی)**

☆ ''آئندہ'' کے روزِ اوّل سے ہمارے تعلقات رہے ہیں جس میں آپ کے مشورے، تعاون اور خلوص کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ اس لیے میرے لیے بڑی سبکی کا باعث ہوتا ہے کہ کوئی شمارہ آپ کی تخلیقات کے بغیر شائع ہو جائے۔ بہت تاخیر کے باوجود آپ نے توجہ نہ دی تو پرچہ پریس کے حوالے کرنا پڑا۔ میں اس سلسلے میں شروع سے بہت واضح رہا ہوں کہ جینوئن لکھنے والوں کی مستقل پذیرائی اور ان کے کاموں کا ان کے سامنے اعتراف

(ان کی زندگی میں ہی) ہونا ضروری ہے اور عملاً یہی کیا۔ ادھر آپ کے یہاں (تسطیر میں) ایک مضمون میرے بھائی مرزا حامد بیگ کا چھپا ہے، بہت خوب، انہیں اختیار ہے کہ اپنے ممدوح انتظار حسین کو سر پہ بٹھائیں پر بے سبب دوسروں کو گرائیں نہیں۔ یا تو وہ افسانہ نہیں سمجھتے یا چند لوگوں کے علاوہ کسی اور کو پڑھنا نہیں چاہتے۔ اللہ ان پر رحم کرے۔ اپنے قاعدے کے مطابق (جہاں سے میرا اختلاف ہوا ہے) یہی مضمون دہلی کے ''قصے'' میں چھپا ہے۔ اور میری بنیادیں سرحد پار پیدائش اور ادبی نشوونما کے سبب زیادہ گہری ہیں۔ سونقصان کا سوچیے۔ سانحہ مشرقی پاکستان پر جدید انداز میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ریکارڈ پر ہے، کچھ بھجوا رہا ہوں، اگر ممکن ہو تو پروفیسر جیلانی کامران یا ڈاکٹر وہاب اشرفی یا دونوں کے مضامین اور میرے افسانے اپنے یہاں شائع کردیں تاکہ ان کی بنائی ہوئی دھند چھٹے۔ **(محمود واجد-کراچی)**

☆ تازہ ''تسطیر'' موصول ہوا۔ احباب سے اس کے آنے کی خبر سن چکا تھا اور منتظر تھا کہ رسالہ آئے تو ذرا نئی تحریروں سے استفادے کی صورت پیدا ہو۔ اب رسالہ پہنچا ہے تو اشتیاق کے ساتھ ادھر اُدھر سے کچھ چیزیں دیکھی ہیں۔ آپ بہت محنت اور لگن کے ساتھ بہت مشکل زمانے میں ایک اچھے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ادب کی مکمل پسپائی کے ذکر پر بڑھ چڑھ کر گفتگو کرنے والوں کے لیے سنجیدہ ادبی اسالے جن میں ''تسطیر'' بھی شامل ہے ایک دستاویزی جواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ **(افتخار عارف۔ اسلام آباد)**

☆ آپ کا ضخیم وعظیم پرچہ ملا، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو عمل تسخیر آتا ہے۔ اکیلا وکیلا آدمی ایسے تحیر خیز کارنامے کیسے انجام دے سکتا ہے۔ الہ دین کا کھویا ہوا چراغ کہیں سے آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ جس کا تابع جن ہر وقت آپ کے اشارۂ ابرو کا منتظر رہتا ہے۔ آپ جو کام کررہے ہیں وہ کشف وکرامت سے کم نہیں۔ اردو زبان وادب کو ایسے ہی ''فرزانہ دیوانوں'' کی ضرورت ہے۔ میری کچھ چیزیں شاید آپ کے پاس ہیں۔ اگر فرمائیں تو کچھ اور بھیج دوں.....طبعزاد؟ ترجمہ؟ **(عبد العزیز خالد- لاهور)**

☆ بشریٰ اعجاز صاحبہ سے تسطیر کا نیا شمارہ مل گیا۔ کچھ کاپیاں دوسروں کے لیے ہیں، میں ہفتہ دس دن کے لیے دلّی سے باہر جا رہا ہوں۔ واپس آجاؤں تو ان سب کو بھجوا دوں گا۔ ابھی سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ سفر میں پڑھوں گا۔ **(شمیم حنفی-دلی، بھارت)**

☆ آپ ان چند نظم نگاروں میں سے ہیں جن کے یہاں غضب کی شگفتگی ہے۔ آپ کا ڈکشن اور لفظیات بڑی حد تک مختلف ہیں۔ میں آپ کی نظمیں بڑی توجہ سے پڑھتا ہوں اور محظوظ ہوتا ہوں۔ صلاح الدین پرویز ہمارے یہاں محمد علوی اور ندا فاضلی کے بعد کی نسل کے منفرد شاعر ہیں۔ پاکستان میں آپ مجھے بہت مختلف لگتے ہیں۔ افضال سید، ذیشان ساحل اور انور سن رائے کو میں اہم نظم نگار مانتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ نظمیں پاکستان ہی میں لکھی جارہی ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں تو میرے احباب سخت خفا ہوتے ہیں۔ انوار فطرت صاحب کو پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب پڑھوں گا۔ اچھا کیا جو آپ نے مجھے ان کا مجموعہ بھیج دیا۔ اگر میں یہ کہوں گا تو آپ شاید یقین نہ کریں گے کہ انوار فطرت کی کتاب جیسا جاذب نظر سرورق میں نے آج تک کسی اردو، ہندی اور مراٹھی کتاب کا نہیں دیکھا۔ کمال کا سرورق ہے۔ راحت سعید صاحب اور انوار فطرت صاحب

کومیری دلی مبارک باد۔ میں دراصل ایک کمزور سا مصور بھی ہوں اس لیے تصویروں کے رنگوں سے سرگوشی میں گفتگو کر لیتا ہوں۔ آپ کی نظمیں ''نیا ورق'' ۔۱۶ میں شامل کر رہا ہوں۔ نیا ورق آپ تک پہنچا یا نہیں ضرور لکھیں۔ مناسب سمجھیں تو e-mail کرنے کی زحمت کریں۔ نیا ورق نمبر ۱۸ کے لیے آپ کی کم از کم دس نظمیں درکار ہیں۔ یہ نظمیں آپ ڈیڑھ ماہ بعد یعنی اپریل کے اوائل تک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ شکریہ۔ ''تسطیر'' برابر مل رہا ہے آپ بڑی توجہ سے پرچہ نکالتے ہیں۔ جی خوش ہو جاتا ہے۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

(ساجد رشید ...... ممبئی، بھارت)

☆ تسطیر کے تین شمارے ملے۔ ایک ساتھ تین شمارے پا کے مجھے ایسا لگا جیسے کوئی خزانہ میرے ہاتھ آیا ہو۔ پہلے تو تینوں کے سرورق زبردست تصویر کشی لگے۔ بے چارگی کے مجسمے کے پس منظر میں پھیلتا ہوا بادل کتنا معنی خیز ہے (شمارہ ۱۱-۱۲)۔ بنجر کے نیلے پر جھاڑی کا بادل سے گلے ملنا اور بھٹے جیسے دو پیڑوں کی چھاؤں کا ایک دوجے میں merge ہو جانا، پراکرتی اور پُرش کے فلسفہ جیسا لگا۔ کہاں کہاں سے خوبصورتیوں کو سمیٹتے ہیں آپ، کیا زندگی نے آپ کے Perceptions کو کوئی خاص Training دی ہے یا پھر چیزوں کو یوں Conceive کرنے کے لیے (آپ کی نظمیں) کوئی خاص Mental Tuning ہوتی ہے آپ کی؟ تسطیر کی اتنی خوبصورت تخلیقات سامنے ہیں کہ سونے کا بھی جی نہیں کرتا حالانکہ کل صبح کی فلائٹ سے دلی جانا ہے۔ سفر اور کام کو میں زندگی کی علامت سمجھتی ہوں۔ لیکن زندگی کا حسن آپ ہی کی آنکھ میں کہیں چھپا ہوا ہے جو آپ کی نظموں کی صورت میں نزول ہوتا ہے۔

(۲)

پچھلے چند ماہ سے ب سے مسائل میں الجھی رہی اور کوئی چھ مہینے دلی میں گزرے۔ ایک روز صلاح الدین پرویز کے ہاں ''استعـ کے آفس میں میرے نام پوسٹ کیا ہوا آپ کا مجموعہ کلام اور ''تسطیر'' آ گئے۔ اور صلاح الدین پرویز آپ کے متعلق باتیں کرنے لگے تو اچھا لگا۔ شکر گزار ہوں آپ کی، خاص طور پر ''تسطیر'' میں میرے لیے نظم بطور خاص چھاپنے پر۔ آپ کی نظموں کی کھنک میرے یہاں گونج رہی ہے۔ آپ کی نظموں کی جو سطریں ہیں کسی سیک نے ''کسی نکور سے کم نہیں!'' ''میں سوچتی ہوں'' کے پیش لفظ میں میں نے لکھا تھا کہ وجودی صورت حال کی تپش کو تجرباتی سطح پر محسوس کرنے کی ادا نظم کہلاتی ہے۔ نصیر ناصر صاحب! وجودی صورتِ حال کی ٹوٹن کو سہلانے والی ادا کو کیا کہتے ہیں؟ آپ کی نظم......؟

(ڈاکٹر شبنم عشائی – ٹیر پتن، کشمیر)

☆ میں بہت شرمندہ ہوں کہ پچھلے شمارے پر اپنے تاثرات قلمبند نہ کر سکا۔ آپ جانتے ہیں ایک مدیر کن کن جنجالوں میں پھنسا رہتا ہے۔ میں بھی اپنی تگ و دو میں الجھا رہتا ہوں۔ ''شیشۂ'' نے مجھے کھنڈر بنا کے رکھ چھوڑا ہے۔ آپ قابل ستائش ہیں کہ اس قدر ضخیم اور خوبصورت پرچہ شائع کرتے ہیں اور اپنے (اندر کے) تخلیق کار کو بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ مزید براں نثری نظم کے حوالے سے مباحث کا سلسلہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ کہیں آپ کو روحانی طاقت تو حاصل نہیں ہے۔ یا جنات کو قابو میں کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو نظر بد سے

بچائے۔ مجھے اپنے پرچے ''شیش'' کے لیے اس شمارے میں کئی چیزیں کام کی لگ رہی ہیں۔ لیکن ایک وقت یہ ہے کہ آپ کے ہاں اتنے ضخیم رسالے شائع ہوتے ہیں کہ ''شیش'' کا کشکول ان کے لیے ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ یہاں ہندی حلقہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ سرحد کے اس پار کیا کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اردو کے کچھ لوگ اس بات پر بھی معترض ہیں کہ یہاں کے مدیران نے پاکستانی ادب کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ میرا کام نہایت مشکل ہے کہ دونوں طرف کے ادب میں توازن رکھنا ہے۔ کاش 'شیش' کی طرح دو چار رسالے اور بھی ہوتے تو اردو ادب کی اصل صورت سامنے آتی۔ اس وقت یہ خدشہ لاحق ہے کہ ہندی والے کہیں ''شیش'' میں شائع تخلیقات سے اپنی آرا نہ بنالیں۔ اس شمارے میں غزالہ خاکوانی کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی۔ مزید حیرت تب ہوئی جب مشمولات میں غزالہ کو بھی دیکھا، ان کی ایک غزل میں نے بھی ''شیش ۔۲۲'' میں شائع کی ''طویل ظلمت جو ہم نے کاٹی''۔ نثری نظم کے حوالے سے آپ کا اداریہ اور اس پر مقتدر اصحاب کے مباحثے پر میری نظر ہے۔ دیکھئے کب میں ہمت کر پاتا ہوں۔ **(حسن جمال - جودھپور، بھارت)**

☆ تسطیر میں نظموں کی شمولیت کے لیے ممنون ہوں۔ خطوط کے کالم میں قارئین کے ردِ عمل پر بھی نظر پڑی۔ تسطیر خوب جا رہا ہے۔ ہندو پاک کے بہت کم رسالے اب اس کے مقابل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ایک طویل نظم اور ایک افسانہ کے ساتھ حاضر ہو رہا ہوں۔ میرے منظوم ناول (تقریباً ساڑھے چار سو صفحات) کی کتابت اختتام پر ہے۔ اسی سال شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کی دعا اور نیک خواہشات کا طلب گار ہوں۔

(صدیق عالم - کلکتہ، بھارت)

☆ آپ نے تو حصہ نظم پر ایسی باکمال اور خوبصورت شاعرات کے کلام بلاغت نظام کا میلہ لگا دیا کہ پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ ہماری خواتین بھی کس تازگی اور شگفتگی سے لکھتی ہیں اور ان کے لفظوں کے پیچھے کیسے کیسے دلکش تجربات بولتے ہیں۔ ادا جعفری، ناہید قاسمی، ثمینہ راجہ، شاہین مفتی، بشریٰ اعجاز، پروین طاہر، ناہید قمر، ترنم ریاض، شہناز نبی، رخشندہ نوید، نعیمہ ضیاالدین، رخسانہ صبا، ثروت زہرا، سحر علی کس کس کا نام لکھیں کس کس کو چھوڑیں۔ سبھی نے تسطیر کی دلکشی میں اضافہ کیا۔ اردو تنقید تاریخ کے جبر کا شکار ہے، آپ کے اداریے پر ڈاکٹر سلیم اختر اور ستیہ پال آنند کے ردِ عمل کشادگیٔ ذہن اور تازگیٔ فکر مہیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناصر عباس نیر ، ارشد نعیم، فہیم شناس کاظمی، حامد سراج، ابوالمعانی عصری کی تحریریں بھی بڑی فکر انگیز ہیں۔ سبھی نے موضوع کے بارے میں دل کھول کر بحث کے نئے نئے دروازے کھولے ہیں۔ **(محسن احسان - پشاور)**

☆ تسطیر اب اتنا وقیع ہو گیا ہے کہ اس میں لکھنے کی ہر اچھا شاعر ادیب خواہش کرتا ہے۔ یہ نئے خیالوں اور نئے طرزِ ادا کا پرچہ ہے جو دور دور تک پڑھا جا رہا ہے۔ انشائیے کی کمی تھی جو آپ نے اب کے پوری کر دی۔ آپ جانتے ہیں میں آپ کی شاعری کا مداح ہوں اور یہ از راہ دوستی نہیں از راہ شاعری ہے۔ نظم کے علاوہ میں آپ کے ہائیکوز کا بھی مداح ہوں۔ مراسلت میں میرے خط کے جواب میں آپ نے اپنے ہائیکوز کی مقبولیت کی جو تفصیلات لکھیں ان سے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ آپ نے اچھا کیا کہ یہ تفصیلات سامنے آگئیں۔ میرے ہائیکوز اور آپ کے ہائیکوز میں اگرچہ مضامین مختلف ہیں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ کے

بعض مصرعے میرے ہائیکوز کے میں آگئے ہیں یا ان کی پرچھائیاں آگئیں۔ یہ آپ کے ہائیکوز کے وہ اثرات ہیں جو آپ کے قارئین کے ذہنوں میں رہ جاتے ہیں۔ ''سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری'' پر آپ نے اچھی باتیں کہی ہیں اور درس گاہوں میں قابل عمل ہیں۔ اس لیے یہ باتیں توجہ طلب ہیں۔ اختر رضا سلیمی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری طرف سے وضاحت کر دی۔ سلیم اختر کا سفرنامہ بہت دلچسپ ہے اور اوریجنل ہے۔ ان کا اسلوب بھی پر لطف ہے، سپاٹ نہیں۔ یہ سفرنامہ اچھی نثر میں ہے اور معمولات کی زندگی سے بہت قریب ہے۔ غزلوں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

(اکبر حمیدی- اسلام آباد)

☆ آپ کا رسالہ ''تسطیر'' بڑی سرعت سے ارتقائی عمل میں سے گزر رہا ہے۔ آپ نے مسلسل کوشش اور توجہ سے اسے خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ اب یہ اردو دنیا کے منفرد جرائد میں شمار ہوتا ہے۔ آپ کو اپنی اس کاوش میں معاصر ادب کے مشاہیر کا تعاون بھی حاصل ہے۔ آپ کی اپنی شعری تخلیقات بڑے تواتر سے رسائل و جرائد میں شائع ہو رہی ہیں۔ نظم کے میدان میں آپ کا کام بہت وقیع اور پائدار ہے۔ میرے خیال میں جدید نظم کا کوئی بھی تذکرہ آپ کے ذکر کے بغیر ادھورا ہوگا۔ شمارہ زیر نظر کی ترتیب و تدوین مثالی ہے۔ پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھاریوں کی ایک معتد بہ تعداد اس ایڈیشن کا مابہ الامتیاز ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کسی وقت یہاں ایک ادبی مجلس کا انعقاد کیا جائے جس میں ''تسطیر'' کے چند ممتاز قلمی معاونین کو آپ کی سربراہی میں مدعو کیا جائے۔ اور قارئین و شائقین ادب سے ان کی ملاقات کرائی جائے۔ آپ اپنی رائے سے مطلع کیجیے گا۔

(محمد افسر ساجد- فیصل آباد)

☆ کہیں سے آپ کا ایڈریس ہاتھ لگا ہے۔ عرض یہ ہے کہ اگر آپ کے معاشی حالات اجازت دیں تو آئندہ کے لیے مجھے [illegible] مہ دتسطیر اعزازی طور پر جاری فرمادیں۔ گزشتہ رسالہ بھی بھجوا دیں تو نوازش ہوگی۔ مجھے آپ کے ذاتی خط کا انتظ[illegible] رہے گا۔

(۲)

خط ملا، گویا آپ ملے، تسطیر کا ایک شمارہ منگوایا تھا آپ نے تین بھجوا دیے۔ اب دو تین ہفتے کی آئندہ تنہائی کے دوست میسر آگئے ہیں۔ میری عمر ۸۷ برس ہے۔ صحت ڈانواں ڈول رہتی ہے۔ فقیر گوشہ نشین ہوں۔ میں نے آپ کے خط کی تحریر میں جھانک کر دیکھا ہے۔ آپ بلاشبہ ایک بہترین انسان ہیں، دھڑے بندی سے الگ ہیں۔ کبھی کبھی خط لکھ دیا کریں۔ آپ کی نظم گوئی قابل تحسین و ستائش ہے۔

(بیدل حیدری- کبیر والا)

☆ ظفر اقبال کی غزل سب سے آگے آگے جا رہی ہے۔ ہراول دستے میں امجد اسلام امجد، محسن احسان، مظفر حنفی اور کرشن کمار طور ہیں اور ان کے شانہ بہ شانہ ممتاز اطہر، خاور اعجاز، عالم خورشید، احمد حسین مجاہد اور قاضی اعجاز احمد محور بھی اپنے مطلوبہ ہدف کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ نظم صہبائی اور ظہیر غازی پوری کے اشعار میں بحر کے سقم موجود ہیں اور زم کا عنصر بھی۔ انفرادی مطالعہ کے تحت ثمینہ راجہ اور شہاب صفدر کی غزلیں آپ نے دی ہیں۔ اگرچہ یہ غزلیں بڑی مربوط افکار اور مضبوط اشعار ہیں، مگر یہ قاری کے دامن کو نہ ہی پکڑتی ہیں اور نہ ہی جکڑتی ہیں۔ صرف اپنی قادر الکلامی اور خوش گوئی کا احساس دلاتی ہیں، ثمینہ کی غزلوں سے متعلق یہی تاثر دل میں

جاگتا اور سہاگتا ہے کہ یہ کسی منجھی ہوئی شاعرہ نے لکھی ہیں، پروین شاکر کی طرح، نسوانی لہجہ کی لطافت یہاں ثقافت نہیں ہو سکی۔ شہاب صفدر بھی غزل کو کسی نئے نگر اور علیحدہ ڈگر سے آشنا نہیں کرا سکے۔ اچھا شعر کہنا اور بات ہے اور اسے نئے شعری تقاضوں میں صراط کرنا اور واردات ہے جو یہاں درجات نہیں ہو سکی۔ آپ نے اچھا کیا خواتین کی نظموں کو ایک علیحدہ پورشن میں سربند کر دیا۔ اس سے ان کی گندھ اور سگندھ دو چند ہو گئی ہے۔ دل پسند نظموں میں ادا جعفری، شاہین مفتی، پروین طاہر، ناہید قمر، شاہدہ لطیف اور نعیمہ ضیاالدین کی نظمیں ہیں۔ بشریٰ اعجاز کی نظم ''چلے جانا'' کے سریر میں آپ کی نظم ''اجنبی کس خواب کی دنیا سے آئے ہو'' کے جاپ اور الاپ تنویر ہو رہے ہیں، میں اسے سرقہ تو نہیں کہہ سکتا توارد ہی کہوں گا۔ مگر یہی توارد کچھ آگے بڑھ کر مجید امجد کی نظم ''دستک'' تک جا پہنچا ہے۔ محمد صلاح الدین پرویز کی نثری نظمیں اپنے گیان استھان کے ایک اعلیٰ نروان کی پہچان پر براجمان ہیں۔ اپنی یکتائی اور کبریائی کے ساتھ اور ان نظموں کا ہر تصور، ظہور ہو کر اپنی ایک خاص شعری پارسائی کی طرف رسائی کے لیے بڑھ رہا ہے۔ ساتھ ساتھ ہی آفتاب اقبال شمیم، ابرار احمد، احمد سہیل، نجمہ منصور، شبنم عشائی، شہناز نبی، فہیم شناس کاظمی، خالد ریاض خالد اور اسماء رابعہ کی نظمیں اپنی فنی دلربائی کو مکمل رعنائی عطا کر رہی ہیں۔ اور پھر آپ کی نظم ''کاغذ کی تنہائی'' اپنے اندر اتنی جلوہ سامانی رکھتی ہے کہ ذہن کی وجدانی کیفیتوں کو مسلسل غیر فانی محویتوں سے دوچار کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کی عروضی بحر میں شہر کی ہوئی نظم ''مگر تم تو ایسی نہیں ہو'' کو پڑھ کر مزا دوبالا بلکہ سہ بالا ہو جاتا ہے۔ آپ کی نظم میں جو بُو باس اور مٹھاس آ چکی ہے، دورِ حاضر کے نظم گوؤں میں وہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ اپنی بہت ساری شعری طاقتوں اور صداقتوں کے ہمراہ لفظوں کے اُجالوں اور شوالوں میں گھومنا اور جھومنا، آپ کی شعری پہچان کا ودوان بن گیا ہے۔ اقتدار جاوید کی نظمیں بھی بڑی دلنواز اور کارساز ہیں۔ رنگوں اور روشنیوں سے مزین اور ان کے بین بین آپ کے لکھے ہوئے نوٹ کی عکاس اور اساس۔ جیلانی کامران کی نظم ''ہماری حکایت''، جمیل ملک کی ''یادیں''، تاج سعید کی ''آنسوؤں کا گیت'' اور قربانی، ادیب سہیل کی خفی میں جلی اشارہ، کرامت بخاری کی ''ہمارا کیا ہے''، ارشد نعیم کی ''خواب گاہ'' اور ''مراجعت'' اور غضنفر عباس سید کی ''کون دیکھتا ہے'' اس شمارہ کی بے خسارہ نظمیں ہیں۔ غضنفر عباس سید کی مجید امجد ہی کے اسلوب میں کہی گئی نظم انتہائی شرجیل اور جمیل نظم ہے۔ یہ نظم مجھے فکری جمال اور وصال کی ان وادیوں میں لے گئی جہاں خیالوں کے رنگ ورکتے اور خوشبوؤں کے جھالوں کے انگ پکھر کتے ہیں۔ حامدی کاشمیری کی نظم ''کوہ سبز پر'' بلند بانگ اور ترشنا تانگھ لہجے میں لکھی ہوئی نظم ہے حامدی کاشمیری کی روح کا سارا درد اس نظم کی سطروں میں فرد فرد ہو کر نظم نورد ہو گیا ہے۔ یہ نظم پڑھ کر مجھے مرحوم جعفر طاہر یاد آ گئے، الفاظ کا یہ اعجاز ان کے ہاں بھی رقم طراز ہوا کرتا تھا۔ دوسری نظم جو بطور خاص مجھے پسند آئی وہ یامین کی ہے۔ اس نظم کا ابلاغ ہر جگہ چندن چراغ ہو رہا ہے۔ بڑے مرصع اور مسجع مصرعے کہے ہیں یامین نے۔ نظم کی ہر سطر اپنے اندر شاداب و تر رکھتی ہے۔ جہاں فن کی فصلیں اپنی پوری شکتیوں اور بھگتیوں سے لہراتی اور سوم رس لٹاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نصیر احمد ناصر کی حمد یہ نظم انتہائی الوہی اقتدار اور وقار کو بروئے کار لا رہی ہے۔ نصیر احمد ناصر اپنے قاری کو اپنے شعر کی ثنویت اور معنویت میں اُتارتے چلے جاتے ہیں گویا صاف کھلتے

بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والی صداقت ہر جگہ رفاقت بن کر ساتھ رہتی ہے۔ عبدالعزیز خالد کی نظم ان کے خاص اسلوب میں محجوب ہو رہی ہے۔ بشریٰ اعجاز کی کامنا بھری نظم کو کئی خواہشوں کا سامنا ہے، ہر خواہش میں خوبصورت خواب بھی ہیں، اور ان خوابوں کے عذاب بھی۔ بہت سارے سرور سے مجبور ہو کر بشریٰ اعجاز نے یہ نظم لکھی ہے۔ ڈنمارک کے سفرنامہ کو ڈاکٹر سلیم اختر نے مختلف ابواب اور لفظی القاب میں تقسیم کر کے کافی خوبرو اور مشکبو بنا دیا ہے۔ تحریر کی تابندہ تنویر جگہ جگہ فروزاں اور درخشاں ہے۔ بشریٰ اعجاز کا طویل افسانہ اپنی محویتوں اور سرور آگیں کیفیتوں کی الوہی سبیل رکھتا ہے۔ بشریٰ اب انکشاف ذات کے جس عمل سے گزر رہی ہیں وہاں ابدی نشاط بھی ہے اور دائمی التفات بھی۔ انہیں اپنے اوپر واردات کرنے میں اگرچہ انتہائی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑتا ہے مگر آگے آنے والی رعنائیوں اور دلربائیوں کے حصول اپنے مسافر کو اس مقبول راہ سے پھول پھول گزار دیتے ہیں۔ میرے اپنے خیال میں بشریٰ حافظ محمد رانجھا کے قبیل سے تکمیل ہیں۔ اس لیے ان منزلوں کی دلیل بنا ان کے لیے کچھ غیر کفیل نہیں ہوگا۔ اپنے سے بڑے ادب کے اثرات کہیں کہیں شعوری یا لاشعوری طور پر قبول کرنے ہی پڑتے ہیں۔ لہذا مجھے بشریٰ کے ہاں بھی کہیں کہیں ادیبہ عصر قرۃ العین حیدر کے نثری سٹائل کے فضائل ادھر ادھر منعکس ہوتے ہوئے نظر آئے، مگر یہ اوپرے نہیں لگے بلکہ انہی کی تحریر کا حصہ ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اردو زبان میں پنجابی کے پیوند ایسے ہیں جیسے اطلس پر گوٹہ کناری کی کام گاری۔ گملے میں اگا ہوا شعر اور مرا ہوا بچہ تقریباً ایک سے ہی افسانے ہیں۔ مگر مرا ہوا بچہ میں وضاحت کچھ زیادہ اور سادہ انداز میں کی گئی ہے۔ کہانی کھلتی چلی گئی ہے۔ اور ہمارے اس ماحول کی پرچول کر رہی ہے جو آجکل ہمارے ہاں گزشتہ تیس سال سے ابتر ہو کر ہماری زندگیوں کا دفتر بن گیا ہے۔ منیر الدین احمد کا افسانہ ''مسدود راستہ'' ابتدا میں تو سپاٹ اور بے ٹھاٹھ ہی رہا ہے مگر اپنی انتہا پر پہنچ کر سمراٹ ہو گیا ہے۔ جہاں ضمیر کی آواز اپنے لیے انسانی تنویر کے انداز اپنا لیتی ہے۔ اور گھانا کا نوجوان اپنی ستم رسیدہ عائشہ اور اپنے ناجائز بچے ہاشم کے حصول کے لیے آگ میں جل کر سہاگ ہو جاتا ہے۔ احمد شیر رانجھا کا افسانہ ''منو کی مرغابیاں'' ایک اچھا افسانہ ہے۔ زبان اور بیان دونوں کے گیان سے اس افسانے کا اصلی مزا اسی پر واگزار ہو سکتا ہے جس نے دیہات کے کلچر کو قریب سے دیکھا ہو یا فیوڈل نظام کے التزام کا حصہ رہا ہو۔ افسانہ پڑھتے ہوئے مجھے بار بار ابو الفضل صدیقی اور فضل الرحمٰن خان یاد آئے، وہ دونوں بھی اس طرح چٹخارے دار لشکارے بار زبان لکھتے تھے، جو قاری کو جگہ جگہ الست اور مست کر دیتی تھی۔ ''منو کی مرغابیاں'' میں لکھی گئی زبان بھی وہی شادابیاں اور نثری آبادیاں دکھا رہی ہے لیکن قطعی الگ اور علیحدہ پھوٹتی اور چھوٹتی ہوئی مہتابیوں کے ہمراہ۔ ''سمجھوتہ'' ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی کا ایک گھریلو افسانہ ہے اعلیٰ زبان اور اس کے نروان سے تہی۔ بہتر تھا کہ یہ خواتین کے کسی رسالہ میں چھپتا، کچھ اور چاٹ دار مصالحہ کے ساتھ۔ اس افسانہ کے مطالعہ سے وقت بھی برباد ہوا ہے اور ذہن بھی بے مراد رہا۔ اردو زبان کے معاملہ میں ارمان نجمی کا مضمون معنی خیز ہے جگہ جگہ صاحب مضمون سے متفق ہونا پڑا۔ نصیر احمد ناصر نے بڑا زندہ و پائندہ اداریہ لکھا ہے۔ مگر ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔ الیکٹرانک یا پرنٹ میڈیا کو کیا پڑی ہے کہ ادب کے جوہر قابل کو تلاش کرتا پھرے۔ میڈیا سے وہی لوگ وابستہ ہیں جن کے اپنے گروہ ہیں اور اپنی

ثوہ۔اب مشکور حسین کی سیوا میں تھوڑی سی فریاد۔مشکور حسین یاد گئی ایک واسطوں سے میری روح میں آباد ہیں۔ایک واسطہ تو یہ ہے کہ وہ میرے آبائی ضلع ''منٹگمری'' موجودہ ساہیوال کی ایک نہایت ہی معزز اور مقتدر سادات فیملی میں بیاہے ہوئے ہیں۔دوسرا واسطہ یہ ہے کہ پہلی بار میں انہیں مجید امجد کی معیت میں ملا،جو میرے لیے اب تک شانتی اور شوبھا کے مصداق ہے،تیسرا واسطہ یہ ہے کہ وہ میری طرح سے غزل کے علاوہ سلام اور مرثیہ بھی کہتے ہیں اور چوتھا واسطہ یہ ہے کہ حضرت علامہ طالب جوہری سے میرا پہلا تعارف انہی کے مصارف سے ہوا۔تفہیم غالب سے متعلق ان کا جو مضمون ''تسطیر'' میں چھپا تھا اس کے کچھ حصے میرے ذہن کا قصہ نہ بن سکے اور مجھ سے بالاتر ہی رہے۔تنقید ادیبوں کا ابدی حق ہے۔ہمارے دوسرے حقوق تو چھن چکے ہیں۔خدارا ہمارا یہ حق تو وہ ہم سے نہ چھینیں۔میرے اختلافی خط پر انہیں اتنا سیخ پا نہیں ہونا چاہئے تھا کہ وہ میری مدتوں کی نیازمندی کو بھی محو کر بیٹھے۔ان سے ہو سکتا تو وہ میرے اعتراضات کو رد کر دیتے۔اپنے مکتوب میں جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے وہ کبھی مناجاتیں نہیں ہوئیں۔اپریل ۲۰۰۱ء میں میری ایک ملاقات ان سے ضرور ہوئی ہے وہ بھی سر راہے۔لاہور میں ماڈل ٹاؤن (اتفاق مسجد والی روڈ) پر میں اپنی کوٹھی سے نکل رہا تھا۔وہ رستے پر مجھ سے کچھ آگے علامہ طالب جوہری کی مجلس سننے کے لیے جا رہے تھے۔میں نے پیچھے آواز دی۔مشکور صاحب سلام تو کرواتے جائیے۔وہ رک گئے اور اپنے ایک ساتھی سے یہ کہہ کر میرا تعارف کرایا کہ یہ ہمارے قبیلے کے ایک ممتاز شاعر ناصر شہزاد ہیں۔پھر تفہیم غالب والی بات سے متعلق گویا ہوئے کہ میں نصیر احمد ناصر کو خط لکھنا چاہتا تھا مگر کچھ تاخیر ہوگئی اور پھر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔اب اس بارے میں میری کتاب آگئی ہے جس کی بہت پذیرائی ہو رہی ہے۔اس کے بعد یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ میں دھان پان سا آدمی ہوں،سٹیج پر جگہ بنانی ہے،لہٰذا مشکل در پیش آئے گی۔میرے خط میں میرے جو جملے انہیں کھلے ہوں میں انہیں انتہائی معذرت کیساتھ واپس لیتا ہوں۔ہاں ان کا یہ کہنا مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں ہندی ڈکشن کو چھوڑ کر ذرا باہر آؤں تو مجھے پتہ چل جائے کہ میں کس پانی میں ہوں۔یہ تو اس طرح ہے کہ اگر میر تقی میر کو ہم کہیں کہ میر جی آپ اپنے حسرت و یاس میں بھرے اداس لہجہ کو تیاگ کر ذرا باہر آئیں تو ہم آپ کو بتائیں کہ آپ کس برتے پر اتنا مان اور گمان رکھتے ہیں یا غالب سے یہ کہا جائے کہ آپ اپنے سپر پاور اور بلند باور لہجہ سے تہی دست ہو کر ذرا شعر کہیں تو آپ کا پول خود بخود ہی کھل جائے گا یا پھر فیض صاحب کو یہ حکم دیا جائے کہ آپ اپنے خوشبو خیز اور خواب بیز لہجہ کے بغیر ایک کوڑی کے بھی نہیں۔میں میر،غالب اور فیض کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں مگر مجھے یہ ادراک ضرور ہے کہ میں نے پورے چالیس سال تک ہندی ڈکشن میں کام کیا ہے۔میں نے غزل کے خمیر کو گیت کی جاگیر میں تعمیر کیا ہے۔اور اس کا بدل آپ کو ہندو پاک دونوں ملکوں کے شعرا میں نہیں ملے گا۔یہ شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ میرے سادھ کی فنی تجلی ہے،اور اس کا اقرار سو بار میرے روبرو مشکور حسین یاد بھی کر چکے ہیں۔اگر مجھے ہندی ڈکشن سے باہر لانا ہی مشکور حسین یاد کا مقصود ہے تو اس کے لیے کچھ شرائط ہوں گی،جنہیں یاد صاحب کو بھی اپنانا پڑے گا۔ **(ناصر شہزاد-شیخو شریف، اوکاڑہ)**

☆☆ممنون کرم ہوں کہ آپ نے قابل قدر سہ ماہی ''تسطیر'' کے تازہ شمارے (۱۷۔۱۸) ہی سے نہیں بلکہ اپنی

منفرد خصوصیات رکھنے والی فکر انگیز نظموں کے مجموعے سے بھی نوازا۔ آپ کتنے پیارے ادب دوست ہیں جو اتنے وقیع کارنامے انجام دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یقیناً ادبی جریدے اور بھی ہیں مگر ان کے مدیران کی ترجیحات و ترغیبات؟ ''ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں''۔ ہاں آپ سے ایک شکایت ہے اور وہ یہ کہ بہت عرصہ پہلے میں نے شیخ ایاز پر ایک مضمون بھیجا تھا جس کی میرے پاس کوئی نقل بھی نہیں ہے۔ آپ نے اپنے خط میں یہ لکھا تھا کہ اسے آئندہ شمارے میں شامل اشاعت کیا جائے گا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ تب سے اب تک دو ضخیم اور بھرپور شمارے نظر نواز ہوئے مگر وہ مضمون دکھائی نہ دیا۔ ہوسکتا ہے کہیں کاغذوں کے انبار میں گم ہو گیا ہو۔ شاہ لطیف یونیوسٹی خیر پور میں ایاز چیئر قائم ہے جس کا مشیر ادبی مجھے نامزد کیا گیا اور میں نے ڈاکٹر ندیم ملک کو بتایا کہ تسطیر میں اس مضمون کی اشاعت ہو جائے گی۔ پچھلے دنوں سیمینار میں وہاں گیا تو ایاز کے چاہنے والوں نے پوچھا کہ اس مضمون کا کیا بنا؟ میں نے کہا کہیں گم ہو گیا۔ ﴿۱﴾ یہ بہت باریک سی شکایت ہے، خدارا آپ اسے پڑھ کر بھول جائیں کیونکہ جو کام آپ کر رہے ہیں اس کے لیے تو خلوص دل سے سراپا سپاس ہوں اور معذرت خواہ بھی کہ اپنی بساط کے مطابق جو تعاون مجھے کرنا چاہیے اس میں متواتر کوتاہی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ اب آپ کے شعری مجموعے نے ایسا جکڑا اور پکڑا ہے کہ ایک ایک نظم کو بار بار پڑھتا ہوں۔ اور لفظیات کی تجرید میں جو اشاریت و رمزیت موجود ہے اس کی حسیاتی جہتیں تلاش کرنے میں کافی وقت گزر جاتا ہے۔ ذرا یہ تو بتائیے کہ ''عرابچی'' ﴿۲﴾ کا کیا مفہوم ہے؟ میں نے بی۔ اے ایڈوانس اردو کی طالبات کو یہ کتاب دکھائی تو انھوں نے پہلا سوال یہی کیا جس کا جواب ابھی تک نہیں دے سکا ہوں۔ بہرکیف آپ نے آزاد نظم کے پیراہنِ فکر و خیال کو جو نئی طرحداریاں بخشی ہیں ان کے محاسن کا جائزہ لینا ہر سنجیدہ ادب دوست پر واجب ہے۔ آپ کی نثری تحریریں بھی بڑی توانا ہوتی ہیں اور نظموں میں جو معنی آفرینی ہے اس کا تجزیہ فی الوقت ممکن ہی نہیں۔

(آفاق صدیقی۔ کراچی)

﴿۱﴾ آفاق صدیقی صاحب مضمون شاملِ اشاعت ہے۔ تاخیر کی معذرت قبول کیجیے۔ (ن۔ا۔ن)

﴿۲﴾ عرابچی: گاڑی بان (Charioteer)

☆ تسطیر میں موجود شاعری اور نثر پر تبصرہ کرتے وقت کوشش ہوتی ہے کہ دیانتداری اور غیر جانبداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس بار ڈاکٹر شاہین مفتی کی ''مجبوری کی سچائی'' نے مجھے گم صم کر دیا۔ میں مبارک احمد کی زندگی میں بھی ان سے اتنا اچھا تعارف حاصل نہیں کر سکتا تھا جتنے اچھے انداز سے اب شاہین مفتی نے ان سے متعارف کروایا ہے۔ اسی طرح بشریٰ اعجاز کی ''صبح سفر کی رات'' نے بھی مجھے مسحور کر دیا۔ گو، انداز بیان کو جدید بنانے کی دھن میں انھوں نے کہیں کہیں الجھاؤ پیدا کر دیا ہے اور مناظر کے مختلف ٹکڑے جوڑ کر ایک مجموعی منظر بناتے وقت دقت پیش آتی ہے لیکن اثر انگیزی میں زیادہ کمی واقع نہیں ہوتی۔ رشید امجد کے افسانے میں اگر گملے میں اگا ہوا شہران لوگوں کی علامت ہے جن کی جڑیں اب بھی اپنی دھرتی میں مضبوطی سے پیوست نہیں اور وہ اس سرزمین پر اپنے خوابوں کی فصل کی طرف سے مایوس ہیں کہ وہ نہیں پھولے گی، تو مجھے کہنے دیجیے کہ افسانے کا متن کامیابی سے ان ''عارضی پناہ گزینوں'' کے مسائل کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ عاطف علیم،

منیر الدین احمد، احمد شیر رانجھا کے افسانے موضوعات کے انتخاب کے باعث اچھے لگے۔ محسن عثمانی کا ''سچ کا سپنا'' متاثر کن تھا۔ انفرادی مطالعہ میں اقتدار جاوید کی نظمیں خصوصاً ''غم زاد'' اور ''جہنم کا تازہ بہ تازہ گماں'' میری دانست میں فقط قومی المیے کی نہیں بلکہ تلخ کائناتی سچ کی بھی نشاندہی کرتی ہیں۔ حصہ مضامین میں ارمان نجمی کی تحقیق دیانتداری پر مبنی ہے۔ ان میں یہ اہلیت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اس موضوع پر ایسا مضمون لکھیں جو کسی کے مضمون کے ردِ عمل تک محدود نہ ہو بلکہ تفصیلی اور مستقل نوعیت کا ہو۔ اس طرح اردو زبان وادب کے سفر کا مستند احوال ہمارے سامنے آئے گا۔ اور بہت سے لوگ اس سے مستفید ہو سکیں گے۔ ابرار احمد کی نثری نظمیں انسان پر ان کی گہری سوچ کا اظہار کرتی ہیں۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ آپ کی نظم'' کاغذ کی تنہائی'' ان نظموں میں شامل ہوگئی ہے جنہیں بار بار پڑھا جاتا ہے۔ اس نظم میں عورت، مرد، شاعر اور خدا چار کردار ہیں جو اپنے اپنے مقام پر تنہا ہیں۔ ''باغ عدن'' جہاں ان کی ''تنہائی'' دور ہو سکتی ہے، وہاں کا راستہ بہت دشوار ہے۔ ان چاروں کرداروں کے مابین جو غیر مرئی تخلیقی رشتہ ہے اس کی جینیاتی رمز ابھی تک دریافت نہیں ہو سکی لہٰذا دنیا فی الحال ایک بڑی تباہی سے دوچار ہے۔ لیکن آپ کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ سیاحوں سے بھری اس دنیا کی ویرانی ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گی اور ہمیں آنے والے وقت کی تلاش میں زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔ خواب ہم سے بچھڑیں گے نہیں بلکہ ہمارے ہمسفر ہوں گے۔ حصہ غزل کا مجموعی تاثر بھی بہت عمدہ ہے۔

آج کل آپ کی کتاب ''عرا بچی سو گیا ہے'' زیرِ مطالعہ ہے۔ میرے لیے ایک قابلِ قدر اثاثہ اور میرے ذخیرہ کتب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ اس کتاب کے بارے میں پہلا تاثر، میرے ذہن میں، ایک سوال کی صورت میں پیدا ہوا کہ نصیر احمد ناصر اپنی نظموں کے ذریعے خالق سے گفتگو کر رہے ہیں یا مخلوق سے، دوسرا تاثر اس سوال کے جواب کی صورت میں ابھرا کہ ان نظموں کا تخلیق کار، خالق اور مخلوق کے مابین حدِ فاصل قائم رکھنے کا قائل نہیں۔ اس جواب کا ابھرنا تھا کہ سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ عرا بچی کون ہے؟ زینے والا کیا ہے؟ کس ہستی کو زمینی ستارہ کہا گیا کہ جس کے خواب ہر مسافر دیکھتا ہے؟ ''نفسِ مطمئنہ'' نے ہر سوال کا سکون سے تجزیہ کیا، نتیجہ یہ اخذ کیا کہ ''بے انت ہو جا''۔ بے سکون صامت نے تہہ میں اترنے کی کوشش کی تو خبر ملی کہ خالق نے انسان کے ذریعے خود کو لازوال بنانے کا خواب دیکھا ہے۔ اور جواب میں انسان خالق کے ذریعے اور اپنی ''تخلیق'' کے ذریعے خود کو لازوال بنانے کے خواب میں گرفتار ہے اور واللہ کیا دلکش اسیری ہے کہ جس سے رہائی پانے والا ''فنا'' ہو جاتا ہے۔ نصیر احمد ناصر! آپ کون ہیں؟ نئی تقویم کون لکھ رہا ہے؟ یقیناً یہ کاتبِ تقدیر نہیں، یہ شاعر ہے جو موت کی سیاہی کی طرف بڑھتی ہوئی حیات میں لفظوں کے ستارے گھولتا ہے تو تاریخ کا پہیہ زور سے گھومتا ہے اور زمین پوشاک بدلتی ہے۔ نصیر احمد ناصر! شاعر کون ہے؟ ''لال پلکا'' کہ ''ساگر دیوتا''؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ شاعر کے وجود کا حصہ ہیں مگر محسوس یہی ہوتا ہے کہ لال پلکا بہت ہی دور سے اڑ کے آیا ہے۔ اور ''ساگر دیوتا'' جسے شاعر کے خواب ڈھونڈتے رہتے ہیں وہ اسی وقت مل جاتا ہے جب شاعر خود کو آواز دیتا ہے۔ آپ کی شاعری میں بظاہر وہ تحیر و تجسس ہے جو بچے کی معصومیت کا گواہ ہوتا ہے مگر درحقیقت اس میں بالغ

نظر انسان کا تحیر ہے جو لائٹ کونز اور بلیک ہولز کو دریافت کر چکا ہے، تاریخ کی ویرانیوں سے اور تاریخ سے باہر ایک آدمی کے مقدر سے لرزہ براندام ہے۔ آپ کی نظموں کا بالغ نظر انسان، حساس شاعر، بارش کے نہ ہونے پر، بصارت کے قحط پر اور ایک نئے اطلانتہ کے گم ہونے پر حیرت زدہ ہے۔ اس کا تجسس جب اسے مہمیز کرتا ہے تو وہ دریافت کرتا ہے کہ ''اے مرے خواب، کہاں جائے گا'' اور ''اجنبی کس خواب کی دنیا سے آئے ہو''۔ نصیر احمد ناصر، واقعی ایک نہ ختم ہونے والا سفر آپ کو صدائیں دے رہا ہے اور آپ کی نظم، شاعری کے انت دھارے کا لازوال حصہ قرار دی جائے گی۔ بلاشبہ آپ شاعروں کے دلوں کی کسک کی بہترین ترجمانی کر رہے ہیں اور حساس انسانوں کو اس کسک کی مٹھاس کا شناسا بنا رہے ہیں۔ آپکی نظم نے میرے بعید ترین احساسات اور لطیف ترین جذبات کو مَس کیا ہے ''عرا بچی سو گیا ہے'' کی صورت میں میرے پاس ایک ایسی کتاب آ گئی ہے جس کے لفظ لفظ کو میں بار بار پڑھنے کی خواہش کروں گا۔ **(صامت وقار۔ فیصل آباد)**

☆ آپ کی نظم ''کاغذ کی تنہائی'' نے تو اور بھی تنہا کر دیا ہے۔ نظم کی اٹھان بہت شاندار تھی۔ یوں لگا جیسے شاکیہ منی جیسی کوئی ہستی آنکھیں بند کیے خطاب اور آشیر باد جیسا ہاتھ اٹھائے بڑی گھمبیر آواز میں محوِ گفتگو ہو۔ ایک ایک لفظ من میں اتر گیا۔ یہ نظم پوری دنیا کی حساس اور تخلیق کار عورتوں کے لیے ہے۔ میں ان سب کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مگر کوئی آپ کی Suggestion پر عمل کرے تو کیسے کرے۔ ایک بات اور آپ سے کہنی ہے کہ خاک اور پسینے کا ایک خاص تقدس ہے۔ انسان خاکی ہے۔ دھول زمین اور خاک کا جزو ہے۔ دھول میں اٹنا اور پسینے میں بھیگنا انھیں ہی نصیب ہوتا ہے جو سچے اور خالص ہوں، جن کا تعلق اپنی زمین اپنی دھرتی سے بدستور جڑا ہوا اور وہ جو اپنے دستِ بازو اپنی صلاحیت اپنی محنت پر یقین رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو ہمیشہ سر اٹھا کر چلنے کا شرف حاصل ہوتا ہے اور انھیں کبھی کسی کے آگے جھکنا نہیں پڑتا ہے۔ دھول اور پسینہ مثبت معانی میں شرفِ انسان کی اصل پہچان ہے۔ تھکن بھی انھیں ہی ملتی ہے جنھوں نے اقدام سفر کیا ہو۔ کسی مقصد کو پانے کی سعی کی بھلے وہ سعی وہ سفر ناکام ہی ہو مگر تجربہ انسان کا اصل حاصل ہے۔ تجربہ شعور و آگہی ہے۔ اور اگر تجربہ آپ جیسے پارس انسان کا ہو تو وہ تجربہ بھی کندن بن کر کبھی صفحۂ قرطاس پر بکھرتا ہے اور کبھی دلوں پر اطلسی پھوار بن کر۔ قدرت نے آپ کو قوتِ اظہار سے نہال کر رکھا ہے۔ بہر حال ''زندگی اور شاعری کرنے کے باوجود ہم مخلوق ہی رہتے ہیں'' **(پروین طاہر۔ راولپنڈی)**

☆ ''کاغذ کی تنہائی'' پڑھی۔ کیا کہوں؟ کیسی ہے؟ چلچلاتی دھوپ میں ابر کے ایک ٹکڑے جیسی، جس طرح کسی قدیم عبادت گاہ کی دیوار پر لکھی نامانوس تحریر، جیسے ایک دکھ کو پڑھ لیا جائے، جیسے روح کی پاتال میں رکھے ایک گھاؤ کا بوجھ لیے خواب کے رستے پر چلتے ہوئے زندگی کا مطلب بتایا جائے۔ مگر ایک خواب میں ہنسنے اور ایک خواب میں رونے کے باوجود پرچھائیاں حقیقت نہیں بنتیں تو کاغذ کی تنہائی اور بڑھ جاتی ہے۔ جسم کو ناؤ بنانے کا لمحہ تو کشتیاں جلانے سے پہلے آتا ہے۔ اب تو ہجر اور ہجرت کو گوندھ کر اپنے لیے نیا آسمان اور نئی زمین بنانی ہے۔ کیونکہ محبت اور سفر کے مابین کئی زندگیوں جتنے فاصلوں پر اب کسی خواب کا پُل نہیں ہے اور واپسی کا راستہ یاد رکھنے کی خواہش پر دل نے انکار کی سیاہی رکھ دی ہے۔ نظم کی سطریں، سیڑھیاں بن کر احساس کی کن عمیق

گہرائیوں میں اترتی ہیں کہ اس کی کھڑکیوں سے جھانکتا چہرہ اپنا چہرہ معلوم ہوتا ہے۔

(ناھید قمر- بھاولپور)

☆ تسطیر۔ ۱۷۔۱۸ پہلے کی طرح ہی بہت خوبصورت اور معیاری مواد سے مزین ہے۔ اداریہ آپ نے ایک پرانے مگر ایک بنیادی ادبی مسئلے پر رقم کیا ہے۔ آپ نے دراصل سائنس و ٹیکنالوجی کے زمانے میں جمالیاتی اقدار کی اہمیت اور جواز کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس پہ ضرور بحث ہونی چاہیے۔ یقیناً پہلے کی مانند ''تسطیر'' کے قارئین آپ کے اداریے پر کھل کر اظہار خیال کریں گے۔ آپ کے اداریے موجودہ ادبی منظر نامے کی سمت نمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ تازہ شمارے میں بھی آپ کے اردو تنقید سے متعلق اداریے پر ایک درجن سے زائد لوگوں نے ردعمل ظاہر کیا ہے۔ اگرچہ دو تین حضرات کے سوا اکثر نے جذباتی انداز میں باتیں کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ تاہم ایک اہم مسئلے پر تفصیلی گفتگو تو ہوئی اور لوگ فکری سطح پر فعال تو ہوئے۔ بہت کم ادبی پرچے قارئین کو فکری اور تخلیقی سطحوں پر متحرک کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ آپ قارئین کے ردعمل پر اپنا ردِعمل بھی کہیں کہیں شامل کرتے ہیں۔ بحیثیت مدیر یہ آپ کا اختیار اور حق ہے مگر کہیں کہیں یوں لگتا ہے جیسے آپ اپنے نقطہ نظر کو بہر طور منوانا چاہتے ہیں۔ آپ کے اسلوب میں قطعیت آ جاتی ہے۔ یہ میرا تاثر ہے ممکن ہے غلط ہو۔ امید ہے آپ اس بات کا برا نہیں مانیں گے۔

(ناصر عباس نیر-جھنگ)

☆ آپ نے میری چار غزلیں ''خصوصی مطالعے'' کے عنوان سے شائع فرمائی ہیں اصولاً مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ لیکن افسوس! معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر خصوصی مطالعے کے سلسلے میں آپ مجھ سے مشورہ کر لیتے تو آپ اور تسطیر کے قارئین اس سزا سے بچ جاتے جواب ملنے والی ہے، ان پندرہ نظموں کی صورت میں، کیونکہ چار غزلوں کی اشاعت کو میں نہ ''خصوصی'' تسلیم کرتی ہوں نہ ''مطالعہ''۔

(ثمینہ راجہ۔ اسلام آباد)

☆ میں ''تسطیر'' سے بدگمان ہو رہی تھی کہ اچانک تسطیر آ گیا اور اس میں اپنی نظم ''تیرھواں قبیلہ'' دیکھ کر سارا غصہ اڑ گیا تیز ہوا میں بادل کے ٹکڑے کی طرح۔ مگر ثمینہ راجہ کا گوشہ دیکھ کر جو کہ انفرادی مطالعہ کے عنوان سے شائع ہوا ہے، بہت غصہ آیا۔ آپ بھی لگتا ہے آنکھوں سے اندھے ہیں تبھی آپ کو سیفو سے ثمینہ راجہ تک کوئی اور نظر نہیں آتی۔ ہم منتظر ہیں آپ کی نگاہِ انتخاب ہم پر کب پڑے گی۔ اس دفعہ کے تسطیر میں بشریٰ اعجاز کا طویل افسانہ پسند آیا مگر مذہبی شخصیت پہ کتاب مرتب کر ڈالی پڑھ کر خوب ہنسی آئی۔ بندہ آئیڈیل تو اونچا رکھتا ہے۔ جس کا آئیڈیل اتنا چھوٹا ہو اس کی وسعتِ نگاہ کیا ہو گی۔ اگر ثمینہ راجہ اور بشریٰ اعجاز کے لیے صفحات مخصوص ہو سکتے ہیں تو میرے لیے کیوں نہیں! امید ہے کہ آپ مجھے تسطیر کے چند صفحات دیں گے۔ جیسے آپ نے ثمینہ راجہ کو دیئے ہیں۔ میں اسے اپنے لیے اعزاز سمجھوں گی۔

(غزالہ خاکوانی-ملتان)

☆ آپ سے بات کرنے کے بعد چند اوٹ پٹانگ نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اب نظم لکھوں اور آپ کو نہ دکھاؤں، ایسے تو ممکن نہیں، لہذا ان دنوں کی بے ترتیب سوچوں، حالات، آس پاس کے انتشار اور اندر کی بے چینیوں کا حال آپ بھی دیکھ لیں۔ خدا جانے ان نظموں کا مخاطب کون ہے، جو کوئی بھی ہے، اسکو ڈھونڈنا میرا کام نہیں میرا

کام تو اس دکھ کو عام کرتا ہے جو اب ایک اجتماعی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ **(بشریٰ اعجاز-لاہور)**

☆ سعید احمد اور داؤد رضوان آپ سے مل کر آئے اور آپ سے متعلقہ حالات کا علم ہوا۔ خصوصاً والد صاحب کی وفات کا۔ خدا انہیں اپنی رحمت میں جگہ دے۔ پھر آپ کی مصروفیات، مکان کی تعمیر، آنا جانا ان سب سے ''تسطیر'' کی دیری بھی سمجھ میں آئی، بہرحال اس دن دیر تک آپ کا ذکر رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظم کے حوالے سے گذشتہ دو تین دہائیوں سے آپ جو ہمہ جہت جدوجہد کر رہے ہیں وہ میری نسل کے نظم گوؤں کے لیے انتہائی سودمند ہے۔ نظم کے حوالے سے ہمارا تخلیقی اعتماد درحقیقت آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے اب نظم کے حوالے سے (خصوصاً پچھلی دو دہائیوں کی نظم) مذاکرے اور تجزیئے اور تنقید بھی سامنے آنی چاہئے۔

(روش ندیم-راولپنڈی)

☆ مجھے اس کا گمان تک نہیں تھا کہ اس بار تسطیر میں مجھے اتنی جگہ ملے گی۔ مجھے اچانک اتنی ڈھیر ساری خوشی ملی ہے کہ میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ زیادہ تر ادبی رسائل تو دوستی نبھاتے ہیں مگر آپ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ آپ صرف فن اور اعلیٰ تخلیق کے قدردان ہیں۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ آپ نے مجھے زیادہ جگہ دی ہے۔ اس سے پہلے آپ نے میری بہت تخلیقات رد بھی کر دیں اور تسطیر میں شامل نہیں کیں، جس سے مجھے آپ کی خاموش تنقید کا اندازہ ہوا اور میں نے خود کو مزید بہتر بنایا۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں۔ آپ کی نظمیں حیرت سے حیرت تک سفر ہیں۔ ایسی حیرت جس میں تہہ بہ تہہ کئی کائناتیں سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں۔ آپ نظموں میں صرف لفظ برتتے نہیں بلکہ اپنے اعجازِ مسیحائی سے نئی زندگی، بھرپور زندگی عطا کر دیتے ہیں۔ آپ نے اردو شاعری کو تھکن اور بے حسی کے دور میں جینے کا حوصلہ عطا کیا ہے اور آبرو بخشی ہے اور بے خواب عہد کی آنکھوں میں اپنے بجل بجیلے، نئے نویلے خواب سجا دیئے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ نامیاتی دور کیا ہے اور ساختیاتی عہد کیا ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ نظریے اور تنقید کی اپنی ڈگر ہے اور ادب اور شاعری کی اپنی روش۔ آپ نے اس روش کو دریافت کر لیا ہے۔ جسے ہم پانچویں سمت یا آٹھویں در کی علامت سے سمجھ سکتے ہیں۔ جس تک پہنچنے میں بہت سے شاعروں کی تخلیقی قوت ہانپنے لگتی ہے۔ آپ کی شاعری پارس ہے گرو...... گرو آپ سمان بناتا ہے، آپ نے بہت سوں کو آپ سمان بنا دیا ہے، جس میں سے بہت سے نام آج اردو شاعری میں ایک نئے دور کی علامت بن چکے ہیں۔ ناگڑیاں واقعی امر ہے۔ جس کی خواب آلود خاک سے آپ جیسے سپوت نے جنم لیا ہے، جس نے رشید امجد کے بقول اردو نظم کو غزل کی آمریت سے نجات دلا دی۔ یہ ایک مشکل کام تھا مگر آپ کی جرأت مندی اور کاوش لائق تحسین ہے کہ آپ نے فردِ واحد ہوتے ہوئے اردو ادب کی ایک ہزار سالہ تاریخ کا دھارا بدل دیا اور خصوصاً نظم کو فیض احمد فیض کے اثرات سے آگے کے امکانات کی سمت دکھا دی۔ میں آپ کی جرأت مندی کو سلام پیش کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کے خواب امر کر دے۔ تسطیر کا شدت سے انتظار ہے۔ **(فہیم شناس کاظمی - نواب شاہ، سندھ)**

☆ گزشتہ تین چار سال سے اپنی صحت کے باعث ادبی کیا تقریباً تمام دنیا سے ظاہری کے علاوہ تمام رابطے منقطع رہے ہیں۔ اب صورت حال کچھ بہتری کی طرف مائل ہے سو رابطے از سرِ نو بحال کرنے کا خواہش مند

ہوں۔ اور اس ضمن میں بسم اللہ آپ ہی سے کر رہا ہوں۔ ''تسطیر'' دیکھنے کا اکثر موقع ملتا رہتا ہے۔ البتہ اپنے حالات کے سبب چونکہ خریدنے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا چنانچہ ابتدائی پرچوں کے علاوہ کوئی پرچہ نہ پڑھ سکا۔ کبھی کبھی کسی مہربان کی عنایت سے دیدار کا شرف ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ پرچہ بہت ترقی کر چکا ہے۔ چند نظمیں ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کی رائے اور جواب کا متمنی ہوں۔ آپ کی صحت اور پرچے کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

(داؤد رضوان-اسلام آباد)

☆ آپ نے بہت زمانے سے ''تسطیر'' بھجوانا بند کر رکھا ہے، مجھے آپ کا آخری شمارہ ۸-۷ جھریا سے کسی صاحب نے بھجوایا تھا جن کا نام میرے ذہن میں نہیں ہے۔ میں نے تفصیلی خط اس شمارے سے متعلق آپ کو لکھا تھا لیکن نہ ہی آپ کا کوئی جواب آیا اور نہ ہی کوئی شمارہ، بہت انتظار کے بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ادھر ایک ڈیڑھ سال سے میں اپنے ''ڈی لٹ'' کے مقالے کے سلسلے میں الجھا ہوا تھا۔ اب خدا خدا کر کے کام مکمل ہوا ہے اور مقالہ یونیورسٹی میں داخل کر رہا ہوں۔ ابھی ساہتیہ اکادمی کے لیے ایک مونوگراف پر کام کر رہا ہوں، جس وجہ کر دوسرے تمام کام التوا میں پڑے ہوئے ہیں۔ ابھی کچھ سکون ہوا ہے تو آپ کو پہلا خط لکھ رہا ہوں۔ انشااللہ جلد ہی کوئی مضمون بھی آپ کو بھجواؤں گا۔ ابھی چند دنوں قبل وزیر آغا کا شعری مجموعہ ''ہم آنکھیں ہیں'' ملا ہے اور خط بھی۔ انھوں نے دریافت کیا ہے کہ تسطیر مل رہا ہے یا نہیں، شاید ان کی کئی چیزیں آپ کے رسالے میں بھی آئی ہیں، جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے۔ تسطیر کے گیارہویں شمارہ پر میں نے یہاں کسی رسالے میں تبصرہ بھی دیکھا ہے۔ آپ کی کئی نظمیں شب خون اور ''ذہن جدید'' میں پڑھی، پچھلے دنوں دہلی کے سفر میں زبیر رضوی اور شہپر رسول نے آپ کی نظموں کی بڑی تعریف کی تھی۔ اسعد بدایونی اور منظور ہاشمی (علی گڑھ) نے بھی خصوصی طور پر آپ کا تذکرہ کیا تھا۔ تسطیر کا جو بھی شمارہ دستیاب ہو جلد از جلد بھجوائیں، آپ کا کرم ہوگا۔﴿۱﴾

(قیصر زمان - گریڈ هیه، بهارت)

﴿۱﴾ قیصر زمان صاحب! تسطیر کے اب تک کے تمام شمارے آپ کو بھجوائے گئے تھے، افسوس کہ آپ تک نہ پہنچ سکے اور ڈاک میں ضائع ہو گئے۔ اس خط کے علاوہ آپ کا کوئی تفصیلی خط مجھے نہیں ملا۔ اسے بھی محکمہ ڈاک کی کرشمہ سازی سمجھنا چاہیے۔ (ن۔ا۔ن)

☆ تسطیر ۔ ۷، ۸ وقت سے مل گیا تھا۔ مضامین نظم و نثر کی کثرت کی وجہ سے پڑھنے میں کافی عرصہ لگ گیا۔ اداریے میں آپ نے ٹھیک لکھا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے پیدا شدہ خشک دماغی سے نجات کا راستہ شاعری ہی کے چمن زار سے ہو کر گزرتا ہے۔ ڈارون نے بھی تو یہی بات کہی تھی کہ اگر مجھے اپنی پچھلی زندگی واپس مل جاتی تو میں ہر ہفتے کچھ وقت شاعری کے مطالعے میں ضرور صرف کرتا۔ اس شمارے میں جناب ستیہ پال آنند کا خط شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے بڑے مایوسانہ انداز میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں اردو ادیب و شاعر چھ سات سے زیادہ نہیں باقی رہ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ موصوف کا قیام چونکہ مستقلاً امریکہ میں ہے اس لیے وہ ہندوستان میں اردو زبان و ادب کے منظر نامے سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ میں نے ہندوستان کے غیر مسلم اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک فہرست بنائی ہے جس میں ۷۵ ادیبوں اور شاعروں کے نام ہیں اور یہ وہ لوگ

ہیں جو اس وقت (مارچ ۲۰۰۲ء) بقید حیات ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ میرا مختصر مضمون معہ فہرست تسطیر میں چھاپ دیں تا کہ ایک اجمالی خاکہ ستیہ پال آنند کے سامنے بھی آجائے اور پاکستان کے عام قارئین بھی اس سے واقف ہوسکیں۔

(نامی انصاری ۔ کانپور، بھارت)

☆ آپ کی خیال انگیز نظموں کے ذریعہ نہ صرف آپ کا تعارف ہے بلکہ میں آپ کا مداح ہوں۔ ''تسطیر'' ابتداً ایک دو شمارے آپ نے روانہ کیے تھے پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ یہاں تسطیر جیسے وقیع رسالے کے مطالعے کے لیے سینکڑوں اہل علم و ادب منتظر رہتے ہیں اور میرے توسط سے دیگر عالمی رسالوں کی طرح استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔

(ڈاکٹر انور مینائی ۔ کولار، بھارت)

☆ تسطیر مارچ ۲۰۰۱ء مجھے جناب جمال اویسی نے ارسال کیا۔ پاکستان سے آنے والے رسالوں میں ''تسطیر'' کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ زیادہ تر لوگ اس کی معیاری تخلیقات سے متاثر ہیں۔ آپ کی نظمیں بہت ہی تازہ دم لگتی ہیں۔ آپ کے اسلوب سے یہاں کے کچھ ادیب خاص طور سے متاثر ہیں۔ آپ کی نظموں کے علاوہ بھی بہت اچھی نظمیں شاملِ اشاعت ہیں مگر غزلوں نے اپنے قاری کو مایوس کیا ہے۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح تلخ و ترش ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو تنقید نے اپنے ادب سے اب تک کچھ نہیں سیکھا اور آج تک بیرونی ادب کے تلوے چاٹ رہی ہے۔

(شاهد عزیز ۔ اودے پور، بھارت)

☆ ''تسطیر شمارہ مارچ ۲۰۰۱ء گیا (بہار) اور دھنباد (جھارکھنڈ) کا سفر طے کرتے ہوئے ایک طویل مدت کے بعد مجھے ہمدست ہوا۔ ویسے ان دنوں ڈاک پہنچنے میں بھی غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہے۔ موجودہ نامساعد حالات کے باعث یہ سب کچھ متوقع بھی ہے۔ آپ کا اداریہ فکر انگیز ہے۔ واقعہ ہے کہ اردو تنقید مشرقی شعریات پر استوار ہونے کی بجائے ابتدا ہی سے مغرب کی طرف راجع رہی ہے۔ ناقدوں نے انگریزی ادب کا چشمہ لگا کر اردو شعر و ادب کو جانچنے پر کھنے کی سعی لا حاصل کی ہے۔ اور پھر اقربا پروری نے بھی اردو تنقید کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ جابہ جا اس پر جانبداری کا لیبل چسپاں نظر آتا ہے۔ اردو ادب کے اعلیٰ ترین ادارے یا ان کے روح رواں شعر و ادب کے نظری سرمائے اور ادب کی ترجیحات، Currents اور Cross Currents سے نابلد تو نہیں ہیں مگر ان کی نظریں روس اور امریکہ کی طرف رہتی ضرور ہیں کہ وہ انعام و اکرام سے نوازے جائیں۔ تاریخ، ادب، تنقید اور نئی نظم پر ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، جیلانی کامران، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر، ناصر عباس نیر، حامدی کاشمیری اور ڈاکٹر اسد علی خان نے معروضی انداز میں بحث کو آگے بڑھایا ہے اور بہت سے ان چھوئے نکات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ تنقید و تحقیق اور نظم و غزل کا حصہ بھی دلچسپ اور جاندار ہے۔ مراسلات سے بھی عرق ریزی اور مطالعہ کی وسعت مترشح ہے۔ روح عصر سے متعلق آپ نے دل لگتی باتیں کہی ہیں۔

(ظهیر غازی پوری ۔ هزاری باغ، بھارت)

☆ تسطیر Exclusively خوبصورت پرچہ ہے۔ آپ کا poetic اور Aesthetic سینس قابل رشک ہے۔ اس دور میں ادبی پرچہ نکالنا کافی حوصلے کی بات ہے۔ خدا آپ کے ساتھ ہو۔

(اسماء راجہ ۔ اسلام آباد)

☆ سر حیدر علی لغاری کے خطوط نہایت متاثر کن ہوتے ہیں۔ ہر سطر سے دانش جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ تسطیر کے بارے میں ایک خط میں لکھا تھا ''لفظ کے محدود پیکر میں مفہوم کا لامحدود بہاؤ جب اپنے تعلقات تلاش کرتا آفاق کے ازل گیر کناروں پر حاوی ہونے لگتا ہے، تب تسطیر کے اصل ادراک کا سواد انسان کو مست کر دیتا ہے۔ پھر لفظ/سطر، اپنی لغت، گرامر اور تجوید کے روایتی قید خانے کو توڑ کر رنگ و بو اور رانگ و آہنگ کے جمال کے طویل و عریض کل وقتی سوانگ کا حصہ بن جاتا ہے۔ کاش! اس کیفیت کو دوام حاصل ہو جائے۔ مگر ہمارے نصیب کہیں کسی پست جادے کی مسافت میں بھٹکتے رہتے ہیں''۔ **(شہناز شورو۔ کراچی)**

☆ کیا بات ہے آپ لفٹ نہیں کروا رہے۔ میں نے امریکہ سے آنے کے بعد آپ کو ای میل بھیجی تھی کہ شاید اب آپ سے خطاب کرنے کا یہی نیا طریقہ ہے لیکن جواب ندارد۔ تسطیر مل گیا تھا۔ سارا چاٹ ڈالا۔ بہت اچھا تھا۔ اب نیا کب آ رہا ہے؟ آپ خیریت سے تو ہیں نا! ﴿ا﴾ **(نیلم احمد بشیر۔ لاہور)**

﴿ا﴾ نیلم، گزشتہ ایک سال سے راولپنڈی میں مکان کی تعمیر، اس دوران والد صاحب کی وفات، پھر میرپور سے راولپنڈی گھر کی شفٹنگ کے مسائل اور دل کے عارضے میں شدت کے باعث کسی سے جوابی رابطے کی فرصت نہ مل سکی۔ اب حالات نے مہلت دی ہے تو ایک بار پھر ''تسطیر'' کے ذریعے آپ سب سے رابطے میں ہوں۔ دعا کیجیے کہ یہ رابطہ برقرار رہے۔ تسطیر کے لیے اپنا تازہ اور غیر مطبوعہ افسانہ بھجوایئے۔ بہت عرصہ سے محترمہ پروین عاطف کا خط نہیں آیا، ان کی کوئی تازہ تحریر بھی بھجوایئے۔ (ن۔ا۔ن)

☆ کیا وہی ''تسطیر'' تخلیق کار کو ارسال کیا جاتا ہے جس میں اس کی تخلیق موجود ہو؟ اور اگر تخلیق کار یہ کہے کہ ''تسطیر'' اس کی طبع کے لیے Source of inspiration ہے تو......؟ بہر حال میں نہیں جانتی آج کل تسطیر کا کون سا نمبر کس مرحلے میں ہے لیکن امید کرتی ہوں آپ کو یاد رہے گا کہ آئندہ تسطیر مجھے بھیج ہی دیا جائے۔ آپ کی کتابیں میرے سرہانے رہتی ہیں، سکون کے لمحوں میں، سکون حاصل کرنے کے پل میں!

(رخشندہ نوید۔لاہور)

☆ مجھے تسطیر میں اداریے پر ردِ عمل کا حصہ بے حد پسند آیا۔ حصہ نظم میں کرامت بخاری کی ''ہمارا کیا ہے''، سعید احمد قائم خانی کی ''سمندر سے کہاں تم چھین پاؤ گے''، ناہید قمر کی ''اسم اعظم'' اپنے موضوعات اور خوبصورت بیانیے کی وجہ سے اثر انگیزی سے متصف ہیں۔ آپ کی دونوں نظمیں ''خدا ایک آنسو مرا'' اور ''مگر تم تو ایسی نہیں ہو'' مجھے بے حد پسند آئیں۔ مضامین میں ناصر عباس نیر کا ''اقبال اور رادھا کرشنن'' جو نظیر صدیقی کی ادبی کاوشوں کا اعتراف بھی ہے اور جناب ارمان نجمی کا ردِ عمل بر مضمون ''زبان کا مسئلہ'' پسند آئے۔ مجموعی طور پر پورا رسالہ بے حد قدر و قیمت کا حامل ہے اور منفرد بھی ہے۔ **(رخسانہ صبا۔ کراچی)**

☆ تسطیر پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا، بلاشبہ وقار اور جدت کا حامل ہے۔ نثری نظم (بقول ڈاکٹر ریاض مجید ''شم'') کے حوالے سے مقتدر اہلِ قلم کی آراء نے بے حد لطف دیا۔ ''کانوں میں جگنو'' کے بارے میں آپ کے تاثرات کا انتظار رہے گا۔ **(میمونہ روحی۔فیصل آباد)**

☆ بشریٰ اعجاز کا افسانہ ''صبح سفر کی رات'' ایک عمدہ تخلیقی کاوش ہے اس پر بشریٰ اعجاز مبارکباد کی مستحق ٹھہرتی

ہیں۔ نیلم احمد بشیر کے افسانچوں نے بھی بہت متاثر کیا۔ جاوید فیروز، تنویر قاضی اور فہیم شناس کاظمی کی عمدہ نثری نظموں نے ذہن و دل پر اچھا تاثر چھوڑا ہے۔ توصیف تبسم، ظفر اقبال، خاور اعجاز، احمد صغیر صدیقی، احمد حسین مجاہد کی غزلوں کے کئی اشعار بہت پسند آئے۔ آپ کی خوبصورت نظم کہانی ''کاغذ کی تنہائی'' تو ایک کلاسیکل نظم ہے۔ جس کی تعریف نہ کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔

(محمد ضیااللہ قریشی۔ میانوالی)

☆ آپ بہترین شاعری کے ساتھ ساتھ بہترین نثری ادب بھی مہیا کر رہے ہیں البتہ پروز پوئٹری کے لیے اتنے زیادہ صفحات کا مختص کرنا کچھ جچتا نہیں کیونکہ میرے خیال میں نثری نظم کا ذوق ابھی زیادہ نہیں ہوا، اور کچھ تو محض شاعر کہلوانے کے شوق میں اس کا سہارا ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ آپ نے پروز پوئٹری کو جس قابلِ فخر مقام تک پہنچایا ہے نئے لکھنے والے اس کے ارتقاء میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کر پا رہا ہے۔ شاعری میں آصف ثاقب، ہارون الرشید، آمنہ بہار رونا، امجد اسلام امجد، احمد حسین مجاہد، شبنم عشائی، خادم حسین خاکسار اور ثمینہ راجہ کے پروازِ تخیل نے مسحور کر دیا۔ صلاح الدین پرویز کی دونوں نظمیں بھی پسند آئیں۔ افسانوں کا انتخاب خوبصورت ہے۔ خصوصاً ''بلی ماں''، ''حکمت کا اصول'' اور ''نیا سمجھوتہ'' بہت پسند آئے۔

(محمد فیاض عزیز۔ بالا کوٹ، ہزارہ)

☆ ایک شاعر دوست کی ذاتی لائبریری میں پہلی بار ''تسطیر'' سے ملاقات ہوئی البتہ اس کا تذکرہ سنجیدہ ادبی حلقوں میں بارہا سن رکھا تھا۔ میں اپنے دوست سے چند روز کے لیے ''تسطیر'' مستعار لے آیا۔ آپ سے اگرچہ ملاقات نہیں مگر میں ایک عرصے سے آپ کی خوبصورت نظم کے ''کشتگان'' میں سے ہوں۔ تسطیر میں شائع ہونے والے تنقیدی و علمی مباحث قابلِ قدر ہیں۔ ایسی ہی تنقیدی کاوشوں کے نتیجے میں اردو ادب کا منظرنامہ جدید ترین رخ پر تشکیل پائے گا۔ نثری نظم کے حوالے سے گفتگو بہت اہم ہے مگر کام کی بات کم کم ہے۔ ''اردو تنقید کے اصطلاحاتی شگاف'' میں ایک انتہائی اہم سمت میں گفتگو کا آغاز ہوا ہے۔ میرے نزدیک جس قوم کے پاس اعلیٰ پائے کی تنقید نہیں ہوتی اس کے ہاں بڑا ادب بھی جنم نہیں لے سکتا۔ اسی طرح ڈاکٹر احمد سہیل کا مضمون ''متن شکنی کی نئی روایت'' ایک ایسا موضوع ہے، جس پر ہمارے ہاں نہ ہونے کے برابر کام ہوا ہے۔ ابھی ہمیں اس کھوج میں بہت آگے جانا ہے۔ نظموں کے تجزیاتی مطالعے کا سلسلہ انتہائی خوبصورت ہے۔ پروین طاہر ''مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں'' (وزیر آغا)، ''پانی میں گم خواب'' (نصیر احمد ناصر) اور معراج رعنا ''ساحل پر ایک رات'' (شاہد کلیم) کے بطون میں بڑی خوبصورتی سے اترے ہیں۔ بلاشبہ تسطیر ایک انتہائی اہم پرچہ ہے اور اردو کو اس جیسے مزید کئی رسائل کی ضرورت ہے۔

(جواز جعفری۔ لاہور)

☆ دو مہینے کی چھٹیاں گزار کر آئی تو تسطیر ملا۔ آپ کا رسالہ ہندوستان کے سنجیدہ حلقوں میں بہت مقبول ہو گیا ہے۔ علی گڑھ میں بھی تسطیر کا ذکرِ خیر ہوا۔ ایک مہینے کے لیے ہم امریکہ بھی گئے تھے۔ ڈیلاس، لاس اینجلس کی ادبی دنیا کی جھلک بھی دیکھی جو زیادہ تر مشاعروں کے گرد گھومتی ہے۔ پچھلے دنوں مشکور حسین یاد صاحب ریاض آئے ہوئے تھے۔ وہ اکثر ہمارے گھر آتے تھے۔ ہم چند لوگ ان کے ساتھ بیٹھ جاتے تھے تو وقت کا پتہ ہی نہیں لگتا تھا۔ وہ باتیں بہت کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ بہت عالم فاضل ہیں مگر خشک اور بورنگ نہیں

ہیں شاعری بھی ان کی بہت مختلف ہے۔ ان کے ساتھ گزارا ہوا وقت ہمارے لیے بہت یادگار ہے۔ ریحانہ روحی بھی ملنے آئی تھیں۔ ان کا مجموعہ کلام آ گیا ہے۔ ان کے ساتھ بھی اک چھوٹی سی محفل ہوئی تھی۔ آپ کے کام کی رفتار دیکھ کر رشک آتا ہے۔ میری کہانیوں کی کتاب ''آنگن جب پردیس ہوا'' شائع ہوگئی ہے آپ کو جلد ہی بھیجوں گی۔ میری نظمیں آپ نے تسطیر میں شامل کیں اور کچھ لوگوں کو پسند بھی آئیں، اس سے کچھ اور لکھنے لکھانے کی ترغیب ملی۔ نظم کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، بہت خوب ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آزاد نظم میں خیالات کو امیج بنا کر پیش کرنے کے بہت امکانات ہیں، اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔'

(عذرا نقوی۔ ریاض، سعودی عرب)

☆ ''تسطیر'' ۱۷۔۱۸ موصول ہوا۔ مراسلت میں غزالہ خاکوانی اپنے دونوں مکتوبات میں مختلف زاویوں کے ساتھ برہم اور مطمئن نظر آئیں۔ مراسلت۔۲ میں وہ خاصی برہم ہیں۔ حیرت ہے اس مکتوب میں اُن کا کہنا ہے کہ ''میں جانتی ہوں تسطیر میں کتنی چیزیں معیاری چھپتی ہیں'' اور مراسلت۔ ۱ کے مکتوب میں اپنی غزل کی اشاعت پر وہ رقم طراز ہیں ''اپنی غزل دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ تسطیر معیار کے اعتبار سے اس وقت نمبر ون ہے''۔ فن تراشنے والوں میں اتنی بردباری اور دانش مندی تو ہونی چاہئے کہ وہ کسی جریدے کے معیار اور وقار کے بارے میں دیانت دارانہ اور بے لاگ کھری رائے کا اظہار کرتے ہوئے ورق الٹ کر اپنی تخلیقات کو تلاش کرنے کی بجائے مجموعی طور پر یہ دیکھیں کہ اس جریدے نے ہمارے تھکے ہوئے ذہن کی تسکین کیلئے ادبی کاوشوں کی جو انجمن سجائی ہے اس میں کون کون ہماری ملاقات کو آیا ہے۔ انسان کو نرگسیت کی بجائے وسیع القلبی کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ جس روز ذہن کے کارخانے میں یہ سوچ ڈھل کر زبان کی دوکان میں سجتی ہے کہ میں نے کیا غضب کا فن پارہ تخلیق کیا ہے، میرے فن کی بات ہی اور ہے۔ وہی دن تخلیق کار کی موت کا دن ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو منوانے کی خواہش انسان کو زوال پذیر کرتی ہے۔ تاریخ اور وقت تخلیق کار کے بارے میں اپنا جو فیصلہ ثبت کرتے ہیں وہی حتمی اور دائمی ہوتا ہے۔ اس کی زندہ مثال ''کاغذی پیرہن'' کا بیسویں صدی کے دس بہترین اردو نظم گو شعراء (بالترتیب) کا Survey ہے۔ ترتیب میں نصیر احمد ناصر ساتویں نمبر پر ہیں پہلے چھ شعراء میں مجید امجد، ن م راشد، وزیر آغا، فیض احمد فیض، میراجی اور اختر حسین جعفری ہیں۔ جوش ملیح آبادی، اختر الایمان اور منیر نیازی کا نام نصیر احمد ناصر کے بعد آتا ہے۔ یہ سروے ''کاغذی پیرہن کے شمارے (نومبر دسمبر ۲۰۰۰ء) میں سامنے آیا۔ اس ساری وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی ہے کہ جس طرح غزالہ خاکوانی نے اپنے گن بزبانِ خود گنوائے ہیں، ایک ایسی ہی برہمی اور خودنمائی ''آئندہ'' شمارہ ۲۳، ستمبر ۲۰۰۱ء میں ''محبتیں اور شکائتیں'' کے تحت مرزا حامد بیگ کا مکتوب پڑھ کر نظر آئی۔ سوال یہ ہے کہ ہمارا ادیب Narcissism کا شکار کیوں ہے؟ وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا، اگر وہ اچھا اور جاندار ادب تخلیق کرے گا تو وہ ادب اپنا قاری خود بخود تلاش کر لے گا۔ جتلانے سے تخلیقی قوتوں کو نہ صرف ضعف پہنچتا ہے بلکہ ادب میں تعمیری کی بجائے تخریبی عمل نمو پذیر ہونے لگتا ہے۔ ادب کسی عہد کا پابند نہیں ہوتا۔ کیا ادب قاری کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے؟ اسی سوال کا بڑا مدلل جواب نصیر احمد ناصر نے دیا ہے وہ

لکھتے ہیں ''یقیناً ادب اور قاری لازم ملزوم ہیں۔ ادب ہوگا تو قاری بھی ہوگا لیکن یہ پہلے انڈا یا پہلے مرغی والی بات نہیں، ظاہر ہے کہ ادب پہلے تخلیق ہوتا ہے اور قاری بعد میں آتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ کسی خاص زمانے کے ادب کا قاری بھی اسی زمانے میں موجود ہو۔ ادب ہر دور میں موجود رہتا ہے۔ قاری کا زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے کا ادب آج بھی بڑی رغبت سے پڑھا جاتا ہے۔ حقیقی ادب قاری کو سامنے رکھ کر تخلیق نہیں کیا جاتا۔ یہ اپنا قاری خود بناتا ہے۔ ادیب اور قاری کے زمانی و مکانی منطقے غیر متعین فاصلوں میں معلق ہوتے ہیں۔ کب، کہاں، کیسے اور کس عہد، کس زمانے میں وہ باہم دگر ہو جاتے ہیں یہ کہنا مشکل ہے۔ قاری ایک طرح سے ادب کی بازیافت کرتا ہے''۔ مقبوضہ کشمیر پر چتن سے شبنم عشائی اور ملتان سے شمع نورین اقبال کے مکتوبات میں ''تسطیر'' کے ساتھ اُن کی قلبی وابستگی اور آپ کی شاعری کے حوالے سے اُن کے بے ساختہ اور کھرے جذبات کی عکاسی نمایاں ہے۔ کامونکی سے شبانہ یوسف کے مکتوب میں سادگی اور سچائی ہے۔ فاروق مونس کا مکتوب انتہائی Fruitful ہے۔ انہوں نے تسطیر کے گذشتہ شمارے کے تجزیے کا حق ادا کر دیا ہے۔ کاشف مجید کے مکتوب کے جواب میں آپ نے جس طرح ان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی کی ہے یہ آپ ہی کا خاصہ ہے۔ آصف ثاقب، شفیع ھمدم، جمیلہ ہاشمی، احسان الٰہی احسن، شاہد حنائی، زہیر کنجاہی، اختر رضا سلیمی، ستیہ پال آنند اور احمد صغیر صدیقی کے مکتوب انتہائی پر مغز اور بامعنی ہیں۔ ایسے مکتوبات کی ایک مستقل ادبی اور تاریخی حیثیت ہوتی ہے۔ عاطف علیم کے افسانے ''مرا ہوا بچہ'' اور تسطیر ۱۵، ۱۶ میں ''دھند میں لپٹا ہوا لایعنی وجود'' دونوں طبع زاد کی بجائے مطبوعہ ہیں۔ عاطف علیم کا افسانوی مجموعہ ''شمشان گھاٹ'' جنوری ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا۔ تخلیق کسی ادبی جریدے میں اشاعت پذیر ہو یا کتاب کی شکل میں سامنے آئے ہر دو صورتوں میں منظر کہلائے گی۔ اس کی Originality بعد میں قائم نہیں رہتی۔ میں انتہائی ادب سے عرض کروں گا کہ یہ ادبی بددیانتی ہے۔ عاطف علیم میں ٹیلنٹ ہے۔ وہ افسانہ لکھنا جانتے ہیں۔ وہ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں۔ لیکن ایک ہی افسانہ مختلف جرائد کو بھیجنے سے گریز کریں۔ رشید امجد کا افسانہ'' گملے میں اگا ہوا شہر ۔۲'' علامتی انداز میں لکھا گیا ایک اچھا افسانہ ہے۔ معاشرے میں بسنے والے لاکھوں انسانوں کا باطنی کرب انہوں نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ احمد شیر رانجھا کا ''منو کی مرغابیاں'' میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ احمد شیر رانجھا صاحب نے افسانے کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ ممکن ہے افسانہ واقعی اعلیٰ ہو مجھے اپنی کم فہمی کا اعتراف ہے، میں اس افسانے کو بالکل نہیں سمجھ سکا۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی کا ''نیا سمجھوتہ'' میاں بیوی کی شادی کے بعد اولین والہانہ محبت کے زوال کی عکاسی کرتا ہوا ایک حقیقت پسندانہ پس منظر میں بُنا گیا افسانہ ہے بچے ہونے سے کیا عورت کی محبت تقسیم ہو جاتی ہے؟ یہ اس افسانے کا مرکزی نقطہ ہے۔ شفیع ہمدم کا ''ڈھال'' ایک عورت کی باطنی Odessey کی مکمل کیفیات کا آئینہ دار جاندار افسانہ ہے۔ اگر مجھے صیغہ واحد متکلم میں اجمل اعجاز سے بات کرنے کی اجازت دی جائے تو میں برملا کہوں گا، اجمل اعجاز تم نے ''بلی ماں'' کمال کا افسانہ تراشا ہے۔ طنز بھی ہے' کاٹ بھی' سبق آموز اور فکر انگیز بھی! بلی کی یہ فطرت ہے اسے جتنی دور جا کر چھوڑ دیا جائے، وہ اپنا گھر تلاش کر کے لوٹ آتی ہے۔ یہ افسانہ اُن فیشن ایبل خواتین کے منہ پر طمانچہ ہے جو اپنے

Breast کو Figure کو maintain رکھنے کے لیے اپنی اولاد کو دودھ جیسی نعمت سے محروم رکھ کر Cancer تو پال لیتی ہیں لیکن ''بلی ماں'' کا کردار ادا نہیں کرتیں۔ محسن عثمانی نے ''سچ کا سپنا'' میں پیار سے محروم بچے کی کیفیات کو paint کیا ہے۔ ثمینہ افتخار اعوان نے ''حکمت کا اصول'' میں عورت اور مرد کی فطری تفاوت سے لے کر اُن Roots تک کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے تحت مرد ہمیشہ Upper Hand ہوتا ہے۔ تحریر میں نفاست اور سلاست ہے۔ افسانے کا کمال یہ ہے کہ اس میں وحدت تاثر نمایاں ہے۔ آخری افسانہ محمد فیاض عزیز کا ''تھا خواب میں خیال میں'' اپنی نوعیت کا منفرد افسانہ ہے۔ معاشرتی "Hypocrisy" کے حوالے سے تخلیق کئے گئے اس افسانے میں کڑوا سچ ہے۔ تسطیر کے اداریے پر ردِ عمل کے عنوان کے تحت چھپنے والے خطوط اپنی افادیت کے حوالے سے ایک الگ کتاب کے متقاضی ہیں۔

(محمد حامد سراج - میانوالی)

☆ میں نے سن ۶۰ اور ۷۰ کی دہائی میں کچھ نظمیں لکھی تھیں جنھیں میں نے کسی کو نہیں دکھایا۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں جس پیشے سے میں منسلک تھا اُس میں ادب لطیف کی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا میں اُس ڈائری کو وقت کی الماری میں تالا بند کر کے اُسے بھول گیا۔ کئی دہائیاں بیت گئیں۔ شاید اس لیے بھی کہ اس کے اصل ناقد ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ چند برس قبل میں نے اپنے بزرگوار دوست محمد خالد اختر (جنہوں نے اس ماہ وفات پائی) کو ایک خط میں لکھا کہ میں اس ڈائری کو جلانے لگا ہوں کہ یہ مجھے اپنے گھناونے ماضی کی یاد دلاتی ہے۔ انہوں نے مجھے منع کرتے ہوئے جواب میں لکھا کہ ایسا ہرگز مت کرنا، بعض اوقات جو چیزیں ہم جلانا چاہیں وہ محفوظ کرنے والی ہوتی ہیں۔ بالآخر ایک دن میں نے اس ڈائری کو وقت کی پاتال سے نکالا، اس پر دہائیوں کی جمی گرد کو جھاڑا اور اسے اس زمین کے خالص باسیوں کی ایک چوپال میں پڑھنے کے لیے لے گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ زمین کے باسی سچائی کو سننا پسند نہیں کرتے۔ خوش قسمتی سے وہاں ایک خلا سے اُتر آنے والی اپسرا ابھی موجود تھی جو دن کے اُجالے میں سپنے بُنتی ہے اور مدھر گیت لکھتی ہے۔ میں نے وہ ڈائری فرحت سپنا کے حوالے کر دی۔ اُس نے ان میں سے چند نظمیں ''تسطیر'' کو لاہور روانہ کر دیں۔ جواب میں جناب نصیر احمد ناصر نے مجھے اپنی کتاب ''عرا بچی سو گیا ہے'' ارسال کی۔ نصیر احمد ناصر کی یہ نظمیں پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ ہمارا عرابچی بھی سویا تھا اور جواب جاگ پڑا ہے۔ یہ نظمیں خلا کے پار کے ساتوں آسمانوں کو چیرتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کا اسلوب منفرد اور الفاظ و معنی کا انداز نہایت لطیف ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے 'عرابچی سو گیا ہے' کی نظمیں کشمیری پشمینے کی شال کی طرح ہلکی پھلکی، ملائم، گداز اور خوبصورت ہیں۔ اپنے گوٹھ کے آشرم میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا جب میں یہ سطور قلم بند کر رہا تھا تو موسم سرما کے اختتام پر باہر بہار کا سماں تھا۔ آسمان میں ہلکے بادل تھے اور فضا میں ہلکی اور سہانی ہوا۔ اچانک میرے پالتو موروں کا جوڑا معمول سے پہلے چھت سے اُتر کر دانہ طلب کرنے کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ تب مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مور میرے جذبات بھانپ کر اپنی رنگین اور نازک سندرتا کے ساتھ عین اس وقت اپنی گواہی دینے آئے ہوں۔ ایک سندر چیز کی اس سے سندر گواہی اور کیا ہو سکتی ہے! رہا سوال میری نظموں کا تو وہ اب چالیس برس پرانے مرقد کے کھنڈر سے زندہ ہو اُٹھنے والی

بدروحیں لگتی ہیں۔ تو بھی اُنکی اپنی ایک جگہ ہے کہ ان میں وقت کے دھاروں، زمینی غاروں اور گپھاؤں میں پلنے والوں کے خواب شامل حال ہیں۔ میں اب نئی نظم نہیں لکھ سکتا۔ شاید میرے اندر کا شاعر کب کا مدفون ہو چکا ہے۔

(خورشید قائم خانی - میرپور خاص، سندھ)

☆''تسطیر'' پہلی دفعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا، سعید احمد قائم خانی کے توسط سے، اچھا لگا، اُس کی بہت زیادہ تعریف کرنا میرے لیے ممکن نہیں کیوں کہ میرا کوئی اتنا اہم ادبی مقام نہیں کہ اس پر کوئی تبصرہ کرسکوں لیکن دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ تعریف جتنی کی جائے کم ہے۔ تمام نگارشات ہی خوب تھیں لیکن بشریٰ اعجاز کا افسانہ تو بہت زیادہ اچھا تھا۔ آپ کی نظمیں خوب تھیں۔ سعید قائم خانی بہت اچھی نظمیں لکھتے ہیں اور ہماری ''ادبی چوپال'' کے سرپرست اعلیٰ تاج قائم خانی کے صاحبزادے ہیں۔ تاج قائم خانی گیتوں اور دوہوں کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ ہمارے میرپور خاص کا تعارف تو آپ سے ضرور ہوگا اور ہم نے ''ادبی چوپال'' کے نام سے ایک ادبی تنظیم بنائی ہے اور ایک رسالہ ''پہچان'' کے نام سے نکال رہے ہیں۔ اور اگر آپ جیسے بڑے ادیبوں کی رہنمائی اور سرپرستی رہی تو یقیناً کوئی اچھا کام ہم بھی کرسکیں گے۔ میرا نام فرحت سپنا ہے بنیادی طور پر گیت نگار ہوں لیکن پہلی بار نثری نظمیں لکھی ہیں اور نظم کے ایک بڑے نام کو ہی بھجوانا چاہ رہی ہوں۔ اپنے علاوہ میں خورشید قائم خانی جو بین الاقوامی شہرت کے ادیب ہیں ان کی چند نثری نظمیں بھی بھجوا رہی ہوں۔ خورشید قائم خانی دو کتابوں ''بھٹکتی نسلیں'' اور ''سیپیاں اور پتھر'' کے مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ کالم نگاری اور مضمون نگاری بھی کرتے ہیں اور انڈو پاک میں اپنا مقام رکھتے ہیں اور ہمارے ادبی چوپال کے باقاعدہ ممبر ہیں۔ میری تحریر کا تو مجھے اندا[زہ] نہیں کہ کیسی ہے لیکن خورشید صاحب کی نثری نظمیں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں امید کرتی ہوں ضرور شائع کر[یں] گے۔ ساتھ ہی زر سالانہ بھجوا رہی ہوں کیوں کہ اتنے اچھے رسالے کی میں ممبر بننا چاہونگی۔

(۲)

میرے لیے تو یہ اعزاز سے کم نہیں کہ آپ نے خط کا جواب دیا۔ کیونکہ ایسا رسپانس بہت ہی کم لوگ دیتے ہیں۔ خاص طور پر بڑے ادیب لیکن اس سے اندازہ ہوا کہ آپ بڑے انسان بھی ہیں۔ خورشید صاحب سے تو آپ کا تعارف کرا دیا ہے انشاء اللہ اُن کی کتابیں بھی بھجوا دونگی۔ اب آپ جیسے ہی ایک انسان اور ادیب اور شاعر تاج قائم خانی کا آپ سے تعارف کراتا ہے۔ یقیناً آپ تاج صاحب سے واقف ہوں گے دوہوں اور گیتوں کے حوالے سے ایک منفرد نام اور کام والے تاج قائم خانی اُن کی شاعری کا ایک مجموعہ ''چھاؤں سلگتی راہوں میں'' آ چکا ہے اور راجھستانی لوک کہانی کا ترجمہ ''ڈھولا مارو'' کے نام سے کیا ہے جو اُن کا ایک منفرد کام ہے۔ پیشے سے وکیل ہیں۔ رسالہ ''پہچان'' کے نگران اور سرپرست اور ہماری ادبی تنظیم ''ادبی چوپال'' کے بھی سرپرست ہیں۔ اُن کی شخصیت میرپور خاص کے ادیبوں اور شاعروں کے لیے سایہ دار بوڑھے برگد کی طرح ہے۔ اُن کی کتابوں کا سیٹ آپ کے لیے بھجوا رہی ہوں۔ یقین مانیئے مجھے یقین نہ تھا کہ میری ''نظم'' اس لائق ہوگی کہ آپ جیسے بڑے ادیب اُسے اپنے رسالے میں جگہ دیں گے۔ دراصل میں نے ایک خط ''استعارہ'' والے ''صلاح الدین پرویز'' کو بھی لکھا تھا اور اپنا ایک دیرینہ مسئلہ اُن سے بیان کر کے اُن سے مدد مانگی تھی لیکن

اُنھوں نے خط کا جواب نہیں دیا۔ اب آپ کی کتاب ''عرا بچی سو گیا ہے'' پڑھی تو روشنی محسوس ہوئی سو وہ خط یعنی اُس کی فوٹو اسٹیٹ آپ کو بھجوا رہی ہوں پڑھ کر اگر کچھ رہنمائی کر سکیں تو مہربانی ہوگی کیونکہ یقیناً آپ صاحب علم لوگ ہیں۔ اور یقین کریں مجھے نثری نظموں نے کبھی انسپائر نہیں کیا لیکن آپ کی نظمیں پڑھنے کے بعد میرا دل خود بخود نثری نظم لکھنے کو مائل ہو رہا ہے۔ میں جو بھی نظمیں لکھوں گی آپ کو بھیجوں گی اس لیے نہیں کہ آپ شائع کر دیں بلکہ اُن پر اگر وقت ہو تو اپنے تاثرات بتا دیں کہ کیسی ہیں۔ اس خط کے ساتھ دو نظمیں اور بھجوا رہی ہوں اگر وقت ہو تو ضرور پڑھیے گا۔ اور ہاں سر ''اردو تنقید تاریخ کے جبر کا شکار ہے'' اس موضوع پر میری سحر انصاری سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے تنقید کے جن کے نام سے ایک اداریہ لکھا تھا جو ادبیات نے شائع کیا تھا اُس کی ایک خاص بات جو انہوں نے بتائی آپ کو لکھ رہی ہوں جو مجھے بہت اچھی لگی وہ یہ کہ ہمارے تنقید نگاروں کا حال الہ دین کے جن والی شہزادی کا سا ہے جس نے پرانا چراغ دے کر نیا چراغ لے لیا تھا۔ اب لاکھ اُس چراغ کو رگڑو اُس میں سے جن برآمد نہیں ہوگا یعنی تنقید نگار اب نئے چراغ کو رگڑ رگڑ کر پریشان ہیں لیکن اُس میں سے تنقید کا جن برآمد ہی نہیں ہو رہا۔ **(فرحت سینا- میرپور خاص، سندھ)**

☆ آپ کو ایک نظم ارسال کی تھی وہ تسطیر میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس قدر حوصلہ افزائی ہوئی کہ اس مرتبہ ایک غزل اور افسانہ بھیج رہا ہوں۔ اگر یہ دونوں چیزیں کسی قابل ہوں تو مجھے خوشی ہوگی۔ شمارہ ۱۷-۱۸ پڑھا تو محسوس ہوا کہ کچھ پڑھا ہے۔ تسطیر کی خوبی یہ ہے کہ اس کے معیار اور انبار سے انسان کا وزن زیادہ اور قد آسمان سے کچھ قریب ہو جاتا ہے۔ پچھلے شمارے میں غزال ضیغم کا افسانہ ''گنبد تیز گرد نیلی فام'' پڑھا تھا۔ اس پر لکھنے کا ارادہ بھی تھا۔ لیکن والد کی بیماری اور پھر وفات کی وجہ سے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ جب تازہ شمارہ ملا تو ابھی تک اس افسانے کا سحر باقی تھا اور ذہن معطر تھا۔ اچھے فن پارے کی تعریف قاری کا فرض ہوتا ہے لہٰذا مجھے اپنی کوتاہی کا احساس تھا کہ میں نے اپنا فرض پورا نہیں کیا شاید اسی لیے حصہ مراسلت پڑھنے کو جی چاہا لیکن حیرت ہوئی کہ خطوط میں غزال ضیغم کا نام کہیں نہیں تھا۔ تقریباً پچپن خطوط میں سے صرف بارہ (۱۲) میں افسانوں کا ذکر تھا، ان میں ''گنبد تیز گرد نیلی فام'' کا ذکر نہ پا کر جی چاہا کہ اس خوبصورت افسانے پر چند سطریں لکھوں جو یقیناً افسانے کا حق تو ادا نہیں کر سکتیں بس مدح سرائی ہیں۔ غزال ضیغم کا افسانہ ''گنبد تیز گرد نیلی فام'' اردو کے بہترین افسانوں میں رکھنے کے لائق ہے جس کامیابی سے جیسمین بلموٹ کے اندر کی کشمکش کو اجاگر کر کے اسے منطقی انجام تک پہنچایا گیا ہے اس پر افسانہ نگار کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ جنسی جذبے پر معاشرتی اور مذہبی دباؤ نے بہت سی الجھنیں پیدا کر رکھی ہیں۔ ان الجھنوں نے اس فطری جذبے کے ساتھ احساس گناہ کو اس طرح گھلا ملا دیا ہے کہ اکثریت نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ یہی حالت جیسمین بلموٹ کی ہے وہ نفس کو پاکبازی کی وجہ سے اپنا آئیڈیل سمجھتی ہے باپ اور پھوپھی کی نصیحتوں نے اسے ذہنی طور پر بالغ نہیں ہونے دیا ہے۔ ۳۲ سال کی عمر تک اسے چھونا تو کجا کبھی کسی نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ جیسمین بلموٹ پولیس کے محکمے کی ایک اہلکار بھی ہے اس حوالے سے وہ ایک آن بان والی دبدبے دار اور اکھڑ مزاج عورت ہے۔ اسے جب ریڈیو اسٹیشن کا ایک میوزک ڈائریکٹر مار پیٹ کر جبر کر کے جھکا لیتا ہے تو اس کی

انا کو شدید دھچکا پہنچتا ہے وہ ایک ہی وار میں دو محاذوں پر شکست کھاتی ہے اور فاتح سے شدید نفرت کرنے لگتی ہے۔ انا کے مجروح ہونے کا دکھ اور احساس گناہ جیسمین کے اندر عجیب کشمکش پیدا کر دیتا ہے۔ وہ خودکشی تک کرنے کا سوچتی ہے اور کشمکش شدید ہو کر بالآخر جیسمین کی نفرت کو محبت میں بدل دیتی ہے۔ اور وہ بھی ایسے شخص سے جس کے متعلق جیسمین کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری کئی عورتوں سے تعلق رکھتا ہوگا۔ یہ انجام افسانے کو فطرت کے بہت قریب کر دیتا ہے۔ یہ موضوع افسانہ نگار سے جس دلیری اور بہادری کا تقاضا کرتا تھا وہ یقیناً پورا ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کا آغاز، جیسمین کا تعارف اور انجام جس مشاقی اور مہارت سے کیا گیا ہے وہ غزال ضیغم کے پختہ فنکار ہونے پر گواہی دیتا ہے۔ موجودہ شمارے میں ستیہ پال آنند کا خط پڑھا دل بھر آیا اس گمبھیر مسئلے پر غور و فکر کی اشد ضرورت ہے بلکہ یہ مسئلہ سنجیدہ تحریک کا متقاضی ہے۔ کچھ باتیں علی دانش صاحب کے مقالے پر کرنا چاہوں گا۔ جو انھوں نے مشکور حسین یاد کے مقالے ''ہجرت کا جدید ترین تصور'' کی تردید میں لکھا ہے۔ مقالہ نگار سے معذرت کے ساتھ مقالہ مواد کے اعتبار سے کمزور، منطقی حوالے سے بے جان اور ابلاغ کے لحاظ سے مبہم اور غیر واضح ہے۔ مقالہ مبہم اور غیر واضح اس لیے ہے کہ مقالہ نگار نے وطن اور قوم کی کوئی تعریف کیے بغیر مواد پیش کر دیا ہے جبکہ یہ دونوں اصطلاحیں متفق علیہ نہیں بلکہ متنازع فیہ ہیں۔ پورا مقالہ پڑھ لینے کے باوجود قاری وطن اور قوم کی مروجہ تعریفوں میں سے کسی ایک تعریف کا اطلاق مقالے پر نہیں کر سکتا۔ اس کمی نے مقالے میں شدید تشنگی پیدا کر دی ہے۔ اس کے باوجود منطقی اعتبار سے اس میں ''ہجرت کا جدید ترین تصور'' کی تردید کی بجائے اس کی تائید نظر آتی ہے۔ **(سید ماجد شاہ۔ راولپنڈی)**

☆ تسطیر۔ ۱۵، ۱۶ نظر نواز ہوا۔ غزل اور خط کی اشاعت کے لیے شکر گزار ہوں۔ خطوط اور ردِ عمل کے تحت آپ کے اداریئے کے حوالے سے اثرات یقیناً جاننے اور کہنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ''گہرے نیلے پانیوں کی جل پری'' میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ڈنمارک کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اُن کا مخصوص انداز ہی نہیں بلکہ قاری کو پڑھنے پر مجبور کرنے کی انفرادیت کا حامل ہے۔ پسند آیا۔ ''طاؤس کے خطوط'' میں اردو ادب کی تاریخ کے کچھ یادگار واقعات چھاپ کر آپ نے ہمیں طاؤس سے بھی روشناس کروایا ہے۔ جوگندر پال کی ''سواریاں'' اور رفاقت حیات کی ''پرچھائیں'' دو ایسی کہانیوں پر مربوط ہیں جن سے موجودہ معاشرے اور حالات کی آگاہی شعور سے لاشعور تک جا پہنچتی ہے انتظار حسین پر مرزا حامد بیگ کی تحریر اور آپ کے فٹ نوٹ نے کچھ زیادہ ہی لطف دیا۔ پڑھ کر میں بہت دیر تک اس کے سُرور میں رہا۔ اعجاز نعمانی اور نصیر احمد ناصر کے ماہیے بھی اچھے لگے غزلوں کے حصے میں اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی بے ترتیبی دیکھنے میں آئی، غزلوں میں ترتیب کا وہ حُسن جو ''تسطیر'' کا خاصہ ہوا کرتا تھا اس شمارے میں مفقود تھا۔ **(غالب عرفان۔ کراچی)**

☆ تسطیر۔ ۱۷، ۱۸ میں بہت سی معیاری چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ ''کیا ادب اور قاری لازم و ملزوم ہیں'' میں آپ نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ حقیقی ادب قاری کو سامنے رکھ کر تخلیق نہیں کیا جاتا بلکہ یہ اپنا قاری خود بناتا ہے۔ افسانوں میں حسرت کاسگنجوی کا ''نیا سمجھوتہ'' انسانی جذبات کا عمدہ عکاس ثابت ہوا ہے۔ طویل نظم میں حامدی کاشمیری کی ''کوہ سبز پر'' بھرپور کاوش ہے۔ نظموں میں جیلانی کامران، گلزار، جمیل ملک، ریاض مجید، کرامت

بخاری، ادا جعفری، بشریٰ اعجاز اور سیدہ آمنہ بہار رونا کی نظمیں اچھی لگیں۔ نثری نظم میں بھی بہت سی عمدہ کاوشیں سامنے آئیں۔ ترجمہ اور تنقید و تحقیق کا حصہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ شاعری میں انفرادی مطالعہ کا سلسلہ ضرور جاری رکھیے گا۔ رتھ وائلڈس شلر نے نثری نظم کی جو وضاحت کی ہے وہ مخالفین کے لیے کافی ہونی چاہئے۔ ویسے بھی یہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو دیارِ ادب میں اپنا ایک معتبر مقام بنا چکی ہے۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ ''عرا بچی سو گیا ہے'' پڑھنے کا موقع ملا۔ نظموں میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور خارج اور باطن کی بہت سی کیفیات کو خوبصورتی کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔ ''اجنبی کس خواب کی دنیا سے آئے ہو''، ''یہاں تو وہی خواہش آب ہے''، ''ابد کے اُس طرف سے فاصلے ہیں'' اور ''بک مارک'' جیسی نظمیں محبت کی جزئیات کی تصویر کشی کرتی ہیں اور اسی نوع کی نظمیں مجھے زیادہ پسند آئی ہیں اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ میری تحریروں کا مرکز محبت کا طاقتور جذبہ ہی ہے۔ یہ نظمیں موضوعات اور پیرائیہ بیان دونوں اعتبار سے متنوع خصوصیات کی حامل ہیں۔ اس سے قبل آپ کو اپنی نثری نظموں کا پہلا مجموعہ ''شبنم سے مکالمہ'' ارسال کر چکی ہوں۔ اسی سلسلے کی دوسری کڑی ''محبت زمانہ ساز نہیں'' کی شکل میں حاضرِ خدمت ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اس کتاب پر اپنی رائے سے ضرور نوازیں۔ مستقبل قریب میں اپنی ایک اور کتاب (جو کہ تراجم پر مشتمل ہے) بھی پیش کروں گی پچھلے شمارے کے لیے اپنی اور استادِ محترم جناب ڈاکٹر ریاض مجید صاحب کی تخلیقات ارسال کی تھیں جن میں سے چند ایک شمارہ ۱۷، ۱۸ میں شامل ہیں۔ میں آپ کی بہت ممنون ہوں اور اپنی اور استادِ محترم کی مزید کچھ تخلیقات ارسال کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر ریاض مجید صاحب کی طرف سے سلام قبول کیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ''تسطیر'' کو مزید کامیابیوں سے نوازے۔

(رابعہ سرفراز-فیصل آباد)

☆ نثری نظم کو آپ کی حمایت حاصل ہے۔ یہ خبر ہمارے لیے مسرت آمیز ہے۔ کچھ لوگ نثری نظم کی مخالفت صرف اور صرف اس سوچ کے تحت کر رہے ہیں کہ چھوٹی بڑی سطروں میں کسی عامیانہ سے خیال کو تحریر کر دینا ہی نثری نظم ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میرا دعویٰ ہے آزاد نظم کے مقابلے میں نثری نظم کہیں زیادہ مشکل ہے اور وہ اس لیے کہ آزاد نظم میں عروضی آہنگ کی موجودگی میں ترنم ہر مصرع میں لہریں مارتا نظر آتا ہے اور نثری نظم میں ہم سطریں اس انداز میں کاٹتے ہیں کہ نثر پہ نظم کا گمان گزرتا ہے اور کوشش کرتے ہیں کہ خیال بھی بلیغ ہو۔

(غلام شارق عدیل-انڈیا)

☆ تسطیر مل جاتا ہے تو بہت سے دن اچھے گزر جاتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس معیار کا مجلّہ، جیسا کہ ''تسطیر'' ہے نکالنا کس طرح سے جان جوکھوں کا کام ہے اور اس میں کتنی توانائیاں ڈالنا پڑتی ہوں گی۔ آپ کی محنت اور ریاضت ہی سے اس کا ادبی رنگ اور خوشبو بنتی ہے۔ تحریروں کا ذوق اور معیار بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔ اگلے شمارے کے لیے افسانہ ''نیند'' بھیج رہا ہوں۔

(محمد سعید شیخ-خوشاب)

☆ عرصہ ہوا تسطیر سے ملاقات ہوئے۔ نئے شمارے کی کچھ خیر خبر دیجئے۔ پچھلے دنوں چینی وفد کے استقبال لیے میں اسلام آباد میں کچھ احباب سے سنا کہ تسطیر کا کوئی خواتین سے متعلق شمارہ آ رہا ہے۔ خبر خوشی کی ہے لیکن مجھ تک دیر سے پہنچی۔ میں پچھلے دنوں اردو ماسٹرز کے پیپرز دینے میں مصروف رہی۔ پیپرز کے فوراً بعد میری

خوشدامن صاحبہ نہایت علیل رہ کر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ غرض ایک پریشانی اور افراتفری میں مبتلا رہی۔ اردو کے پیپرز میں جتنا فائدہ گزشتہ تسطیر کے مختلف شماروں سے اٹھایا اتنا اور کسی رسالے سے نہیں اٹھایا چونکہ ہر شمارے میں کورس سے متعلق دو تین مضامین ملتے رہے جس کی وجہ سے تسطیر کے سنجیدہ حصوں کا مطالعہ بھی ہوگیا۔ پچھلے شمارے میں مجھ تک جو کتاب پہنچی اس میں ایک پوری کاپی غزلوں کی غیر حاضر تھی جس کی وجہ سے بہت سی اچھی غزلوں کے مطالعے سے محروم رہ گئی۔

(شبہ طراز-لاہور)

☆ تسطیر-۱۸، ۱۷ موصول ہوا۔ سرورق خوبصورت ہے۔ اداریہ ''سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شاعری کی افادیت'' متاثر کرتا ہے، اداریئے میں اٹھائے گئے سوالات پر اگر عمل ہو جائے تو یہ ادب اور معاشرے کے لیے بڑا سود مند ثابت ہوگا۔ رشید امجد کا ''گملے میں اُگا ہوا شہر'' شفیع ہمدم کا ''ڈھال'' اجمل اعجاز کا ''دبلی ماں'' محسن عثمانی کا ''سچ کا سپنا'' یہ افسانے معیار، اسلوب اور کہانی کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کے ہیں۔ یامین کی طویل نظم ''جہلم کے کنارے'' قابل داد ہے۔ کرامت بخاری کی ''ہمارا کیا ہے'' عامر عبداللہ کی ''آخر اک دن'' ڈاکٹر علی اظہر کی ''وجدان کی دہشت'' ارشد نعیم کی ''مراجعت'' اکمل شاکر کی ''یہ صدی کی انتہا ہے'' ادا جعفری کی ''وہ بے خبر نہ تھے'' (بہت مدت بعد ادا جعفری کی نظم پڑھنے کو ملی) ثمینہ راجہ کی ''زندگی جو کہانی بن گئی'' شاہین مفتی کی ''ایک بے عنوان سی نظم'' بشریٰ اعجاز کی ''چلے جانا'' ناہید قمر کی ''کہانی ختم ہوتی ہے'' بہت اعلیٰ نظمیں ہیں۔ محمد صلاح الدین پرویز، آفتاب اقبال شمیم، ابرار احمد، زاہد حسن، مصطفیٰ ارباب، ارشد معراج، غزالہ خاکوانی، جاوید فیروز اور فہیم شناس کاظمی کی نثری نظمیں لاجواب ہیں۔ فہیم شناس کاظمی ان دنوں خوبصورت نثری نظمیں کہہ رہے ہیں۔ آپ کی نظم ''کاغذ کی تنہائی'' بے مثال نظم ہے۔ اس بار شاعری میں حصہ نظم بھاری ہے۔ ظفر اقبال، امجد اسلام امجد، عرفان خانی کی غزلیں بہتر ہیں۔ غزلوں میں کوئی متاثر کرنے والے اشعار نہیں مل سکے۔ انفرادی مطالعہ میں ثمینہ راجہ کی غزلیں قابل داد ہیں۔ سندھی ادب میں شامل تحریریں متاثر کرتی ہیں۔ سندھی ادب کو آپ نے تسطیر میں نمایاں جگہ دی ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔

(خالد ریاض خالد-ملتان)

☆ دو سال قبل بشریٰ اعجاز کے ہاں پہلی دفعہ ''تسطیر'' سے تعارف ہوا تب سے اس کی ریگولر قاری ہوں اور اس کی تحریروں کے سحر میں پوری طرح گرفتار ہو چکی ہوں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نئے لکھاریوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ورنہ ادبی رسائل عموماً نئے لکھاریوں کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کرتے ہیں۔ گزشتہ شمارے میں میری دوست ثمینہ افتخار اعوان اور آسیہ اعوان کی تحریریں چھپیں تو مجھے بڑی حیران کن خوشی ہوئی وہ دونوں مجھے بھی اپنی تحریریں آپ کو بھجوانے کا مشورہ دے رہی تھیں مگر مجھے تھوڑی سی ہچکچاہٹ ہو رہی تھی قلم اور کاغذ سے میرا بھی رشتہ ہے لیکن تسطیر جیسے پرچے میں اپنی تحریر بھیجنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ ثمینہ کے اصرار پر چند غزلیں، نظمیں اور ہائیکو ارسال کر رہی ہوں اگر تسطیر کے معیار پر پورا اتریں تو انہیں جگہ دیں۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو پھر افسانے وغیرہ بھی بھیجوں گی۔

(فضہ ملک گل-راولپنڈی)

☆ ''پنجابی ادبی سانجھ'' کے دفتر میں تسطیر ۱۸، ۱۷ میز پر جلوہ افروز دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ انتہائی معیاری، معلوماتی اور ذہن کو معطر کرنے والی تحریروں سے مزین پرچہ ہے۔ میں پنجابی پرچوں کا ہی مستقل قاری ہوں یہ

پہلا اُردو پرچہ ہے جو اس قدر باریک بینی سے زیرِ مطالعہ ہے۔ فاروق مونس، ذوالفقار احسن، اکبر حمیدی، انور سدید، نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر سلیم اختر، اختر رضا سلیمی اور اسماء رابعہ کی منظوم و منثور تحریریں پڑھ کر دل باغ و بہار ہو گیا، آتش کیانی کا نام پنجابی ادب سے تعلق رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں ان کے ماہیے انتہائی معیاری اور پنجابی کلچر کی عکاسی کرتے ہیں لیکن ان سے گزارش ہے ماہیا ایک پنجابی لوک صنف ہے۔ آتش کیانی تو پنجابی ادب اور کلچر کو سمجھتے ہیں۔ مجھے افسوس ہوا آتش کیانی ایسا سچا اور سُچا پنجابی سیوک ادبی بدیانتی کا مرتکب ہوا ہے۔ اردو والے اردو ماہیا بے شک اسی بحر میں لکھیں۔ لیکن ایک سچے پنجابی سیوک اور شاعر کا جان بوجھ کر اصل بحر کو چھوڑ کر اردو والوں کی تقلید کرنا اچھا نہیں۔ نصیر احمد ناصر ایک قادر الکلام شاعر اور وسیع ظرف کے مالک ہیں، امید ہے میرا یہ خط ضرور شائع کریں گے، پھر آتش کیانی نوجوان شعراء میں پنجابی اور پنجاب کی محبت کا دم بھرنے میں سب سے آگے ہیں مجھے حیرانگی ہوئی ہے کہ تسطیر کو اس قدر پسند کرنے کی اصل وجہ کیا ہے۔ فاروق مونس سے ایک ادبی دوست کی معرفت تسطیر کا تازہ پرچہ مانگا تھا لیکن وہ تمام پرچے تقسیم کر چکے تھے۔ میرے اسی ادبی دوست نے وعدہ کیا ہے کہ اس دفعہ مجھے پرچہ ضرور ملے گا۔ **(الیاس رومی - هڑپه)**

☆''اردو تنقید تاریخ کے جبر کا شکار ہے'' کا تسلسل اور اس پر جو ردِ عمل سامنے آیا ہے اس نے سنجیدہ اور پُر خلوص تنقیدی اور تاریخی پہلوؤں کا اُردو ادب میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ یقیناً ادبی تناظر میں صحت مند تبدیلی کیلئے بھی بارش کے پہلے قطرے کا کردار ادا کیا ہے۔ المختصر اس جیسے تازہ موضوعات سے خوشگوار تبدیلی کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ **(غضنفر عباس سید-ساهیوال)**

☆تسطیر کے آغاز سے اختتام تک بین السطور کئی ادبی، تخلیقی اور تنقیدی پہلو سامنے آتے ہیں یوں جہاں ایک عام قاری اس سے محظوظ ہوتا ہے وہاں تخلیق کار بھی اس سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں۔ کیا ادب اور قاری لازم و ملزوم ہیں؟ نصیر احمد ناصر کے ''ادبی دنیا'' کے لیے لکھے گئے انٹرویو سے اقتباس پیشِ نظر ہے۔ ادب اور قاری کے حوالے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ ادب جب اور جہاں بھی تخلیق ہوا، اسی دور میں اور وہیں اس کا قاری بھی پیدا ہوا۔ جس ادب کا قاری نہیں وہ ادب ہی نہیں ہو سکتا۔ ادب اور قاری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب ہر دور میں موجود رہتا ہے تو قاری اس کے سنگ رہتا ہے۔ قاری کا زمانہ نہیں بدلتا بلکہ مزاج و معیار بدلتا ہے۔ جس طرح ادب کے لیے کوئی زمانی قید نہیں اسی طرح قاری پر بھی کوئی عصری قدغن نہیں۔ غالب کا قاری اگر اپنے زمانے میں نہیں تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ غالب اپنے دور کا ناکام شاعر تھا لیکن عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ کیوں! وہ اس لیے کہ غالب کا قاری اُس زمانے میں بھی کسی نہ کسی صورت موجود تھا۔ حقیقی ادب اگر قاری کو سامنے رکھ کر تخلیق نہیں کیا جاتا تو تخلیق کار اتنے کاغذ کیوں اور کس کے لیے کالے کرتا ہے۔ رشید امجد کا افسانہ'' گملے میں اُگا ہوا شہر۔۲'' وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر اور جناب انور سدید کے Level کا علامتی افسانہ ہے۔ علامات کا اتنا بے دریغ استعمال عام قاری کیسے سمجھ پائے گا۔ وہ تو ایک نے کہا، دوسرے نے سُنا، کیا ہوا، کچھ نہیں، مرنے والا کون تھا، میں نہیں جانتا، تم نہیں جانتے، کی گتھی سلجھاتے تھک کر آدھے راستے سے واپس ہو لے گا۔ شفیع ہمدم کا افسانہ'' زحال'' کا موضوع انتہائی گھسا پٹا ہونے کے علاوہ مکالمات میں بھی

اغلاط ہیں۔ محسن عثمانی نے ''سچ کا سپنا'' دیکھا اور لکھا۔ اس مافوق الفطرت تحریر کے اندر تو جو ہے یا نہیں ایک الگ بات ہے مگر نثر کے حوالے سے کہانی کار کی ناپختگی بہت واضح ہے۔ (شہزادی! ناگہانی کیا ہوتی ہے) جناب عثمانی ناگہانی کو (کوئی بہت بڑا واقعہ یا کوئی...... بہت بڑی بات جس کے لیے بہت زیادہ پیسوں کی ضرورت ہو) سمجھتے ہیں اور غلط سمجھتے ہیں۔ ناگہانی، اچانک کسی مصیبت میں گرفتار ہو جانا یا اچانک افتاد پڑنا ہوتی ہے۔ (کھنگورے کی آواز پر) محترم! کھنگورا پنجابی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مصنوعی مختصر کھانسی یا کسی کو متوجہ کرنے کے لیے گلا صاف کرنے کے ہیں جو ظاہر ہے بغیر آواز کے ممکن نہیں۔ اردو افسانہ پنجابی کے ہر اِلے نِہلے لفظ کو قبول نہیں کرتا اور بجائے خوبصورت لگنے کے بھدا لگتا ہے۔ محمد فیاض عزیز کی ''تھا خواب میں خیال میں'' ایک معاشرتی کرب کے تناظر میں لکھی گئی تحریر ہے مگر اسلوب غیر متاثر کن ہے۔ منیر الدین احمد کا افسانہ ''مسدود راستہ'' درحقیقت ایک سوڈانی لڑکی عائشہ کی سرگزشت ہے۔ لیکن افسانہ نگار نے قاری کو جرمنی کی سیر کراتے ہوئے افسانے کو سفرنامے میں بدل دیا ہے۔ جناب ادیب سہیل نے ''خفی میں جلی اشارہ'' میں وجود اور عدم وجود کا بھرپور تذکرہ کیا ہے۔ مکرمی عشرت رومانی کی ''کوئی چہرہ تمہارا ہو'' ایک بہاؤ میں لکھی گئی مکمل نظم ہے، (تمہیں آواز دیں گے اور بلائیں گے) آواز دینا اور بلانا ایک ہی فعل کے دو نام ہیں۔ ''ہمارا کیا ہے'' یہ کرامت بخاری کی نظم کا عنوان ہے (فریب خوردہ ساعتوں کے فسوں میں رہنا) نجانے کیا کہنا چاہتے ہیں (خاک ہوتی ہوئی مزاروں میں جا نکلنا) (i) مزار مذکر ہے (ii) ہمیشہ مزاروں ''پر'' یا ''پہ'' جایا جاتا ہے۔ توصیف خواجہ کی ''آخری نظم'' لفظ کی حقیقت کا احاطہ کیے ہوئے خوبصورت نظم ہے۔ انواز فیروز کی "Blind" گھور اندھیرا پر ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ کالا! اضافی ہے کہ گورا اندھیرا Itself دوبارہ کالا نہیں بلکہ کئی بار کالا ہوتا ہے۔ دستگیر شہزاد کی ''ہوائے شامِ غم'' اچھی نظم ہے مگر (ہوا کی زد سے کسی شاخ کا کوئی پتہ) ہوا کی زد ''پہ'' یا زد ''میں'' ہونا تو پڑھا، سُنا اور لکھا رکھا ہے ''زد سے'' پہلی بار پڑھا ہے۔ اجمل اعجاز نے ''بلی ماں'' لکھ کر مشرقی معاشرے پر مغربیت کی چھاپ کا اظہار کیا ہے، نثری حوالے سے افسانہ کشش سے محروم ہے۔ موجودہ دور کے افسانے پر افسانہ نگاروں کی گرفت مضبوط نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو تخلیق کاروں کی اسلوبی ناپختگی اور غیر موزوں آغاز ہے۔ دوسری وجہ بنامِ جدت پنجابی الفاظ کا بے دریغ اور بھدا استعمال ہے۔ تیسری وجہ افسانے میں کہانی کا عدم وجود ہے اسی لیے آج لکھاری کو لکھاری یا نقاد پڑھتا ہے اور قاری نے عدم توجہی کا اعلان کر دیا ہے۔ اردو افسانے کے زوال کی کئی اور وجوہات بھی ہیں۔ مثلاً مغربی ادب کے تراجم اور اڑوس پڑوس سے غیر معیاری افسانے کی پاکستانی اردو ادب میں شمولیت۔ اور سب سے زیادہ خوفناک وجہ افراطِ ادب بھی ہے۔ یہاں افراطِ ادب سے مُراد ادب بطور اکائی ہے۔ اس کے محرکات کیا ہیں، اس موضوع پر ایک تحقیقی اور مفصل مضمون کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ میں جناب نصیر احمد ناصر سے توقع رکھتا ہوں کہ متوقع پرچے میں اس موضوع پر اداریہ لکھیں گے۔ تنقید و تحقیق کے عنوان تلے ناصر عباس نیر کا ''اقبال اینڈ رادھا کرشن''، امجد طفیل کا ''تنقید کی آزادی سے معاملہ'' اور محمود احمد قاضی کا ''ترقی پسند تحریک کا مستقبل'' انتہائی پُر مغز اور تحقیق پر مبنی ہونے کے علاوہ تخلیق کاروں کے لیے علمی اور ادبی خزینوں کے حامل ہیں۔ یوں تو تسطیر کی سطر سطر ادبی

دلچسپیاں سمیٹے ہوئے ہے مگر مراسلت میں مراسلہ نگاروں نے اپنی ایک الگ محفل سجائی ہوتی ہے۔اس محفل میں جہاں ادبی تذکرے اور علمی مباحثے ہوتے ہیں وہاں باذوق قارئین کے لیے مسکراہٹ کا سامان بھی ہوتا ہے۔ محترمہ جمیلہ ہاشمی کے مراسلے میں فقط خنکی اور رطوبت ہی بحث طلب نہیں تھی بلکہ آپ (نصیر احمد ناصر) کے ایک ماہیئے کے وزن کے حوالے سے بھی بات ہوئی تھی۔ بہر حال آپ نے رطوبت پر دلائل دے کر مجھ جیسے کئی تشنگانِ ادب کی تشفی کی ہے۔ حصہ غزل کے حوالے سے اگر بات نہ ہوتو گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔توصیف تبسم کی غزل کے آخری شعر کے مصرعہ اولی میں ''آہنگ'' سکتے کا باعث بننے کے علاوہ،بحر و وزن پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ناصر شہزاد کی غزل کے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں ''کیسے'' تیسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں ''پریتما'' چوتھے شعر کے مصرعہ اولی میں ''قسم'' وزن میں سکتے کے موجب بنے ہیں۔علاوہ ازیں چھٹا،ساتواں اور نویں شعر کے مصرعہ اولی بحر سے خارج ہیں۔صابر ظفر ''جہاں تک میں جا سکتا تھا'' کی ردیف کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے اس لئے تمام شعر مفہوم سے خالی ہیں۔عبداللہ یزدانی کی غزل کا کوئی ایک شعر بھی مفہوماتی حوالے سے Appeal نہیں کرتا۔کرشن کمار طور کی غزل کے اشعار نجانے کون سے ماورائی مفاہیم سمیٹے ہوئے ہیں۔پی۔پی سریواستوا رند ساغری،اتنے بڑے نام کے شاعر کی پوری غزل میں صرف مطلع اور مقطع اشعار کی صف میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ظہیر غازی پوری کی غزل کے تیسرے اور چوتھے شعر کا مصرعہ اولی بے وزن ہیں۔چھٹے شعر کے مصرعہ اولی میں ''بے جان پیکروں کی زبان پر ہے التجا'' معنوی خامی واضح ہے۔خاور اعجاز کی غزل کے ساتویں شعر کے مصرعہ ثانی میں ''گی'' آٹھویں شعر کے مصرعہ ثانی میں ''اُڑی'' وزن میں خلل پیدا کر رہے ہیں۔گفتار خیالی کی غزل کے تیسرے شعر کے مصرعہ اولی میں ''فضا میں طاری'' جب کہ کوئی حالت بھی کسی بھی وجود ''پر'' یا ''پہ'' طاری ہوتی ہے۔ناصر بشیر کی غزل کے چھٹے شعر کے مصرعہ اولی ''کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں ننگ دھڑنگ'' کو پڑھنے کے بعد میں نے اپنے لباس کو چھو کر دیکھا،پہنا ہوا تھا۔شاعری شاعر کو ننگ دھڑنگ نہیں کرتی بلکہ خوبصورت الفاظ کی ردا اس پر پھینک کر ستر فراہم کرتی ہے۔یہی مصرعہ اگر ''کمرے میں بیٹھا ہوں میں عریاں بدن'' ہوتا تو اتنی شتر بے مہار شاعری تخلیق نہ ہوتی۔محترم ناصر صاحب! ان صفحات پر جن اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اغلاط العام ہیں۔ان کو اگر اب بھی گرفت میں نہ لایا گیا تو اپاہج ادب کی حوصلہ افزائی ہوگی جو پاکستانی ادب کی تاریخ مسخ کر کے رکھ دے گی۔ **(احسان الٰہی احسن۔اٹک شہر)**

☆ تسطیر۔۱۸،۱۷ملا۔اداریے کے موضوعات نہ صرف تسطیر کے اوراق پر بلکہ یہاں کی علمی و ادبی مجلسوں میں بھی خوب بحث ہوتے ہیں۔یوں ان موضوعات کی اہمیت اور آپ کی فکری وسعت بھی انکشاف ہو رہی ہے۔ ردِعمل میں ڈاکٹر سلیم اختر،ڈاکٹر ستیہ پال آنند، ارشد نعیم اور حامد سراج کی سطروں کے مفاہیم و اشارات زیادہ قائل کرتے ہیں۔آپ کے اداریوں کے ردِعمل کے مستقل سلسلے سے تنقید نگاری کے نئے نام اپنی صلاحیتوں کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ڈاکٹر سلیم اختر کا سفر نامہ ایک سوغات ہے۔مادام تساؤ کا میوزیم سننے کی بجائے دیکھنے کی چیز ہے۔ڈاکٹر صاحب نے قارئین کو لفظی تصویر کے ذریعے یہ میوزیم دکھانے کی کوشش کی ہے۔ بشریٰ اعجاز کا طویل افسانہ ''صبح سفر کی رات'' اپنے موضوع اور لفظیات کے اعتبار سے قابلِ تحسین ہے۔بشریٰ

اعجاز کا نام و کام گزشتہ دہائی میں زیادہ کھل کر سامنے آیا ہے۔ ان کی صلاحتیں مختلف اصناف میں مشاہدہ کی گئی ہیں۔ ان کے سفرنامے منفرد ہیں اور کہانیاں کچھ اور طرح کی۔ میرا یقین ہے کہ آنے والے برسوں میں بشریٰ اعجاز کا نام قطب مینار قرار پائے گا، بشرطیکہ وہ اس چینڈے سے رک نہ گئیں۔ افسانوں کے حصے میں متعدد کہانیاں مثالی ہیں۔ رشید امجد وہ کہانی کار ہیں جو لکھنے کا حق ادا کرتے ہیں۔ ''گملے میں اُگا ہوا شہر۔۲'' کسی ایک شہر کا قصہ نہیں۔ مقام افسوس ہے کہ ایسی آبادیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ مرا ہوا بچہ از محمد عاطف علیم میں بچے کی معصومیت خاص طور پر دکھائی گئی ہے۔ منیر الدین احمد کی کہانی مسدود راستہ نے سب سے زیادہ جگہ گھیری ہے۔ اس کے باوجود افسانہ نگار افسانہ لکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ بلاشبہ مصنف ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور رکھتے ہیں مگر اردو کی کہانی میں اردو لکھنا ہی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ مثلاً اسائلم کی جگہ پناہ یا قیام کا لفظ لکھا جا سکتا تھا۔ اب منیر الدین احمد لکھت کے تجربے میں اس مقام پر ہیں کہ قاری ان سے بڑی کہانی کی توقع رکھنے میں حق بجانب ہے۔ جس طرح حسنِ اتفاق سے کوئی نووارد بڑی کہانی لکھنے میں کمال کر جاتا ہے۔ اس طرح عام طور پر بڑے نام چونکانے یا جھنجھوڑنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بہر کیف میں منیر الدین احمد سے مایوس نہیں ہوا۔ میں نے ان کی کئی اچھی کہانیاں قرات کی ہیں اور آئندہ بھی یہی توقع رکھتا ہوں۔ ''نیا سمجھوتہ'' از ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی ان لوگوں کی کہانی ہے جو تقسیم ہو کر گزشتہ نسل اور آئندہ نسل کے بیچ پھنسے عذاب ناک تجربوں سے گزر رہے ہیں۔ ''پچھلا دروازہ'' از حامد سراج میں نفسیات و روحانیت کے رنگ نمایاں ہیں۔ کہانی کے اختتام پر قاری کے دل سے اک ہوک اٹھتی ہے۔ ''پچھلا دروازہ'' اپنے اختصار کے باوجود جامعیت پر مشتمل ہے۔ ''عزلت نشیں'' از آسیہ اعوان عمدہ مکالموں کی مثال ہے۔ اک خاص لہجہ جو کچھ عرصے سے رواج پا چکا ہے۔ اسی تیکنیک کو آسیہ اعوان نے بھی آزمایا ہے۔ شمشاد احمد اور نیلم احمد بشیر کے افسانچے خوب ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فلیشز کے ذریعے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ خصوصاً ''سٹینس'' از شمشاد احمد اک ملامتی لمحہ فکریہ ہے۔ مگر کیا کیجیے کہ ہماری معاشرت اب اسی نہج کی طرف گامزن ہے۔ تنقیدی مضامین سنجیدہ مطالعے کے متقاضی ہیں۔ آپ مستقل گوشہ سندھی ادب آباد کیے ہوئے ہیں۔ یہ سندھی زبان و ادب سے آپ کے دلی لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ شہناز شورو نے اک سنجیدہ مضمون کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ عموماً اس نوعیت کی چیزیں ترجمہ نگاروں کی ترجیح نہیں بن پاتیں۔ میں سمجھتا ہوں اس ترجمے سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی اردو دانوں میں تفہیم میں مدد ملے گی۔ حیدر جعفری سید صاحب بڑی باقاعدگی سے تراجم کر رہے ہیں۔ ان سے خاص طور پر ہندی افسانے کے ترجمے کرائے جائیں۔ نظم و غزل کا انتخاب یادگار ہے۔ نظم کے حوالے سے آپ کے زیر ادارت شائع ہونے والے پرچے میں آپ ہی کی تعریف مناسب نہیں سمجھتا، تاہم یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ نصیر احمد ناصر کی تعریف درحقیقت نظم کی تعریف ہے اور نظم کی تعریف دراصل نصیر احمد ناصر کی تعریف ہے۔

(شاہد حنائی - کراچی)

☆ تسطیر کا تازہ شمارہ میرے ایک کزن نے برادرم فاروق مونس سے لیا تھا۔ وہ عید کرنے میرے پاس آئے تو تسطیر بھی لیتے آئے۔ سچ پوچھیں تو عید سے زیادہ خوشی تسطیر ملنے کی ہوئی، ذوالفقار احسن اور فاروق مونس کے

خطوط سے مجھے اپنے ماہیے تسطیر میں شائع ہونے کی اطلاع مل گئی تھی لیکن اپنی آنکھوں سے نظارہ کرنے کا اشتیاق تھا۔ یہ میرے لیے اعزاز ہے۔ آپ نے حوصلہ افزائی کی جس کیلئے شکر گزار ہوں۔ میں کافی عرصے سے پنجابی میں لکھ رہا تھا اور چھپ رہا تھا۔ جب دو برس پہلے دانہ پانی اور ذریعہ معاش سرگودھا کھینچ لایا تو انہیں دنوں تسطیر سے تعارف ہوا۔ چند ماہیے تسطیر کے لیے ارسال کیے۔ آپ نے جواب دیا۔ ماہیوں کو پسند کیا اور تسطیر کے لیے منتخب بھی کیے۔ اگر آپ جواب نہ دیتے تو شاید میں پہلے کی طرح پنجابی تک ہی محدود رہتا۔ یہ آپ کی حوصلہ افزائی اور محبت ہی ہے کہ آج میں کچھ نہ کچھ اردو میں بھی لکھتا رہتا ہوں۔ تازہ شمارے میں منظوم اور منثور دونوں حصے ہی انتہائی معیاری ہیں۔ ٹائیٹل انتہائی جاذب نظر ہے۔ کتابت، طباعت اور چناؤ بھی انتہائی شاندار ہے۔ جمیل ملک، سجاد مرزا، کرامت بخاری، عامر عبداللہ، غضنفر عباس سید، فاروق مونس، رب نواز مائل اور اکمل شاکر کی نظمیں پسند آئیں۔ تنقید و تحقیق میں ناصر عباس نیر کی تحریر انتہائی معلوماتی ہے۔ ثمینہ رجب، آمنہ بہار رونا، سیما سراج، نعیمہ ضیاء الدین کی نظمیں انتہائی معیاری اور خوبصورت لگیں۔ نئی اصناف میں شاخ نبات (ماہیے) سائنسی نوعیت کے تھے بے حد پسند آئے۔ خلیق الرحمن کی ہائیکو خوبصورت ہیں۔ اختر رضا سلیمی کی بلا عنوان سے لطف اندوز ہوا۔ آپ کے نظمیے ایک خوبصورت تخلیق ہے۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ نثری نظموں میں ثمینہ رجب، غزالہ خاکوانی، نجمہ منصور، سیما سراج، اسماء رجب، آشا پربھات کی نظمیں اچھی لگیں۔ ''کاغذ کی تنہائی'' آپ کی خوبصورت کاوش ہے۔ اکبر حمیدی، کرشن کمار طور، پی پی سریواستو ارند، ساغری، گفتار خیالی، سجاد بابر اور ذوالفقار احسن کی غزلیں ادبی سرمایہ ہیں۔ ذوالفقار احسن اعلیٰ اور معیاری پنجابی شاعری کے ساتھ ساتھ خوبصورت اردو غزل کہنا بھی جانتے ہیں۔ مراسلت میں جمیلہ ہاشمی کا تبصرہ نظر سے گزرا جو انھوں نے بڑی محنت سے سپرد قلم کیا۔ لکھتی ہیں کہ ڈاکٹر محسن مگھیانہ کے پہلے تینوں ماہیوں کی ابتداء لفظ ''کوئی'' سے ہوتی ہے جو خالص پنجابی لہجہ ہے اور اردو میں اچھا نہیں۔ عرض ہے کہ ماہیا بھی تو پنجابی سے ہی اردو میں آیا ہے۔ اور اب تو انگریزی کے لفظ اتنی بڑی تعداد میں اردو میں بولے اور لکھے جاتے ہیں کہ اردو اکیلی بنے ہوئے مدتیں ہوگئی ہیں۔ لفظ ''کوئی'' پر اعتراض اچھا نہیں لگا۔ ڈاکٹر غزالہ خاکوانی کا خط انتہائی جلا کٹا اور بیزار سا تھا۔ نظم نہ چھپنے پر اتنی مایوسی اچھی نہیں لگی۔ نصیر احمد ناصر تو بےلوث سے آدمی ہیں۔ شکر ہے آپ نے نظم شائع کر دی۔ خط پڑھ کر تو میں خود پریشان ہو گیا تھا۔

(آتش کیانی-ساہیوال)

☆ تسطیر -۱۸-۷ پڑھ لیا ہے۔ میری غزل کو چھوڑ کر باقی سب ہی غزلیں اور نظمیں قابل فہم اور مختلف روایات کی آئینہ دار ہیں۔ ہر افسانہ کسی نہ کسی معاشی یا معاشرتی پہلو کی خرابی کو عیاں کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ تاہم منیر الدین احمد اپنے افسانہ ''مسدود راستہ'' میں، شفیع ہمدم ''ڈھال'' میں اور اجمل اعجاز ''بلی ماں'' میں اپنی افسانہ نگاری کا پورا پورا حق ادا کر رہے ہیں۔ شفیع ہمدم نے ''ڈھال'' میں تو صرف ایک لڑکی کا رونا رویا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ آج ہر دوسویں گھر میں ایک ثمرہ ایسی بیٹھی ہے جسے کسی اچھے سے نوشہ کا انتظار ہے۔ مراسلت میں کئی غیر معروف اور معروف حضرات شامل ہیں جنہوں نے اس حصہ کیلئے خاصے کامیاب ''مراسلے'' بھیجے ہیں۔ ادیب اور شاعر کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ جو چاہے لکھے مگر اتنا ضرور خیال رکھے کہ جو کچھ وہ لکھے گا اسے نئی

ایک پڑھیں گے۔ترقی پسند تحریک کے مستقبل کے بارے جناب محمود احمد قاضی نے ایک مثبت نوید سے نوازا ہے۔ اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حق بات کہنا دار پر چڑھ جانے کے مترادف ہے مگر میں نے دیکھا ہے کہ محمود احمد قاضی کبھی بھی حق بات کہتے ہوئے نہیں ڈرتے۔ تنقید و تحقیقی والا حصہ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی دلچسپ ہے یعنی جس مضمون کو شروع کریں، پڑھے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اور پھر ہر مضمون ایک دلچسپ تنقیدی و تحقیقی حیثیت کا مقالہ ہی ہے۔ ناصر عباس نیر نے پروفیسر نظیر احمد صدیقی کی کتاب ''اقبال اینڈ رادھا کرشنن'' پر تبصرہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ جزئیات تک کو بیان کرتے ہوئے بھی بڑی باریک بینی سے کام لیا ہے۔ امجد طفیل ''تنقید کی آزادی'' مظفر علی سید کی کتاب پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں مگر کہیں کہیں خود بھی مظفر علی سید ہی دکھائی دیتے ہیں۔ علی دانش کا پُر مغز مقالہ بار بار پڑھنے کی چیز ہے کاش! ہماری قوم یہ سمجھ سکے کہ ہم آج بھی اگر انگریز کے غلام نہیں تو پھر ایک انگریز لارڈ میکالے کے بنائے ہوئے نظامِ تعلیم کے غلام کیوں ہیں؟ دُکھ اس بات کا ہے کہ آج کے رائج انگلش میڈیم ادارے قوم کے نونہالوں کو نہ صرف ذہنی طور پر انگریز کے غلام بنا رہے ہیں بلکہ انہیں اپنی ثقافت سے بھی دُور لے جا رہے ہیں۔ یاد رہے کہ اگر یہی نظام تعلیم اسی طرح چلتا رہا تو ایک ایسا طوفانِ بدتمیزی اُٹھے گا کہ طالب علم خود اُستاد سے کہے گا کہ ''میں تیرا شاگرد نہیں بلکہ تُو میرا شاگرد ہے'' کبھی حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔ بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پیش از سبق / کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے۔

(زهیر کنجاهی-راولپنڈی)

☆ تسطیر-۱۶،۱۵ میں صہبا وحید (دہلی بھارت) نے اپنے مراسلے میں ممتاز اطہر کی غزل میں ''چاک'' کا قافیہ ''طاق'' باندھے جانے کو بدعت قرار دیا ہے۔ بقول اُن کے اگر اس سلسلے میں پنجاب کے تلفظ کو جواز تسلیم کر لیا جائے تو پھر حیدر آباد دکن کے لوگوں کی مجبوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ''خ'' اور ''ق'' کو بھی ہم قافیہ ماننا پڑے گا۔ تلفظ کی بوالعجبیوں کے باب میں انہوں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی کے ایک حیدر آبادی نیوز ریڈر کے مزیدار نشریے اور پطرس بخاری کے دلچسپ اقدامات کا بھی ذکر کیا ہے۔ حالانکہ صہبا وحید نے ایک طے شدہ مسئلے کو چھیڑ کر کوئی قابلِ فخر کارنامہ انجام نہیں دیا مگر درپیش صورت حال میں اہل نظر کے لیے ان کے نکتہ اعتراض سے اغماز بھی ممکن تھا۔ سفر ناموں میں ان کی بے اعتدالیوں کے باوجود میں مستنصر حسین تارڑ کو ایک معتدل انسان سمجھتا تھا۔ مگر صہبا وحید کے بے ضرر خط کو موصوف نے جس شدت سے محسوس کیا ہے اور جس مبتذل انداز میں اس کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا واقعی غلط نہیں کہ ''مردہ ذہنیت ابھی تک بساند دے رہی ہے۔''

(احمد جمیل-واہ کینٹ)

☆ تسطیر ۱۸-۱۷ اپنی تمام تر رنگینوں اور رعنائیوں کے ساتھ پنجابی ادبی سانجھ چیچہ وطنی کے دفتر میں پڑا دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ ہم نے اٹھا کر دیکھا چند صفحے ہی نظر نواز ہوئے تھے کہ ہم اس کے سحر میں اسیر ہوتے چلے گئے۔ یہ ہمارے ساتھ ہی نہیں ہوا جو بھی اس چمنستان شعر و ادب کو دیکھتا ہے وہ اسیرانِ تسطیر میں شامل ہو جاتا ہے۔ کافی عرصہ سے ایک ایسے پرچے کی شدت سے ضرورت تھی جو غیر جانبدار ہو۔ اس شمارے میں ناہید قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا اکٹھے نظر آئے۔ صد شکر کہ ہمارے ادبی بزرگ کم از کم

تسطیر کے پلیٹ فورم پر تو یکجا ہوئے۔تسطیر ایک دل میں اُتر جائے والی تحریک کا نام ہے۔ پرانے لکھاریوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی نمائندگی پسند آئی۔ اس طرح ادب جمود کا شکار نہیں ہوتا۔ آپ کا اداریہ انتہائی فکر انگیز ہے۔ اس پر ہم کالج کی سطح کے طالب علم اظہار خیال تو نہیں کر سکتے لیکن فیض ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ بڑے بڑے نقادوں اور دانشوروں کے خیالات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ تسطیر سے ہمیں معلوم ہوا کہ ادب موجودہ صدی میں کونسا رخ اختیار کر سکتا ہے، آپ کے بارے میں اتنا تو ہمیں پہلے بھی معلوم تھا کہ آپ نظم کے بہت بڑے شاعر ہیں لیکن تسطیر پڑھ کر آپ کی قدر و منزلت سے مزید آگاہی ہوئی۔ ہماری ناقص رائے میں طالب علم اگر اسی پرچے کا باریک بینی سے مطالعہ کر لیں تو انہیں اپنے نوٹس بنانے میں اضافی کتب کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اگر آپ مراسلت میں تھوڑی سی جگہ تسطیر کے عام قارئین کے لیے وقف کریں تو مہربانی ہوگی کیونکہ تسطیر جتنا شعراءِ کرام، صاحب بصیرت نقادوں اور ادیبوں کا ہے اتنا ہی اس پر ہمارا بھی حق ہے، ہم نے جس دن سے تسطیر پڑھنا شروع کیا ہے اس دن سے کوئی اور پرچہ دل میں اُترتا ہی نہیں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ منظوم حصہ میں گفتار خیالی، سیما سراج، احمد جمیل، اسماء راجہ، ثمینہ راجہ، ستیہ پال آنند، انور سدید، غزالہ خاکوانی اور نصیر احمد ناصر کی تخلیقات کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ نئی اصناف میں آصف ثاقب اور سلطان کھاروی کے ماہیوں میں ماہیے کا رنگ ناپید تھا۔ آصف ثاقب کے ماہیے ویسے عروض کے حساب سے ٹھیک تھے۔ آتش کیانی کے ماہیے دوبارہ پڑھنے کو جی چاہتا تھا یہ اُن کی انتہائی خوبصورت کاوش ہے آپ کے نظمیے بھی بے حد خوبصورت تھے۔ مراسلت میں حیدر قریشی کا خط پڑھا، کوئی حیرانگی نہیں ہوئی، دوسروں پر کیچڑ اچھالنا اُن کی عادت ہے۔ آپ نے بڑا مدلل جواب دے کر انھیں مطمئن کر دیا۔ آپ سے ایک درخواست کرنی تھی کہ آپ نے ۷۰-۸۰ کی دہائی کے بعد ہائیکوز لکھنی کیوں بند کر دیں۔ آپ کی شاعری کے کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں، ایک بڑا شاعر تمام اقوام کا مشترکہ اثاثہ ہوتا ہے، مہربانی کر کے اس طرف اب بھی توجہ دیں، ہمارے خیال میں تو پاکستان میں ہائیکو اور ماہیا نگاری کی ابتداء آپ ہی نے کی تھی ﴿۱﴾۔ ''کاغذی پیرہن'' کا سرورق گواہ ہے کہ آپ نظم کے بہت بڑے شاعر ہیں اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے اور ہمارے لیے خوبصورت ادب تخلیق کرتے رہیں۔ (آمین)

(نثار تابش، عرفات کاوش۔ چیچہ وطنی)

﴿۱﴾ یہ آپ کی محبت ہے کہ ایسا سمجھتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ میں نے ۸۰ء کی دہائی کے اوائل میں بہت سی ہائیکوز لکھیں اور کچھ اردو ماہیے بھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں تخلیقی سطح پر مساوی الاوزان ہائیکو کی ابتدا کرنے والوں میں محمد امین کا نام سرِ فہرست آتا ہے۔ اردو ماہیا نگاری میں میرا کام بالکل معمولی اور بنیادی نوعیت کا ہے۔ اس صنف کے فروغ کے لیے علی محمد فرشی اور حیدر قریشی کا کام بڑی اہمیت اور اولیت کا حامل ہے۔ ویسے عزیزانِ من! شاعری تو ہمیشہ سے موجود ہے، میرے نزدیک اس کی کسی صنف کی ابتدا (یعنی کب، کس نے، کیسے اور کیوں؟) کی بات کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ ہر نئی بات پرانی ہی تو ہے/ زندگی لوک کہانی ہی تو ہے۔ (ن۔ا۔ن)

☆ آپ نے جو تسطیر شمارہ ۱۸-۱۷ میرے گھر کے پتہ پر وی پی کیا تھا وہ یہاں مجھ تک پہنچ چکا ہے۔ میں آپ کا

ممنون ہوں کہ آپ نے میری غزل کو بھی جگہ عنایت فرمائی لیکن غزل کے مطلع میں غلطی ہوگئی جو جو غالباً کتابت کی وجہ سے ہوئی ہے۔ میری غزل کا مطلع اس طرح سے تھا: دھوپ کے شہر میں نہ آؤ تم / ہم کو ڈر ہے پگھل نہ جاؤ تم **(خادم حسین خاکسار-مدینہ المنورہ، سعودی عرب)**

☆ جہاں تسطیر کے مطالعے سے مجھے خوشی ہوئی وہاں کسی قدر حیرت بھی ہوئی کہ جمیلہ ہاشمی اور احسان الٰہی احسن نے عروضی سقم کے حوالے سے شہاب صفدر صاحب کا نام بھی لیا۔ بغیر تحقیق اور مطالعے کے کسی پر تنقید کرنا دوسرے ناقدین کو اپنی کم فہمی پر تنقید کرنے کے لیے دعوت دینا ہے۔ بظاہر تو تنقید ایک آسان عمل نظر آتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تنقید کرتے وقت ایک نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ تصنیف کی روح میں داخل ہو جائے، اس کے اسقاطی اور دائمی عناصر میں تمیز کرے، اس کے محاسن کا تجزیہ کرے اور مفہوم کی تشریح کرے۔ اس کے جمالیاتی اور اخلاقی عناصر کو پیش کرے اور اس کے تاریک گوشوں پر روشنی ڈالے۔ اور ان تمام باتوں میں سے کسی ایک بات کو بھی مدنظر نہیں رکھا گیا۔ اور ایک ایسے شاعر پر تنقید کی گئی جس نے پہلے دن سے باوزن اور مفاہیم سے بھرپور اشعار لکھے۔ غزل کے مصرعہ اولیٰ میں لفظ ''پیاس'' کو ہمیشہ ''پاس'' کے وزن پر ادا کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے آپ کو باقی ماندہ مصرعے مصرعہ اولیٰ کے وزن سے ہٹ کر دکھائی دیئے کہ آپ نے لفظ پیاس کو پیاس ہی کے وزن پر دیکھا۔ **(اخلاق احمد-ڈیرہ اسمعیل خان)**

☆ تسطیر ستمبر ۲۰۰۱ء ملا۔ آپ کی شاعری پڑھنے کا ایک ذریعہ ہاتھ لگا، جی ہاں ''ردی کاغذ پر لکھنے والے / شاعر مر جاتے ہیں / نظمیں زندہ رہتی ہیں!'' میں شاعر ہوں نہ رسمی حوالوں سے ادیب ہوں، صرف اس قدر ہے کہ شاعری اچھی لگتی ہے اور شاعر پیارے لگتے ہیں۔ نثر کے سو صفحات مل کر وہ تاثر نہیں پیدا کرتے جو ایک شعر یا مصرعہ کر جاتا ہے۔ شاعری انسانی سوچ، جذبوں محبتوں اور احساسات کا ایک جہان ناپیدا کنار ہے۔ تسطیر کے مندرجات میں ''مراسلت'' کے راستے داخل ہوا ہوں اور کراکری کی شاپ میں سانڈ کے داخلہ والی بات ہے۔ بہت اچھے خطوط پڑھے۔ آپ کے ایک مراسلہ نگار خیر الدین انصاری کی تجویز بحوالہ محمد افسر ساجد کی تائید کرتا ہوں۔ لکھنے والوں کا پتہ اور فون نمبر ضرور دیئے جائیں تاکہ لوگ رابطوں میں رہیں۔ انصاری صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ پڑھنے کا شوق رکھنے والوں کی قوت خرید بے حد کم ہے، جن کے پاس مال ہے انکو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ستیہ پال کا خط توجہ سے پڑھا، ہندوستان کی حکومت اور عوام نے اردو کو اسلام کی زبان سمجھ کر رد کر دیا ہے، حالانکہ زبانوں کا مذہب نہیں ہوتا۔ میری آبائی لائبریری میں بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے کچھ جرائد موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ایک ہزار سے زائد ہندو اور سکھ اُردو کے شاعر، ادیب، مصنف اور صحافی تھے۔ اب صرف تین ہندو اور ایک سکھ رہ گیا (جیسا کہ ستیہ پال نے لکھا ہے)۔ ستیہ پال نے اردو کورس میں جو کتابیں پڑھی تھیں وہی میں نے بھی پڑھی تھیں، زیر تبصرہ خط پڑھ کر لطف بھی آیا، آنسو بھی آئے۔ خاصا عرصہ پہلے لندن میں ستیہ پال آنند سے ملاقات (شاید) ہوئی تھی، برٹش لائبریری لندن والوں نے میرا وڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا تھا۔ **(سید بشیر حسین جعفری - راولپنڈی)**

☆ پچھلے دنوں میرے ایک عزیز پاکستان سے آتے ہوئے کچھ کتابیں اور رسالے لیتے آئے۔ ان میں سے

ایک تسطیر کا شمارہ ۱۰،۹ بھی تھا، جو گمان ہے کہ میرے گھر ان دنوں موصول ہوا ہوگا جب میں ناروے آ چکا تھا۔ سو اس Content Rich پرچے کو مجھ تک آتے آتے دو سال سے زیادہ وقت لگا۔ یہ خط لکھتے ہوئے عجیب سے احساسات ہیں۔ ان دنوں میں خاص طور پر وسلاوا شمبورسکا کو پڑھنے اور ترجمہ کرنے میں مصروف تھا۔ یہ تراجم زیادہ تر یونہی پڑے کے پڑے رہ گئے، تاہم ان میں سے کچھ "آثار" اور "تسطیر" میں چھپے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ آپ نے اپنی نظموں کا کسی لاطینی/ جنوبی امریکی زبان میں ترجمہ مجھے بھجوایا تھا، اور غالباً میری رائے جاننا چاہی تھی اس بارے میں کہ یہ ترجمے وغیرہ کس زبان میں ہیں۔ میں نے ایک دوست سے جو انہی دنوں برازیل میں ایک سال رہ کر آئے تھے، استفسار کیا مگر وہ کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈال سکے۔ پھر یہ ہوا کہ میں ادھر چلا آیا۔ اس پرچے میں بہت سی قابل مطالعہ چیزیں ہیں۔ مارکیز کے ناول کے اجزا، تارڑ کا انٹرویو، نظمیں، مضمون، کہانیاں، تراجم ... غزلیں آپ نے ٹھیک چھاپی ہیں بلکہ خوب۔ تراجم کے حوالے میں البتہ عرض کروں گا کہ بعض اوقات لائنوں میں درمیان فاصلہ دینا یا الفاظ وغیرہ "چیرنے" بنا دینا، عام تفہیم کے علاوہ خود اصل تخلیق کی جمالیاتی فضا تک رسائی کے لئے بھی اچھا ہوتا ہے۔ بعض جگہ یہ بات نظر نہیں آئی۔ کچھ حصہ اس میں ترجمہ کرنے والوں کا بھی (مجہولیت) ہو سکتا ہے۔ وسلاوا شمبورسکا کی نظم "خوابوں کی مدح میں" کا ترجمہ شاید کچھ ٹھیک نہیں چھپا، مصور کے نام کے بارے میں مجھے ٹھیک سے علم نہیں کہ اردو میں کیسے لکھا جائے گا۔ وطن عزیز میں ادبی جرائد کا مستقبل مخدوش ہی ہوا کرتا ہے، پھر بھی مجھے بہت امید ہے کہ "تسطیر" جاری رہے گا اور خوبصورت شمارے پیش کرے گا۔

(ادریس بابر۔ناروے)

☆ سچ پوچھئے تو تسطیر ایک مطالعاتی سلسلہ ہے جو ہمہ وقت چلتا رہتا ہے، رکتا نہیں۔ جس طرح "تسطیر" کے سابقہ شمارے بھی کبھی کبھی شیلف سے گھر کے مالک کو اشارہ کرتے ہوئے دعوت مطالعہ دیتے ہیں!!! میں بسا اوقات رضی الدین رضی کی مکالماتی نظم "خواب بیچنے والا" تسطیر شمارہ ۲ کا ورد کرتا رہتا ہوں۔ اس طرح اور بھی کئی چیزیں ہیں جو اپنا اثر دکھاتی رہتی ہیں۔ تازہ شمارہ کی قرات کے بعد میں اپنی سی رائے آپ کو بھجوانے کی جسارت کر رہا ہوں میرے نزدیک ایک اچھے قاری کی یہی ایمانداری ہے کہ وہ اپنی رائے ضرور قائم کرے ورنہ ذہن کے اندر پڑا مواد سڑنے لگتا ہے۔ سابقہ اداریوں کی طرح اس بار بھی آپ کا اداریہ ایک اجتماعی فکری سوال اٹھاتا نظر آتا ہے۔ اس پر تمام بڑے اہل علم دوستوں کو توجہ دینی چاہئے، ان معاملات پر گفتگو ہونی چاہئے مذاکرے ہوں، سیمینار ہوں۔ ہمارے کچھ نقاد اپنی الگ راہ اختیار کر کے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور نتائج بھی اپنی مرضی کے ہی پیش کرتے ہیں۔ اچھا ہے آپ اپنا کام برابر کرتے جا رہے ہیں ورنہ کچھ صاحب زبان خاموش بیٹھے ہیں اور مسلسل خاموشی ایک بڑا خلا پیدا کر دیتی ہے۔ ایک مغربی دانش نے کہا ہے۔

(If you are silent for long time people just arrive in your mind)

افسانوں کے حصہ میں اچھے افسانے پیش کیے گئے ہیں۔ جوگندر پال نے "سواریاں" میں موجود خیال بہت چھوٹا سا ہی مگر بڑی اچھی ترتیب اور بناوٹ کے ساتھ اس باریک نکتے کو افسانہ بنایا گیا ہے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر قاری کی توجہ کھینچتا ہے۔ ورنہ قاری مکالمہ بولنے والے کردار کے پیچھے گم ہو سکتا ہے۔ جوگندر

پال اردو ادب کے بلاشبہ ایک عظیم افسانہ نگار ہیں۔ رشید امجد کے افسانے ''عشق نہ پچھے'' میں ایک بوڑھے کو اپنی گاڑی سے عشق کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس طرح کے کردار اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں جو بعض چیزوں کی ایسی دیوانگی کے ساتھ پوجا کرتے ہیں۔ زمین پر رہتے ہوئے انسان بے حس نہیں ہو سکتا۔ وہ حساسیت جو انسان کے اندر خداوند نے بھر دی ہے وہی اس افسانے کے اندر جھلک رہی ہے۔ اور آخرکار ایسا مجبور شخص ہلکی سی ٹھوکر سے ایک دن ٹوٹ جاتا ہے۔ منیر الدین احمد کی کہانی ''رچرڈ رائٹ'' افسانہ سہی تاہم کسی قریبی دور کی سچی داستان معلوم ہوتی ہے۔ کہانی کا بیانیہ بھی بتاتا ہے یہ واقعہ حقیقی ہے تو بھی خوشی اس بات کی ہے کہ ایک اور خوبصورت افسانہ پڑھنے کو ملا ہے۔ اعجاز احمد فاروقی نے اپنے افسانہ میں ایک اہم معاشرتی برائی کو نہایت خوبی کے ساتھ پینٹ کیا ہے۔ دارو از محمد سعید شیخ کی کہانی تو نئی نہیں طرز تحریر ضرور مختلف ہے۔ اس طرح کی کہانیاں ویسے تو ''سسپنس'' جیسے رسالوں میں ہی ملتی ہیں مگر یہاں اس کی خوبی کچھ اور بھی ہے۔ مصنف نے جملہ بندی کے ساتھ کرداروں کو خوب نبھایا ہے موصوف کو خوب فنکاری آتی ہے۔ محمود احمد قاضی، ایک عجیب مقدمہ پیش کرتے ہوئے کمال ہنر مندی کے ساتھ بچ نکلے ہیں۔ انسانوں سے ہٹ کر دوسری اجناس پر اظہار رائے ذرا مشکل ہوتا ہے تاہم جس طرح دوستو وسکی گھوڑوں کی نفسیات بیان کرتے ہوئے قاری کو پیچھے لگا لیتا ہے محمود قاضی صاحب بھی اسی طرح قاری کو چوہوں کے بل میں ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ شجر زاد شمع خالد کا بڑے نرم و گداز طرز احساس کا افسانہ ہے، کہانی کوئی نئی نہیں پھر بھی طرز تحریر ان کا اپنا ہے۔ کہانی شروع ہوتی ہے تو قاری بے خیالی میں پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یقین کیجئے افسانے کی آخری سطر پر میری نگاہ پہنچی تو آنکھیں نم تھیں جہاں (روزینہ اپنے بیٹے تجمل کی چھوٹی بیٹی کو گود میں اٹھائے اس کے پاؤں چوم رہی د   ضیاء الدین کے افسانے/گم شدہ رشتے میں ایک عجیب الجھاؤ تھا، میں مطالعہ جاری نہ رکھ سکا غزال ضیغم   مانہ ''گنبد تیز گرد نیلی فام'' عمدہ افسانہ ہے، بنت کاری اور گفتگو خوب ہے۔ اچھا لگا ہے۔ رفاقت حیات کی ''پرچھائیں'' میں کہانی کو افسانہ نگار نے بڑی عمدگی سے بُنا ہے موصوف نے بڑی کامیابی سے مشاہدات کا میدان قاری کے پاؤں تلے بچھاتے ہوئے کہانی کا تسلسل قائم کیا ہے۔ کہانی کے مرکزی کریکٹر کو میری سوچ کے مطابق (Develop) کیا گیا ہے۔ کیا بات ہے! کیا کہنے! کیا ہی خوب ہوا گر افسانہ نگاروں کے لیے ایک سوال اٹھایا جائے کہ ''مصنف کس ماحول یا خیال کے زیر اثر کہانی لکھنا شروع کرتا ہے'' اس پر آپ (محترم نصیر احمد ناصر) بھی زور دے سکتے ہیں یوں لکھاری کی ایک اور جہت سامنے آئے گی۔ مرزا حامد بیگ کا مضمون اچھا ہے، تاہم کچھ کچھ تعریفی سا لگتا ہے۔ نظموں کا حصہ خوب ہے۔ غلام جیلانی اصغر، جمیل ملک، انور سدید، ڈاکٹر صابر آفاقی، عذرا نقوی، عشرت رومانی، روش ندیم، معصومہ شیرازی، وزیر احمد شان کی نظمیں پسند آئیں۔ خصوصی مطالعہ میں احمد ہمیش کی غزلیں اور سیدہ آمنہ بہار رونا کی نظمیں خوب تھیں۔ بشریٰ اعجاز کی نظمیں بھی خوب ہیں۔ میں بشریٰ اعجاز کو خاص طور پر پڑھتا ہوں۔ افسانہ ہو یا نظم غزل ہو یا کوئی مراسلاتی تحریر بشریٰ کے لفظ کسی انسانی صحیفے کی طرح جوق در جوق سینے میں اتر کر چھید کرتے ہیں۔ بشریٰ کی نظموں میں محبت کا اثر کچھ زیادہ گہرا ہے ''محبت کا خدا بس ایک ہوتا ہے'' اور ''محبت حادثہ ہے'' پر مجھے کوئی بحث نہیں کیونکہ یہ

(Natural Conversation) ہے۔ غزل کے میدان میں بڑے خوبصورت شعر ملے ہیں۔ محسن احسان، ظفر گورکھپوری، ظفر اقبال، جعفر شیرازی، آصف ثاقب، ارمان نجمی، سیماب اویسی، کاشف مجید، شہاب صفدر، احسان شاہ، ہارون رشید، تنویر قاضی، تبسم ریحان، ہارون الرشید، صادق عدیل فرشتہ کے اشعار پسند آئے ہیں۔ ان کے علاوہ ماہیے، ہائیکو اور دوہے خوب رنگ و جمال پیدا کرتے ہیں۔ تاہم کئی دوستوں کے ماہیے بھی کسی اخباری کالم کی سرخی کا گماں پیدا کرتے ہیں جبکہ ''ماہیا'' دراصل ساجن/محبوب سے گفتگو کا نام ہے۔ اس صنفِ نازک میں سیاسی، سماجی مسائل کی بجائے رومانی جذبات کو بیان کیا جائے تو کیا ہی بہتر رہے۔ اس خط کے ساتھ ارم انجم کے ماہیے بھجوا رہا ہوں اس نقطہ پر رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ ترجمہ میں مسیح بے صلیب شاہین مفتی کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ نظم میں وزیر آغا، جیلانی کامران، ستیہ پال آنند، انوار فطرت، رفیق سندیلوی، علی محمد فرشی، ثمینہ راجہ، پروین طاہر، نصیر احمد ناصر کی نظموں کو کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ چند نام ہی نظم کا جواز ہیں ان نظموں کے لفظاً و معنیً چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔

(سرفراز تبسم- گوجرانوالہ)

☆ تسطیر بے حد معیاری ادبی رسالہ ہے، جس میں بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں کے فن پارے پڑھنے کو ملتے ہیں اور یوں ادب کے قاری کی تشنگی مٹ جاتی ہے۔ یقیناً ''تسطیر'' جاری کر کے آپ اردو ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کی شاعری بہت اچھی ہے۔ موضوعات اور اظہار بیان کے اچھوتے پن نے بہت متاثر کیا۔ نظموں میں جدید مشینی دور کے انسان کے مسائل آپ نے بلندیٔ فکر کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ لہجے کی تازگی بہت خوشگوار تاثر پیدا کرتی ہے، بے حد اثر انگیز نظمیں ہیں۔ **(نرگس آراء-گجرات)**

☆ کافی عرصہ ہوا تسطیر نظر سے نہیں گزرا۔ بقول مصطفیٰ زیدی ''اب تو ہر روز گزرتا ہے مہینے کی طرح۔'' یوں تو میں بہت سے ادبی رسالوں کا مطالعہ کرتا ہوں لیکن تسطیر مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ غلام علی کی آواز میں آپ کی غزل ''بے کراں تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا'' میں بہت شوق سے سنتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے نثری اور آزاد نظموں میں خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن جب آپ کی کتاب ''عراپچی سو گیا ہے'' پڑھی تو مجھے آزاد نظموں کا صحیح تناظر اور صحیح مقام معلوم ہوا۔ بعد میں آپ کی ایک اور کتاب اکمل شاکر سے لے کر پڑھی۔ آپ کا ایک ایک مصرعہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کی نظمیں دراصل کائنات کا حسن، محبت، ہجر و وصال کا حسین امتزاج ہیں۔ تبھی تو بیسویں صدی کی بہترین نظم نگاری میں آپ کا انتخاب کیا گیا۔ محترم ناصر صاحب! میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اسے خوشامد سے تشبیہ مت دیں۔ یہ میری چاہت ہے اور دل نے مجبور کیا ہے کہ آپ کے متعلق کچھ لکھوں۔ ورنہ آپ کی شخصیت تو مجھ جیسے کسی بھی شخص کی تعریف کی محتاج نہیں ہے۔ امید ہے آپ جواب سے ضرور نوازیں گے اور ''تسطیر'' کا نیا شمارہ بذریعہ وی۔ پی ارسال فرمائیں گے۔

(وسیم صادق-پسنی، بلوچستان)

☆ ناصر کاظمی نے غزل کو نئی لے اور نئے انداز مہیا کیے تھے تو نصیر احمد ناصر نے نظم کو مابعد جدید کا آہنگ عطا کر دیا جس نے اُن شاعروں کی پول کھول دی جو پچھلے کچھ سالوں سے اپنی بے سروپائی کر رہے تھے اور

میں Neologism میں مبتلا تھے۔ وہی شاعری بڑی بنتی ہے جو ابہام کے ہمراہ سمجھ کے دائرے میں سمٹ آئے۔ آپ کی شاعری آج کو مکمل کر رہی ہے۔ میں نے پچھلے جون میں زر سالانہ بھیجا تھا مگر ابھی تک رسید سے آپ نے سرفراز نہیں فرمایا ☆ اف پتہ نہیں کیا بات ہے۔ مجھے پیسوں کی بالکل بھی فکر نہیں آپ پیسوں سے بہت زیادہ اونچی شخصیت ہیں۔ اب میں جلد ہی ''تسطیر'' کے لیے اکٹھا دو سال کا زر سالانہ ارسال کرنے والا ہوں کیونکہ ''تسطیر'' پڑھ کر مجھے سکون آتا ہے ورنہ تو بہت سے رسائل ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ادب میں رہنا چاہتا ہوں، آپ کی کسی بھی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ آپ نثر بے حد خوبصورت اور معنی خیز لکھتے ہیں، اس لیے میں اپنی شاعری پر ایک مضمون آپ سے ''کتاب نما'' کے لیے چاہتا ہوں اگر آپ کو اپنی مصروفیات سے تھوڑا وقت مل جائے تو یہ کرم آپ مجھ پر ضرور فرمائیں۔

(ڈاکٹر حنیف ترین - عرعر، سعودی عرب)

☆ اف ڈاکٹر حنیف صاحب! ڈرافٹ مل گیا تھا لیکن میں اپنے حالات و مسائل میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ ڈرافٹ بینک میں جمع نہ کروا سکا اور وہ کاغذوں میں کہیں گم ہو گیا۔ دوبارہ بنوا کر بھیج دیجیے، ممنون ہوں گا۔ فی الحال صحت زیادہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ کی محبت کا دل سے معترف ہوں۔ (ن-ا-ن)

☆ اس مرتبہ پچھلے شمارے کے اداریے کے ردِ عمل میں اچھی خاصی تنقیدی اور تاریخی بحثیں شامل ہو گئی ہیں۔ مجھے اربابِ ادب کے خطوط پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔ ستیہ پال آنند صاحب کا طویل ردِ عمل بغور پڑھا۔ موصوف نے علمی انداز سے آپ کے اداریہ کو لیا ہے اور مدلل طرزِ بیان سے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے ان کے یہاں نو آبادیاتی ذہن کی کارفرمائی نظر آئی۔ اگر آپ کے پاس ان کا شعری مجموعہ ''مستقبل آ مجھ سے مل'' موجود ہو تو مہربانی کر کے اس کے طویل مقدمہ کو ایک بار پڑھ جائیں گے۔ آنند صاحب کے ذہنی تحفظات آپ کو صاف نظر آ جائیں گے۔ موصوف اردو شاعری اور شعری تہذیب و روایت سے حد درجہ متنفر ہیں۔

(جمال اویسی - دربھنگہ، بھارت)

☆ تسطیر کا نیا شمارہ موصول ہوا، اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں، میں رسالے کی رسید جلد نہ بھجوا سکا، اس لیے کہ دو ماہ تک علیل رہا، اب طبیعت قدرے بہتر ہو رہی ہے۔ آپ نے میری چیزیں شامل اشاعت کی ہیں، شکریہ! میں ان دنوں ''متن، نقاد اور قاری'' کے موضوع پر کام کر رہا ہوں۔ اس سے متعلق مقالہ جلد پوسٹ کر دوں گا، انشاءاللہ! تسطیر زیرِ مطالعہ ہے، آپ نے جس محنت اور بصیرت سے قیمتی اور متنوع مواد کو مرتب کیا ہے، وہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ طاؤس بانہالی مرحوم کے خطوط پڑھے، کتنے زندہ دل اور شگفتہ مزاج شخص تھے، ۱۹۸۶ء میں اُن سے مقتدرہ کے اجلاس میں ملاقات کا نقش دل میں اب بھی روشن ہے، اُن کے خطوط اُن کی باغ و بہار شخصیت کا عکس پیش کرتے ہیں۔ اردو دنیا کے معروف اور مقتدر افسانہ نگاروں، نقادوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ نوخیز فنکاروں کو بھی تسطیر میں جگہ دے کر آپ نے ادبی اقدار کو فروغ دینے کی لائق تحسین سعی کی ہے۔

(پروفیسر حامدی کاشمیری - سرینگر، کشمیر)

TASTEER

Issue No. 19, 20 & 21, 22 Oct 2001 to Mar 2003